

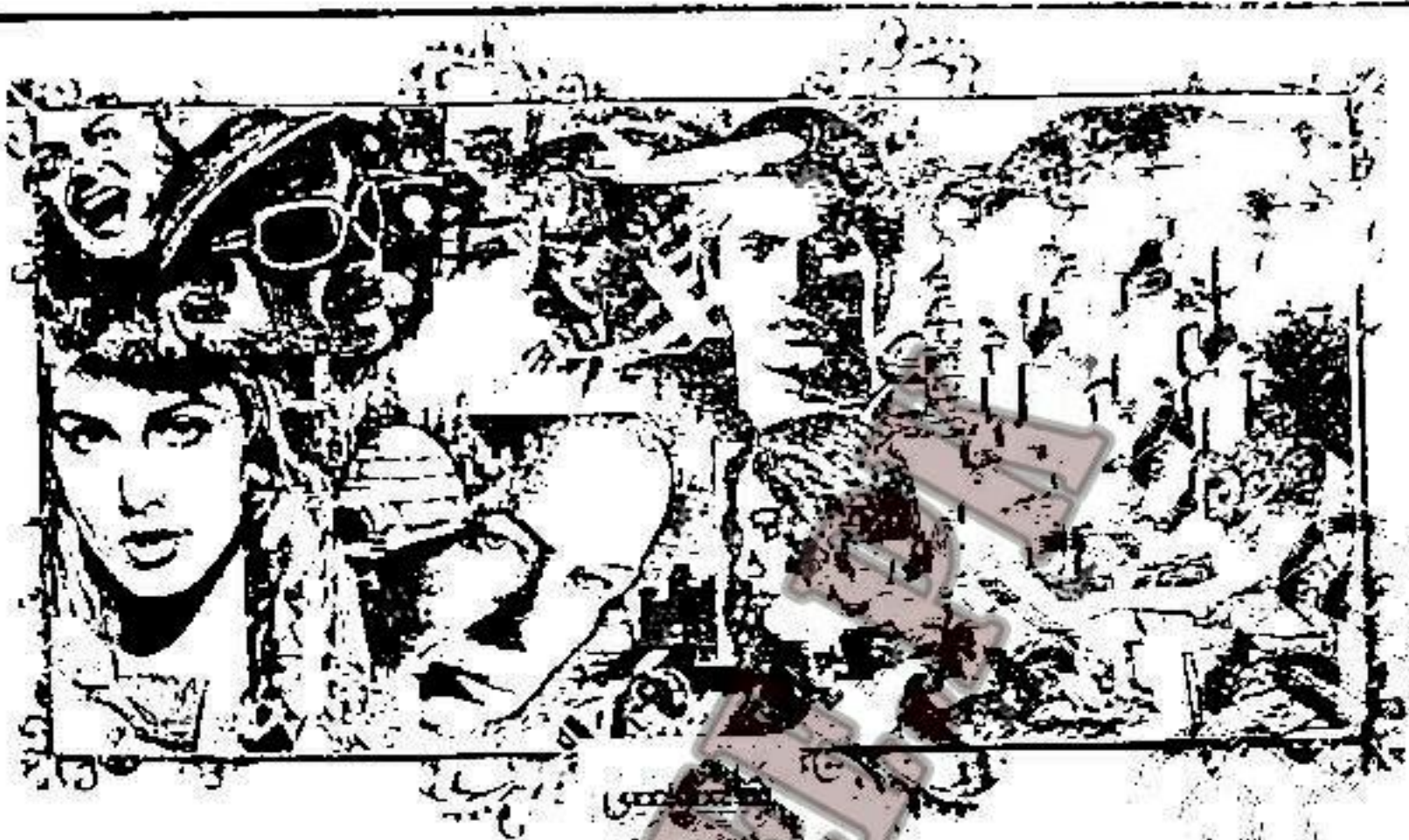
دلچسپ اور نئی خیز کہانیوں کا مجموعہ

جاسوسی ڈائجسٹ

دسمبر 2015

نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK



بہوش و موش
آسیم اکمل



جین کا فیصلہ
مس خان



گوریا
مس خان



نامک جنت
مس خان



ٹھنڈا انتکا
مس خان



چھسکارا
مس خان



ناکافتاح
مس خان



انگارے
مس خان



مدیر اعلیٰ
عذرارمول

162
آوارہ گرد
ڈاکٹر عبدالرحمن نعیمی

تیرے... سستی اور ایکشن میں ابھرتا
آہستہ آہستہ سلسلہ...

159
خاک گواہی
جمال دوستی

بھیس بھیس سرج کی کارکردگی
جس نے یوم پانس پلٹ دیا

217
پرفیکٹ مڈل
امیر سعید

چونکاوئے والے انجمن آئے
مزین... مقرر ہو گئی جدت پسندی

205
جوکر
حمید اقبال

میر محبوبی ذہین، حریف کے
مالک نفس کا طریت تحقیق

195
ہتھکڑی
سینئر منار ارض

آئل کی ایک ڈکارانہ واردات ہے کہ...
جج کے اپنا کارڈ بڑے بجاات بجااتا

00
تراش تراش
املاؤ و قارین

اقتباسات نگہیان مسکرائیں اور قہقہے
سب کچھ آپ کی آفریح طبع اور تواضع کے لیے

259
بساط
محمد اویس اعجاز

ایک شائستگی اور کبھی کہانی جس میں رشتہ کی...
دہائی کی اور وہ شئی... بشارت کی عبرت ہمارے تحریر

220
حرف و رواں
کاشف زبیر

کچھ کچھ اور وہ شئی جس میں ہمارے انسانی ہوت
وہ کہانی ہے وہ کہانی ہے وہ کہانی ہے وہ کہانی ہے



عزیزانِ من..... السلام علیکم!

گردشِ دوراں کا پیمانہ مزید ایک برس بڑھنے کو ہے۔ سالِ رواں کا آخری شمارہ غریبِ قارئین ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے لیکن ہم وہ سال کی ان پیش قدمیوں سے بے پروا اپنے معمولات میں گم رہتے ہیں۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہمارا یہ رویہ بڑی حد تک باعثِ عداوت ہے۔ 2015ء میں سیلاب، زلزلے، برقانی طوفان اور برسات کی تباہ کاریاں وقتی طور پر سب کو لاتی رہیں، ہر برس یہی ہوتا ہے۔ ان قدرتی آفات سے انسانی جانوں کے تحفظ کا اختیار رب العزت نے اپنے ان بندوں کو سونپا ہوا ہے جو اقتدار پر براجمان ہیں مگر وہ جو کچھ کرتے ہیں، وہ وقتی اٹک شوکی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ سیلابی بند، بارانی نالے، شکستہ سڑکیں، بے دردی سے کانٹے گئے پہاڑی درختوں کا نوحہ کرتے ہولناک لینڈ سلائیڈز..... یہ سب اس معزز طبقہ اشرافیہ کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ امدادی رقوم آفت زدہ لوگوں کی عزت نفس کو مجروح کرتے ہوئے ایسے احسان کے ساتھ بانٹی جاتی ہیں جیسے ذاتی جیب خاص سے دی جا رہی ہوں۔ یہ سب ہمارے اور آپ کے دیے ہوئے ٹیکسوں کا سرمایہ ہوتا ہے۔ جسے لاکھوں گھوٹ ملازمن، خیانت کار، راشی اور بد عنوان سرکاری اہل کار مدتوں سے چانتے چلے آ رہے ہیں۔ سارا زور دو بام کی زیبائش پر رہتا ہے۔ کھوکھلی ہوتی ہوئی بنیادوں پر کوئی سرسری نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔ چین نے قدرتی آفات کے مقابلے اور ان سے قاعدہ اٹھانے میں بے مثال کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ بارانی اور سیلابی پانی کو چھوٹے چھوٹے ہزاروں ڈیم بنا کر ذراعت اور پین بجلی کی طرف موڑ دیا ہے۔ ہم منگلا تریبلا اور کالا باغ کے بحر میں جکلا ہیں۔ کاش! آنے والا سال ہمارے مقتدر طبقے کے لیے چشم کشا ثابت ہو اور وہ محض باریاں بھگتاتے کے بجائے ہم اور آپ جیسے عام لوگوں کو بھی کچھ فیض پہنچا سکیں اور اب فیض یاب ہوتے ہیں اپنے محترم قارئین کے کئے ٹھٹھے پیمائش اور تجروں سے۔

کراچی سے ایم عمران جو ثانی کی روانی ”جاسوسی جب مستقل پڑھنا شروع کیا تو خیال یہی تھا کہ صرف پڑھنے پر دھیان دیں گے لیکن اس قدر پُر رونق محفل میں شامل نہ ہوتا بس میں نہیں رہا۔ مجموعی طور پر آپ کا پرچہ ایک شاہکار ہے جس میں تمام لوگوں کی پسند کے حوالے سے کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہے چاہے وہ دہلی کہانیاں ہوں، مغربی تڑکا یا پھر سلسلے وارد استاں۔ (شکریہ) ایک بات کہتا چلوں کہ جاسوسی تقریباً سارے کا سارا نئے ادب پر مشتمل ہے اس میں اگر کچھ حصہ کلاسیکی ادب اور مشہور دہلی بدلی قلم کاروں کی تحریروں کے لیے مختص کیا جائے تو دلچسپی کا گراف جو پہلے ہی بلند ہے مزید اوپر جائے گا۔ نومبر کے نائل پر غالباً انگارے کی ہیروئن کوٹ کیا گیا، خوب صورت چہرے پر شہر نگ کی لٹیں نمایاں ہیں اور پس منظر میں دورخی چہرہ۔ جلد باز، جنوری ریاض کی عمدہ تحریر ثابت ہوئی۔ ہمارا عمومی رویہ بھی یہی ہے، آدمی بات کزور مشاہدے کے زور پر نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور بدلہ لینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ غرض بے غرض بابر نعیم کے قلم سے یوں لگا کہ افراتفری میں لکھی گئی، پہلی ہی مرتبہ میں درست گھر تک پہنچتا، وہیں دوسرے طرمان کو بلوالینا، فوراً ہی ان پر قابو بھی پالینا اور رقم بھی درست اکاؤنٹس میں منتقل ہو گئی۔ بھئی ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ مریم کے خان کی خاندانی، جاسوسی کا خاص رنگ لیے ہوئے ہے، ایکشن سے بھرپور اچھا ٹائم پاس تھا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، دلچسپی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ہر پل ایک نیا موڑ، نئے کردار گھرا ہوا نیا انداز اور جاندار منظر نگاری بندہ خود کو شاہ زیب کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ اس قسط کا اختتام سسٹنس لیے ہوئے ہے، آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا۔ ایس انور، اعتراف جرم کے ساتھ متاثر نہ کر سکے۔ جمال دستی کی مونگ پھلی کی گواہی دل میں نہ اتر سکی، حالانکہ سرد موسم میں مونگ پھلی سے بڑھ کر کیا سوغات ہوگی۔ سلیم فاروقی کی بلیک وارنٹ ترتیب کے اعتبار سے لیڈ کر رہی ہے۔ اس نے پہلے نمبر کی لاج بھی رکھی۔ ایکشن، جھڑپ سے بھرپور اس خوب صورت تحریر نے آخر تک جکڑے رکھا، امجد رئیس کی بہت سی تحریریں تیرہ، سے پہلے بھی پڑھی ہیں۔ وہ میرے پسندیدہ لکھاری ہیں۔ آخری صفحات میں آصف ملک کی ذریعہ آمدنی اپنے خوب صورت پلاٹ کی بدولت بازی لے گئی۔ آمدنی کے اس ذریعے کی طرف کم از کم میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ جفاوری لکھاری، احمد اقبال صاحب نے پرائی بنی سرورق کے لیے دل سے لکھی۔ سین در سین کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں اپنے ساتھ آگے لے گئے اور پھر سارے ٹکڑے جوڑ کر کہانی کو مکمل کر دیا، ویلڈن جناب۔ سرورق کا دوسرا رنگ کاشف زبیر ٹھیک طرح جمانہ سکے۔ جانے کیوں انداز اکھڑا اکھڑا اور پُر تکلف سا لگا۔ وہ بے ساختگی نہیں کہ انسان آگے پڑھنے پر مجبور ہو۔ چینی نکتہ چینی جاسوسی کی جان ہے، دل بے کیسے کیسے لوگ ہر ماہ بہترین تبصرہ کرتے ہیں، دکھ سکھ شیر کرتے ہیں۔ اس ماہ بھی احسان سحر، حارث محبوب، عزیز بن یاسین، مرزا گل، معراج محبوب عباسی، محمد قاسم رحمان، شمس الحق، انور یوسف زکی، شفقت محمود، عہادت کاظمی، چوہدری سرفراز، ایف ایم اور میری بہن طاہرہ گھزار خوب صورت خطوط کے ساتھ محفل کی جان بنے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ بلقیس خان کا تبصرہ پسند آیا، نہایت باریک بینی سے مطالعہ کرتی ہیں آپ۔“

چوک سرد شہید سے غلام نسیم نوٹاری کی کٹھا ”ماہ نومبر کا شمار حسب معمول 2 نومبر کو موصول ہوا۔ نائل اس بار منفرد انداز لیے ہوئے تھا۔“

ہیرو کی پیشانی، ولن کی پیشانی اور ہیروئن کے فیس پہ میک اپ کی فراوانی اچھا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ خوشی سے بے قابو، اچھلتے کودتے محفل میں گھسنے کی ٹرائی کی۔ احسان سحر نے فوراً دروازہ کھولا، شاید انہیں ہماری آمد کی ایڈوائس خبر پہنچ چکی تھی کیونکہ آج کل جرم بعد میں ہوتا ہے خبر پہلے پھیل جاتی ہے۔ دورِ حاضر میں ہر شے ہی ایڈوائس ہو چکی ہے۔ احسان سحر نے دلچسپ انداز میں شگفتہ و برجستہ لفظوں کا برہنہ استعمال کرتے ہوئے بہترین حق ادا کر دیا۔ اسلام آباد سے عزیز بن یاسین کی پہلی حاضری خوشگوار رہی۔ معراج محبوب عباسی کی خوب صورت نوک جھوک نے محفل کا رنگ بڑھا دیا۔ محمد قاسم رحمان، فلک شیر ملک اور چوہدری محمد سرفراز کے طویل تبصرے محفل کی جان تھے۔ پشاور کی ننھی مٹی بہن طاہرہ گلزار کو جاسوسی میں اتنا خوب صورت خط لکھنے پر مبارک باد۔ ویسے طاہرہ! آپ اتنا طویل تبصرہ لکھتی ہیں، کمال ہے۔ ہم سے تو جملہ لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف محسوس ہوتا ہے۔ ایف ایم نے بھی آخر کار جاسوسی کی محفل میں اپنی حاضری لگائی دی۔ کافی عرصے پہلے جاسوسی کی محفل میں بلیک زیرو کے نام سے دلچسپ تبصرے ہوا کرتے تھے۔ موصوف نہ جانے کہاں غائب ہیں۔ (آپ ڈھونڈ کے لائیں نا) اعجاز احمد راحیل، شوکت شہر یار بھی نظر نہیں آ رہے۔ انکارے کی پانچویں کڑی نئی نئی دلچسپیوں اور حسرت ناک ہنگاموں سے بھر پور تھی۔ شاہ زیب اب رفتہ رفتہ فل قاسم میں آتا جا رہا ہے۔ آوارہ گرد کی آوارہ گردی کو لگام ڈالنے کے لیے ماں جی نے نیگم صاحبہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما ہی دیا۔ یہاں بھی سرمد بابا کی موت کا پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں اور جب ہم نے یہ پڑھا کہ وہ وصیت میں شہزاد احمد خان کو بہت کچھ سونپ گئے تو دل بھر آیا۔ رنگوں میں دونوں رائی زنی زبردست تحریریں لائے۔ احمد اقبال اس بار سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ ان کی مزاحیہ تحریریں دل کو جا لگتی ہیں۔ کاشف زبیر نے دلچسپ کہانی لکھی۔ پروفیسر کا کردار بے حد پسند آیا۔ جنید پر بے انتہا غصہ آیا۔ نہ جانے لوگ اصل حقیقت جانے بغیر کسی سے اتنی جلدی بدگمان کیوں ہو جاتے ہیں۔ زخم خوردہ اور خاندانی بھی متاثر کن تحریریں تھیں۔

سرگودھا سے اسد عباس کی لطف اندوزی "خلاف توقع اس بار جاسوسی 4 نومبر کو ہی مل گیا۔ خوشی دو بالا ہو گئی (پہلی خوشی تنخواہ ملنے کی تھی) نائل والی حسینہ کی شکل میری سابق محبوبہ سے مل رہی تھی۔ فہرست پر نظر ڈالی تو آخری صفحات پر اپنے محبوب مصنف کا نام دیکھ کر خوشی سے بالا ہو گئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بے داغ منصوبہ سے انصاف کیا۔ نئے دور کی افواہی واردات نے بہت لطف اندوز کیا۔ تاہم جنید کی منفی سوچ نے اچھا تاثر نہیں دیا۔ احمد اقبال کی پرانی بیٹی نے بہت لطف اندوز کیا۔ احمد صاحب کا انداز بیاں سب سے جدا ہے۔ دیر سے ہی کسی لیکن ڈاکٹر ہما کو سچا پیار مل ہی گیا، اینڈ کچھ غیر فطری سا تھا۔ انکارے، گوکہ ٹاپک پرانا ہے لیکن مغل صاحب کا انداز بیاں اتنا منفرد ہے کہ قاری کو ہر بار ایک نیا پن ملتا ہے۔ گوکہ کہانی کچھ تیز جارہی ہے لیکن پڑھنے میں لطف دے رہی ہے۔ آصف ملک صاحب کی ذریعہ آمدنی ایک اچھی تحریر تھی۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو رات دن صرف پیسا کمانے کے چکر میں ہیں حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر۔ بظلم نے کہا تھا کہ ہم ساری زندگی دوسروں کے لیے کما رہے ہیں۔ ایم افضل انجم صاحب کی یکسانیت اچھی کاوش تھی۔ اینڈ توقع کے خلاف تھا۔ انگریزی تراجم میں خاندانی، اعتراف جرم، بلا عنوان اور غرض بے غرض اچھی تھیں۔

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی قلم نویسی "ایک دوسرے میں مدغم خونچکاں چہرے، انکار آنکھیں دیکھ کر لگ رہا تھا نائل کچھ زیادہ ہی خونی ہو گیا ہے مگر کائنات میں رنگ کی جلوہ گری دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ ابھی پیار و محبت کے سین باقی ہیں۔ ہلکی سی زلف فم سجائے دو شیزہ بھی آنکھوں سے حسرت و یاس کی تصویر بنی نظر آئی۔ چینی نکتہ چینی خوب رہی۔ ہمارے ہاں تو اتنے خوب صورت سیاحتی علاقے ہیں کہ بندہ دیکھ کے اشک کر اٹھے لیکن ار با سید اقتدار مری کو اس لیے توجہ دیتے ہیں کہ خود بھی وہاں رہنا ہوتا ہے۔ احسان سحر بھی واہ آپ نے تو تبصرے میں بھی سحر کھیر دیا ہے۔ محمد صفدر معاویہ کا خراج تحسین قابلِ قدر ہے۔ حارث محبوب اتنی کم عمری میں لکھنا جذبہ قابل ستائش ہے۔ عزیز بن یاسین جسارت اچھی ہے، کرتی رہنا چاہیے۔ مرزا گل اتنا غصہ۔ چلو اب خوشیاں بھی سیٹ لیجیے، ہا ہا ہا۔ معراج محبوب کیا اب اعتبار کرنے کے لیے آنکھیں ہی رہ گئی ہیں۔ باقی تبصرہ اچھا ہے۔ قاسم رحمان محبوبہ کو تو بچا لیتے پھل دیکھ کے ہی راہ فرار پکڑ لی۔ شمس الحق اب تصویر کائنات میں رنگ میں بھنگ بھی تو کسی کو ڈالتا ہوتا ہے نا، سو اس کے لیے صنفِ کرخت ہی سامنے آتی ہے۔ فلک شیر، عابد اسلم اور شفقت محمود نے بھی بہت اچھا لکھا ہے۔ بشری افضل نے مختصر تبصرہ لکھ کر دوسرے کے لیے جگہ چھوڑی ہے نا۔ بقیہ خاں کی تفصیلات ایک دم زبردست لگیں۔ طاہرہ گلزار کا تبصرہ بھی اثر انگیز رہا۔ چوہدری محمد سرفراز نے بھی محفل میں رنگ بھجوا دیا ہے۔ اینڈ یہ ایف ایم کی حاضری بھی ٹھیک رہی۔ اب ذکر کرتے ہیں کہانیوں کا۔ جس میں سلیم فاروقی کی بلیک وارنٹ بہت پسند آئی۔ وطن سے محبت کرنے والوں کی جب آنکھ کھلتی ہے تو ایسے ہی ملک دشمنوں کے بلیک وارنٹ بھی جاری کر دیتے ہیں۔ خاور اور عینا نے قربانی دے کر عظیم کام کیا۔ آوارہ گرد میں سرمد بابا تو زندگی کی بازی ہار گئے اور شہزی کی ماں نے شہزی اور زہرہ بانو کا ہاتھ ایک دوسرے کو دے کر شادی کا عندیہ دے دیا ہے۔ باقی اس دفعہ بھی شہزی نے اپنے ایکشن سے اپنے کردار کو سنسنی خیز بنائے رکھا۔ طاہرہ جاوید مغل کی انکارے بھی زبردست جارہی ہے۔ پرانی بیٹی ہمارے بھی زندگی کی دوڑ دھوپ میں اپنے آپ کو منوالیا۔ ناصر کا ملنا بھی یادگار ٹھہرا۔ احمد اقبال کی تحریر بہت خوب لگی۔ سچ کہتے ہیں جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اس میں گرتا ہے۔ یہی حال ہیروں کا تھا، وہ جینی کی بربادی کا جال بٹا ہوا خود ہی اس میں پھنس گیا اور جینی نے اس سے ٹک آئے کولن کو اپنا یا۔ محمد فاروق انجم کی زخم خوردہ بھی بہترین کہانی تھی۔ سرورق کا دوسرے زبردست رہا۔ خواب گزیدہ، اعتراف جرم، مونک پہلی کی گواہی یہ سب کہانیاں مختصر مگر بہت محفوظ کر دینے والی اچھی رہیں۔

ممانوالی سے لیتی ریحام ملک کو کرکی درخواست "پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ کوئی غلطی ہو تو پہلی خطا سمجھ کر درگزر کر دینا، شکریہ۔ میرے تیسرے سمسٹر کے ایگزام ہو رہے ہیں، پلیز میرے لیے دعا کرنا۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ چینی نکتہ چینی کا در کھٹائے بغیر سیدھی چھلانگ لگائی انکارے پر۔ شاہ زیب کی مشکلات میں سا لکونی کی آمد سے مزید اضافہ ہو جائے گا۔ کہانی میں یوں کم ہو جاتی ہوں کہ ہوش نہیں رہتا۔ ہوش تب آتا ہے جب جاری ہے پڑھ دیکھتی ہے۔ طاہرہ جاوید مغل صاحب کی کہانیاں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے ہیرو انجما اور کسی بنوں بھی انہی کے قلم سے نکلے ہوں گی۔

آوارہ گرد بہت اچھی اور گرداب سے کچھ کچھ مشابہت لیے ہوئے ہے۔ سوبائل فون کی دوستیاں یونہی رنگ لاتی ہیں۔ یکسانیت میں غلطی کے ساتھ بھی یہی ہوا، حالانکہ سارا قصور تو اس کے شوہر کا تھا۔ سوچ بچلی کی گواہی سر کے اوپر سے گزر گئی۔ پرانی بیٹی نے شروع شروع میں بہت اداس کیا، شکر ہے انجام اچھا ہوا، ورنہ دل اداس رہتا۔ میرے ابو اور ای بیمار ہیں ان کے لیے دعا لازمی کرنا۔“

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کا قصہ چہار“ کہا جاتا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی تھا جب پاکستان میں ایک ادارہ چار معیاری ڈائجسٹ ایک وقت شائع کرتا تھا۔ ملک کے سنجیدہ اور ادبی حلقوں میں یہ تمام ڈائجسٹ ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ ادارے کے روح رواں جناب معراج رسول صاحب اور عذر رسول صاحب مصنفین اور قارئین کو بہت خوش اسلوبی کے ساتھ لے کر چل رہے تھے۔ بہت سارے تبصرہ نگاروں کے آپس میں رابطوں کی زیادتی کی وجہ سے دوستوں میں دوریاں اور غلط فہمیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ صنف مخالف میں مقبول ہونے کا جنون ہر بندے پر سوار ہو گیا۔ ابھی یہ طوفان تھما نہیں تھا کہ انٹرنیٹ کی دنیا پر تقریباً سارے تبصرہ نگار اور بہت سارے مصنفین اکٹھے ہو گئے۔ پہلے پہل یہاں پر بھی لوگ بہت خوش ہوئے۔ مگر ہر چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے اسی لیے یہاں پر بھی تفریق پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ اب میں مزید وضاحت یہ کرتا چلوں کہ یہ جو لکھا وہ میری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں اور فی الحال میرے ساتھ آج تک ایسا کوئی معاملہ نہیں ہوا مگر میں دوسروں کی آواز پہنچا رہا ہوں۔“ (ادارے کی طرف سے آپ کو جواب بھیج دیا گیا ہے)

دراہن کلاں سے مر حاکل کے بگلے“ صنف کرخت کی اکلوتی آنکھ نائل گرل کو گھورنے میں معروف تھی، اس سے بچتے دوستوں کی محفل میں پہنچے، جہاں احسان سحر کی سحر انگیز باتیں پڑھ کر سر زد رہ گئے۔ آخر معصوم بچہ جو ٹھہرے، تبصرے ایک سے بڑھ کر دو تھے۔ چودہری سرفراز جی کیا بات ہے جو آپ صنف نازک پر ملنڈے مار رہے ہیں، آپ کا اپنا تبصرہ کم تفصیلی تھا کیا؟ حارث محبوب کی آمد اچھی لگی۔ سب سے پہلے انگارے پڑ گئے، آہ... شاہ زیب نے عمران کی یاد دلادی۔ ویسے طاہر انکھ کی ہراسٹوری کی ہیروئن شادی شدہ یا منگنی شدہ کیوں ہوتی ہے؟ سلیم فاروقی بلیک وارنٹ لے کر آئے۔ خاور اینڈ نیما نے جان پر کھیل کر حب الوطنی کا ثبوت دیا، ویلڈن۔ یکسانیت ایک بھیا تک تحریر تھی۔ مانا کہ عورت کو برائی کی طرف راغب کرنے میں مرد کا ہاتھ ہے پھر برا انجام بھی عورت کا، افسوس صد افسوس۔ آوارہ گرد بس جی کیا کہیں اللہ شہزی کو کامیاب کرے اور جلد اختتام ہو اسٹوری کا۔ پلیز مریم کے خان سے کئی سلسلہ وار نال لکھوائیں۔ پہلا رنگ احمد اقبال صاحب کا بس ٹھیک تھا۔ ٹرین حادثہ پر اسٹوری لکھی گئی نہ مار دھاڑ تھی نہ ٹھاٹھا... بے داغ منصوبہ، کاشف زبیر نے اپنے ہاتھوں میں قید قلم سے موتی نکھیرے ہوں اور وہ ہمارے دل میں نہ اتریں تو یہ نا انصافی ہوگی، سو بیٹ رہی۔ پروفیسر ز کے کردار ہمیشہ سے اچھے لگتے ہیں۔ ہر گز رتا ہل سکنس، جاسوسی کو دن دگنی رات چھٹی ترقی دیتا رہے، آمین۔“

بہادر پور سے سعید عباسی کے اندازے“ نومبر کا جاسوسی کیم کوئل گیا تھا۔ نائل میں اگر کچھ دیکھنے کے لائق تھا تو وہ حسین اور خوب صورت لڑکی تھی۔ چاند سا چہرہ، کالی گھائیوں جیسی زلفیں، کشادہ پیشانی، تاروں جیسی ٹٹھائی آنکھیں، گلاب کی ہاتھکڑیوں جیسے ہونٹ، ہیرے جیسے چمکتے دانت گویا حسن کی ملکہ تھی۔ چینی بکھ چینی کے تمام دوستوں کے لیے اتنا کہیں گے کہ زندگی چار دن کی ہے کسی سے کیا شکوہ شکایت کریں۔ شروعات بلیک وارنٹ سے کی۔ حالات حاضرہ پر لکھی گئی داستان۔ پتا نہیں کتنے دشمن عناصر ہمارے ملک میں اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں پر اللہ پاک ہر بار خاور اور نیما جیسے بھلے لوگوں کو بھیج کر ان کی سازشیں ناکام بنا دیتا ہے۔ اے میرے عظیم وطن تجھ پر اٹھنے والی ہر بری نظر کو خدا اسی طرح ختم کر دے، آمین۔ بے داغ منصوبہ، کاشف زبیر اس بار ہمیشہ کی طرح کیا خوب سے خوب تر کاوش لے کر آئے۔ ہما، جنید کو بے حد پسند کرتی تھی پر جنید کے رد عمل سے ہما کو سخت ٹھیس پہنچی اور اس نے پروفیسر کو اپنا لیا۔ جنید کو جب بچھا داسو اتب دیر ہو چکی تھی، تیر کمان سے کل چکا تھا اور کمان سے نکلے تیر کبھی واپس پلٹا نہیں کرتے، زبردست کاشف زبیر صاحب۔ پرانی بیٹی احمد اقبال کی اچھی کاوش تھی۔ ناصر اور ہما کا کردار اچھا لگا۔ ذریعہ آمدنی آصف ملک کی اچھی تحریر تھی، برے کام کا برا انجام۔ زخم خوردہ بھی اچھی کہانی تھی۔ ہیرس انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اور جب اسے موقع ملا تو اس نے جینی کو نیست و نابود کرنا چاہا پر خدا کی لاشی بے آواز ہوتی ہے جو کھڈا اس نے جینی کے لیے کھودا تھا خود اس میں جا کر، کولن نے ٹھیک وقت پر آ کر ہیرس کو ناک آؤٹ کر دیا اور ہیرس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جلد باز، بس ٹھیک ہی تھی، نیکو اور کوئی قتل کے الزام میں پکڑے گئے۔ سوچ بچلی کی گہرائی بھی خوب رہی۔ سزاور تھی کی موت کا ذمے دار ٹھہراؤنڈی مین ڈی کروٹ۔“

صلح بکھرے شمر خان کی التجا“ میں تقریباً جاسوسی ڈائجسٹ کا 11 سال سے مستقل قارئین ہوں، ایک مرتبہ پہلے بھی خط لکھ چکا ہوں لیکن وہ ردی کی نوکی کی نذر ہو گیا، اب دوسرے مرتبہ کوشش کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے نائل کی بات۔ نائل بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں سے سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی، ڈاکٹر صاحب کے کیا کہنے، بہت اچھی تحریر ہے۔ پڑھنے میں بہت مزہ آیا۔ اس کے بعد طاہر جاوید مغل صاحب بھی کسی سے کم نہیں۔ انگارے بھی زبردست کہانی ہے اور اس ماہ رنگ بھی بہت اچھے تھے۔ کاشف زبیر کی ہر کہانی اچھی ہوتی ہے۔ پروفیسر نے واقعی بے داغ منصوبہ بندی کی تھی اور کامیاب بھی ہو گیا۔ سلیم فاروقی صاحب نے خاور عرف شہزاد خان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا اگر زندہ رہ کر کسی غصہ جھگڑے کے ساتھ مسلک کر دیتے تو بہت سی اچھا ہوتا۔ خیر کہانی پھر بھی اچھی تھی۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ اس مرتبہ میا نوالی سے احسان سحر آغاز میں براجمان تھے، مہارک ہو بھی۔ باقی تقریباً سب کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ میری تمام تبصرہ نگاروں سے عرض ہے کہ میرے لیے دعا کرو کہ میرا گہرا دوست جو مجھ سے ناراض ہے صلح کر لے۔ وہ بھی جاسوسی کا مستقل قاری ہے، آمین۔“

احمد پور شرقیہ سے چوہدری عاصم سعید کی آمد "نومبر 2015ء کے شمارے نے بتا انتظار کے دیدار کروادیا۔ سرورق کی دلکش حسینہ فوراً ہی دل میں اتر گئی۔ سب سے پہلے اپنے فیورٹ مصنف طاہر جاوید مغل کی تحریر انگارے سے آغاز کیا۔ شاہ زیب بڑی تیزی سے واقعات کو اور حالات کو تو نظر رکھتے ہوئے روپ بدل کر بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ انیق بھی بہت اچھا کردار ہے اور تاجور مجھے بھی بے حد اچھی لگی ہے۔ مولوی فدا حسین کی بیٹی زینب کی بیماری کی تشخیص بھی ہوئی گئی۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ محمد فاروق انجم بھی میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔"

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی عمدہ پسندی "سرورق کو خوب صورت، حسین اور بہت پیاری دوشیزہ اور ساتھ میں صنف مخالف کے افراد سے سجا یا گیا۔ آپ کا ادارہ پڑھا، آپ حالیہ زلزلے اور پاکستان کے حکمرانوں کے کارناموں پر روشنی ڈالتے نظر آئے۔ محفل میں انٹر ہوئے توجناب احسان سحر نظر آئے۔ اچھا تبصرہ تھا۔ محبوب عباسی کا تبصرہ بھی بہت عمدہ رہا۔ رومی انصاری کا تبصرہ بہت اعلیٰ۔ محمد قاسم رحمان کی اچھی تبصرہ نگاری۔ سید عبادت کاظمی اور بلقیس خان کی آمد بھی عمدہ رہی۔ چوہدری سرفراز بھائی اگر آنکھوں میں کرب نظر آ جاتا ہے اور کبھی خوشی کی چمک نظر آ جائے کبھی روتی بلکتی آنکھوں کی سمجھ آ جائے، کبھی ہنسی مسکراتی آنکھوں کی سمجھ آ جائے تو پھر وفا اور بے وفائی نظر کیوں نہیں آتی۔ بس اس کے لیے تجربہ اور آنکھوں کو پڑھنے کا علم چاہیے۔ ایف ایم کو دیکھ کہتے ہیں۔ باقی مختصر لکھنے والوں اور نئے دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ سلیم فاروقی کی بلیک وارنٹ عمدہ رہی۔ خاور اور عینا کے کردار عمدہ رہے۔ خاور کا برے کاموں سے اچھے کام کی طرف کم ہیک اور پھر عینا کا اس مشن کو پورا کرنا اچھا لگا۔ احمد رئیس کی تین تیرہ میں ہیری کو سکتے سا ہو گیا جب سامنے زندہ کھڑی میری کودیکھا، انجانے میں ولما کا کام تمام کر دیا، بے چارہ۔ محمد فاروق انجم کی زخم خوردہ میں ہیرس نے بدلہ لینے کے لیے جینی کو بہت تڑپایا۔ تنویر ریاض کی جلد باز میں نیکی کی جلد بازی نے اسے موت کی کرسی کا راستہ دکھایا۔ سلیم انور کی بلا عنوان روپے پیسے کی ہوس میں کھیل جانے والی گیم میں سب نے جان سے ہاتھ دھو لیا تو پیسا کسی کے کام نہ آیا۔ غرض بے غرض، بابر نعیم کے قلم سے جوڑ اور ایکین نے عمدہ طریقے سے اپنا کیس نمٹایا۔ آوارہ گرد آب تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ جمال دست کی سوگ پھلی کی گواہی بھی عمدہ رہی۔ آر تھر کو جسکین سوگ پھلی نے مردادیا۔ مریم کے خان کی خاندانی بھی بہت عمدہ رہی۔ آپس کے جھگڑے میں دونوں منشیات گروپ جان سے گئے اور علاقے میں امن ہو گیا۔ ایم افضل انجم کی یکسانیت کا اختتام پڑھ کر دکھ ہوا۔ انگارے کی یہ قسط بھی عمدہ رہی جس میں شاہ زیب کا طارق سے سچ اگلوٹا مولوی سے ملاقات اور پھر، موت اور آخر میں عاصمیر پارٹی کا سجاد کی طرف جانا کافی عمدہ رہا۔ سکندر طیس کی خواب گزیدہ بھی اچھی رہی۔ اولیس انور کی احترام جرم بھی اچھی اسٹوری تھی۔ آصف ملک کی ذریعہ آمدنی بھی عمدہ تھی۔ احمد اقبال پرانی بیٹی لے کر آئے کافی جاندہ کہانی تھی خصوصاً ہما کا کردار پسند آیا۔ کاشف زبیر کی بے داغ منصوبہ بہت ہی نائس رہی، جنید کے کردار نے مایوس کیا۔ بہر حال پروفیسر اور ہما کا کردار بہت بیٹ رہا، بہت عمدہ طریقے سے رٹم نکلوائی۔"

جوتی سے چوہدری محمد سرفراز کی عرق ریزی "ماہ نومبر کا جاسوسی خلاف توقع 2 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق پر نگاہ پڑی تو خوشگوار کی لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ٹائٹل گرل کا دلکش انداز اور صنف کرخت کا تحریر بیانہ انداز، دونوں اپنی اپنی جگہ سرورق کی شان بڑھا رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر ٹائٹل گرل کی ماتھے والی لٹ تھی، جو الگ ہی انداز میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ جینی نکتہ چینی کی جانب بڑھے تو احسان سحر صاحب کو براجمان پایا۔ عزیزین حسین صاحبہ کسی کے کہنے پر محفل میں حاضری لگوا کر آپ نے بڑا ہی نیک کام سرانجام دیا ہے۔ بس اب ایسے ہی آتے جاتے رہا کریں۔ مرزا گل اور شفقت محمود صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکر یہ۔ طاہرہ گلزار صاحبہ! فیس بک گروپس سے خاصا شاکی نظر آئیں۔ اتنا زیادہ غصہ اور وہ بھی اس عمر میں صحت کے لیے چنگا نہیں ہوتا۔ بلقیس خان صاحبہ یہ چوہدری ہوتے ہی اتنے جینکس ہیں کہ آپ کا متاثر ہونا جانی ہے۔ ابتدا مغل صاحب کے شاہکار انگارے سے کی۔ موجودہ قسط میں بہت ساری گتیاں سلجھنے کے باوجود تحریر ابھی ابھی سی رہی۔ کچھ معاملات سامنے آ گئے ہیں اور باقی کا بے مبری سے انتظار ہے۔ سسٹمز میں ڈالے رکھنا مغل صاحب کی تحریروں کا خاصہ ہے اور یہ سسٹمز اینڈنگ جاری رہے گا۔ پہلا رنگ پرانی بیٹی احمد اقبال صاحب کا مخصوص انداز تحریر لیے ہوئی تھی۔ عرصہ دداز سے مجھے احمد اقبال صاحب نے گرویدہ بنا رکھا ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی تحریروں میں سب سے منفرد چیز ان کی ٹیکنالوجی اور جدید ایجادات سے آگاہی اور پھر ان کا اپنی تحریروں میں بہترین انداز میں پیش کرنا ہے۔ یہی چیز ان کی تحریروں کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ دوسرا رنگ بے داغ منصوبہ میں اسی چیز کا لطف لیا اور تحریر کو خوب انجوائے کیا۔ پروفیسر کے منصوبے میں چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا اتنے شاعرانہ انداز میں خیال رکھا گیا کہ پڑھتے وقت کچھ بھی غیر فطری نہیں لگا۔ سلیم فاروقی صاحب کی تحریروں کا ہمیشہ سے ہی یہ خاصہ رہا ہے۔ فائنٹ ایکشن اینڈ ایکشن فائنٹ۔ چاہے اس چکر میں کہانی کا پلاٹ راستے میں گم ہو جائے۔ بلیک وارنٹ میں بھی صرف وارد حاذی تھی۔ کہانی کا پلاٹ بہتر تھا۔ مگر مصنف نے اس کا خیال نہیں رکھا۔ نتیجتاً اینڈ میں کہانی غلط میں سمیٹی گئی اور تحریر کا سارا امپریشن ایک دم سے ختم ہو کر رہ گیا۔ محمد فاروق انجم کی زخم خوردہ میں ہیرس نے چالاکی سے کولن اور جینی کے لیے جال بچھایا مگر تمام تر ہوشیاری کے باوجود اختتام پر وہ خود اپنی ہی چال کا شکار ہو گیا۔ اختتام پر جینی یہ تحریر اچھی رہی۔ محبت کے جہاں اچھے اثرات ہوتے ہیں وہاں برے اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔ تنویر ریاض کی جلد باز میں بھی سب نہایت عمدگی سے دکھایا گیا۔ غرض بے غرض، وحیدہ سی تحریر تھی اور کہانی سمجھنے کے لیے اچھی خاصی دماغ سوزی بھی کرنی پڑی۔ ذریعہ آمدنی کو آصف ملک نے ملجے ہوئے انداز میں تحریر کیا۔ سوگ پھلی کی گواہی میں کچھ بھی چوٹا دینے والا نہیں تھا۔ مریم کے خان کی تحریر خاندانی بھی بہتر رہی۔"

رضوان تنولی کرپڑوی کی لٹافی کراچی سے "30 کی سندر شام ٹکڑوں نے سرورق کا طواف کیا۔ مادھوری ٹائپ ماری کے سرخ و سپید رخسارہ ادھ کھلے لیوں پہ بھی نیم مسکان زلفوں کی شریٹ لٹ، ایسے حسین نظارے میں 2 سرورق لکڑوں نے ڈالارنگ میں بہنگ۔ لفظوں کے جادوگر،

احسان سحرمدگی کے ساتھ دلکش الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے بزمِ دوستان کا انکیشن جیت کر رونق افروز ہوئے۔ واہ کینٹ کی بلیقیں عرف بلوائینڈ پشاور کی طاہرہ عرف گلو جو دِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ، آپس میں نہ بھایا کروٹیل جنگ، باتیں کیا کروسٹ رنگ۔ ہری پور ہزارہ سے قاسم رحمان کے معصومانہ انداز پر بے ساختہ پیار آیا۔ غازی علم الدین شہید لاہور کی نگری سے عبدالجبار رومی انصاری خوش گفتاری کے ساتھ نمایاں رہے۔ جنگ چوہدری محمد سرفراز جاہ و جلال کے ساتھ فل فارم میں نظر آئے، کستوری لگا کے۔ شفقت محمود نے سیلہ لوٹ لیا تنگ لگا کے۔ بشری افضل شکوہ شکایت کرتی نظر آئیں۔ فلک شیر ملک، ابرار وارث، سید عبادت کاظمی کے نامے پسند آئے، غلام حسین، محمد یوسف سانول کی کی محسوس ہوئی۔ چینی نکتہ چینی میں نئے دوستوں حارث محبوب عہای، عزیز بن یاسین، عابد اسلم کو خلوص دل سے خوش آمدید۔ انکارے نے ابتدائی تحریر سے سحرزدہ کیا ہوا ہے، چھاگئے ہو مغل اعظم، بہت خوب۔ سلیم فاروقی کے جذبہ حب الوطنی کا میں اسیر مگر بلیک وارنٹ ابتدائی صفحات کے لائق ہرگز نہیں۔ امجد رئیس کی تین تیرہ سر پر سے گزر گئی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گردیہ قسط شاندار رہی۔ سرورق کے دونوں رنگ احمد اقبال کی پرانی بیٹی اور کاشف زبیر کا بے داغ منصوبہ نے رنگوں کا حق ادا کر دیا، کستوری لگا کے۔

منظر گڑھ سے بہار حسین کی خوشی و سرشاری ”سب سے پہلے تو ادارے کا ممنون ہوں کہ میرا پہلا خط بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے شائع کیا اور پھر ان دوستوں کا از حد ممنون ہوں جنہوں نے میرے الفاظ کو سراہا اور اپنے تبصروں میں ناچیز کا تذکرہ کیا۔ اس بار سرورق خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ سرخ رنگ خون کا رنگ ہوتا ہے۔ اس خونی سرورق کو دیکھ کر ایک دم جبر جبری سی آگئی۔ البتہ سرورق کی خوب رو، دلشین ہونٹوں والی حسینہ کا حسن باکمال دیکھ کر خوشگوار احساس ہوا۔ اسی خوشگوار احساس کے سنگ چینی نکتہ چینی کی دلچسپ محفل میں داخل ہوا جہاں پہ زلزلے کے حوالے سے ادارے میں مدیر اعلیٰ کے قیمتی خیالات جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ صدارت کی کرسی میانوالی کے نوجوان احسان سحر نے سنبھال رکھی ہے بہت خوب، دلکش انداز، خوب صورت تحریر۔ لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کا دل چھو لینے والا بے ساختہ انداز، بے حد اچھا لگا سدا خوش رہو۔ انکارے کی ہیرا رانجھے سے مشابہت والی بات بھی خوب کہی۔ ہری پور سے محمد قاسم رحمان دلچسپ تبصرہ نگاری کے ساتھ چھاگئے۔ لفظوں کا خوب استعمال کیا اور برخل کیا، ویلڈن۔ پشاور کی طاہرہ گلزار کی باتوں پر بے حد پیار آیا۔ اب بات ہو جائے کہانیوں پر۔ آوارہ گرد میں خاصی تیزی آگئی ہے۔ سرمد بابا کی موت نے افسردہ کر دیا۔ عابدہ ہنوز دشمن کی قید میں، اب دیکھو شہزاد احمد خان ماں کی مانتا ہے یا دل کی۔ دل میں تو عابدہ کی محبت ہے۔ انکارے میں نامساعد حالات کا دھار شدت اختیار کر گیا۔ مولوی فدا حسین کی بیٹی حنین کی پُر اسرار بیماری کی اصل حقیقت بھی آشکارا ہوگئی۔ آخری رنگ پر کاشف زبیر کا نام پا کر بے حد خوشی ہوئی۔ اس بار ان کی تحریر میں پروفیسر کا کردار انتہائی دلچسپ لگا۔ مختصر تحریروں میں جلد باز، تین تیرہ اور زخم خوردہ بے حد اچھی لگیں۔“

کراچی سے محمد اور لیس احمد خان کی تشریف آوری ”ماہ نامہ جاسوسی ڈائجسٹ اپنے وقت پر دستیاب ہوا۔ ہمیشہ کی طرح ٹائٹل زبردست رہا۔ ٹائٹل گرل کے چہرے پر ایک آوارہ لٹ آئی ہوئی، پٹل کی نال سے خون ٹپکتا ہوا پس منظر میں دو اور چہرے۔ پہلے اداہیے سے مستفیض ہوئے۔ حالیہ زلزلے نے کتنے لوگوں کے گھرا جاڑ دیے۔ سیکڑوں، ہزاروں گھرتاہ و برباد ہو گئے۔ دس سال پہلے بھی زلزلہ اکتوبر میں آیا تھا اور اس سال بھی اکتوبر میں آیا؟ شاید قدرت کی طرف سے لوح انسانی کو پیغام ہو کہ سنبھل جاؤ مگر افسوس صد افسوس کہ بے حس دنیا جلد بھول جاتی ہے اور پہلے کی طرح لہو ولہب میں مصروف عمل ہو جاتی ہے۔ ناموں کی محفل میں احسان سحر سرفہرست تھے۔ ہماری طرف سے مبارک باد۔ محمد قاسم رحمان کا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ طاہرہ گلزار، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ بھی اچھے انداز میں تبصرہ لکھتی ہو۔ ابتدائی صفحات کی پہلی کہانی بلیک وارنٹ، سلیم فاروقی کی بہتر تحریرائے میں لکھی ہوئی اچھی کہانی تھی۔ تین تیرہ امجد رئیس کی کہانی میں ہیری نے اپنی گرل فرینڈ کو ہی قتل کر دیا۔ جوش انتقام میں اتنا اندھا ہو گیا کہ اس کو گرل فرینڈ نظر ہی نہیں آئی۔ اور اس نے اندھا حد قائم کر کے زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ فاروق انجم کی زخم خوردہ بھی اچھی لگی۔ ہیرس نے کولن اور جینی کے لیے غلط سوچ اپنائی۔ نتیجتاً وہ خود ہی اپنی کھودی ہوئی کھائی میں گر گیا، جو دوسروں کے لیے غلط سوچتا ہے وہ اس کے آگے آتا ہے۔ خور و ریاض کی جلد باز بھی اثر انگیز رہی۔ سلیم انور کی بلا عنوان بھی اچھی رہی۔ ہمیشہ کی طرح ایک عورت نے مکر و فریب سے ہیری کو لپک کر لیا۔ غرض بے غرض بھی پسند آئی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد کامیابی سے جاری و ساری ہے اور شہزاد نے اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھادی ہے۔ شاید کہانی کا اینڈ بھی قریب ہے۔ سوگ بھلی کی گواہی میں محض ایک چھوٹے سے نکتے پر غور کرنے سے سراغ رساں نے قاتل کو پکڑ لیا اور اس نے ڈورنگی کے قتل کا احترام کر لیا۔ یوں سوگ بھلی کے عدانوں نے قتل کا پل کھول دیا اور قاتل کیفر کردار کو پہنچا۔ مریم کے خان کی خاندانی بھی بہتر تحریر تھی۔ ربی کی ہمت اور ثابت قدمی سے منشیات فروشوں کا خاتمہ ممکن ہوا۔ یکسانیت میں فلک نے ایک چتے جتے گھر کو شعلہ دار کر دیا اور شعلہ کی بھڑکتی آگ نے گرمستی کا نشین ہلا کر خاک کر دیا۔ انکارے، جاوید مغل کی بہترین کہانی، بہترین انداز میں اپنا آپ منوانے میں کامیاب ہے۔ اس میں ہر دلچسپی کا عنصر موجود ہے جو کسی تحریر کے لیے لازم اور ضروری ہے۔ خواب گزیدہ اور احترام جرم بھی اچھی تحریریں ثابت ہو گئیں۔ آصف ملک کی ذریعہ آمدنی میں مجید اور ماریہ نے بے لوث جذبات کی وجہ سے کامیابی کی منزل تلاش کر لی۔ پرانی بیٹی احمد اقبال کی تحریر اور بے داغ منصوبہ کاشف زبیر کی تحریر دونوں آخری صفحات کی بہترین تحریریں ثابت ہو گئیں۔ کترین بھی بہت پر اثر اور سبق آموز رہیں۔“

شاہ گڑھ سے فلک شیر ملک کے تجربات و تجویزے ”نومبر کا جاسوسی پڑھا، ٹائٹل آخری دونوں تحریروں کے مطابق تھا۔ تبصروں میں عبدالجبار رومی انصاری، بلیقیں خان اور طاہرہ گلزار بھرپور انداز میں جلوہ گر تھے۔ انکارے اور آوارہ گرد کے علاوہ میری پسندیدہ تحریریں بلیک وارنٹ، زخم خوردہ، یکسانیت، جلد باز، ذریعہ آمدنی، احترام جرم اور خواب گزیدہ تھیں۔ آخری دونوں رنگ بہت زبردست تھے مگر کہانی کو طول دینے کے لیے منظر کشی بہت

زیادہ کی گئی تھی۔ پرانی مٹی میں غلام محمد کا سوا در شرفو (شریف) کی فیملی کا ڈسپوزل نہیں کیا گیا۔ بے داغ منصوبہ بہت اچھی لکھی گئی مگر اس تحریر میں بھی ہر چیز کی منظر کشی کی گئی مثلاً پروفیسر کے گھر کا نقشہ کافی لمبا چوڑا کھینچا گیا بہر کیف نہروں تحریر تھی۔ چینی نکتہ چینی میں مدبر اعلیٰ نے حکمرانوں سے التجا کی لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ ہمارے اعمال کیا ہیں۔ جب آٹھ اکتوبر 2005ء میں زمین ہل گئی تو اس وقت کشمیر میں تھا اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے کئی بستیاں پہاڑوں کے نیچے آتی دیکھیں۔ ٹھیک ایک ماہ بعد وہ لوگ پھر اسی طرح ان برے اعمال میں لگ گئے جس کی وجہ سے جھٹکا دیا گیا۔ اب یہ پھر بڑا جھٹکا لگا ہے۔ عمارتیں منہدم ہو رہی ہیں، کبھی فیکٹریوں میں آگ تو کبھی جنگیوں میں آگ لگ رہی ہے۔ سیلاب کی صورت میں عذاب نازل ہو رہا ہے۔ کسی انسان کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں ہے۔ ماسوائے چند ایک کے ہر بندہ پریشان ہے۔ کیونکہ ہم نوے فیصد لوگ گناہوں کی لذت میں پڑ چکے ہیں اور ہمارا مکافات عمل شروع ہو چکا ہے۔ یہ ناگہانی آفات قیامت کی جھلکیاں ہیں جو دکھائی جا رہی ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں سورج اوزون کی چادر پھاڑ کر نیچے نہ آئے۔ کراچی میں ریکارڈ تو زگرمی پہلے تو نہیں تھی۔ وجہ اللہ سے دوری ہے۔ قیامت کی کافی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں۔ مثلاً گھر گھر گانے کا سامان، موسیقی وغیرہ، قتل عام، زنا وغیرہ وغیرہ۔ بس جو وقت ملا ہے تو غنیمت جان کر ہمیں رب ذوالجلال سے معافی مانگ لینی چاہیے۔ کیونکہ کسی وقت موت اچانک ہی اچک لے گی۔ سب ٹھٹھا پڑا رہ جائے گا جب لا دھلے گا بجا رہ۔“

ذیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت علی کاظمی کی تفصیلات ”خلاف معمول جاسوسی 3 تاریخ کو مل گیا تھا۔ سرورق اس مرتبہ کچھ خاص تاثر قائم نہیں کر پایا، البتہ حسینہ ماہ حسینہ کے گھر سے بال اور کان کی بالی بہت اچھی لگی۔ کبھی تو حسینہ کا منہ بند بھی کر دیا کریں ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ ہم خنجر رہتے ہیں مگر وہ تو بولتی تک نہیں۔ چینی نکتہ چینی کی ابتدائی سیٹ احسان سحر کے حصے میں آئی۔ تبصرہ زبردست لکھا گیا تھا۔ اسلام آباد سے عزیز بن یسین آپ کو محفل دوستان میں گوڈے گوڈے دیکم۔ ہری پور سے پیارے دوست قاسم رحمان کا تبصرہ مزیدار سے لذیذ تر تھا محبت سے گوندھا ہوا تبصرہ بہترین تھا۔ طاہرہ گلزار آپ تبصرہ پسند کرنے کا شکر یہ اور میری پہلی ترجیح پڑھائی ہی ہوتی ہے۔ لیکن جاسوسی کی تو عادت ہے جب تک پڑھ نہ لیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ آپ کی اتنی محبت پر شکر گزار ہوں۔ کافی عرصے کے بعد بشری الفضل کی آمد بہت اچھی لگی۔ ساگر ٹکڑ، طاہرہ گلزار، قاسم رحمان اور چوہدری محمد فراز کے تبصرے بہترین تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی، بھی میرا اندازہ درست نکلا، شہزی اور میڈم جی کی جوڑی بن رہی ہے لیکن عابدہ کی گشدگی کا تاثر اچھا نہیں ہے، عابدہ کو مارنا مت ڈاکٹر صاحب، عارفہ سے سخت نفرت محسوس ہوئی جو اخلاقیات کا پاس نہیں رکھتیں، وہ عورتیں کہلانے کی حق دار نہیں۔ اس ماہ آوارہ گرد کی کارکردگی بہترین رہی۔ حسب معمول آوارہ گرد کے بعد انگارے اسٹارٹ کی۔ شاہ زیب کی گشدہ مجھ پر آخر تا جو رہی نکل آئی۔ انٹی کی کارکردگی نہیں دکھا رہے رائٹر، لگتا ہے آگے چل کر یہ کردار اہم ہوگا۔ مولوی صاحب کی موت شاہ زیب کی پریشانی بڑھائی ہے۔ ابھی تک کہانی کچھ خاص تاثر قائم نہیں کر پائی جیسے مغل صاحب کی باقی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ابتدائی صفحات پر سلیم فاروقی کی کہانی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جس طرح خاور تقیوں سے لڑتا رہا۔ ہمت کی بات ہے لیکن رائٹر نے اینڈ شاید جلدی میں کیا، تھکنی رہ گئی۔ خاور کی موت نہیں ہونی چاہیے تھی محبت میں جدائی کے روگ بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ عینا کی زندگی بھی خاور کے پناہ خالی خالی تھی۔ رنگ اس مرتبہ کچھ خاص تاثر نہیں قائم کر پائے۔ احمد اقبال نے پھر بھی کچھ اچھا لکھا لیکن کاشف زبیر نے کہانی بہت بور لکھی۔ معذرت کے ساتھ کاشف زبیر کی تحریر لگ ہی نہیں رہی تھی۔ زخم خوردہ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ جینی کا کردار زبردست تھا۔ فاروق انجم صاحب اچھی کہانیاں لکھتے ہیں۔ مریم کے خان کی کہانی خاندانی عمدہ اور مکمل کہانی تھی۔“

کندیاں سے ناور سیال کے پُر آلام لمحات ”حیرت انگیز طور پر اور معمول سے ہٹ کر جاسوسی ہمیں 3 نومبر کو موصول ہوا۔ اتنے ماہ جاسوسی کی محفل سے غیر حاضر رہا کیونکہ میرے محترم والد مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسی صدمے میں تھا۔ تمام قارئین سے گزارش ہے میرے والد صاحب کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ (ہمیں بے حد افسوس ہے اللہ تعالیٰ آپ کے والد محترم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے) 26 اکتوبر کو زلزلہ نے پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواں پشاور میں بہت تباہی مچائی، بہت سے لوگ اللہ کو پیارے ہوئے، بہت گھرتا ہوا ہوئے اللہ ان سب کو حوصلہ دے اور ان سب کی مشکلات آسان کرے، آمین۔ ہم بھی تمام اسیران اس وقت کوٹھری میں بند تھے، بڑا شدید زلزلہ تھا، ہمیں کسی نے بھی بند کوٹھریوں سے باہر نہیں نکالا۔ ہم نے بہت شور شرابا کیا لیکن ہم قیدیوں کی کوئی سننے والا نہیں تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کیا۔ بس یہی دعا ہے کہ یا اللہ ہمارے پاک ملک کو اپنی پناہ میں رکھے۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو بے بسی کی زندگی سے باہر نکالے) ٹائٹل گرل تو جناب شاہ زیب کی تاجور محبوبہ لگ رہی ہے۔ وہی خوب صورت چہرہ، وہی پیشانی، وہی بالوں کی لٹ جو ہوا کے دوش پر لہراتی مل کھاتی، پیشانی پر ناگن کی طرح جینے جاتی ہے۔ یہی لٹ تو ہے جو شاہ زیب کو دیوانہ کیے ہوئے ہے۔ واہ ڈاکٹر اگل کمال کر دیا آپ نے (واقعی) اب چلتے ہیں اس ہال کی طرف جہاں لوگ اسی کو دیکھتے ہیں جو اس ہال میں داخل ہو۔ مجھے کسی نے بھی یاد تک نہیں کیا۔ اگر یاد کیا تو وہ ہے جتیس خان جو درد سمجھتی ہے اور محسوس کرتی ہے اسی کو کہتے ہیں پاکیزہ دوستی۔ مراگل صاحب، بالکل آپ نے بھانپ لیا اسنے انتظار کے باوجود جب محفل میں خط شامل نہ ہو تو طے آنا فطری سی بات ہے۔ معراج محبوب عباسی آنکھوں پر اعتبار مت کرنا یہی آنکھیں تو کم بخت لے ڈھتی ہیں۔ عبدالباقی رومی انصاری جی آپ کی سوچ پر ترس آ گیا جو آنکھیں بے وقاہوں بھلا وہ خوب صورت کیسے ہو سکتی ہیں۔ محمد قاسم رحمان، میں آپ کی اس بات پر انگڑی نہیں کرتا، مجھ سمیت بہت سے اور بھی لوگ ہیں جن کو اکتوبر اور نومبر کے مہینوں میں دلچسپی نہیں ہوتی، لگتا ہے بشری الفضل کو کہیں جانے کی جلدی تھی یا پھر ناراض تھی۔ سید عبادت کاظمی آپ اچھے دوست ہو بھی مجھے یاد بھی نہیں کیا۔ اللہ پاک آپ کی تمام چویشانیاں آسان کرے۔ جتیس خان جی، یہ دہشت گردی کی لعنت ہمارے ملک سے صاف ہو جائے اللہ کرے تو پھر ہمارا ملک بھی خوش حال ہو جائے گا۔ طاہرہ گلزار صاحب میں تو آپ کو سو پرست نہروں کا، بہت اچھا تبصرہ تھا آپ کا۔ اسلام آباد سے عزیز بن یسین، آپ جیسے شاید کوئی ہوں جو اپنے نام کے ساتھ اپنے والد حضور کا نام بھی زعمہ رکھا ہوا ہے، خوش آمدید! اچھا رہا۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔ رخ کرتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے

ڈاکٹر عبدالباقی کی آوارہ گرد پڑھی، بابا سرمد کی موت کا افسوس ہوا۔ دولت کی خاطر اپنے ہی انہوں کا خون کرتے ہیں۔ شیری خان بھی بہت مشکلات میں پھنستا چلا جا رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ماں کی بات مانتا ہے یا نہیں۔ امید ہے ماں کا کہنا مان جائے گا۔ میڈم! زہرہ بانو سے شادی کرے گا ماں کے کہنے پر۔ اب میری پسندیدہ کہانی طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو ایکشن سے بھرپور ہوتی جا رہی ہے۔ اب تو سیالکوٹی بھی ان ہو گیا ہے ادھر مولوی جی کو اسحاق وغیرہ نے مار دیا اور اب شاید اسحاق وغیرہ سیالکوٹی سے تاجور کو اغوا کرانے اس سے ذیل کرنے گئے ہوں۔ بھرپور ایکشن دیکھنے کو ملے گا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ ہماری پاکستانی ٹیم انگلینڈ سے فتح سیٹے۔“

بہاولپور سے علی محمد کی محبت ”میں جاسوسی کا اس وقت سے قاری ہوں جب سے یہ شروع ہوا، میرے پاس پورا ریکارڈ موجود ہے۔ پرانی بات ہے آپ کے ریکارڈ میں تین رسالے نایاب تھے۔ آپ نے نکتہ چینی میں اشتہار دیا تو میں نے یہ رسالے بھیجے اور آپ نے دو سال جاسوسی مفت میرے نام کیا۔ اتنی لمبی رفاقت۔“

معراج محبوب عباسی کی ہری پور ہزارہ سے دلی معذرت ”اس بار جاسوسی کا دیدار 2 نومبر کو ہوا۔ ادارہ یہ حسب سابق ملک کی ابتر حالت پہ لکھا گیا۔ محفل میں سرفہرست تبصرہ احسان سحر کا تھا۔ کہانیوں پر اس قدر شاندار تبصرہ نگاری کے بعد یہ حق تو تھا جناب کا۔ کاشف عبید صاحب، آپ اتنا وقت کہاں سے لاتے ہیں، میں تو جاسوسی بھی کسی کسی ماہ پورا نہیں پڑھ پاتا۔ چھوٹے بھائی کے کارنامے پہ کافی حیرانی ہوئی۔ بلکہ پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ اسی کا خط ہے۔ عزیز بن حسین صاحب و یکلم! اور اگر ایک بار جسارت کر لی ہے تو اب باقاعدہ حاضر ہوتے رہنا۔ مرحا گل آپ اسے ڈاکے کی ہی غلطی کہیں ورنہ کے بعد کچھ نہیں لگتا۔ اور جہاں تک یاد کا تعلق ہے تو ہم سب یہاں ایک فیملی کی طرح ہیں۔ شمس الحق بھائی ہم تو بس خانہ پُری ہی کرتے ہیں ورنہ تو نیوٹن کے جے بھی اکثر بھول جاتے ہیں۔ فلک شیر ملک صاحب بھی دو شہر رنگ لٹیں ہیں جن کے چکر میں طاہر صاحب نے مسٹر شاہ زیب کو پوری کہانی کے دوران چکر کر رکھا ہے۔ بشری افضل اس بار جناب جمال دتی صاحب کے طرزِ تحریر سے مرعوب نظر آئیں بھی تو اتنے اختصار سے کام لیا۔ بلقیس خان اور عبادت کاظمی کی جرأت کو سلام کہ مجھے تاجیز کا تبصرہ پسند کر لیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے سب کی طرح میں نے بھی انگارے پڑھی۔ جاند ار قلم کار کی اس شاندار تحریر کے تو کیا کہنے۔ شاہ زیب سیاہ رات کی ہولناکی میں ایک ڈھانچا پوش خدائی فوجدار خلق خدا کی خدمت کو لکھا ہے۔ واہ جی واہ... کیا کہنے جناب شاہ زیب صاحب کے۔ آخر میں مولوی کی ناگہانی موت نے بتایا یا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ لگتا ہے اب اگلا چھاپا اس ڈیاہر پر ہی پڑے گا۔ آوارہ گرد میں سرمد بابا کی موت شہزاد احمد خان عرف شہزی کے لیے ناقابلِ حلافی نقصان ہے مگر سرمد بابا کی معاملہ فہمی کی بدولت عارفہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پائی۔ بے داغ منصوبہ میں پروفیسر اور ہما کا منصوبہ بے شک فول پروف تھا اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔ جنید کی زندگی بھی بچ گئی اور پروفیسر کا گھر بھی بس گیا۔ ہما ایک کم ظرف انسان سے بھی بچ گئی یعنی ہر طرح سے پیپی اینڈنگ، ویلڈن کاشف زبیر۔ سلیم فاروقی، بلیک وارنٹ لے کر اولین صفحات پر اپنے مخصوص اسٹائل کے ساتھ آن دھمکے۔ وہی انداز جس میں صراطِ مستقیم پر چلنے والے ہیر و ہمایا کو قدم قدم رکاوٹیں پیش آتی ہیں مگر کچھ اتفاقات اور کچھ زور بازو کے سہارے وہ کشتی پار لگا ہی لیتا ہے۔ شادی کی بے تحاشا مصروفیات کے باعث مکمل تبصرہ ممکن نہیں جس پہ دلی معذرت۔“

آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی ازدواجی اسیری ”چند ماہ کی فیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ مجھے بھلا یا نہیں گیا ہو گا۔ چند مصروفیات تھیں جن کی وجہ سے محفل سے دوری رہی جن میں سے ایک بڑی وجہ یہ کہ مابعد دولت 4 اکتوبر کو شادی کے پُر وقار بندھن سے منسلک ہوئے ہیں۔ (مبارک ہو، پھر تو غیر حاضری بنتی ہے) ماہ نومبر کا جاسوسی 5 تاریخ کو جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل جاسوسی کے عین مطابق پایا۔ ٹائٹل گرل کا اندازِ تفاخر قابلِ داد تھا۔ ماتھے پر آئی بالوں کی پریشان لٹ، سناپ کی طرح تل کھاتی، خساروں کو چھیڑتی، بجلی لگ رہی تھی۔ (اچھا!) زیادہ تعریف میں نہیں جاؤں گا کیونکہ اب چوبیس گھنٹے سر پر خطرے کی گھنٹی بجتی رہتی ہے۔ (ہو جیو! بھئی) نکتہ چینی میں، احسان سحر کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ معراج محبوب عباسی نے اچھا لکھا۔ عبادت کاظمی بھی اپنے معصوم سے تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ مرحا گل بھی اچھا اضافہ ثابت ہوئی ہیں۔ بلقیس خان اور طاہرہ گزرا معمول کے مطابق تبصرہ لیے حاضر ہیں۔ مجال ہے جو ناغہ کریں۔ گئی بات تو یہ ہے کہ اس بار نکتہ چینی کی محفل چمکی سی گئی۔ (آپ جو نہیں تھے) ابتدا انگارے سے کی۔ دیہاتی ماحول میں لکھی گئی یہ قسط لکار کی یاد تازہ کر گئی۔ تاجور اور شاہ زیب کی محبت فی الحال خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ مولوی صاحب کی موت کا دکھ ہوا۔ یہ قسط بہترین رہی۔ دیکھو پھر اگلے واقعات کیا رنگ لاتے ہیں۔ آوارہ گرد کی قسط بھی بہترین رہی، سرمد بابا جیسے شریف اور نیک دل بزرگ سازشوں کا افکار ہو کر دنیا سے چل ہے۔ افسوس یہ کہ ان سازشوں میں انہوں ہی کا ہاتھ تھا۔ اس قسط کے آخر پر ایک چوٹا دینے والا سوڑ ہے جہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا شہزی، بیگم صاحبہ سے شادی کر کے، عابدہ کی محبت کی قربانی دے گا؟ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سرورق کے دنگوں میں، بے داغ منصوبہ پسند آئی۔ جذبات و محبت کے انمول اور دبیز پردوں میں بھی مطلب پرستی اور پُر فریب چہروں کو بے نقاب کرتی یہ تحریر فوری رہی۔ پرانی بیٹی، احمد اقبال ہمیشہ کی طرح زبردست رنگ لے کر حاضر ہوئے۔ اس رنگ میں ساتوں رنگ شامل نظر آئے۔ دل میں کسی چاہنے والے کا نہ ہونا کتنی سخت اذیت ہوتی ہے اور انسان دور کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ دنیا جہان کی دولت ہو اگر پیار کی دولت سے محروم ہو تو وہ شخص جی دامن رہتا ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ انسانی زندگی میں پیار کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ بہترین کاوش۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا جاسوسی بہترین رہا۔ کتر نہیں بھی کافی بہتر رہیں۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔
انور یوسف زئی، اسلام آباد۔ سجاد علی شہری، اسکر دو۔ ایم نوح خان، سوات۔ تحریم قاطر، کراچی۔

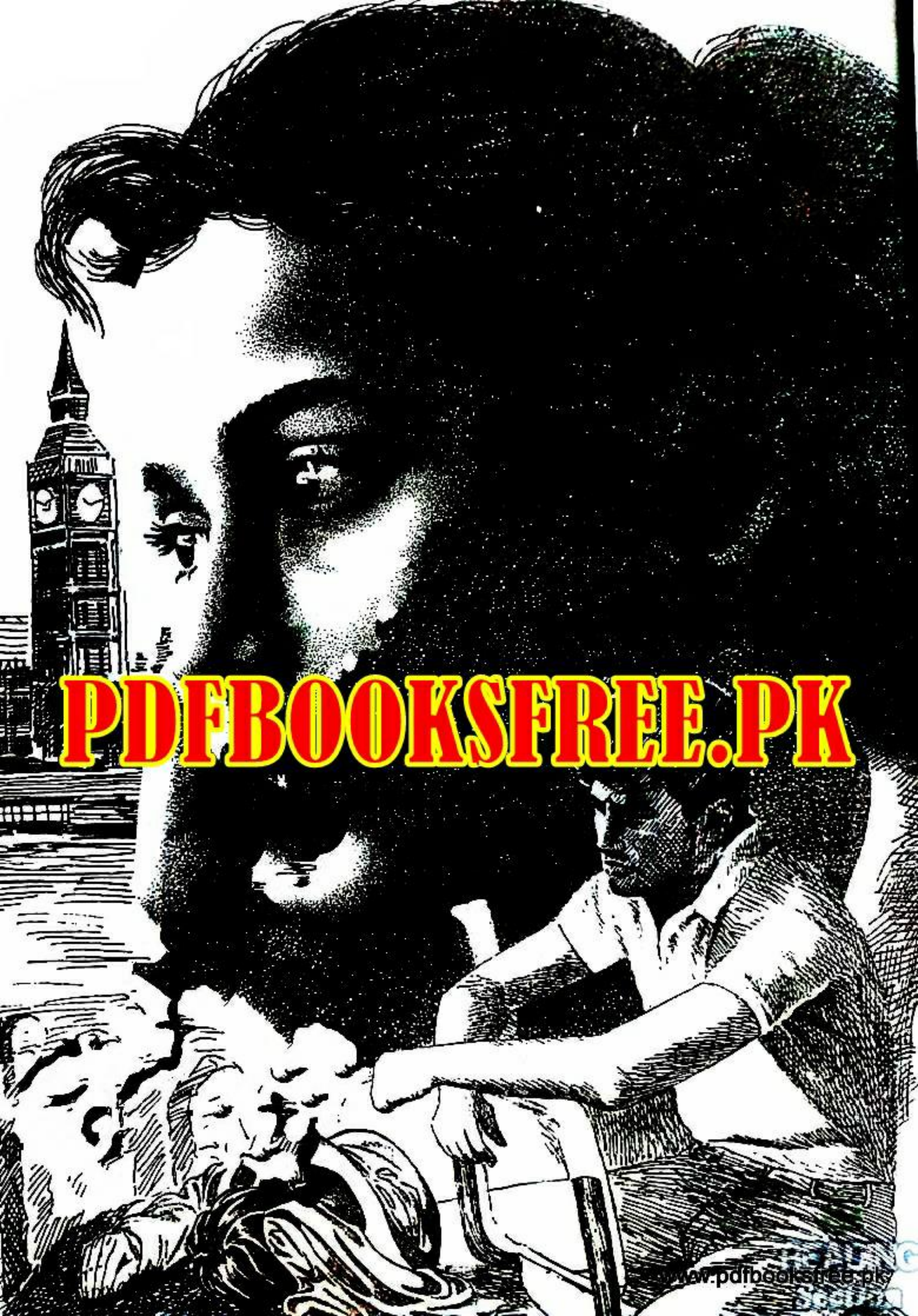
ہوش و مدہوش

احمد اقبال

تجسس... تحیر اور تاثر کسی بھی کہانی کے بنیادی جزو ہیں... ان تینوں عناصر کی موجودگی کہانی کار کی فنکارانہ ہنر مندی کی مرہون منت ہے... انہی خوبیوں سے مزین ایسی ہی داستانِ حیات... ہمارے تہذیبی اور سماجی ڈھانچے میں ہونے والی شکست و ریخت... بد تری اور بے سکونی بخوبی منعکس ہوتی ہے۔ بعض لمحات زندگی میں ایسے آتے ہیں جن کی تلاطم خیزی زندگی کا سکھنہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے... ہوش و خرد کی دنیا کے ایسے ہی کرداروں سے سچی کہانی کے تانے بانے... کرداروں کی نفسیاتی الجھنیں... عورت اور مرد کے متصادم فکری رویے اور روابط... قدم قدم پر بکھری انسانی بے بسی اور مجبوریوں کا نوحہ... جاسوسی کے اولین صفحات کی زینت...

حقیقت سے قریب زندہ کرداروں پر مشتمل معاشرے کی صحیح عکاسی کے ساتھ ایک بھرپور تحریر.....

وہ سب فرشی دسترخوان کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ، اس کا اٹھاون سالہ کارپینٹر باپ اور اس سے عمر میں آٹھ سال کم مگر برابر کی نظر آنے والی بیوی... اب ڈھائی فٹ چوڑا سبز رنگ کا بلیک پرنٹ والا دسترخوان ڈھرا کر کے بچھایا جاتا تھا کیونکہ کھانے پر بیٹھنے والوں کی تعداد نصف رہ گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس کے تین بھائی چلے گئے تھے۔ جو سب سے بڑا تھا، اسے استاد کمال دین نے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجا تھا۔ تعلیم تو پتا نہیں اس نے کیا حاصل کی، برطانیہ کی شہریت ضرور حاصل کی تھی اور اس کے لیے وہیں شادی کر لی تھی۔ دوسرے کے لیے کمال دین یہ نہ کر سکا تو وہ باغی ہو گیا اور اس نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ آوارہ گردی کے دوران میں ہی اسے کچھ دوست مل گئے جو اسے ایک مدرسے میں لے گئے اور ایک دن پتا چلا کہ وہ جہاد پر افغانستان چلا گیا ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی اطلاع آئی نہ وہ خود آیا۔ تیسرا، جو دراصل پہلا تھا۔ بچپن ہی میں لیوکیما یعنی بلڈ کینسر میں مبتلا ہوا۔



PDFBOOKSFREE.PK

کچھ عرصے اسے رفاہی اداروں سے خون کا عطیہ ملتا رہا۔ پھر یون میر وٹرانسپلانٹ کا مرحلہ آیا تو وہ مر گیا۔ کمال دین نے کھانا کھاتے اسے غور سے دیکھا۔ ”ہیروشیما پر کون سا بم گرا ہے جو چپ ہے۔ کیا ہوا ہے پتر۔“

شائلہ کو پیار سے سب شیما تو کہتے ہی تھے جب اس کے بھائی نہ رہے تو باپ نے اپنی سب توقعات اسی سے وابستہ کر دیں یا اپنی بیوی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اسے ہیروشیما کہنا شروع کر دیا۔ ”یہ میری ہیرو بیٹی ہے، ہیروشیما...“ وہ شیما کی امتحانات میں شاندار کارکردگی پر خوش ہو کے ہنستے ہنستے کہتا۔ اس کی ہنسی میں بیٹوں سے محرومی کا دکھ صاف جھلکتا تھا۔

شیما کا دل اس کے سینے میں زور سے دھڑکا مگر وہ مسکرائی۔ ”کچھ نہیں ہوا۔“

وہ کیسے بتاتی کہ ایٹم بم تو وہ خود گرانے والی ہے۔ بس وہ مناسب وقت کے انتظار میں حوصلہ مجتمع کر رہی تھی۔ اس کی ماں نے سالن کی خالی پلیٹوں کو اکٹھا کیا اور دسترخوان سمیٹا تو کمال دین نے بیڈ کا سہارا لے کر پاؤں پھیلا دیے۔ ”آج تو خیر سے پھر جہیز کے لیے چنیونی کام آگیا۔ ڈبل بیڈ، تین پٹ کی الماری، ڈبل بیڈ کے ساتھ کی سائڈ ٹیبل اور ڈریسنگ ٹیبل تین پٹ والی... جس میں بیچ والے بڑے آئینے کے ساتھ اسی لمبائی کے دو آئینے والے کم چوڑے پٹ ہوتے ہیں۔ بند کرو تو شیشے کے اوپر کھولو تو خود کو دونوں سائڈوں سے دیکھ لو۔“

”وہ تو بڑا مہنگا پڑتا ہوگا؟“ اس کی ماں بولی۔

وہ سگریٹ جلا کے ہنسا۔ ”ان کو کیا مہنگا سستا جو ایک بیٹی کو شادی میں دس لاکھ کا فرنیچر دیں... سونا کتنا ہوگا اور باقی جہیز کیا ہوگا، میں نے سات لاکھ مانگے تو مجال ہے جو دوسری بات کی ہو۔ بولے ابھی تین ہفتے ہیں، میں نے صاف کہا کہ کسی اور سے کرا لو یہ کام... میرے ہاتھ میں آرڈر ہے۔ وہ اگلے ہفتے پورا کرنا ہے پھر آپ کا کام کروں تو چار ہفتے لگیں گے مجھے... آگے منت سماجت پر کہ استاد کسی اور کے پاس ہم کیوں جائیں... پہلے بھی دو بیٹیوں کو تم نے ہی بنا کے دیا تھا۔ تم بے شک سات کے آٹھ لے لو۔“

شیما کی ماں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”آٹھ لاکھ، تم کر لو گے؟“

”ہاں... بس دن رات ایک کرنا پڑے گا۔ کافی دن سے کام مندا تھا۔ اب اچانک اللہ نے کرم کیا کہ دو

آرڈر آگئے۔ سوچتا ہوں ہیروشیما اپنے گھر کی ہو جائے تو میں بھی گھر کو دیکھوں... تجھے تو فکر ہے نہیں۔“

”فکر سے کیا ہوتا ہے جی... میں کیا بے شرم بن کے خود گھر گھر جاؤں اور شیما کے لیے رشتے کی بھیک مانگوں...“

اپنی بات کرنے کا یہی سب سے اچھا موقع تھا۔ ”ابا آپ میری فکر مت کریں۔“

کمال دین سگریٹ کے دھوئیں کو اوپر چھوڑ کے بولا۔ ”اچھا؟ پھر کون کرے گا؟“

”فکر ہوتی تمہیں تو اس نامراد شے کو چھوڑ دیتے۔“

شیما کی ماں دوپٹے کو ناک منہ پر رکھ کے بڑبڑائی۔ ”کتنا منع کیا تھا ڈاکٹر نے... خدا خدا کر کے کام کے قابل ہوئے ہو پھر...“

”میں نے کہا نا ابا، میری نہیں اپنی فکر کریں۔ انکار کر دیں سات کے آٹھ دینے والوں کو... وہ تو آپ کی جان سے کھیل رہے ہیں۔ دیکھتے نہیں رندہ چلاتے ہو تو سانس دھونکئی کی طرح چلتا ہے۔ چھوڑ دیں اب یہ کام جو چالیس سال سے کر رہے ہیں۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”اچھا چھوڑ دوں گا۔ ہیروشیما کا حکم جو ہے مگر اس کے بعد تو کرے گی یہ کام...؟“

”اور بہت کام ہیں دنیا میں۔“

”لیکن پہلا کام ہے تجھے گھر سے نکالنا۔“

ساری ہمت کو جمع کر کے اس نے منہ سے بات نکال ہی دی۔ ”میں خود کر لوں گی اپنی شادی۔“

وہ غیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”خود کر لے گی۔ واہ بھی واہ۔“

”آپ کا کوئی خرچہ نہیں ہوگا۔ ایک پیسا بھی نہیں۔“

لیکلخت کمال دین کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ بات کو اس کے دماغ کی گہرائی تک اترنے میں کچھ وقت لگا۔ شیما کا چہرہ دیکھتا رہا، شیما کا بدلا ہوا لہجہ اس کا خوف بن گیا۔ ماں کی نظر اس پر جم کے رہ گئی۔

”میں اُن پڑھ آدمی اس بات کا کیا مطلب سمجھوں شائلہ...؟“ وہ بالآخر سپاٹ لہجے میں بولا۔

شائلہ پہلا قدم اٹھا چکی تھی اس کے لیے واپسی کا راستہ بند رکھنا ضروری تھا۔ ”وہی جو میں نے کہا ابا... مجھے آپ کی اجازت چاہیے۔“

”اجازت؟“ وہ یوں بولا جیسے یہ کسی اور زبان کا لفظ تھا جو اس نے پہلی بار سنا ہو۔

پر پڑی ملی تھی۔ دکان کے سامنے... لوگوں نے بڑا احتجاج کیا تھا۔ اس کا بیٹا وکیل بن گیا ہے؟ نام کیا ہے اس کا؟

”حامد رشید... اس نے بتایا کہ ماں نے بڑی محنت کی، گارمنٹ فیکٹری میں کپڑے سیسے اور اسے پونٹھا۔ وہ بھی مرچکی ہے۔ اس نے سب رشتے داروں سے تعلق ختم کر دیا تھا جو مدد ایک پیسے کی نہیں کرتے تھے، بدنام بہت کرتے تھے۔ شادی کو صرف سات سال ہوئے تھے، وہ جوان تھی اور خوب صورت تھی مگر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔“

کمال دین افسردہ نظر آنے لگا۔ ”وہ کیسے مر گئی؟“

”چلتی وگین سے اتری تھی۔ پچھلے پہرے کے نیچے آگنی۔ اب دنیا میں حامد کا کوئی نہیں... وکالت سے اچھی آمدنی ہوتی ہے آج بھی کسی بڑے وکیل کا ماتحت ہے۔ ایک دن اپنی وکالت شروع کرے گا تو لاکھوں کمائے گا، آپ اس سے مل لیں۔“

”کیوں نہیں، میں اس سے ضرور ملوں گا۔“ کمال دین کی آنکھوں میں جیسے کوئی خواب اتر آیا۔ ”رشید کارگیر کا بیٹا غلط آدمی نہیں ہو سکتا۔ اس نے بھی جان دے دی تھی اصول کی خاطر... اس کا بیٹا بھی انصاف دلا رہا ہے... اچھا بھی مجھے تو نیند آرہی ہے۔“

وہ سونے کے لیے اٹھا تھا کہ آگے جھکا اور منہ کے بل گر گیا۔

”ابا۔“ وہ چلائی۔

”ابا کی بیٹی۔“ اسٹیشنل پرائیویٹ روم میں لیٹے ہوئے مریض نے چلا کے کہا۔ ”تو سونے آئی ہے یہاں... سونا تھا تو میرے ساتھ سو جاتی۔“

شیمان نے ضبط سے کام لیا۔ ”آئی ایم سوری... مجھے جھپکی آگنی تھی۔“

”اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہاں آ جا... بیڈ پر جگہ اتنی کم بھی نہیں۔“

”مسٹر سلیمان، زبان سنبھال کے بات کریں... یہ واہیات بات آپ دوسری بار کر رہے ہیں۔“ شیمان نے برہمی سے کہا۔

”کیا؟ میرے ساتھ زبان لڑاتی ہے؟ دو ٹکے کی نرس... کیا اتنا پیسہ ہم بے عزتی کرانے کے لیے دیتے ہیں؟“ اس نے سرہانے لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔

”آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، میں یہاں ملازم نہیں، مالک ہوں اس اسپتال کی۔“

احسن اندر آیا اور اسے باہر لے گیا۔ وہ غصے سے

”کیا کہنا چاہتی ہے آخر تو؟“ اس کی ماں چلائی۔

”کیا کسی کو پسند کر لیا ہے؟“

شیمان نے ماں کی طرف دیکھا۔ ”ہاں مگر چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں... نہ میں نے گناہ کیا ہے نہ جرم۔“

”کیمنی... مجھے منع کرتی ہے یا ریاں لگا کے...“

”بس۔“ کمال دین ایک دم دھاڑا۔ ”خبردار جو یہ بکواس کی۔“

اس کی ماں دھپائی دینے لگی۔ ”بکواس میں کر رہی ہوں یا تمہاری یہ لاڈلی جو بی اے کرنے سے پہلے کسی سے آنکھ منکا کر چکی ہے۔“

”ہاں تو بتا ہیروشیما... کون ہے وہ جسے تو نے پسند کیا ہے؟“

شیمان کا دل جوتلی کی طرح کانپ رہا تھا شیر جیسا ہو گیا۔ ”ابا، صرف دو منٹ میری بات سن لیں... پھر آپ کا جو فیصلہ ہوگا مجھے منظور... صرف دو منٹ۔“

”ہاں ہاں... تو بول، میں سن رہا ہوں۔“

”ابا! جب ہم شرع کی بات کرتے ہیں تو بی بی خدیجہ کی مثال دیتے ہیں جنہوں نے خود ہمارے پیارے نبی کو پسند کیا اور شادی کے لیے پیغام دیا۔ میں بالغ کی حیثیت سے قانونی حق کی بات نہیں کرتی۔ آپ ولی ہیں، آپ کی رضامندی ہوگی تو میں شادی کروں گی ورنہ نہیں... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ شیمان نے مضبوط لہجے میں آہستہ آہستہ کہا۔

کمال دین کے چہرے پر طمانیت کا احساس صبح کی دھوپ کی طرح پھیلا۔ ”اللہ خوش رکھے تجھے۔“

”وہ ایک وکیل ہے ابا، اس کا باپ بھی یہی کام کرتا تھا، لاہور میں۔“

”ترکھان تھا؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

شیمان نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ”اس کا نام رشید تھا۔“

عبدالرشید... بڑا مشہور کارگیر تھا۔“

”رشید؟“ کمال دین چونکا۔ ”وہ تو نہیں... جس کو پولیس نے مار دیا تھا۔“

”وہی ابا، اس نے کسی کا آرڈر لینے سے انکار کر دیا تھا آپ کی طرح۔“

”مجھے پتا ہے، بہت پرانی بات ہے یہ... ایک

تھانے دار کی بیٹی کے لیے جہیز تیار کرنا تھا۔ اس نے بھی کہا تھا

کہ پہلے ایک کام نمٹا لوں... بس یہی انکار مہنگا پڑ گیا

اُسے... وہ تھانے لے گئے اُسے... صبح اس کی لاش سڑک

کانپ رہی تھی۔ ”احسن اس بدتمیز مریض سے کہو کہیں اور چلا جائے، کسی بھی اسپتال میں جاسکتا ہے وہ۔“

”ڈارلنگ، تم جانتی ہو وہ ایک سیاسی بھگوڑا ہے جو اسپتال میں آ کے لیٹ گیا ہے۔“

”احسن، میں نے پھر ابا کو خواب میں دیکھا۔ کل اُن کی بری تھی نا، میں نے مجبوری میں یہ ڈیوٹی قبول کی تھی۔ وہ نرس نہیں آئی تھی۔“ اس نے احسن کے کندھے پر سر رکھا اور رونے لگی۔

”کم آن، تم گھر جا کے آرام کرو، اس سے میں نمٹ لوں گا۔“ احسن نے کہا۔

☆☆☆

دوسرے خوابوں کی طرح یہ خواب بھی اب شیما کا آسیب بن گیا تھا۔ اس کی حالت کسی نان اسٹاپ آرکنڈیشنڈ ٹرین میں سکون سے سونے والے مسافر جیسی تھی جو صبح ایک نئے دن میں سلامتی کے ساتھ منزل پر پہنچنے کا اتنا ہی یقین رکھتا تھا جتنا اپنی زندگی کے تسلسل پر، مگر ٹرین الٹ گئی اور منزل یوں غائب ہو گئی جیسے اس کا وجود ہی نہ تھا۔

ابھی اس سانحے کو دن ہی کتنے ہوئے تھے آٹھ مہینے پہلے استاد کمال دین سونے کے لیے اٹھا تو ایک خوش اور مطمئن آدمی تھا۔ اس کو ایک کام ملا تھا جس میں جان مار کے وہ چار پانچ لاکھ روپے کما سکتا تھا اور گزشتہ دو ماہ کا سارا نقصان پورا کر سکتا تھا۔ یہ سب زندگی بھر کی نیک نامی تھی کہ دکان پھر کھولتے ہی قدرداں آگئے تھے۔ اچانک اس کی ہیرو بیٹی شیما نے اس کی آخری اور سب سے بڑی فکر بھی دور کر دی تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کا انتخاب ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ وہ رشید کو جانتا تھا، اس کا بیٹا اگر دیگیل تھا تو باپ جیسا ہی ہوگا۔ وہ کسی طرح بھی شیما کے خوابوں کو شرمندہ نہیں ہونے دے گا۔ وہ اس کی شادی اتنی دھوم دھام سے کرے گا اور اسے اتنا جہیز دے گا کہ وہ تمام عمر سر اٹھا کے جی سکے۔

مگر وہ گرا تو پھر نہ اٹھا۔ اسپتال میں ڈاکٹر نے اسے دیکھ کے کہا۔ ”ہمارا اندیشہ درست تھا۔ تمہارے والد نے اس وقت ہماری بات مان لی ہوتی تو یہ وقت نہ آتا، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”ایسے مت کہیے ڈاکٹر صاحب، آج کل تو ہر مرض کا علاج ہے۔“

ڈاکٹر نے اسے افسوس سے دیکھا۔ ”ہاں ہے، انڈیا میں لیورٹرانس پلانٹ پر تقریباً دس لاکھ خرچ ہوں گے۔ اپالو (APPOLO) انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں

علاج، دوا، رہائش، آمدورفت کے اخراجات... سب ملا کے یہ زیادہ تو نہیں مگر تم کہاں سے لاؤ گی دس لاکھ؟“

”اس کے بعد بابا ٹھیک ہو جائے گا نا؟“

”آئی ہوپ سو... لیکن دس لاکھ تم کہاں سے کرو گی، ہی از اے کارپینٹر... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس نے یہی بتایا تھا دو مہینے پہلے۔“

”اگر میں دس لاکھ کا انتظام کر لوں... تو دوسرے مرحلے بھی ہوں گے ڈاکٹر صاحب... پاسپورٹ پرویزا کے...“

سینئر ڈاکٹر نے ہمدردی سے اس موت سے لڑنے پر کمر بستہ لڑکی کو دیکھا۔ ”اس کے لیے تم مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو۔ ریفرنس، این اوسی اور میڈیکل ہسٹری، ان سے ویزا جلدی مل جائے گا۔ میں آن لائن بات کر لیتا ہوں وہاں کے ڈاکٹر سے، گڈ لک۔“

اسپتال سے واپس آ کے اس نے ماں سے کہا۔ ”ہم ابا کو علاج کے لیے انڈیا لے جائیں گے۔“

”انڈیا؟“ اس کی ماں نے سوچی ہوئی آنکھیں اٹھا کے یوں کہا جیسے یہ لفظ اس نے پہلی بار سنا ہو۔

”ہاں ماں انڈیا، بڑے ڈاکٹر نے آج مجھے بتایا کہ یہاں ابھی علاج کی سہولت نہیں، برطانیہ، امریکا میں ہے، لیکن سب سے کم خرچہ انڈیا میں ہے علاج کرانے کا۔“ شیما نے کہا۔

اس کی ماں نے ڈاکٹروں کے رویے سے مایوس ہو کے خود پر قبل از وقت بیوگی طاری کر لی تھی۔ یہ رونے کی بات نہیں تھی مگر اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ ”کتنا کم، لاکھ کی تو اب کوئی اوقات ہی نہیں رہی۔“

شیما نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”دس لاکھ میں سب ہو جائے گا، آنا جانا اور وہاں آپریشن وغیرہ...“

ماں اسے یوں دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”کہاں سے آئیں گے یہ دس لاکھ؟ دس ہزار کی بات ہوتی تو اتنا میرا زور تھا، باقی سب تو نکل گیا جب تیرا ابا دو مہینے پہلے بیمار پڑا تھا۔ وہ سب جو تیری شادی کے لیے جوڑ کے رکھا تھا۔“

”ماں میں علاج کی بات کر رہی ہوں، تم شادی کو لے کر بیٹھ گئیں۔“

”تو بتا دے نا کہ دس لاکھ کہاں سے آئیں گے؟“

تیرے پاس ہیں جو انڈیا جانے کی بات کر رہی ہے؟“ ماں کی سے بولی۔

شیمانے سراٹھا کے چاروں طرف دیکھا۔ ”یہ مکان ہے ہمارے پاس۔“
وہ چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم اسے گروی رکھ دیں گے۔ اب تو بینک بھی لون دیتے ہیں پراپرٹی پر... اگر بیچنا ہو تو کھڑے کھڑے ہندوہ لاکھ مل سکتے ہیں، مجھے پتا ہے۔“
ماں نے اسے متوحش نظر سے دیکھا۔ ”مکان بیچ کے جائیں گے تو واپس آ کے کہاں رہیں گے؟“

وہ اٹھ بیٹھی۔ ”ماں، میرا باپ ہے وہ مگر تمہارا بھی شوہر ہے۔ کیا اس مکان سے اس کی زندگی کم اہم ہے تمہارے لیے؟“

”یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں۔“
”تم یہی کہہ رہی ہو ماں... لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ منہ پھیر کے سو گئی مگر نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔ تقدیر بڑی سفاک تماشا کی تھی۔ اس نے رنج اور خوشی کے تصادم کے لیے ایک ہی لمحہ منتخب کیا۔ انتظار کیا کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کسی مشکل اور پریشانی کے بغیر تسلیم کر لے تو اسی لمحے محبت کرنے والے باپ کی زندگی واپس لینے کا فیصلہ سنا دے۔ جیسے یہ کوئی مشروط سودا تھا کہ شوہر کی محبت کے بدلے باپ کی محبت دے دو۔ یہ دکھ سکھ کا ڈراما آگے پیچھے بھی تو ہو سکتا تھا۔ ایک دن یا ایک ہفتے یا ایک مہینے پہلے یا بعد... تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ... یہ بات اس کے باپ نے نہ جانے کب اپنے فارسی کے استاد سے سنی تھی اور اسے یاد رہ گئی تھی کہ اسے دہراتا رہتا تھا۔

حامد سے ملاقات صرف چھ مہینے پہلے کی بات تھی۔ کالج سے ادھر ادھر کہیں جانا شیماکا دستور نہیں تھا حالانکہ وہ دیکھتی تھی کہ اس کے ساتھ کی لڑکیاں کتنی بے خونی سے افسرز چلاتی تھیں اور کتنے فخر سے سب کے بیچ میں بیٹھ کے سناٹی تھیں۔ ان پر مرنے والے کالج کے گیٹ سے انہیں ساتھ لے جاتے تھے۔ کبھی کالج لگنے سے پہلے تو کبھی چھٹی کے بعد... نامہ بری تو اب کوئی مسئلہ ہی نہیں تھی۔ ان کے درمیان طویل رومانی گفتگو کے لیے موبائل فون کے پیکیج دستیاب تھے۔ ان کے لیے جان دینے والے پرستار بدلتے بھی رہتے تھے۔ شیماسب دیکھتی اور سنتی تھی مگر اسے اپنے باپ کا محبت کرنے والا اور اعتماد کرنے والا مظلوم چہرہ کوئی غلط قدم اٹھانے سے روک لیتا تھا۔ وہ ایک نہیں تین بیٹے گنوا چکا تھا اور اب اس نے ساری توقعات شکستہ سے... اپنی بیرو شیماسے وابستہ کر رکھی تھیں۔

بوشو و مذبوش

وہ ماں کو بتا کے آئی تھی کہ کالج کے بعد وہ غزالہ کے گھر جائے گی۔ اس کے بھائی کی منگنی تھی۔ غزالہ ان کے گھر آتی جاتی تھی۔ اس کا باپ کسی سرکاری محکمے کا چھوٹا موٹا افسر تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی بہت ایماندار آدمی نہیں تھا۔ اس نے ملازمت کے دوران ہی اپنا چار سو گز کا گھر بنالیا تھا، اس پر ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن کا قرض بھی تھا مگر زمین لینا اور تعمیر کے زیادہ تر اخراجات برداشت کرنے کے بعد ماہانہ قسط ادا کرنا بھی صرف تنخواہ میں مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ تاہم وہ شریف لوگ تھے۔ ایک تقریب میں انہوں نے شیماکے والدین کو بھی مدعو کیا تھا تو انہوں نے ایک کار میٹر کو بھی مساوی عزت دی تھی اور دبے لفظوں میں اعتراف بھی کر لیا تھا کہ ایماندار تو جرم ہو گئی ہے۔ سب کے درمیان رہ کے وہی کرنا پڑتا ہے جو سب کرتے ہیں ورنہ نوکری نہیں چلتی... اور شیماکے باپ نے بعد میں کہا تھا کہ چلو اس نے مجبوری کا اعتراف تو کیا، زمانہ واقعی ایسا ہی ہے۔

غزالہ کے باپ نے اسے کالج آنے جانے کے لیے ایک چھوٹی سی پرانی مگر اچھی حالت کی گاڑی لے دی تھی۔ اس کا گھر مخالف سمت میں نہ ہوتا تو وہ روز شیماکولانے لے جانے کی ذمہ داری قبول کر لیتی۔ یہ اس نے استاد کمال دین سے بھی کہا تھا۔ اس روز کالج سے نکل کے گھر جانے کے بجائے غزالہ نے گاڑی کا راستہ بدلاتا تو شیمانے پوچھا۔
”یہ کدھر جا رہی ہے تو...؟“

”بس یار ایک چھوٹا سا کام ہے وکیل سے... میرے والد کا کلاس فیلو تھا۔ میں اسے بھی چاچا جی کہتی ہوں۔“

”وہی کرائے دار کا معاملہ ہے؟“
”ہاں، وہ شرافت سے گھر خالی کرنے کی بات ہی نہیں سنتا۔ حالانکہ ابھی شادی میں چھ مہینے تھے جب ہم نے اپنی ضرورت بتائی تھی۔ ورنہ اتنے سالوں سے ڈیڑی نے تو کرایہ بھی نہیں بڑھایا تھا۔ یہی غلطی ہو گئی شرافت میں، اب اتنے کرائے میں ایسا گھر کون دے گا۔ ٹال رہا تھا کہ ہاں دیکھ رہا ہوں، تلاش کر رہا ہوں، اب منگنی کے تین مہینے بعد شادی کی تاریخ طے ہو گئی تو خبیث مکر کیا کہ وعدہ نہیں کر سکتا... دوسرا مکان طے گا تو خالی کروں گا۔ ہم نے تو خالی ہونے والے دو گھر بھی بتائے مگر اس کی نیت ہی نہیں تھی ایک کو کہا کہ خراب بنا ہوا ہے رہنے کے قابل نہیں تو دوسرے کا کرایہ... اسے بہت لگا۔ اب یہ تو ہو گا... مکان اچھا بھی چاہیے اور سستا بھی... یہ ہو سکتا ہے بھلا؟ اور جب مجبوری

کوئی نہ ہو۔“

”کرتا کیا ہے؟“

”جب آیا تھا تو ایم، اے کر رہا تھا۔ باپ کے تعلقات سے کسی نیوز چینل میں نوکری مل گئی۔ بس وہیں سے اس کا رویہ بدل گیا۔ اب تعلقات کی دھمکی ہے۔ پولیس اور ایف آئی اے کیا ہر جگہ مراسم ہیں۔ باپ تو شریف آدمی تھا۔ یہ سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ یہ جو صحافی ہیں اور وکیل آج کل کے... ان کے اسی رویے کی وجہ سے بینک بھی انہیں قرضہ نہیں دیتے۔“

”وہ تمہیں مشکل میں نہیں ڈالے گا اگر اس پر مقدمہ کیا؟“

”یار پھر کیا کریں... ہمارے بھی تعلقات ہوتے نا بد معاشوں سے، پولیس یا فوج میں... تو ہم تھانہ کچہری کیوں کرتے... بڑی لگواتے، اس کی صحافت والی بد معاشی نکال دیتے۔ ابا نے کہا تھا کہ وکیل چاچا سے کہنا ہم اور انتظار نہیں کر سکتے، کیس کر دیں۔“

وہ کوئی معمولی وکیل کا آفس نہیں تھا۔ وہاں پورا دفتر لگا دیکھ کے شیما بھی سمجھ گئی تھی کہ کوئی لیگل فرم ہے جس میں ماتحت وکیل بھی اپنے اپنے کیمین میں بیٹھتے تھے۔ دو کلرک ٹائپ ملازم تھے اور ایک سیکریٹری... اس وقت وہاں سب موجود تھے۔ احمد محمود ایسوسی ایٹس کے مالک احمد صاحب کے لیے انہیں انتظار کرنا پڑا۔ سیکریٹری غزالہ کو جانتی تھی چنانچہ ان کے لیے چائے آگئی۔

احمد صاحب آدھے گھنٹے بعد آئے۔ وہ سفید بالوں والے پُرکشش شخصیت کے مالک تھے اور غزالہ کو بیٹی ہی سمجھتے تھے۔ ”دیکھو، قانون کا راستہ جلیبی کی طرح ہے... مطلب یہ کہ بہت الجھا ہوا اور الجھا دینے والا۔ تمہارے والد صاحب ہیں بھولے خاں کیا کیس کریں گے؟ یہی نا کہ اس نے چار ماہ سے کرایہ نہیں دیا، وہ لے آئے گا جعلی رسیدیں بنا کے تمہارے والد صاحب کے دستخط بھی ہوں گے اس پر، اور صاف مکر جائے گا کہ ہم سے تو کبھی گھر خالی کرنے کی بات بھی نہیں ہوئی۔ اب پہلے تو اسے دیں نوٹس... اس کے بعد ہی کیس ہوگا۔ تین مہینے تو اسی میں نکل جائیں گے۔“

”پھر آپ ہی بتائیں نا کوئی طریقہ۔“ غزالہ پریشان ہو کے بولی۔ ”اب وہ کہتا ہے کہ ایک لاکھ دو تو مکان خالی کر دوں گا۔“

”یہی ہوتا ہے نور چشم... آسان تو یہی ہوتا مگر ظاہر

ہے بھولے خاں کے پاس اس وقت ایک لاکھ کہاں... پہلے تو بیٹھا رہا اس بھروسے پر کہ جب ضرورت پڑے گی کرایہ دار چلا جائے گا۔ اب شادی سر پر آگئی تو خیال آیا۔ خیر، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کرائے دار وہ تو نہیں ہے نا، اس کا باپ ہے۔ اس کا کچھ بندوبست کرتے ہیں۔“

”کیسا بندوبست؟“

”سرکاری مہمان بنانے کا...“ وہ مسکرایا۔

”انکل... وہ تو بوڑھا اور بیمار آدمی ہے۔“

”یہی تو فائدہ ہے۔ دشمن کی کمزوری ہی اس کی

ہلکت کا سبب بنتی ہے۔ مجھے اصل کرائے ٹاے کی کاپی چاہیے۔ کب آئے تھے یہ لوگ تمہارے اس گھر میں؟“ احمد صاحب نے انٹرکام کا بٹن دبایا۔

”میرا خیال ہے آٹھ سال پہلے... جب یہ مکان بنا تھا۔“

”دیکھو ذرا حامد کو بھیجو۔“ احمد صاحب نے کہا۔ ”ہاں، آٹھ سال بالکل ٹھیک بتایا تم نے... اب یہی قانونی غلطی کرتے ہیں مالک مکان جو گلے پڑ جاتی ہے کہ کرایہ نامہ رجسٹریشن نہیں کراتے۔ گیارہ مہینے والا چلتا رہتا ہے اور خرابی کی بنیاد بن جاتا ہے ورنہ سال کے سال بناؤ۔“

ایک نوجوان اندر آ گیا جس کی شخصیت میں اعتماد تھا اور نفاست تھی۔ کوٹ کے بغیر وہ سفید شرٹ بلیک ٹائی اور پینٹ میں تھا۔ ٹائی کو بھی اس نے قمیص کا اوپر والا بٹن کھولنے کے لیے ڈھیلا کر لیا تھا۔ ”آپ نے بلایا ہے سر۔“ پھر اس نے ان کو دیکھ کے سرخم کیا۔

”ہاں، تم ذرا جاؤ غزالہ کے ساتھ... اور ان کے والد سے کرایہ نامہ لے کر آؤ۔ کوئی فائل ہو تو وہ بھی۔“ پھر وہ اسے ہدایت دیتے رہے کہ مزید کیا معلومات حاصل کرنا ضروری ہیں۔ وہ صرف سر ہلاتا رہا لیکن شیما نے نوٹ کیا کہ ساری توجہ باس کی طرف رکھنے کے باوجود وہ چوری چوری ایک نظر اس پر ڈالتا تھا اور پکڑا جاتا تو جھینپ کر سرخ ہو جاتا۔ شیما مسکرائے بنانہ رہ سکی۔

”آپ برائے مانیں تو میں گاڑی چلاؤں۔“ وہ نیچے آ کے بولا۔

”کیوں...؟“ غزالہ حیران ہوئی۔ ”میں تو کئی سال سے گاڑی لا رہی ہوں۔“

”جی... وہ... ایسے پیچھے بیٹھنا اچھا نہیں لگتا مجھے... آپ بیٹھیں۔“

خلاف توقع غزالہ نے گاڑی اسے دے دی۔ ”اوکے

کے... مگر مجھے راستے میں ایک دو کام اور بھی ہیں۔“

”کوئی بات نہیں جی...“ وہ بولا۔

ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ کے وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا تو شیمانے کہا۔ ”خوار کر دیا تو نے اس بے چارے کو... ڈرائیور تھا وہ تیرا۔“

وہ ہنسی۔ ”بڑا شوق تھا تا اسے ایٹی کیش کی نمائش کا... بیٹھ جاتا آرام سے پیچھے۔“

دو ہفتے بعد وہ کالج میں تھی کہ اسٹرائک ہو گئی اور اس کے باہر نکلنے تک حالات خراب ہو گئے۔ سڑکوں پر تپلک ٹرانسپورٹ غائب ہو گئی۔ پیٹرول پمپ بند اور ٹریفک جام ہو گیا۔ وہ سڑک پر کھڑی تھی، دور کہیں فائر ہوئے اور پھر دھواں اٹھا۔ وہ سخت گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئی۔ اسی وقت موبائل فون پر اس کے باپ کی کال آئی۔ ”ہیروشیما، کہاں ہے تو بیٹا؟ شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔“

شیمانے جھوٹ بولا۔ ”ادھر تو سب ٹھیک ہے ابھی تک۔ کالج بند ہو گیا۔ میں آرہی ہوں۔“

”کیسے آئے گی، بس، ویکن ہے؟“

”میں رکشا، ٹیکسی پکڑ لوں گی، آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

اسی وقت ایک لمبی سیاہ کار اس کے سامنے آرکی۔ خود کار پاور ونڈو کا شیشہ نیچے اتر اتوا سے حامد کا چہرہ نظر آیا۔

”حامد صاحب۔“

”خاتون جلدی کیجیے... بیٹھے۔“ اس نے شیمانے کی بات کاٹ دی۔

وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے حامد صاحب...“

”کیا ہو رہا ہے؟ وہی جو معمول ہے اس شہر کا... آدھے گھنٹے میں پورا شہر بند... وہ تو اچھا ہوا میری نظر پڑ گئی آپ پر۔“

”آپ کہاں سے آرہے تھے؟ یہ آپ کی گاڑی ہے؟“

وہ ہنسا۔ ”ابھی تو میں نے ایسی گاڑی کے خواب بھی دیکھنا شروع نہیں کیے۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے خاتون... یہ احمد صاحب کی گاڑی ہے۔ سروس کرا کے لا رہا تھا۔ اب آفس کیسے جاؤں گا، خطرناک راستہ ہے۔“

”پھر کیا کریں گے؟“

”ان کے گھر پہنچاؤں گا گاڑی... پھر سوچوں گا کہ اپنے گھر کیسے جاؤں؟ مجھے راستہ بتاتی جائیں... خاتون۔“

”یہ کیا خاتون خاتون لگا رکھی ہے... کیا آپ کو

معلوم نہیں کہ میرا نام شائلہ ہے؟“

وہ جھینپ کے ہنسا۔ ”جی... معلوم تو ہے۔“

”بڑی پریشانی سے بچا لیا اس وقت آپ نے... ابا کے فون پر فون آرہے تھے۔ میں نے جھوٹ بول دیا تھا کہ ٹیکسی لے کر آ جاؤں گی۔“

”اور دیکھیں ٹیکسی آگئی۔ اللہ میاں کبھی تو فوراً سن لیتے ہیں۔“

”سچ کہا آپ نے... وہ غزالہ کا کام ہو گیا؟“

”بتایا نہیں اس نے... آج کیا تاریخ ہے، اٹھائیس... دو دن بعد ان کا مکان خالی ہو جائے گا۔ سامان وہ اٹھا چکے ہیں۔“

”اچھا؟ کیسے ہوا یہ سب؟“

”بس خا... مس شائلہ... تڑپ کا پتا سب کے پاس ہوتا ہے اس کے پاس صحافت کا تھا ہمارے پاس قانون کا۔“ وہ سامنے دیکھتا رہا۔

وہ ہنسنے لگی۔ ”سب کے پاس؟ میرے پاس تو کوئی نہیں۔“

اس نے نظر سڑک سے ہٹا کے شائلہ کو غور سے دیکھا۔ ”ہے شائلہ... بس تمہیں معلوم نہیں... زبردست تڑپ کا پتا ہے تمہارا۔“

اس نے حیرانی سے کہا۔ ”ایسا کون سا تڑپ کا پتا ہے میرے پاس جس کا مجھے بھی پتا نہیں۔“

”تمہارا حسن...“ وہ سیدھا سامنے دیکھتا رہا۔ ”آگے کچھ گڑ بڑ ہے۔“

شائلہ کا رنگ بدلا مگر اس نے بات پلٹ دی۔ ”پیچھے والی گلی سے نکال لیں۔“

اس نے صرف سر ہلایا۔ ”کرائے دار کے والد کے خلاف ایک درخواست آگئی تھی دھوکا دہی کی... انہوں نے مکان کو اپنا بتا کے فروخت کرنے کی کوشش کی، ایک لاکھ پچانہ بھی وصول کر لیا۔ ایک بروکر کی گواہی اور رسید تھی۔ انہیں ایک رات عزت سے تھانے میں رکھا۔“

شائلہ ہنسنے لگی۔ ”واقعی شرافت کا زمانہ نہیں۔“

”یہ نہ کہیں... میں کیا شریف آدمی نہیں لگتا آپ کو... آپ کے والد... احمد صاحب کون ہے بد معاش ہیں مگر ایک بد معاش کے سامنے سو شریفوں کی ٹھکی بندھ جاتی ہے تو وہ شیر ہو جاتا ہے ورنہ سو آدمی مار مار کے اسے دنبہ بنا دیں۔“

شائلہ ہنسی۔ ”بقر عید کے لیے؟ یہ کدھر چل پڑے

”گلستان جوہر۔“

”اور علم حاصل کرنے جاتی ہیں چین... برنس روڈ کیا کم دور ہے... کتنی لڑکیاں ہیں کالج میں؟“

”میرا خیال ہے ہزار سے اوپر... مطلب کیا ہے آپ کا...؟“

”آج تک کتنی اغوا ہوئیں؟ چار سال میں... فرسٹ ایئر سے بی اے فائنل تک... بہت ہوں گی جو آپ کی طرح دور سے آتی ہوں گی اسی طرح بس، ویکن میں... چاروں طرف سے۔“

”آپ یہاں بھی وکیل بن کے دلائل دے رہے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”بات دلیل سے کرنی چاہیے، ورنہ نہیں کرنی چاہیے۔ بغیر دلیل کے صرف محبت ہوتی ہے۔“ وہ متانت سے بولا۔

شائلہ چونکی مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ”پہلے جو پرسپل تھیں دور کے رشتے سے میری تائی تھیں... اب ان کی مانی ورنہ اتنی دور آنے کی ضرورت نہیں تھی۔“

”وقت ضائع کرنے کے لیے تم بھی بی اے کے بعد ایم اے کرو گی۔ یونیورسٹی نزدیک ہے۔“ وہ شن سے سپ کرتا رہا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو تم؟ ایم اے کیا وقت ضائع کرنے کے لیے کیا جاتا ہے؟“ وہ برہمی سے بولی۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”سب کرتے ہیں۔ پھر جھک مارتے پھرتے ہیں نوکری کے لیے... وہ رشوت یا سفارش سے ملتی ہے... سفارش بھی کم سے کم وزیر کی... دو لاکھ نقد میں کلر کی، صرف ان محکموں میں جہاں خدا من فضل رتی نہیں ہے۔ روکھی سوکھی تنخواہ ہے۔ اور لڑکیاں تو بس جھک مارتی ہیں ڈاکٹری پڑھ کے بھی... وہی گھر، شوہر اور بچے سنبھالنا جو میٹرک پاس لڑکی بھی کر لیتی ہے اور بہتر کر لیتی ہے کیونکہ وہ عدم اطمینان کا شکار نہیں ہوتی۔“

”افو، بڑی ریسرچ کر رہی ہے جناب نے... اس قدر تنگ نظری اور تعصب ہے بلکہ جہالت کہ لڑکیاں کیوں پڑھ رہی ہیں جب انہیں کام وہی کرنے ہیں۔“ اسے اب واقعی غصہ آ رہا تھا۔

حامد کا لہجہ نہیں بدلا۔ ”میری ماں نے تو میٹرک کیا تھا۔ مطلب یہ کہ میٹرک تک پڑھا تھا۔ رزلٹ آیا تو وہ ٹیل تھی مگر اس نے دیکھا بھی نہیں۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے میری دادی اور نانی البتہ بہت عالم فاضل

آپ؟“

”گھبراؤ نہیں، تم کو بحفاظت گھر ڈیلیور کرنا میری اخلاقی ذمہ داری ہے لیکن راستہ نہیں ہے ابھی... کچھ دیر لگ جائے گی اپنے والد سے فون پر دوسرا جھوٹ بول دو ان کی تسلی کے لیے۔“

”سچ کیوں نہ بول دوں کہ ایک شریف آدمی کے ساتھ ہوں۔“

”کوئی حرج نہیں اس میں بھی... شرافت کی سند تو ملی آپ سے... کسی طرح بھی سہی۔“

شائلہ نے گھر کا نمبر ملایا۔ ”ای، گھبرانا مت... میں کالج کے اندر ہوں... ذرا یہ ہنگامہ کم ہو جائے تو کالج والے اپنی بس میں سب کو پہنچا دیں گے، رینجرز والے آگئے ہیں۔“

رینجرز کی گاڑیاں واقعی آرہی تھیں۔ سامنے ٹائر جلانے والوں کا ایک مجمع ہاتھ میں لمبے لمبے ڈنڈے لہراتا نظر آ رہا تھا۔ حامد نے ایک عمارت کے گیٹ پر ہارن دیا اور گاڑی کو گھما کے پیچھے لے گیا۔ یہ سپریم کورٹ آف پاکستان کی مقامی رجسٹری تھی جہاں پہلے واٹر بورڈ کا آفس تھا۔ شائلہ کے کچھ پوچھنے سے پہلے گاڑی عقبی حصے میں رک گئی۔ غالباً احمد صاحب کی گاڑی کو یہاں پہنچایا جاتا تھا۔ وہ سپریم کورٹ بار کے رکن تھے۔

”چائے نہایت فضول ملتی ہے یہاں اور چائے کا نہ موڈ ہے نہ موسم... کولڈ ڈرنک کیا لو گی؟“ وہ اتر کے کھڑکی میں جھک گیا۔

شائلہ اب کیسے انکار کرتی۔ ”کچھ بھی لے آؤ، جو تم پیو۔“

وہ ایک دروازے میں غائب ہو گیا اور پھر دوٹن لیے نمودار ہوا۔ ”افسوس کہ بریانی ختم ہو گئی۔ سینڈوچ بھی دو ہی بچے تھے۔ میری اور تمہاری قسمت کے۔“ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے رسماً کہا۔

”اور کیا کرتا... آگے پی سی ہے۔ اچھا تھا عزت سے بیٹھ کے کھانا کھاتے... مگر تم جانتیں کہاں، تم لڑکیوں پر خوف کا بھوت جو سوار رہتا ہے کہ ہر شخص انہیں اغوا کرنے کے لیے پھر رہا ہے۔“

”کیا غلط ہے اس میں؟“ شائلہ نے برامان کے کہا۔

”رہتی کہاں ہیں آپ؟“ وہ سکون سے بولا۔

تھیں۔ قرآن شریف کے بعد بہشتی زیور بھی پڑھا تھا انہوں نے اور مولانا اشرف علی تھانوی کے فرمودات پر عمل بھی کیا تھا۔

”یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“

”میرے والد چار بھائی تھے چھ بہنیں...“ وہ بولتا گیا۔ ”والد صاحب پرچون کی دکان کرتے تھے محلے میں... کتنی آمدنی ہوگی... گھر میں دو کمرے نیچے اور دو اوپر... میرے ایک چاچے نے دکان سنبھال لی۔ میرے باپ نے ترکھان سے کام سیکھا اور کمال کا کارگیر تھا۔ قیمت دینے کے ساتھ لوگ اس کی منت سماجت کرتے تھے فرنیچر بنوانے کے لیے... دو ریلوے میں ملازم ہو گئے تھے۔ لڑکیاں بھی سب بیاہی گئیں ادھر ادھر... سب نے میٹرک کیا، پھر بی اے، مگر میری ماں اور تانی دادی نے ڈگری کے بغیر بھی بچوں کی اچھی تربیت کی۔“

”وہی بات نا کہ لڑکیوں کو نہیں پڑھنا چاہیے؟“

”نہیں، مقصد سامنے رکھ کے پڑھنا چاہیے۔ یہ جو آج کل دلیل دی جا رہی ہے نا کہ تعلیم یافتہ مائیں، بچوں کی بہتر پرورش کرتی ہیں، یہ بکواس ہے۔ پہلے والی مائیں تو سب اُن پڑھ تھیں خواہ سرسید کی ہوں یا قائد اعظم کی... یا علامہ اقبال کی۔“

”اچھا اب آپ برائے مہربانی مجھے گھر پہنچا دیں۔“ وہ جھٹلا کے بولی۔

اس نے سر ہلایا اور خالی ڈبے لے کر باہر ایک ڈرم میں ڈال آیا۔ ”آپ کے والد بھی اچھے کاریگر شمار ہوتے ہیں۔“ وہ باہر آ کے کافی دیر بعد بولا۔

وہ چونکی۔ ”آپ جانتے ہیں؟“

”احمد صاحب نے ذکر کیا تھا۔ اپنی دو بیٹیوں کے جہیز کا فرنیچر بنوانا چاہتے تھے لیکن بنا نہیں تو انہیں افسوس تھا۔“

شائلہ کو فخر کے ساتھ دکھ بھی ہوا۔ ”انہوں نے بہت کام کیا، اب بیمار رہنے لگے ہیں۔“

”میرے والد کی طرح ان کو بھی بزنس کرنا نہیں آتا ورنہ وہ لکھ پتی ہوتے۔ محنت کی اجرت کم لی، بہت کم، ورنہ ان کا جو کام تھا وہ آرٹ تھا۔ نہایت فضول مشینی فرنیچر احمد صاحب کو چار گنا قیمت میں ملا۔“

”شاید یہی بات ہے۔“

”شاید نہیں ایسا ہی ہے شائلہ، ہاتھ سے شاہکار بنانے والے ختم ہو گئے یا فاقے کر رہے ہیں۔ جھل گلی ختم ہو رہی

ہے۔ قلعی گر، کھار، روٹی دھننے والے سب ختم، کیا بیماری ہے تمہارے والد کو؟“

”کچھ سینے میں سانس کی تالی اور پھیپھڑوں کی پر اہلم ہے۔ آری چلاتے، زندہ پھیرتے گل کاری کرتے لکڑی کا برادہ سانس کے ساتھ اندر جاتا رہا۔ پالش کے بخارات گئے۔ اب سانس لینا مشکل ہے، علاج سے فرق نہیں پڑ رہا۔“

”ڈاکٹر کہتے ہوں گے آرام کرو، اچھی خوراک لو۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”میرا کوئی بھائی ہوتا تو سنبھال سکتا تھا ان کا کام... کچھ مدد کرتا۔“

”اونہ... ہوتا تب بھی یہ کام نہ کرتا... رشوت والی نوکری یا افسری کی فکر کرتا، پڑھنے کے بعد قصاب، تائی، دھوبی، کسی کا بیٹا یہ کام نہیں کرتا۔“

”ایم اے کر کے میں پروفیسر بن جاؤں گی، تم دیکھنا۔“

”جیسے میں وکیل بن گیا۔“ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

”اب ذرا مجھے گائیڈ کرو۔“

وہ گھر سے کچھ دور ہی اتر گئی۔ اس میں یہ بتانے کی ہمت نہیں تھی کہ اس گلی کے شاندار بنگلوں میں سے کوئی بھی اس کا نہیں۔ گلستان جوہر کی رہائشی ہونے کے باوجود ان کے پاس ایک سوئس گز کالیز والا گھر نہیں ہے۔ وہ سو گز کے مکان میں رہتی ہے جو پہلے ناجائز آبادی میں تھا مگر اب کچی بستی کو تسلیم کر لیا گیا ہے تو یہ خطرہ نہیں رہا کہ کسی دن بلڈوزر ناجائز تعمیرات کو گرانے آگئے تو وہ ٹوٹے پھوٹے سامان کے ساتھ کھلے آسمان کی چھت تلے بیٹھے رہ جائیں گے۔ اب تو ان کی آبادی میں بجلی گیس کے ساتھ کیبل بھی تھا اور نوجوان قسطوں پر موٹر سائیکل لے کر تنگ گلیوں میں دوڑاتے پھرتے تھے۔ دو چار گھروں میں کار بھی آگئی تھی۔

بعد میں کچھ بھی اتفاق سے نہیں ہوا۔ جیسے اس کا غزالہ کے ساتھ احمد صاحب کے آفس جانا یا حامد کا ہڑتال والے دن نمودار ہونا، بعد میں سب مرضی والی پیش قدمی اور اس کی رضا مندی والی قبولیت سے ہوا۔ حامد کا دماغ پلاننگ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ بے حد منطقی انداز میں سوچتا تھا اور بے خونی والے اعتماد کے ساتھ ہر کام کو تکمیل تک پہنچاتا تھا۔ اسی لیے وہ احمد صاحب کا محترم خاص تھا اور اس کا ارادہ بالآخر اپنی وکالت شروع کر کے اس سے بھی بڑی لیگل فرم بنانے کا تھا اور جب ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو شائلہ کو اس

موجودگی میں یہ اعلان کافی ہوتا ہے اور یہ سب باغی ہیں۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔ تم آج ہوش میں نہیں ہو۔“

”جتنا ہوش میں اس وقت ہوں میں... اتنا ہی کورٹ میں رہتا ہوں اور بات قانون کی کرتا ہوں۔ تم بتاؤ اس میں کیا غلط ہے۔ تم کیوں ملتی ہو مجھ سے... اگر کوئی کہے کہ وقت گزاری کے لیے تو میں اسے قتل کر دوں۔“

”تم عجیب آدمی ہو۔“ وہ حامد کو دیکھتی رہی۔

”اچھی بات یہی ہے کہ آدمی ہوں، حیوان نہیں ہوں۔ کسی غرض کے لیے تمہیں بے وقوف نہیں بنانا ہوا۔ میں نے تمہیں اور تم نے مجھے بہت اچھی طرح جج کر لیا ہے۔ سمجھ لیا ہے پھر کیا فلموں کی طرح گام کے بتانا ضروری ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور شادی کے لیے جدائی کے عذاب سے گزر کے فلم کے ختم ہونے کا انتظار ضروری ہے۔“

پلک جھپکے بغیر اسے دیکھتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

”اب ہماری راد میں رکاوٹ ڈالنے والا ولن بھی کوئی نہیں۔ میرا خیال ہے تمہارے والدین کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ میری طرف سے احمد صاحب بات کر سکتے ہیں کیونکہ اور کوئی نہیں ہے۔“

”والد کا بتایا تھا تم نے... والدہ بھی نہیں ہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اپنا پرس نکالا، اس میں چوبیس پچیس سال کی ایک جوان اور خوب صورت لڑکی مسکرا رہی تھی۔ اس نے دس بارہ سال پہلے کے فیشن کی بلیو شرٹ کے ساتھ زرد شلوار پہن رکھی تھی۔ زرد دوپٹا اس کے ایک شانے پر تھا۔ دوسرے شانے پر اس کے گھنے ریشمی سیاہ بال سامنے آئے ہوئے تھے۔ ”یہ کون ہے؟“

”میری امی۔“ وہ بولا۔ ”وہ تم سے زیادہ خوب صورت تھیں۔ ان کا نام زیب النساء تھا۔“

شیمانے برا نہیں مانا۔ ”یہ کب کی تصویر ہے، شادی سے پہلے کی؟“

”یہ ان کی حادثاتی موت سے صرف ایک ہفتے پہلے کی تصویر ہے۔ انہیں بس سے اترتا تھا۔ ان کراچی کے بس والوں کو تم جانتی ہی ہو، لاہور کے دیکن والے بھی کم نہیں... امی کے چلانے پر اس نے بریک لگا کر رفتار کم کی وہ اتر گئیں اور دیکن کے پچھلے پہرے نے انہیں چل دیا۔“

”ان کو جلدی کیا تھی... ڈرائیور بس روکتا۔“ وہ کچھ

میں کوئی شک نہ رہا کہ جو وہ کہتا ہے، کر سکتا ہے۔

بہت کم وقت میں اس نے گاڑی خرید لی۔ کمال دین سے پہلے ہی وہ شاملہ کو بتا چکا تھا کہ اس کے باپ کو پولیس نے کیسی بے دردی سے مارا تھا۔ اس روز وہ کلفٹن کے ساحل کے آخر میں اس دیوار پر پاؤں لٹکا کے بیٹھے تھے جس سے پھری ہوئی موجیں آ کے ٹکراتی تھیں تو پھوار اوپر تک آتی تھی۔ ہر بار بھیگ جانے والی خواتین خوف، خوشی اور لطف سے چنچیں مار مار کے ہنستی تھیں۔ وہاں ان جیسے بہت تھے مگر کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت بھی نہ ضرورت۔

”تو تم نے بدلہ لینے کے لیے وکالت شروع کی؟“

شاملہ نے گیلے دوپٹے کو جسم کے گرد لپیٹا۔

”ہاں، ارادہ تو یہی تھا لیکن وہ ایک جذباتی احمق نوجوان کا غصہ تھا۔ میں ایسا کرتا تو میرا انجام بدتر ہوتا۔ میں پولیس مقابلے میں مارا جاتا یا کئی قتل کی وارداتوں میں ملوث کر کے لٹکا دیا جاتا۔ چنانچہ میں سب بھول گیا۔ بدلہ لینے کا طریقہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ جو خواب میرے باپ نے دیکھے، وہ میں پورے کروں، اور تم دیکھنا ایک دن میرے پاس ایسی ہی کئی کوشیاں ہوں گی۔“ اس نے سی ویو کے پیچھے والی آبادی کی طرف اشارہ کیا۔

”اور جب وہ دن آئے گا تو مجھے بتانے آؤ گے تم؟“

وہ ہنسی۔

”نہیں، تم دیکھو گی سب... کامیابی کا ہر دن۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے غیر سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

”میری شریک حیات بن کے اور کیسے۔“

وہ دم بخود رہ گئی۔ ”اچھا؟ یہ فیصلہ آپ کر بھی چکے، مجھے بتائے بغیر۔“

وہ سمندر کی لہروں کو دیکھتا رہا۔ ”ہر بات الفاظ اور زبان کی محتاج نہیں ہوتی، محسوس کی جاسکتی ہے۔ جیسے محبت... ہم جو یہاں بیٹھے ہیں تو یہ کسی فلم کا رومانٹک سین پکچر انز نہیں ہو رہا ہے۔ ویسے تم کو پسند ہے یا تم ضروری سمجھتی ہو تو میں اس چٹان پر کھڑے ہو کے اعلان کر دیتا ہوں کہ لیڈ یز اینڈ جیکسین... میں اس لڑکی شاملہ سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔“ وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔

شاملہ گھبرا گئی۔ ”پاکل ہو گئے ہو... بیٹھو۔“ اس نے حامد کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

”ہتا ہے، شرع کی رو سے اگر میں اور تم یہاں اعلان کر دیں کہ ہم نے شادی کر لی ہے تو یہ نکاح تصور کیا جائے گا قانون میں بھی... اور شرع میں بھی... دو بالغ گواہوں کی

ہنگامہ ہوا تھا۔“

”ہاں، وہ تو ہوا تھا، تمہارے ابا صرف اس لیے مان گئے کہ میری بھی وہی ذات ہے ترکھان کا بیٹا ہوں میں۔“

”فضول بات مت کرو، میں نے بتایا کہ تم وکیل ہو... احمد صاحب کے ساتھ کام کرتے ہو۔“

”تو پھر رونی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟“

”ابا کو کل پھر دورہ پڑ گیا۔ وہ اسپتال میں داخل ہیں اور ڈاکٹرز نے ایک طرح سے جواب دے دیا ہے۔“

وہ متفکر ہو گیا۔ ”ایسی کیا بیماری ہے؟“

”بیماری لگی ایک تو اس کام سے، لکڑی کا برادہ سانس کے راستے پھپھڑوں میں جاتا رہا۔ ایک تو انہوں نے ابتدائی علامات کو اہمیت نہیں دی۔ علاج کرایا، کبھی ڈاکٹر، کبھی حکیم یا ہومیو پیتھ... ذرا بہتری آئی تو چھوڑ دیا۔ مزید خرابی پیدا کی سگریٹ نے... چھوڑنے کی بات کرتے ہیں، چھوڑتے نہیں۔“

”اس معاملے میں بڑے بڑے بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ کسی بچے کی طرح... پہاڑ کی چوٹی سر کر لیں اگر چاہیں... ایک سگریٹ نہیں چھوڑ پاتے، تو اب ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

”کہتے ہیں انڈیا لے جاؤ، جگر کے ٹرانسپلانٹ کے لیے۔“

”انڈیا؟ اور معاملہ سانس کی نالی یا پھپھڑوں کا ہونا چاہیے، جگر کیسے متاثر ہو گیا؟“

”یہ سب مجھے نہیں معلوم، ڈاکٹر پہلے کیا دوا دیتے تھے، کیا بتاتے تھے، ابا خود ہی جاتے تھے اور ہمیں مطمئن کرنے کے لیے کہتے رہے تھے کہ ایسی کوئی بات نہیں، اماں کو یا مجھے اصل بات پتا چلتی تو ہم اس کام سے روک دیتے جو بیماری کا سبب بنا، یہ باپ بھی کتنے پاگل ہوتے ہیں۔ میرے سامنے بڑی بڑی باتیں کرتے تھے کہ میں اپنی ہیروشیما کے لیے یہ کروں گا وہ کروں گا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے وہ خود کشی نہیں تو اور کیا تھا، نہ علاج نہ آرام... اور کام وہی۔“

”آئی ایم سوری، ان کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے، اس عمر میں وہ اور کیا کرتے، جتنی آمدنی تھی اسی پیسے میں تھی۔“

”پیشہ بھی کیا منتخب کیا انہوں نے۔ جس میں ان کی مدد صرف بیٹے کرتے... بیٹے کو کچھ پتا ہی نہیں۔“

”چھوڑ دیہ بات، پتا ہوتا تب بھی فرق نہ پڑتا۔“

دیر بعد بولی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”رٹش آور میں انہیں بڑی جلدی ہوتی ہے اور مسافر اتر ہی جاتے ہیں، امی بھی روز اترتی ہوں گی۔ ایک دن کسی نے فون کر کے مجھے بتایا۔ بہت عرصے بعد کہ جب وہ اتریں تو سامنے سے گزرنے والا ایک موٹر سائیکل سوار ان سے ٹکرا گیا تھا مگر وہ بھاگ گیا، یہ گیارہ سال پرانی بات ہے۔“

”گیارہ سال۔“ اس نے تصویر کو پھر غور سے دیکھا۔

”تصویر اتنی پرانی نہیں لگتی۔ اس کے رنگ بھی براٹ ہیں۔“

”میں ڈیجیٹل لیب سے ہر مہینے نیا پرنٹ بنوا لیتا ہوں۔“

”اس کا کیا فائدہ؟ میرا مطلب ہے گیارہ سال پہلے یہ ٹیکنالوجی کہاں تھی؟“

اس نے پرس کو کھولا۔ ”یہ ہے اصل تصویر... دراصل میں ان کو اسی رنگ روپ کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ جیسی وہ تھیں، تو میں نے پرانی تصویر سے چند سال قبل یہ پرنٹ نکلوا دیا۔“

”تمہیں ان کی صورت یاد ہے؟“

”ہاں، وہ بالکل ایسی ہی تھیں۔“ اس کی آنکھیں خلا میں دیکھتی رہیں۔

”گھر میں... جہاں تم رہتے تھے، تمہیں ان کی کمی کا احساس پریشان نہیں کرتا تھا؟“

”اسی لیے تو میں لاہور سے کراچی آ گیا تھا۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ اندھیرا ہو جائے گا تو تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔“

”نہیں ہوتے وہ پریشان۔ آج سالگرہ ہے میری، چلو تمہیں پیزا کھلاؤں۔“ وہ دیوار سے اترے اور پیزا کھانے چلے گئے۔

☆☆☆

حامد نے اس کی اتری ہوئی صورت کو غور سے دیکھا۔

”کیا ہوا، انکار کر دیا انہوں نے... مجھے معلوم تھا۔“

شیمانے نفی میں سر ہلایا۔ ”ماں ناراض ہوئی تھی مگر ابا نے ساری بات سنی اور وہ خوش ہوئے تھے کیونکہ وہ تمہارے والد کو جانتے تھے۔“

”وہ کیسے جانتے تھے؟“

”انہوں نے کہا کہ اخبار میں پڑھا تھا۔ لاہور میں پبلک نے پولیس تشدد کے خلاف احتجاج کیا تھا اور خاصا

تو پھر وقت ضائع کرنے سے فائدہ۔“

”پندرہ لاکھ کا انتظام کیسے ہوگا؟ کسی رفاہی ادارے سے مدد لوگی یا اخبار میں اعلیٰ شائع کراؤ گی؟“

”نہیں، مجھے معلوم ہے اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ ایسے

کیس تو بہت ہیں۔ کوئی میڈیا پر آجائے تو لگتا ہے بندوبست

ہو گیا مگر میں نے سنا ہے وہ سارے مدد کرنے والوں کے

فون یوگس ہوتے ہیں۔ شو کو کامیاب بنانے کے لیے وہیں

اندر سے کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی فون کر دیتا

ہے جذباتی ہو کے اور پھر بیک آؤٹ کر جاتا ہے۔ میں کوئی

رسک نہیں لے سکتی۔“

”پھر پندرہ لاکھ کہاں سے لاؤ گی میرے پاس...“

”مجھے کسی سے کچھ نہیں لینا۔“ اس نے حامد کی بات

کاٹ دی۔ ”تم سے بھی نہیں... میں بینک سے لون لوں

گی۔“

”بینک لون... سکیورٹی کیا ہے تمہارے پاس؟

بینک زیورات پر نوے فیصد دے دیتے ہیں۔ پراپرٹی پر

زیادہ سے زیادہ مالیت کا تین چوتھائی۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”یعنی مکان پر بارہ لاکھ تو

کے... مجھے قیمت کا صحیح اندازہ نہیں۔ ہو سکتا ہے پندرہ لاکھ

نہ ہوا شمارہ بیس لاکھ ہو۔“

”کون سا مکان؟“

”وہی جس میں ہم رہتے ہیں، وہاں یہی قیمت

ہے۔“

حامد اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ ”مائی ڈیئر

شیماء... کس کے نام پر ہے وہ مکان؟“

”ابا کے نام پر... ان کو میں راضی کر لوں گی۔“

حامد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دیکھو، اس میں کوئی شک

نہیں کہ مکان تمہارے ابا نے لیا تھا۔“

”انہوں نے زمین لے کر بنوایا تھا۔“

حامد نے سر ہلایا۔ ”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔

وہ زمین کے ڈی اے کی ضرورت بھی مگر لیز تمہارے ابا کے نام

پر نہیں ہے۔ وہ غیر قانونی قبضہ تھا۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ وہ پوری کچی آبادی رجسٹرڈ

ہے۔ آخر بجلی، گیس سب ملی ہوئی ہے۔ مل بھی آتے ہیں ابا

کے نام پر ہی۔“

”وہ سب ٹھیک ہے لیکن بینک والے لیز مانگتے

ہیں۔ کچھ آبادیوں کو ریگولر کر دیا گیا ہے یعنی جو رہتے ہیں

ان کا حق ملکیت تسلیم کر لیا گیا ہے اب کوئی ان کو ہٹائے گا

”نہیں حامد، یہ بد قسمتی کی انتہا ہے۔ بیٹے اتنے بے

حس بھی نہیں ہوتے، کام میں چاہے ان کا ہاتھ نہ بٹاتے،

علاج تو کراتے... جو علاج انڈیا میں ہو سکتا ہے لندن میں

بھی ہو سکتا ہے، امریکا میں بھی، وہ مالی مدد تو کر سکتے تھے۔“

”تم کو معلوم ہے انڈیا آنا جانا بھی لاکھوں کا نسخہ

ہے۔ سستا ہونے کے باوجود۔“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ڈاکٹر کے اندازے

کے مطابق دس لاکھ... برطانیہ میں اس سے تین گنا اور

امریکا میں دس گنا، ابھی وہ آئی سی یو میں ہیں۔ اس کے بھی

اخراجات کم نہیں مگر میں نے انڈیا جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

حامد اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ ”دس کے بارہ

لاکھ بھی ہو سکتے ہیں، پندرہ بھی۔“

”مجھے بھی اندازہ ہے۔“

”اور گارنٹی؟ سو فیصد یقین ہے ڈاکٹر زکو کہ وہ بالکل

صحت مند ہو جائیں گے؟“

”حامد، زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

وہ بگڑ گئی۔ ”دنیا میں ہے کوئی ڈاکٹر جو علاج کے بعد سو فیصد

شفا کی گارنٹی دے۔ سب آپریشن سے پہلے ہی وارنٹوں سے

دستخط حاصل کر لیتے ہیں کہ کسی بھی وجہ سے ڈھچھ ہو جائے تو

وہ ذمے دار نہیں، یہ تو معمولی اپنڈکس کے آپریشن کا بھی

پروسیجر ہے۔“

”یار مجھے سب معلوم ہے۔ اتنی رقم ہے تمہارے

پاس یہ جو اٹھیلنے کے لیے؟“

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”اس کو جو کہتے ہو تم؟ تمہارا

باپ ہوتا تو تم کیا کرتے، ہارنے کے ڈر سے جو انہ کھیلتے پیسا

بچاتے، کتنے بے حس ہو تم۔“

”پلیز، مجھے غلط نہ سمجھو۔“ اس نے شیماء کو ہاتھ پکڑ

کے بٹھالیا۔ ”شیماء، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارا مسئلہ

میرا مسئلہ بھی ہے۔ مجھے اتنا غلط نہ سمجھو۔“

شیماء نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”میں تم سے کچھ

چھپاؤں گی نہیں، جو ہمارے پاس ہے وہ تو جانے سے پہلے

میں ختم ہو جائے گا۔ آئی سی یو کے اخراجات بہت ہوتے ہیں

پرائیویٹ اسپتال میں... سرکاری اسپتال میں تو وینٹی لیٹر

بھی خراب پڑا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر توجہ نہیں دیتے۔“

”میں احمد صاحب سے کہتا ہوں...“

”چھوڑو، یہ ایک ہفتے یا ایک مہینے کی بات نہیں ہے

اور پھر ڈاکٹرز نے خود بتا دیا ہے مجھے کہ واحد علاج لیور کا

ٹرانسپلانٹ ہے جو سب سے اچھا اور سستا انڈیا میں ممکن ہے

نہیں۔ مگر نہ لیز ہے کسی کے نام پر نہ میویشن... اس کے بغیر بینک لون نہیں دیتے کسی کو۔ ویسے ان کی خرید و فروخت چلتی رہتی ہے۔ رجسٹری بھی ہو جاتی ہے۔“

شیماس کا چہرہ اتر گیا۔ ”میں بیچ تو سکتی ہوں؟“

”ہاں، اگر فوراً کوئی نقد قیمت ادا کر دے... گا ہک مل جائے۔“

”مجھے بھی اتنی جلدی نہیں، پاسپورٹ بنوانے اور ویزا حاصل کرنے میں وقت لگے گا۔ تب تک یہاں علاج چلتا رہے گا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ اب ان کی پوری میڈیکل ہسٹری نیٹ پر انڈیا بھیج دے گا۔ ان کا جواب آنے پر ویزا ملنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ایک طریقہ اور بھی ہے۔ میں اسے گروی رکھ سکتی ہوں۔“

”کس کے پاس، ان سود خوروں کے پاس... وہ تمہیں دس لاکھ دیں گے، زیادہ سے زیادہ۔“

”مجھے کچھ تو کرنا ہی ہو گا حامد۔ میں خاموشی سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان کو مارتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میرے پاس لے دے کے یہی ایک مکان ہے اور کچھ بھی نہیں، میری ماں کا تھوڑا سا زور ہے۔“ وہ منہ چھپا کے رونے لگی۔

”پلیز، پلیز شیما رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔“ اس نے شیماس کا سراپے کندھے پر رکھ کے اس کے آنسو پونچھے۔ وہ کچھ دیر سسکیاں لیتی رہی پھر پرسکون ہو گئی۔

”حامد، میں یہ سب اکیلی نہیں کر سکوں گی اور تمہارے سوا کون ہے میری مدد کرنے والا۔ تم چپ کیوں ہو، بولتے کیوں نہیں۔ بتاتے کیوں نہیں کہ میں کیا کروں؟“

”جان من، کیا تمہیں مجھ سے مدد مانگنے کی ضرورت ہے۔ میں کچھ اور نہیں سوچ رہا تھا۔ زیادہ فکر مجھے ان اخراجات کی ہے جو پورے کرنے کے لیے تم اپنا گھر بیچ رہی ہو۔ لیکن مجھے یہ بھی فکر ہے کہ مہینے دو مہینے یا چھ ماہ بعد جب تمہارے والد کا علاج ہو جائے گا اور وہ صحت یاب ہو جائیں گے تو واپس آ کے تم سب کہاں رہو گے؟ وہ دوبارہ کام کرنے کے قابل ہوں گے تو کیا کریں گے، ظاہر ہے تم ان کو پھر بھی کام تو کرنے نہیں دو گی۔“

”کام میں کروں گی۔“ شیماس نے پر عزم لہجہ میں کہا۔

”تم؟ کیا کام آتا ہے تمہیں؟“

”میں بی اے کا امتحان تو دے چکی۔ ایم اے پرائیویٹ کر لوں گی اور کچھ نہیں، میں ٹیچر تو بن ہی سکتی ہوں۔“

حامد نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”دیکھو، تمہیں اپنا بتانے کے فیصلے کے بعد تم میری ذمہ داری ہو۔ میری آمدنی میں گزارا ہو سکتا ہے۔ ابھی تک میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ احمد صاحب کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہوں۔ لیکن تمہیں وہاں نہیں رکھ سکتا۔ مگر ہم کرائے کا کوئی مکان لے سکتے ہیں اور مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا اگر تم بھی کسی اسکول میں پڑھاؤ مگر صرف بی اے ہو، بی ایڈ بھی نہیں ہو... تمہیں یہ تعلیم کو پیشہ بنانے والے مشکل سے تین ہزار دیں گے۔ اب تم اپنے سارے فکر و غم مجھے دے دو، میں سب سنبھال لوں گا۔“

وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ ”بیچ حامد، تم میرا ساتھ دو گے؟“

حامد نے اسے چوما۔ ”ہم نے زندگی بھر ساتھ دینے کی بات کی تھی۔ سمجھو وہ دن آ گیا۔ آج مجھے اپنے ساتھ اسپتال لے چلو۔ میں تمہارے والدین کے سامنے خود کو پیش کرتا ہوں۔ اس درخواست کے ساتھ کہ کسی اہتمام کے بغیر مجھے اپنا بنا لیں۔ اب یہ تو تقدیر کے فیصلے ہیں۔ دھوم دھام نہیں تو نہ سہی... نکاح اسپتال میں بھی ہو سکتا ہے، تمہیں منظور ہے؟“

اس نے روتے کانپتے کہا۔ ”مجھے کیوں منظور نہیں ہو گا حامد، ایک تم ہی تو ہو میرے۔“

”اچھا، اب ہم پہلے کہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ تم ایزی ہو جاؤ۔ اتفاق سے آج وکیلوں کی ہڑتال تھی تو میں فارغ ہوں۔“ اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

کمال دین کو تین دن بعد آئی سی ویو سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ سبکی پرائیویٹ اسپتال تھا جس کے اخراجات بڑے نام والے اسپتالوں کے مقابلے میں کم تھے۔ قدرتی طور پر یہاں زیادہ مریض آتے تھے اور انہیں کم توجہ ملتی تھی۔ صفائی اور دیکھ بھال کا معیار بھی مثالی نہیں تھا... کئی دوا تھیں تو بہر حال مریض اس کی پوری قیمت ادا کرتے تھے مگر بعض اوقات وہ غیر معیاری اور غیر معروف کمپنی کی بنی ہوتی تھیں۔ عام لوگ اس فرق کو کیسے جان سکتے تھے۔ یہ اس ملک کی بد قسمتی تھی کہ وہ تمام ذلت زاریاں جو کسی بھی حکومت کی کارکردگی کا پیمانہ ہوتی ہیں اب پرائیویٹ اداروں نے پیسا کمانے کے لیے سنبھال لی تھیں۔

حامد نے ڈاکٹر سے ملنے سے پہلے احمد صاحب کا وسیلہ استعمال کیا تو کمال دین کا علاج کرنے والے ڈاکٹر نے اسے اپنے کمرے میں پندرہ منٹ دیے۔ اس وقت شیماس

اسپتال جا پہنچا۔ وارڈ میں رش تھا لیکن کمال دین کا بیڈ ایک قطار کا آخری تھا۔ شیما نے کسی کے ہاتھ پر پیسے رکھ کے ایک بیچ حاصل کر لی تھی جو دیوار کے ساتھ تھی اور جب ڈاکٹر چکر لگاتا تھا بیڈ کے نیچے کر دی جاتی تھی۔ رات کو یہاں کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی مگر کمال دین کی بیوی نے دن میں موجود رہنے کا اجازت نامہ بھی لے لیا تھا۔ دن میں دو چار بار نرس کے خبردار کرنے پر اسے باہر جانا پڑتا تھا۔

احمد صاحب کے ساتھ حامد کو دیکھ کے شیما کھڑی ہو گئی۔ ”ابا، یہ احمد صاحب ہیں۔ بہت بڑے وکیل ہیں۔“ کمال دین نے لیٹے لیٹے ان سے ہاتھ ملایا۔ ”احمد صاحب کو کون نہیں جانتا۔“

اب احمد صاحب نے اپنے ماتحت کا تعارف کرایا۔ ”بھئی یہ ہے میرا جانشین... حامد ایڈووکیٹ۔“ کمال دین سمجھ گیا مگر اس کی بیوی چونگی پھر اس کی نظر اپنے ہونے والے داماد پر جم کے رہ گئی۔ کمال دین نے اخلافا کہا۔ ”احمد صاحب رادھر آجائیں آپ۔“

احمد صاحب نے خواتین کو بیچ پر بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ ”ہم ٹھیک ہیں یہاں... مجھے حامد نے سب بتایا کہ تم انڈیا جا رہے ہو۔“

”میں تو نہیں جانا چاہتا مگر یہ ہیر و شیما... میری بیٹی شامکہ ضد پر اڑی ہوئی ہے، کہتی ہے بندوبست ہو گیا ہے۔“ احمد صاحب نے سر ہلایا۔ ”شی ازرائٹ، تمہیں بیٹی کی بات ماننی چاہیے۔ انشاء اللہ تم بالکل ٹھیک ہو کے واپس آؤ گے۔ میرے پاس وقت کم ہے کمال دین، آفس میں کلائنٹس اسی وقت آتے ہیں لیکن تم سے ایک بات کرنی تھی۔“

”آپ حکم کریں سر۔“ کمال دین کا دل دھڑکا۔ شیما کا رنگ سرخ ہونے لگا۔

”بھئی یہ میرا نائب حامد، میرے بیٹے جیسا ہے۔ میرے ساتھ ہی رہتا بھی ہے۔ اس کے اپنے ماں باپ تو ہیں نہیں، ماشاء اللہ محنتی اور ذہین ہے۔ اس وقت بھی اچھا کام رہا ہے۔ آگے مزید ترقی کرے گا۔ اس کی شرافت کی کیا بات کروں، بھروسے کے قابل نہ ہوتا تو میں اپنے ساتھ گھر میں رکھتا۔ میں اس کے لیے تمہاری بیٹی ہیر و شیما کا رشتہ مانگنے آیا ہوں۔ سوری یہ جگہ بالکل مناسب نہیں ایسی بات کے لیے مگر اس معاملے میں تاخیر نہیں کی جاسکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تمہارے ساتھ جائے تمہارا بیٹا بن کے۔ کسی مرد کا

کے ساتھ نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے وہی بتایا کہ سب سے کم خرچ انڈیا میں ہوگا جہاں آنے جانے کے اخراجات بھی کم ہیں اور اسپتالوں کے بھی۔“

”رپورٹ میں نے آن لائن ارسال کر دی ہے۔ وہاں کے ڈاکٹر باری آنے پر دیکھیں گے اور پھر کوئی تاریخ بتادیں گے۔ اس دوران میں آپ دوسرے انتظامات کر لیں۔ ویزا مل جائے گا۔“

”باقی ہم کر لیں گے۔ بس مجھے آپ لگی لپٹی رکھے بغیر بتادیں کہ سرجری کے بعد مریض کے مکمل صحت یاب ہونے اور نارمل زندگی گزارنے کے چانس کتنے ہیں؟“

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مسٹر حامد! آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اس میں کوئی ایک فیکٹر نہیں ہے۔ کمال دین کی عمر زیادہ ہے۔ جوان آدمی کے چانس زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر بیماری محض عقلیت کی وجہ سے پرانی ہو گئی ہے۔ ابتدائی مرحلے میں چانس زیادہ ہوتا ہے کہ شفا یابی مکمل ہو اور سب سے اہم بات یہ کہ قدرت کا بتایا ہوا جسم ایک ایسی مشین ہے جس کا کوئی پرزہ بگڑ جائے تو اس کی جگہ دوسرا لگانے سے بات نہیں بنتی۔ کام چل جاتا ہے وقتی طور پر... مگر مشین کی کارکردگی میں فرق آ جاتا ہے۔“

”وہ میں سمجھتا ہوں۔ آپ اپنا اندازہ بتائیں۔“ ”ففتی ففتی... اور اس کے بعد جسمانی کارکردگی بھی ففتی پرسنٹ... لائف بھی... فیصلہ آپ کا ہے۔ یہاں ایسے لوگ ہیں جو وینٹی لیٹر افورڈ کر سکتے ہیں جانتے ہیں کہ سانس مریض نہیں لے رہا۔ مشین لے رہی ہے۔ پہلے وہ کہتے ہیں کہ چلو جیسا بھی... مریض زندہ ہے اور ہمارے سامنے ہے۔ مگر ایک مہینہ کسی نے نہیں گزارا۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ خود کہہ دیتے ہیں کہ مریض کا اور ہمارا عذاب ختم کرو۔ اتنا پیسہ خرچ کرنے سے کس کو کتنا فائدہ ہوگا۔ یہ حساب آپ خود کر لیں۔“

معاملہ حساب کا نہیں، جذبات کا تھا۔ وہ شیما کو نہیں بتا سکتا تھا کہ کمال دین کا آپریشن کامیاب رہا اور وہ مرض سے شفا یاب ہو کے لوٹ آیا تب بھی نارمل زندگی نہیں جئے گا۔ وہ اپنا کام نہیں کر پائے گا جبکہ علاج کے اخراجات بہت ہوں گے۔ شیما ایک فیصلہ کر چکی تھی اور حامد ساتھ دے نہ دے اس کو یہ کام کرنا تھا۔ اس معاملے میں نفع نقصان غیر اہم تھا۔

اگلے دن اس نے احمد صاحب کو وقت نکالنے کے لیے راضی کر لیا۔ ان کے ساتھ وہ ملاقات کے اوقات میں

ساتھ ہونا ضروری ہے۔ لیکن وہ اجنبی نہیں ہو سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں منظور ہو تو نکاح یہاں کر دیا جائے تاکہ یہ نامحرم نہ رہے۔ باقی رخصتی وغیرہ تمہارے واپس آنے کے بعد...

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کمال دین بھی سمجھتا تھا کہ "میں جانتا ہوں" کے الفاظ درحقیقت احمد صاحب کے نہیں... شیماء کے بھی ہیں اور حامد کے بھی... اچانک وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنی بیماری کی کوئی فکر ہی نہیں رہی۔ حامد میں ایک مثالی داماد والی ہر خوبی تھی۔ وہ پڑھا لکھا برسر روزگار، خوب رو اور نیک تھا۔ احمد صاحب ایسے آدمی نہیں تھے کہ یہاں اس کے سامنے جھوٹ بولنے آتے۔ انہوں نے بڑے سلیقے سے کمال کی ذمہ داری خود نبھادی۔ کمال دین رضامندی کا اظہار کرنے اور بیٹھ کے حامد کو گلے لگانے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو آنسو تھے، وہ خوشی کے بھی تھے اور شکرگزاری کے بھی کہ خدا نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔ اب وہ مرنے کے لیے بھی راضی تھا۔ شیماء اور حامد نے بس آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغام دیے۔ حامد نے شیماء کا حیا آمیز مسرت سے تکتا چہرہ دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ مسکراتا احمد صاحب کے ساتھ ہی چلا گیا۔ باقی وقت شیماء اپنے ابا کی دونوں آنکھوں سے بہنے والے آنسو پونچھتی رہی جو اپنے دکھ سے زیادہ خوشی کے تھے۔ دکھ تھا تو محض اس بات کا کہ زندگی نے اسے یہ خوشی بھی اس اہتمام کے ساتھ نہ منانے دی جس کی وہ آرزو رکھتا تھا لیکن اچانک وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے سینے پر رکھی ہوئی فکر مندی کی چٹان ہٹ گئی ہے اور بعد میں بیٹی کی خاطر مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔ "ہیرو شیماء، میری ایک بات مانے گی؟"

"کیا ابا؟ ماننے والی ہوگی تو کیوں نہیں مانوں گی۔"

"مجھے گھر لے چل۔ میں اب ٹھیک ہوں اور یہ آپریشن وغیرہ کے چکر میں گھر کا سودا نہ کر۔ میں وعدہ کرتا ہوں تیری قسم کھا کے... میں سگریٹ چھوڑ دوں گا۔ ہیومیو پیتھی میں بڑا کامیاب علاج ہے۔ آزمانے میں کیا حرج ہے۔"

"ابا آپ جانتے ہیں کہ آپ جتنی قسمیں چاہیں کھائیں۔ نہ میں کوئی بات سنوں گی نہ اپنا فیصلہ بدلوں گی۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "ارے پاگل، میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ نکاح کے بعد میں تجھے دلہن بنا

کے رخصت کر دوں۔" وہ پھر رونے لگا۔

شیماء نے دل پر ہتھ رکھ کے وہاں سے چلے جانا بہتر سمجھا۔ رات کو وہاں صرف اس کی ماں رہتی تھی اور اسے یہ پریشانی الگ لاحق رہتی تھی کہ جوان لڑکی گھر پر اکیلی ہوتی ہے حالانکہ شیماء سے یقین دلاتی رہتی تھی کہ وہ رات کو سب دروازوں کی کنڈیاں تالے لگا کے سوتی ہے اور حامد کے کہنے پر اس نے ایک گھنٹی پڑوسیوں کے گھر میں رکھوا دی تھی جو دائر گیس تھی۔ اس کا بیٹن شیماء اپنے بچے کے نیچے موبائل فون کے ساتھ رکھ کے سوتی تھی۔ پڑوسی شریف لوگ تھے۔ اگر خطرے کے وقت کیا غلطی سے بھی شیماء سے بیٹن دب جاتا تو دونوں جوان بھائی دیوار پھاند کے ایک منٹ میں آجاتے اور شاید ان کی بیویاں بھی... لیکن بے اطمینانی کا علاج الفاظ سے ممکن ہوتا تو کمال دین کم سے کم بیٹی کے سامنے آنسو روک لیتا۔

محبت کی وارفتگی کے باوجود ابھی تک شیماء اور حامد کے درمیان وہ حد فاصل قائم تھی جو عشق کو ہوس سے جدا کرتی تھی۔ وہ دن میں ملتے تھے۔ رات کا کھانا اکثر باہر کھا لیتے تھے لیکن نہ وہ کبھی اس کے ساتھ احمد صاحب کے گھر کے عقب میں دو کمروں کا سرورٹ کوارڈر دیکھنے گئی تھی جس کو وہ شروع شروع میں اور عام لوگوں کے سامنے کوٹھی کی انیکسی کہتا تھا اور نہ ہی اس نے شیماء کو گلی کے موڑ پر ڈراپ کرنے کے بعد اس کے گھر کی دہلیز کو عبور کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

اس رات وہ سونے لیٹی تو نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ ایسا اب اکثر ہونے لگا تھا۔ حامد سے ملنے کے بعد اس کے خواب بدل گئے تھے۔ اس کے خیالوں کی دنیا میں جذبات کے وہ رنگ بھر گئے تھے جن سے وہ نا آشنا تھی۔ وہ راتوں کو اس کے بارے میں سوچتی تھی۔ اس کی قربت کو محسوس کرتی تھی اور اس کا جسم اپنی ہی خواہش کی آگ میں جلتا تھا۔ اسے وہ خواب آتے تھے جو اسے زیادہ مضطرب کرتے تھے۔ ایسے میں باپ کے بغیر رہ جانے کا خیال اسے دہشت زدہ کرنے آجاتا تھا اور وہ سوچتی تھی کہ سہارے نہ ہوں تو عورت کی زندگی تو مالِ غنیمت جیسی ہو جاتی ہے۔ یہ سہارے پہلے باپ فراہم کرتے ہیں پھر بھائی، پھر شوہر اور آخر میں بیٹے... ایسے میں حامد فرشتہ غیب کی طرح نمودار ہوا اور اس نے شیماء کا ہاتھ تھام لیا۔ ڈرتی کیوں ہو، میں ہوں نا۔

فون کی گھنٹی نے اس کی نیند میں ایک دم خوف بھر

انڈین ہائی کمیشن کو بھیج دیا گیا ہے۔
 ”پاسپورٹ کل ہی ملے ہیں۔ میں ویزا درخواست
 کے ساتھ کل ہی جمع کر ادیتی ہوں۔“
 ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”خود جاؤ اسلام آباد۔ ہائی
 کمیشن میں کسی سے ملو۔ سفیر نہ سہی... فرسٹ سیکریٹری،
 پروٹوکول افسر اور ڈربانا نہیں۔ نہ ویزا کی بھیک مانگنی ہے۔
 کوئی سیدھے منہ بات نہ کرے تو کہنا کہ میں پاکستان کے
 سفیر عبدالباسط سے بات کرتی ہوں، وہ متعلقہ حکام کے
 سامنے معاملہ اٹھائیں گے۔“ ڈاکٹر کو تنہا ساری ذمہ داری
 کا بوجھ اٹھانے والی اس معصوم صورت لڑکی سے ہمدردی ہو
 گئی تھی۔

”جی سر۔“ وہ ڈاکٹر کے دیے ہوئے کاغذات کا
 پلندا سنبھالے باہر آگئی۔ اسلام آباد جانے کا مرحلہ تھا، وہ نہ
 ماں سے بات کر سکتی تھی نہ باپ سے۔ تو اکیلی کیسے جائے
 گی؟ ان کا پہلا سوال ہوتا۔ اس کے لیے بے شرم بن کے یہ
 کہنا ناممکن تھا کہ میں حامد کے ساتھ جاؤں گی۔ احمد صاحب
 کی اسلام آباد سپریم کورٹ میں پیشی کے باعث اسپتال میں
 سادگی سے ہونے والی نکاح کی تقریب تو ابھی تک نہیں ہوئی
 تھی لیکن حامد نے بطور شوہر اس کا چارج لے لیا تھا۔ اس کا
 کہنا تھا کہ دو چار دن سے کیا فرقی پڑتا ہے اور اب وہ بحث
 کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی کہ فرق کو واضح کر سکے۔
 اس نے اپنی غلطی اور کمزوری یا نوسہ نقدیر کو قبول کر لیا تھا۔
 وہ ڈھائی بجے آیا جب وہ کھڑے کھڑے تھک گئی
 تھی۔ دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے وہ ایک دکان کے
 سائبان کے نیچے چلی گئی تھی۔ دکاندار شریف آدمی تھا۔ شیمہ
 نے کہا کہ میرے شوہر کو لینے آتا تھا۔ پتا نہیں اتنی دیر کیوں
 کر دی تو دکاندار نے کہا تھا کہ اندر آ کے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔
 ایک لمحے اس کا جی چاہا کہ ارد گرد کے لوگوں کی کئی سوالیہ اور
 مشتبہ نظروں سے بچنے کے لیے وہ دکان میں چلی جائے مگر
 اسے اندیشہ تھا کہ حامد فٹ پاتھ پر شیمہ کو غیر موجود پا کے
 سیدھا نہ نکل جائے۔

وہ بیٹھتے ہی حامد پر برس پڑی۔ ”اتنی دیر کر دی، سب
 مجھے ایسے گھورنے لگے تھے جیسے میں کسی شکار کے انتظار میں
 کھڑی ہوں۔“

وہ ہنسا۔ ”شکار آگیا نا بالآخر... جانم، کورٹس کے
 معاملات میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ اب میں جج سے کیسے
 کہتا کہ میری مکھن ملائی جیسی بیوی کا رنگ دھوپ میں سنولا
 رہا ہوگا۔“

دیا۔ یا اللہ خیر، اس کا ذہن فوراً اسپتال کی طرف گیا جہاں
 اس کی ماں اپنے زندگی اور موت کے درمیان بے یقینی کے
 عذاب سے گزرنے والے شوہر کے ساتھ تنہا تھی۔ مگر روشن
 اسکرین پر سرخ رنگ کا دل نظر آ رہا تھا۔ اس نے دھڑکتے
 دل کے ساتھ پوچھا۔ ”حامد! تم جاگ رہے ہو؟“
 ”کیا تم سو رہی ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
 ”میں بھی بہت دیر تک جاگتی رہی... ایک خواب
 دیکھتی رہی، کیا تم بھی وہی خواب دیکھ رہے تھے؟“
 ”ہاں، اور وہ خواب مجھے تمہارے دروازے تک
 لے آیا ہے۔“

”کیا مطلب... کہاں ہو تم؟“ کھڑکی پر بجلی کی
 چمک لہرائی۔

”میں باہر کھڑا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ باہر
 زور سے یاد دل کر جا۔

وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ کیا مطلب؟
 ”مطلب کیا... دروازہ کھولو، بارش شروع ہو گئی
 ہے۔“
 ”نہیں... نہیں حامد... تم واپس جاؤ۔ میں دروازہ
 نہیں کھولوں گی۔“

”میں دیوار پھاند کے اندر آ گیا ہوں۔ کھولو
 دروازہ...“ اس نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔
 اور اس رات شیمہ ایمر جنسی میں استعمال ہونے
 والے پیش بٹن کو نہیں دبا سکی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے کہا۔ ”لڑکی، کیا انتظام کیا ہے تم نے؟
 تمہارے کیس کی کنفرمیشن آگئی ہے انڈیا سے۔“ اور ایک
 بڑے سائز کا سفید لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

لفافے پر ایک میڈیکل اسٹی ٹیوٹ کا نام تھا۔ اس
 نے صرف ایک لیٹر پڑھا جس میں لکھا تھا کہ اگلے ماہ کی کوئی
 تاریخ سرجری کے لیے دی جاسکتی ہے۔ باقی سب اس کی
 سمجھ میں نہ آنے والا ریکارڈ تھا۔ سی ٹی اسکین، الٹراساؤنڈ
 اور ان پر ریمارکس... یہ بھی کہا گیا تھا کہ مریض اپنی آمد کی
 اطلاع کم سے کم پندرہ دن قبل دے اور ایک ہفتہ قبل داخل
 ہو جائے۔

”میں نے... رقم کا انتظام کر لیا ہے۔ تمام
 اخراجات کے لیے۔“ شیمہ نے کہا۔

”اور پاسپورٹ، ویزا... اس میں وقت لگ سکتا
 ہے۔ حالانکہ تمہارا کیس ارجنٹ ویزے کی منظوری کے لیے

”یہ رپورٹ آگئی ہے انڈیا سے اور جانے کا کچھ انتظام نہیں ہوا ہے۔“

”ابھی بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ میرا بھوک سے دماغ کام نہیں کر رہا۔“ اس نے ایک چائیز ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔

اس وقت وہاں پر سناٹا تھا۔ نیم تاریک ماحول میں ان کے علاوہ ایک اور جوڑا دوسرے کونے میں سر جوڑے بیٹھا تھا۔ ویٹریا کسی اور کی طرف دیکھے بغیر وہ ایک دوسرے کو بھی کھلا رہے تھے۔ کیا یہ بھی میاں بیوی نہیں ہوں گے؟ شیمہ نے سوچا۔

”اب بتاؤ، مکان کی بات کی؟“ شیمہ نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا۔

ویٹرنے منزل وائر کی ٹھنڈی بوتل کے ساتھ مینو کارڈ درمیان میں رکھ دیا۔ حامد نے سکون سے ایک گلاس پانی پیا اور پھر بولا۔ ”دس لاکھ سے زیادہ نہیں ملیں گے۔“

”مجھے دس لاکھ فوراً چاہئیں اب۔۔۔ اور کل تمہیں میرے ساتھ اسلام آباد جانا ہے، ویزا لینے کے لیے۔“

حامد اسے دیکھتا رہا۔ ”چار فیصد ماہانہ سود ہوگا۔“

”چار فیصد۔۔۔ یعنی اڑتالیس فیصد سالانہ۔۔۔ دس کے پندرہ واپس کرنے پڑیں گے، ایک سال میں۔“

”زیادہ، یہ سو در سو ہے، ہر ماہ چالیس ہزار نہ دیے تو وہ اصل میں شامل ہو جائیں گے۔ کیے دو گی تم؟“

”حامد دفع کرو مکان کو۔۔۔ واپس آ کے کرائے کا مکان لے لیں گے۔“ دس ہزار میں تین بیڈ کا فلیٹ مل جائے گا۔“

حامد نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”میں اور تم احمد صاحب کی انیکسی میں رہ سکتے تھے خیر۔۔۔“ اس نے ویٹرنے کو آرڈر لکھوایا۔

”اب یہ تو مجبوری ہے، میں ماں باپ کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟“

”نہیں، وہ میری بھی ذمے داری ہیں اور آمدنی اتنی کم بھی نہیں میری۔۔۔ احمد صاحب نے اضافے کا وعدہ کیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ ذمے داریاں بڑھ جائیں گی تمہاری۔۔۔ یہ رپورٹ میں نے کل ہی دیکھ لی تھی۔ تمہیں ڈاکٹر نے کیا بتایا آج؟“

”کوئی نئی بات نہیں۔ وہی جو پہلے کہا لیکن یہ کہا کہ دیر مت کرو، کیوں؟“

ویٹرنے ان کے درمیان سوپ رکھ دیا۔ ”کچھ نہیں،

میرے ساتھ بھی ایک ڈاکٹر تھا۔ میرا سابق کلاس فیلو۔۔۔ اس نے زیادہ تفصیل سے ڈسکس کیا۔“

”اسے کوئی نئی بات معلوم ہوئی؟“

”نئی تو نہیں۔۔۔ لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ڈاکٹر تمہیں ضرورت سے زیادہ امید دلا رہا ہے۔“

وہ چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ شفا یابی کے امکانات بہت کم ہیں۔ وہ تمہیں کہہ رہا ہے کہ تمہارے والد مکمل طور پر صحت یاب ہو کے لوٹیں گے۔ ایسا نہیں ہے۔“ حامد بولا۔ ”سوپ پیٹی رہو۔“

”اور تمہارے اس دوست سے اس نے کچھ اور کہا؟“

حامد نے اقرار میں سر ہلایا، وہاں ان کی بحث کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ وقتی طور پر افاقہ ہوگا اور تمہارے والد بظاہر نارمل ہو جائیں گے تین ماہ میں۔۔۔ لیکن ایک تو یہ تین مہینے انتہائی احتیاط کے ہیں اور نہ صرف یہ کہ دوائیں جاری رہیں گی بلکہ ان کو یہاں کے کسی ماہر ڈاکٹر سے ہفتہ وار چیک اپ کرانا ہوگا۔ وہ صرف آغا خان اسپتال میں ممکن ہے۔ اندازہ ہے کہ اس پر ماہانہ خرچ ہزاروں میں ہوگا۔“

شیمہ نے کھانا چھوڑ دیا۔ ”یہ سب ڈاکٹر نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”ڈاکٹر کسی کو مایوس نہیں کرتے، خصوصاً قریبی رشتہ رکھنے والوں کو پُر امید رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔“

وہ چلائی۔ ”آخر کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

اس نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ ”فار ہیون سیک۔۔۔ ہم ریسٹورنٹ میں ہیں۔“

”مجھے صاف بتاؤ، اور کیا کہا ڈاکٹر نے؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”صاف بات یہ ہے شیمہ کہ تمہارے والد کے اس طویل اور مہنگے علاج کے بعد ان کے مکمل شفا یاب ہونے اور ایک نارمل زندگی گزارنے کے چانس بہت کم ہیں۔ خرچ تو تمہارا ہو رہا ہے ڈاکٹر کو کیا؟“

”ہاں ڈاکٹر کو کیا، ظاہر ہے والد بھی وہ میرے ہیں۔ تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم بھی اس علاج کے حق میں نہیں، لیکن حامد! میں کسی کی مدد یا سہارے کی محتاج نہیں ہوں۔ امکانات ایک فیصد ہوں گے تب بھی میں کوشش ترک نہیں کروں گی۔“ وہ رونے لگی۔

”چلو ہم باہر چل کے بات کرتے ہیں۔ تم یہاں تماشا

دیکھو، وہ روتی ہوئی ہے۔“

”چلو ہم باہر چل کے بات کرتے ہیں۔ تم یہاں تماشا

مجرم نہیں ہے۔ دکالت کا پیشہ چلتا ہی جھوٹ پر ہے۔ گواہ کیوں منحرف ہوتے ہیں؟ قبیلہ مک مک کیوں کرتی ہے۔ ظاہر ہے دمھکی سے... یہ جج بھی جانتا ہے۔“

وہ دم بخود اس کی باتیں سنتی رہی۔ ”خدا کے لیے، باپ کو احمق ثابت کر چکے، اب کیا ماں کی باری ہے؟“

”اگر میرا باپ اس روز ڈی آئی جی کو انکار نہ کرتا، تو کیا میری ماں خوار ہوتی؟ اس خود غرض آدمی نے کسی کا خیال نہیں کیا سوائے اپنے اصولوں کی پاسداری کے... میں آج احمد صاحب کے سرورٹ کو آرٹ میں نہ ہوتا۔ ہماری ایک کنال کی کٹھی ہوتی گلبرگ میں... مگر اس نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ تم ماں کا کہتی ہو تو مجھے کہنے میں شرم آئے نہ آئے... حقیقت تو اپنی جگہ رہتی ہے۔ دوسروں کو چھوڑ دو... آخر وہ سمجھتی کیا تھی خود کو... گارمنٹس فیکٹریوں میں ہی کیا دنیا میں جو کچھ لاوارث رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس کو وہ ختم کر سکتی تھی؟“

شیمانے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”پھر وہ کیا کرتی؟ بھوکے بھیڑیوں کو اجازت دیتی...“

”ڈائلاگ مت مارو، چلو نیچے والوں پر لعنت بھیجو...“ فیکری دوسری بیوی بننے میں اس کا کیا نقصان تھا؟ نقصان میں ہمیشہ پہلی بیوی رہتی ہے۔ نئی بیوی تو غلام بنا کے رکھتی ہے شوہر کو... اگر وہ بے وقوف نہ ہو۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس نے کیا فائدہ اٹھایا قدرت کے اس تحفے سے... خوب صورتی کیا ہر ایک کو ملتی ہے؟ اگر وہ عقل سے کام لیتی تو مالک پر ڈورے ڈالتی۔ نکالا جاتا فیکری... وہ فیکری کی مالک بن سکتی تھی۔ وہ بھی اخلاق اور شرافت کے چکر میں پڑی رہی، جذباتی بے وقوفی۔“

شیمانے ایک دم اٹھی اور باہر نکل گئی۔ حامد میز پر ہزار کا نوٹ چھوڑ کے اس کے پیچھے لپکا۔ گاڑی تک پہنچنے سے پہلے اس نے شیمانے کو جالیا۔ ”یہی خطرہ تھا مجھے... تم ہسٹریا کا شکار ہو رہی ہو بلا وجہ... ورنہ تم سے میں نے کچھ نہیں کہا۔ بیٹھو ورنہ میں کسی کی پروا کیے بغیر پکڑ کے بٹھا دوں گا۔“

شیمانے احتجاجی انداز میں بیٹھ گئی۔ ”مجھے گھر چھوڑ دو اور پلیز جتنا تم کر سکتے تھے کر دیا۔ باقی میں خود کر لوں گی، تمہاری مدد کے بغیر...“

دس منٹ کی خاموش ڈرائیونگ کے بعد اس نے کہا۔ ”احمد صاحب آگئے ہیں ہم کل نکاح کر سکتے ہیں۔“

وہ چپ رہی۔ اس کے جذبات کا دھارا دوسری سمت میں بہنے لگا تھا۔ نکاح اب اس کی ضرورت نہیں، مجبوری بن

بنارہی ہو۔“

”نہیں، اب ہمارے سوا یہاں کوئی نہیں۔ تم بات کرو۔“ شیمانے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

”اوکے، جو بات ایک غیر جذباتی حقیقت ہے، اس پر یہ جذباتی رد عمل خود اپنے ہیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے، تم کسی مداخلت اور ہسٹریا کے بغیر میری بات سن سکتی ہو تو میں آگے بولوں۔“

”بولو، مجھے اندازہ تو ہو گیا ہے کہ تم کیا کہو گے۔“ وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”شیمانے، زندگی کے حقائق کسی جذباتی مظاہرے سے بدلتے نہیں۔ پہلے میں اپنے باپ کی بات کرتا ہوں۔ ایک باپ... یا شوہر کی حیثیت سے وہ کتنے بھی اچھے ہوں، کاروباری طور پر وہ اتنے کم عقل تھے کہ انہوں نے محض اپنے جذباتی رد عمل پر اپنی جان گنوائی۔“

وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔ ”تم اپنے باپ کو بے وقوف کہہ رہے ہو؟“

”ہاں، جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے فائدے کے ساتھ جان گنوانے والا ہر شخص بے وقوف ہی تو ہے، ان کی جگہ میں ہوتا تو اس انتہائی منافع بخش آرڈر سے انکار نہ کرتا صرف اس لیے کہ جو کام پہلے لیا ہے، وہ پہلے کرنا ہے... ایک لاکھ کے منافع پر وعدہ نبھانے کے لیے دس لاکھ چھوڑے، وہ ایک لاکھ والے کو صاف بتا دیتا کہ کام کسی اور سے کرائے... اس سے کیا ہوتا؟ وہ واویلا کرتا، لیکن رو پیٹ کے چلا جاتا۔ اس نے ڈی آئی جی پولیس کو انکار کیا اور اپنی جان گنوائی، اس کا کام کر دیتا تو منافع کے ساتھ آئندہ کے راستے کھل جاتے۔ اسے مزید ایسے ہی ٹھیکے ملتے۔ وہ اپنا کارخانہ بنا لیتا۔ اس کی حمایت میں ہنگامہ کرنے والوں کو کیا ملا؟ بعد میں ایک ایک کر کے پولیس نے سب کے دماغ درست کر دیے ہوں گے۔“

”اومامی گاڈ، آج بیٹا اپنے باپ کو بے وقوف ثابت کر رہا ہے۔ دعائے مغفرت کے بجائے۔“

”دیکھو، جذبات اور حقائق متضاد باتیں ہیں۔ یہ حرام حلال، جائز ناجائز... ان کا پیسے سے کیا تعلق۔ بلیک اور وائٹ منی میں کون فرق بتا سکتا ہے۔ نوٹ سب ایک جیسے ہوتے ہیں کیا میں عدالت میں جا کے سچ بول سکتا ہوں۔ میں ہی کیا احمد صاحب بھی... کہ جناب حقیقت تو یہی ہے کہ ملزم نے قتل کیا ہے مگر اس نے مجھے دس لاکھ دیے ہیں اور پانچ لاکھ پولیس کو کھلائے ہیں تو ہم ثابت کریں گے کہ وہ

کے مکان کی قیمت دیتے ہیں۔ ان کے تہ خانوں اور تجوریوں میں پیسایوں بھرا رہتا ہے جیسے آڑھتی کے گودام میں چاول... وہ چوبیس گھنٹے بینکنگ جاری رکھتے ہیں... ہنڈی کا سارا کاروبار وقت دیکھے بغیر ہوتا ہے۔ یہاں دن ہے تو امریکا میں رات... تم چلو اور دس لاکھ لے لو ابھی۔“

”یعنی اگر ہم صبح جائیں... تو ادائیگی ہو جائے گی۔ ابھی تو بینک بند ہیں۔ وہ مجھ سے کیا لیں گے؟“

”اس گھر کی خرید و فروخت کی دستاویزات... رسیدیں اور اسٹامپ پیپر... جن سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ تم ہی اس جگہ کی مالک ہو۔ عدالت میں ان کی قانونی حیثیت کچھ نہیں۔ اور لیگل پیپر پر تم سائن کر کے دو گی کہ تم نے یہ جگہ گروی رکھی ہے۔ رقم کا ذکر ہوگا اور ماہانہ شرح منافع کا... سود کا لفظ حرام ہے۔ قرض کی رقم کے علاوہ واپسی کی مدت ہوگی اور یہ کہ مقررہ مدت میں تم اصل رقم اور منافع ادا نہ کرنے کی صورت اس جگہ کی مالک نہیں رہو گی۔“

شیمہ کا چہرہ اتر گیا۔ ہاں، یہ تو ہوگا لیکن کیا وہ مجھے قانونی وارث مان لیں گے؟“

”شیمہ ڈارلنگ، قانون کی بات مت کرو۔ یہ سب غیر قانونی بد معاشی کے زور پر چلنے والا دھندا ہے۔ پیسا دینے والے وصولی کے لیے کسی عدالت میں نہیں جاتے۔ وہ خود چار چھ مسلح افراد کے ساتھ آتے ہیں، مقروض اور اس کی فیملی سمیت اسے اٹھا کے باہر پھینک دیتے کہ جاؤ قانون کا دروازہ کھٹکناؤ اور گھر پر قابض ہو جائیں گے۔“

شیمہ نے موضوع بدل دینا بہتر سمجھا۔ ”چلو یہ سب بعد کی بات ہے۔ پہلا کام ویزا لینا ہے اسلام آباد سے، تم میرے ساتھ چلو گے نا؟“

”کیوں نہیں۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا درمیان کے دو دنوں میں جب عدالتوں میں بھی تعطیل ہوگی، وہ نکاح ہو سکتا ہے جس کا وعدہ احمد صاحب نے کیا تھا۔ ایک فطری جھجک کے ساتھ اب اسے خود سے شرم آتی تھی کہ شبِ عروسی کے بعد نکاح پر اصرار کس درجہ معیہ کنیزی کی بات ہے اور کتنی بے معنی... اگر وہ پلٹ کے کہہ دے کہ یار کیا جلدی ہے اب... دو بول کبھی بھی پڑھو لیں گے کسی سے بھی... ابھی ضد اور اصرار کا وقت بھی نہیں آیا تھا۔ بس اپنی تمام خودداری اور قوت ارادی کے قتل کے جرم میں اپنی شراکت کا رسوا کن احساس ایسا تھا کہ وہ خود سے بھی نظر نہیں ملا سکتی تھی۔

رات کو اس نے پھر موبائل فون کی ٹیون سنی اور اس

گیا تھا۔ خود اپنی کمزوری کے گناہ کی پردہ پوشی اور دل کے اطمینان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ حامد کی بیوی بن جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ حامد کے کسی بچے کی ماں بنے۔ حامد نے بڑی ہوشیاری سے ترب کا پتا چلا تھا اور بازی پلٹ دی تھی۔ چنانچہ جب اس نے کلفٹن کا رخ کیا تو نہ چاہنے کے باوجود وہ انکار نہ کر سکی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ حامد ابھی تک نکاح کے وعدے پر قائم ہے ورنہ شیمہ کی جذباتی کمزوری پر الزام دھر کے وہ رسی تڑا سکتا تھا کہ ایسی کمزور کردار کی لڑکی پر میں کیسے بھروسہ کر سکتا ہوں کہ وہ میری وقادار رہے گی۔

کلفٹن پہنچتے پہنچتے شیمہ نے خود سے مفاہمت کر لی تھی۔ اگر آج وہ اپنے ماں باپ کو بے وقوفی کے جذباتی فیصلوں کا ذمے دار قرار دے رہا تھا تو یہ غیر اخلاقی بات تھی مگر وہ ایسا سمجھتا تھا تو اس نے شیمہ کے سامنے حد درجہ صاف گوئی سے کام لیا تھا منافقت نہیں کی تھی۔ وہ حامد کی اس بات سے کیسے اختلاف کر سکتی تھی کہ وکیل فیس لے کر قاتل کو بے گناہ ثابت کرتے ہیں اور بھانسی کا پھندا محض جرمِ غریبی کے باعث کسی بے گناہ کے گلے میں پڑ جاتا ہے۔ یہ تو فطرت کا اصول ہے۔ SURVIVAL OF THE FITTEST... ہے جرمِ ضعیفی کی سزا کرک مناجات... اس کا دماغ کنفیوژن کا شکار تھا۔ ماحول، معاشرے، کتابوں اور والدین کی تربیت اس کے برعکس تھی۔

وہ ایک شیشے کی دیوار والے کافی ہاؤس سے خاموش سمندر کو متحرک دیکھتی رہی۔ اس کا سارا شور شیشے سے گزر کے اندر کے پرسکون انٹرکنڈیشنڈ ماحول پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔

”آئی ایم سوری... بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔“ اس نے بالآخر خاموشی کو توڑا اور اپنا ہاتھ شیمہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”تم میرے ساتھ اسلام آباد چل رہے ہو یا نہیں؟“ شیمہ نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

”اگر کل پرسوں نکاح ہو جائے تو آگے دو چھٹیاں ہیں ہفتہ اتوار... ہم پیر کو جا سکتے ہیں۔“

”چار دن بعد... لیکن اس دوران میں رقم مل جائے...“

”رقم مل سکتی ہے ابھی... ایک گھنٹے میں۔“ وہ بولا۔

”مگر بینک تو بند ہو چکے۔“

وہ ہنسا۔ ”بے وقوف لڑکی، جو اس طرح گروی رکھ

امریکا جاتے۔“

”اب میں کیا کہوں تجھے... سامنے ہوتا تو تھپڑ لگاتا۔ میں تو کمالے سے بھی کچھ نہیں کہہ سکا لیکن اب میری بات سن... جو میں کہوں گا تو وہی کرے گی۔ ورنہ امریکا کوئی آسان پر نہیں ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا خود... تو سن رہی ہے نا؟“

”جی تایاجی۔“

”انڈیا پر بھیج لعنت، لندن آجا... پاسپورٹ ہیں سب کے؟“

”جی... خیال تھا کہ پیر کو اسلام آباد جا کے انڈین ایمبیسی میں ویزے کے لیے جمع کرادوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں، میں نے اسپتال والوں سے بات کی تھی۔ میں نے کیا احسن نے کی تھی۔“

”کون احسن؟“ شیمہ کے منہ سے نکل گیا مگر اس کے ساتھ ہی یاد آ گیا کہ وہ تایاجی کا بڑا بیٹا تھا۔

”احسن؟ احسن نہیں یاد تجھے... ارے وہ تیرا کزن ہے... میرا بڑا بیٹا... وہ لندن میں ہے۔“

”احسن لندن میں ہے؟ آپ کے ساتھ نہیں ہے؟“

”میرے ساتھ احسن ہے۔ چھوٹا والا۔ اس کا اچھا بزنس چل رہا ہے۔ احسن ڈاکٹر ہے۔ لندن سے ایف آر سی ایس کر کے اب وہیں کے ایک اسپتال میں ہے دو سال سے... احسن نے اسپتال کے ڈاکٹرز سے سب پوچھا۔

کیس ہسٹری دیکھی کمپیوٹر پر اور مجھے بتایا۔“

”پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے آپ؟“

”دیکھنا چاہتا تھا کہ تو کتنا جھوٹ بول سکتی ہے۔ اب جو میں کہہ رہا ہوں غور سے سن۔ کمالے کا علاج لندن میں ہو گا۔ تو انڈین ایمبیسی نہیں برٹش ایمبیسی جا کے ویزے کے لیے پاسپورٹ جمع کرا... بلکہ کراچی میں تو ان کا کنسلٹ

ہے۔“

”جی تایاجی ہے مگر...“

”اگر مگر کچھ نہیں۔ میں سب کے اوپن ٹکٹ بھیج رہا ہوں۔ باقی سب احسن کر لے گا۔ یہ اس کا شعبہ نہیں مگر وہ

بہت اچھے اسپتال میں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انڈیا سے بہتر علاج ہو جائے گا۔“

”اباجی ٹھیک ہو جائیں گے نا؟“

”دیکھ پتر! ڈاکٹر کوشش کرتے ہیں زندگی موت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے دعا کرنی چاہیے اور شفا کی امید کے ساتھ کوشش پوی کرنی چاہیے۔ میری بات سمجھ آگئی

نے سوچا کہ وہ نظر انداز کر دے۔ کون ہو گا اس وقت حامد کے سوا اور کیا کہے گا وہ اس کے سوا کہ دروازہ کھول دو، میں باہر کھڑا ہوں اور وہ کسی سسٹمز کے ہوئے غلام کی طرح تعمیل کرے گی۔ لیکن ایک خیال یہ بھی تھا کہ فون کہیں اسپتال سے اس کی ماں نے نہ کیا ہو۔ اس نے روشن اسکرین پر جو نمبر دیکھا، وہ بالکل اجنبی تھا۔ شاید رائٹ نمبر تھا۔

پھر بھی اس نے پوچھ لیا۔ ”ہیلو۔“

دوسری طرف سے ایک بھاری بھر کم سنجیدہ آواز میں سوال کیا گیا۔ ”کون بول رہا ہے؟ شکمہ...“

”جی... جی... آپ کون ہیں؟“

”جمال دین... جانتی ہوتا مجھے...“

اس کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ ”تایاجی... السلام علیکم...“ وہ محتاط ہو کے بولی۔

”ہاں، مجھے کمال کی بیماری کا پتا چلا، بہت دیر سے۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“

”تم نے نہیں بتایا۔“ وہ خفگی سے بولا۔ ”خود کمالے نے فون کیا مجھے... آج کچھ دیر پہلے... وہ رورہا تھا۔ کہنے لگا بھائی جی کہا سنا معاف کر دیں... پتا نہیں پھر موقع ملے نہ

ملے۔ شکایت بھی کر رہا تھا کہ آپ بھول گئے مجھے... میں نے کہا بھول گئے تھے... مگر تو نہیں گئے تھے۔ تو نے خبر لی کبھی... میری بات مانی کبھی... کھانا کہا تھا کہ سعودی عرب

آجا۔ آج میرے ساتھ ہوتا... خیر پھر میں نے اس سے سب پوچھا۔ وہ بولا کہ مجھے صرف یہ پتا ہے کہ جگر کا مسئلہ

ہے اور آپریشن کے لیے شیمہ انڈیا لے جائے گی اور کچھ نہیں معلوم... سب چھپاتے ہیں مجھ سے... ڈاکٹر بھی اور شیمہ

بھی... میں نے پوچھا کہ تیری بیوی کو تو پتا ہو گا۔ تو وہ بولا کہ جب مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا تو وہ اللہ میاں کی گائے... پھر

میں نے اس سے تمہارا نمبر لیا... وہ کہہ رہا تھا کہ بی اے کر لیا ہے تم نے...“

”بس ہو جائے گا اسی مہینے... رزلٹ آنے والا ہے۔“

”اچھا مجھے بتاؤ، یہ کیا مسئلہ ہے جو پاکستان کے ڈاکٹر اور بڑے بڑے اسپتالوں کے بس کا نہیں۔“

”لیور ٹرانسپلانٹ ہو گا تایاجی، یہاں نہیں ہو سکتا۔“

”مگر اس کے لیے انڈیا کیوں؟“

”وہ سستا ہے تایاجی... دس لاکھ میں سب ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ نہیں تھے ہمارے پاس ورنہ برطانیہ اور

ہے نا، یا میں خود آؤں؟“

”میں اباجی سے بات کر لوں...“

”کیا بات کر لوں؟“ مردہ بدست زندہ... سب کچھ تو کر رہی ہے اپنی مرضی سے... وہ تو انڈیا بھی نہیں جانا چاہتا۔ وہ بالکل انکار نہیں کرے گا۔ کرے تو مجھے بتانا... کمالے نے کہا کہ تو نے گھر بیچا ہے علاج کے لیے؟“

”ابھی بیچا تو نہیں تایا... مگر بیچنا پڑے گا۔ علاج کے لیے پیسا تو چاہیے۔ انڈیا میں ہو یا لندن میں۔“

”جب ایک بار سمجھا دیا کہ سب ہو جائے گا تو اخراجات کی ذمہ داری سب میری... اور اس معاملے میں تیرا بولنے کا حق نہیں بنتا۔ میں جو کروں گا اپنے چھوٹے بھائی کے لیے کروں گا۔ تیری اجازت سے نہیں کروں گا اپنی مرضی سے کروں گا۔ ٹھیک ہے اب تک دوری تھی مگر کیا اس سے رشتہ ختم ہوتا ہے۔ میں بڑا ہوں تیرے باپ سے... تجھے بھی میرا حکم ماننا پڑے گا بلا چون و چرا... آئی بات سمجھ میں۔“

وہ دو گھنٹے بات کرتا رہا۔ درمیان میں اس کا فون کارڈ کئی بار ختم ہوا۔ لائن کٹ جاتی تھی اور تھوڑی دیر بعد پھر کال آ جاتی تھی۔ جمال دین نے بتا دیا تھا کہ ایسا ہوگا۔ وہ کمال دین کے مرض کی ساری تفصیل پوچھتا رہا۔ اس کے کہنے کے مطابق اسپتال میں بھر جائی سے یہ سب باتیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے شیما کے بھائیوں کا پوچھا۔ شیما نے ان کی فیملی کا حال دریافت کیا۔ تایا نے بہت سی دعائیں دے کر فون بند کیا تو وال کلاک میں رات کے دو بج رہے تھے۔ فیکس اس میں پچھلے دن کی شام کے چار بجے تھے۔ لندن میں رات کے نو... سب زمین کی گردش ہے جو وقت بن جاتی ہے۔ گردش رنگ چمن ہے ماہ و سال عند لیب... جو کچھ شیما کے کانوں نے سنا تھا خواب کی گفتگو جیسا لگتا تھا۔ اچانک وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ جیسے اس کے سر پر ایک پہاڑ جتنی چٹان تھی۔ وہ اٹھا کے کسی نے اس کی جگہ گلاب کا پھول رکھ دیا سو۔ ایک سوال وال کلاک کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ کیا سچ سچ یہ سب ہو گیا ہے؟ جو میں نے سنا سچ تھا۔ حقیقت تھی، خواب نہیں تھا۔

دونوں بھائیوں کے درمیان آخری ملاقات دس سال پہلے ہوئی تھی جب بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو نیپل کے ساتھ حج کے لیے بلایا تھا۔ ان کے درمیان رابطہ جمال دین کے امریکا جانے کے بعد تنک رہا تھا۔ اب چھ سات سال سے کسی کو دوسرے کی خبر نہ تھی لیکن یہ بہت زیادہ پرانی بات

نہ تھی۔ شیما آج بھی اپنے تایا کی بیوی اور دونوں بچوں کے چہرے تصور میں دیکھ سکتی تھی اور اسے یقین تھا کہ ان سے سامنا ہوگا تو کسی کو بھی شناخت میں دشواری نہیں ہوگی۔ جو فرق کمال دین اور جمال دین میں تھا وہی شیما کے دونوں تایا زاد بھائیوں میں بھی تھا۔ بڑا زیادہ شرارتی لڑاکا اور ضدی تھا۔ اس کے مقابلے میں محسن للو تھا۔ وہ احسن کے ساتھ مل کے آئے دن اسے اپنی شرارتوں سے تنگ کرتے تھے۔ تایا کے ساتھ والے گھر میں شیدا قصاب رہتا تھا۔ دونوں گھروں کو جدا کرنے والی دیوار پہلے آٹھ فٹ اونچی تھی۔ اس دیوار کے دوسری طرف آم کا درخت تھا۔ جب اس پر آم پک جاتے تھے تو شیدا ہر آم پر نظر رکھتا تھا۔ احسن اور شیما مل کے محسن کو اوپر اٹھاتے تھے اور وہ دیوار پر چڑھ کے وہ سارے آم توڑ لیتا تھا جو اس کی دسترس میں ہوں۔ شیدے نے دیوار کو دو فٹ اونچا کر لیا تو احسن نے ایک سیڑھی ایجاد کی۔ اس نے دو بانس حاصل کیے۔ پھر لکڑی کے دو فٹ لمبے ٹکڑے لایا اور ان کو بانسوں کے ساتھ باندھ دیا۔ رات کو انہوں نے یہ سیڑھی استعمال کی اور محسن کو آٹھ فٹ اونچی دیوار پر چڑھا دیا۔ آم توڑ کے وہ نیچے اتر آیا تو سیڑھی کے بانس اور انہیں ملانے والے ڈنڈے کھول کے ادھر ادھر ڈال دیے گئے۔ یہ سیڑھی ہر رات جوڑی جاتی۔ احسن اس کام میں ماہر ہو گیا تھا۔ اس نے بانسوں پر کیل ٹھوک کے رسی سے بندھے ڈنڈوں کو سلپ ہونے کا خطرہ بھی دور کر دیا تھا۔

شیدے کی نظر نے چاروں میں تاڑ لیا کہ آم رات کو غائب ہو رہے ہیں اور ایک رات محسن کو اس وقت پکڑ لیا جب وہ آم کی شاخوں پر کھڑا اوپر والے آم توڑ رہا تھا۔ اس نے نیچے سے ٹارچ لائٹ ڈالی اور محسن کو پکڑ لیا۔ احسن اور شیما اپنی سیڑھی اٹھا کے بھاگ لیے۔ دو منٹ میں احسن نے دونوں بانس الگ کیے۔ ایک کو محسن کے ایک حصے میں ڈالا اور دوسرے کو بیس فٹ دور گھر کی دیوار کے سائے میں۔ ان کے دو فٹ لمبے ٹکڑے محسن میں ادھر ادھر بکھیر کے وہ دونوں غائب ہو گئے اور اندر جا کے لیٹ گئے۔ محسن نے پہلے شیدے سے مار کھائی۔ پھر اپنے ابا سے... وہ چادر میں منہ چھپائے کھی کھی کرتے رہے۔

تو احسن اب سرجن ہو گیا ہے۔ ایف آر سی ایس کر کے اسپیشلسٹ بن گیا ہے اور لندن میں ہے۔ اس نے نہ جانے کس سے یہ سنا تھا کہ ان کی بڑا ہونے کے بعد شادی کر دی جائے گی تو شیما نے بہت شور کیا تھا کہ میں اس کلو سے

آباد جا کے ویزا لینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں برٹش کونسل میں ہی کام ہو جائے گا۔ ڈاکٹر احسن کو سب معلوم ہے پوری کیس ہسٹری کا پتا ہے۔ وہ یہاں کے ڈاکٹروں سے بات بھی کر چکے ہیں۔“

”تو نے تایا جی سے احسن کا فون نمبر نہیں لیا؟“

”وہ تو مل ہی جائے گا۔ یہاں کے ڈاکٹر کو بھی پتا ہو گا۔“ شیمہ کا دل امید سے روشن ہو رہا تھا۔

”تو نے دیکھا ہیروشیمہ، نبھانے والے خون کے رشتوں کی آبرو کیسے نبھاتے ہیں۔ بات تو ساری رل کی ہوتی ہے۔ بڑے بھائی بھی ایسے ہوتے ہیں کہ باپ کی جگہ... اور نہ ہوں تو سگی اولاد نہ پہچانے... ان سے غیر اچھے... پتا نہیں ایک جیسے نظر آنے والے انسانوں کے دلوں میں اتنا فرق کیسے آ جاتا ہے۔ گوروں کے دلس میں جا کے بسنے سے تیرے تایا کا خون تو سفید نہیں ہوا۔“

وہ بھائی کے لیے سخت جذباتی ہو رہا تھا اور شیمہ کا ذہن حامد کی طرف چلا گیا تھا۔ واقعی ساری بات تو دل کی ہوتی ہے۔ کیسی بے حسی کے ساتھ وہ اپنے اصول پرست باپ کو بے وقوف ثابت کر رہا تھا اور اپنی عزت دار ماں کی جدوجہد کو اس کی کم عقلی ثابت کر رہا تھا۔ وہ اس باپ کے لیے مغفرت کی دعا کیسے کرے گا جس کی نادانی نے وہ موقع گنوا دیا جب خوش نصیبی نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی مگر وہ اصول کی بات کرتا رہا کہ جس کا آرڈر پہلے لیا تھا، اس کا کام پہلے کرے گا اور ملا کیا اس سے ذلت کی پر تشدد موت کے سوا۔ اس نے وہ موقع گنوا دیا جب وہ ڈی آئی جی کی مدد سے فرنیچر سپلائی کے ٹیکے لے سکتا تھا۔ اسے تو غرور ہونا چاہیے تھا اس ماں پر جو اپنی عزت کو جو اس کے شوہر کی امانت تھی کسی کے ہاتھوں بیچنے پر راضی نہ ہوئی۔ حامد کو افسوس تھا کہ اس نے اپنے حسن و شباب سے فائدہ نہیں اٹھایا ورنہ آج وہ گارمنٹس فیکٹری کا مالک ہوتا۔

اسے حامد کی ذہنیت پر افسوس ہونے لگا۔ یہ احساس محرومی نہیں تھا۔ یہ ضمیر فردشی جیسی بے غیرتی تھی اگر اس کی ماں نے خود کو بیچ دیا ہوتا تو اسے وہ عقل مندی کہتا۔ وہ ایک ہائی کلاس طوائف بن کے کوٹھی کاکیش سب حاصل کر لیتی تو بیٹا اسے ماں کی ذہانت سمجھتا۔ کیسی عجیب سوچ تھی اس کی جس کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ صرف معاشیات کی زبان سمجھتا تھا۔

اس کی ماں نے شیمہ کا بازو ہلایا۔ ”ابا نے پوچھا ہے کچھ... تو کہاں کس خیال میں گم ہے؟“

شادی نہیں کر سکتی۔ وہ سب کو مارتا ہے۔ مجھے بھی مارے گا اور یہ ارادہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ اسے تو شاہ رخ خان پسند ہے۔ بات ہنسی مذاق میں ٹل گئی تھی۔ بلاشبہ احسن کا رنگ گہرا سانولا اپنے باپ جیسا تھا اور نازک بدن محسن اپنی ماں پر گیا تھا۔

ناشنا بنا کے اس نے ٹی وی کھولا تو اسے بی اے کے نتائج کے اعلان کی خبر ملی۔ وہ ناشتا چھوڑ کے اخبار کی تلاش میں نکلی اور جب تک اسے اپنا رول نمبر نظر نہیں آ گیا، اس کے حواس گم رہے۔ اس نے تھرڈ کلاس کی فہرست سے شروع کیا تھا۔ سیکنڈ کلاس میں بھی رول نمبر نہ ملا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ اسے اپنے قلم ہو جانے میں کوئی شک نہ رہا۔ فرسٹ کلاس میں نام ہونے کا سوال ہی نہیں تھا مگر کسی خاص کوشش کے بغیر اسے مختصر فہرست میں اپنا رول نمبر نظر آیا تو وہ جیسے بھک سے راکٹ کی طرح اڑ گئی۔ بے یقینی دور کرنے کے لیے اس نے آنکھیں مل مل کے ایک ایک عدد کو کئی کئی بار چیک کیا اور جب بالآخر اسے یقین آ گیا کہ اس نے فرسٹ کلاس لی ہے تو وہ اسپتال بھاگی۔

کمال دین بیٹی کا سر سینے پر رکھ کے روتا رہا۔ شیمہ کی خاموش طبع صابر و شاکر ماں بار بار ”لکھ لکھ شکر ہے تیرا مرے ربا“ کی گردان کرتی رہی اور دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کے کونے صاف کرتی رہی جہاں سے آنسو خود بخود خاموشی سے پھوٹ رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مٹھائی لے گئی تھی۔ کمال دین نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دل کھول کے مٹھائی کھائی اور ساتھ ہی اس کو دعائیں دیتا رہا۔ کچھ پرسکون ہو جانے کے بعد بالآخر شیمہ کے ہونٹوں پر سوال آ گیا۔ ”آپ کی تایا جی سے بات ہوئی تھی؟“

کمال نے اعتراف میں سر ہلایا۔ ”بڑا بھائی ہے وہ میرا۔“

”کل رات انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔“ شیمہ نے کہا اور پھر ان سے ہونے والی ساری گفتگو سنادی۔

خوشی سے کمال دین کا چہرہ تہمتا رہا۔ وہ ”اچھا؟ یہ کہا انہوں نے... پھر“ کے الفاظ بار بار دہراتا رہا۔

”وہ میری ایک سننے پر راضی نہیں ہے۔“

”انہوں نے بتایا کہ احسن بہت بڑا ڈاکٹر بن گیا ہے۔“ کمال دین اپنے خیالات میں نہ جانے کہاں تھا اور کیا دیکھ رہا تھا۔ اس کا خون برسوں بعد جوش مار رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ابھی اڑ کے بھائی کے پاس پہنچ جائے۔

”اب ہم انڈیا نہیں، لندن جائیں گے۔ مجھے اسلام

اس کا باپ ہنس۔ ”بھئی اتنی بڑی کامیابی کے بعد دماغ تو آسمان پر ہی پرواز کرے گا مگر بیٹا میں نے پوچھا تھا کہ وہ نہیں آیا۔ اسے معلوم ہے کہ تو نے کیا تیر مارا ہے؟ اسے تو پہلے بتایا ہوگا تو نے؟“ وہ ہنس۔

شیما کا رنگ بدلا۔ ”نہیں ابا، میں اخبار دیکھ کے سیدھی یہاں آگئی تھی۔ حامد کو نہیں معلوم ابھی... وہ دو بجے تک فارغ ہوتا ہے۔“

وہ احمد صاحب کے آفس میں پہنچ کے حامد کے لیے مخصوص کیمن میں بیٹھ گئی۔ اس کو حامد سے بہت کچھ کہنا تھا۔ رات بھر میں دنیا بدل گئی تھی۔ احمد صاحب کا دوسرا معاون جو کرمنٹل کیس دیکھتا تھا اور ساتھ والے دوسرے کیمن میں بیٹھتا تھا، حامد سے پہلے آگیا۔ اس نے مسکرا کے سر کے اشارے سے شیما کو سلام کیا۔ ”آپ تو بہت خوش نظر آرہی ہیں آج...“ اس نے اخلا قارک کر کہا۔

”جی... وہ دراصل میرا رزلٹ آیا ہے۔ بی اے میں فرسٹ کلاس لی ہے میں نے۔“

”اچھا اچھا، بہت مبارک ہو۔ حامد آنے ہی والا ہو گا۔“

”یہ احمد صاحب کب آرہے ہیں اسلام آباد سے؟“ وہ جاتے جاتے رک گیا۔ ”احمد صاحب تو یہیں ہیں... آج ذرا دیر سے آئیں گے۔“

شیما کو ایک شاک سالگا۔ حامد نے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ حامد صاحب سپریم کورٹ میں کسی کیس کی پیروی کرنے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ وہ آجائیں تو نکاح بھی ہو جائے گا۔ شیما کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا وہ نکاح کو ٹال رہا تھا؟ اسے معلوم تھا کہ سوموار کو شیما ویزے کے لیے اسلام آباد جائے گی۔ درمیان میں دو دن تھے۔ کورٹس بند تھیں، نکاح کے دو بول پڑھوانے کے لیے یہ فرصت کافی تھی۔ وہ شیما کے ساتھ جاتا تو لازمی وہ کسی ہوٹل میں قیام کرتے۔ ویزا کا ملنا ہمیشہ غیر یقینی ہوتا ہے۔ دو دن میں مل جائے یا دو ہفتے لگ جائیں۔ اس کے ساتھ ایک کمراشیئر کیے بنا چارہ نہ ہوتا۔ خود کو مسٹر اور مسز لکھوائے بنا ہوٹل میں ان کی پوزیشن مشکوک ہوتی اور حامد کو تو جیسے اب فائدہ اٹھانے کا اوپن لائنس مل گیا تھا۔

شیما کا چہرہ گرم ہونے لگا۔ انڈیا کے ویزے والی بات تو اب ختم ہوئی۔ اسے یہیں برٹش کونسلٹ سے ویزا مل سکتا ہے مگر کسی بڑی خرابی سے پہلے اسے حامد کو روک دینا چاہیے۔ پہلے بھی وہ ایسی بے دست و پا نہ تھی مگر اب تو اسے

حامد کی مدد کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ ”ارے، تم کب سے آئی بیٹھی ہو؟“ حامد اچانک نمودار ہوا اور اس کے مقابل اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ ”بہت دیر سے، میں کچھ بتانے آئی تھی۔ میں نے بی اے کر لیا ہے اور میری فرسٹ کلاس آئی ہے۔“

حامد نے اسے غور سے دیکھا۔ ”اچھا بھئی مبارک، ایک اچھی خبر میرے پاس بھی ہے تمہارے لیے... ایک شریف آدمی تمہاری پریشانی سن کے بارہ لاکھ دے رہا ہے نقد... وہ چار بجے آئے گا، چلو۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا ہے آج کوئی ارجنٹ معاملہ نہیں ہے میرے پاس۔“

”یہ تو خیر اچھا ہوا لیکن اب ہم کہاں جائیں گے؟“ ”تمہارے گھر... وہ وہیں ادا نیگی کرے گا۔ کاغذات لے گا اور گواہوں کے دستخط لے گا، تمہارے علاوہ۔“

وہ حامد کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ”گواہ کہاں سے آئیں گے، کون ہوں گے؟“

”گھر پہنچ کے سب بتا دوں گا۔“ ”لیکن مجھے تم کو کچھ اور بتانا ہے گھر پہنچنے سے پہلے... کل رات امریکا سے میرے تایا نے فون کیا تھا۔“ وہ بولی اور اس نے گھر پہنچنے تک حامد کو سب بتا دیا۔ وہ سنجیدگی سے سن رہا تھا۔

”یعنی تم انڈیا نہیں، لندن جاؤ گی۔“ ”بس، وہ تین ٹکٹ بھیج رہے ہیں اور لندن کے علاج کا سارا خرچ بھی اٹھائیں گے۔ ان کا بیٹا لندن ہی میں سرجن ہے۔“

”چلو، تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا مگر یہ تایا جی کو اتنے عرصے بعد کیا دورہ پڑ گیا بھائی کی محبت کا؟“ ”تم اسے دورہ کہتے ہو؟ یہ محبت ہے بھائی کی۔ خون کا اثر ہے۔“

”خون؟ مائی فٹ... تم دیکھ لینا اس کے پیچھے بھی ان کی کوئی غرض ہوگی۔“

”فضول بات مت کرو۔ میرا خیال ہے کہ یہ بارہ لاکھ بھی خرچ نہیں ہوں گے۔ مجھے اور امی کو اپنے رہنے کا کوئی انتظام تو کرنا ہی ہو گا اور ضرورت کا پتا نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے واپس آ کے میں قرضہ اتار دوں اور مکان واپس لے لوں۔“

وہ گلی کے آغاز میں سڑک پر گاڑی سے اتری تو اسے اپنے دروازے پر دو افراد نظر آئے۔ ”لو، وہ تو ہم سے بھی

کہ جس دستِ غیب نے باقی انتظام کیا تھا اسی نے آج شیما کو ایک غلط قدم اٹھانے سے روک دیا تھا۔

وہ دونوں پٹھان یا افغانی لگتے تھے مگر بہت شرافت سے بات کر رہے تھے۔ ”مکان تو تمہارا دس سے اوپر کا نہیں ہے مگر اب ہم زبان دے دیا۔“

”میں نے بہت دوز دھوپ کے بعد اتنا اچھا سودا کرنے والوں کو تلاش کیا تھا۔“ حامد نے خفگی سے کہا۔

”خان صاحب۔“ شیما نے کہا۔ ”اب مجھے اتنی رقم کی ضرورت نہیں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے تین لاکھ دے دیں اور دو مہینے بعد ساڑھے تین لے لیں۔“

”اس کے لیے میں شکریہ ادا کر سکتی ہوں تمہارا۔۔۔ لیکن حالات بدل گئے ہیں جس خدا نے اتنا کر دیا ہے، وہ باقی بھی کر ہی دے گا۔ میرا خیال ہے لاکھ دو لاکھ سا تھ رکھ لینا کافی ہوگا۔“

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے نفی میں سر ہلایا۔ ”بی بی، تمہارا مرضی ہے۔ مکان تو ہم پورا لے گا۔ قرضہ ایک کمرے پر نہیں ہوگا۔“

”مانگ لو نا تایاجی سے۔“ وہ طنز سے بولا۔

”بارہ لے لو شیما۔ مکان تو پورا ہی گر دی رکھا جائے گا۔“ حامد نے کہا۔ ”فائل لے آؤ، اپنے دو پڑوسیوں کو بلا لو۔ جو گواہ بن جائیں کہ مکان تمہارے والد کا ہے اور تم ان کی بیٹی ہو۔ تمہارے سوا کوئی وارث نہیں۔ رقم ابھی تم میرے اکاؤنٹ میں رکھوا سکتی ہو۔ تمہارا اپنا اکاؤنٹ تو ہے نہیں۔“

”میں سوچ رہی تھی کہ تم سے مانگ لوں۔ اب یہ مت پوچھنا کہ کس رشتے سے؟“

”بارہ لے لو شیما۔ مکان تو پورا ہی گر دی رکھا جائے گا۔“ حامد نے کہا۔ ”فائل لے آؤ، اپنے دو پڑوسیوں کو بلا لو۔ جو گواہ بن جائیں کہ مکان تمہارے والد کا ہے اور تم ان کی بیٹی ہو۔ تمہارے سوا کوئی وارث نہیں۔ رقم ابھی تم میرے اکاؤنٹ میں رکھوا سکتی ہو۔ تمہارا اپنا اکاؤنٹ تو ہے نہیں۔“

”میں سوچ رہی تھی کہ تم سے مانگ لوں۔ اب یہ مت پوچھنا کہ کس رشتے سے؟“

شیما تذبذب کا شکار ہو گئی۔ آمدورفت اور علاج کے اخراجات کا بندوبست ہو جانے کے بعد اس کے لیے پیسے کی ضرورت بہت کم ہو گئی تھی۔ اب اتفاقیہ اخراجات یا طعام و قیام کا خرچہ رہ گیا تھا۔ احسن بھی تو لندن میں ہی تھا۔ وہاں گھر چھوٹے ہوتے ہیں تو دل بھی چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کی فیملی بھی ہوگی۔ بیوی بچے تو کسی شیما کو نہیں جانتے۔ وہ چاہے یا تایاجی کی ہدایت ہو تب بھی احسن کے گھر میں قیام مشکل ہوگا۔ اسے بارہ لاکھ ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن لاکھ دو لاکھ تو پاس ہونے ضروری تھے۔ اور وہ تایاجی سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ آپ نے اتنا کیا ہے تو باقی بھی کر دیں۔

”اگر تم تین لاکھ کی گاڑی کے لیے ایسا سوچتے ہو تو میں بارہ لاکھ کے گھر کے لیے کیوں نہ سوچوں حامد۔ حامد صاحب تم پر اتنا ٹرسٹ کرتے ہیں، بیٹوں جیسا سمجھتے ہیں، کیا وہ تمہیں تھوڑی سی رقم ادھار نہیں دے سکتے؟“

”کیا سوچ رہی ہو شیما؟“ حامد نے کہا۔

”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں ان سے ادھار نہیں مانگ سکتا۔“ وہ برہمی سے بولا۔

”ہاں، ہمارا ٹائم ضائع مت کرو۔“ قرض دینے والوں میں سے ایک نے کہا۔

”اچھا، وہ تمہارے لیے میرا رشتہ مانگنے آسکتے ہیں۔ تمہیں لاکھ دو لاکھ ادھار بھی نہیں دے سکتے۔ چلو تم مت کرو ان سے بات، میں خود ان سے کہوں گی۔ آج ہی بات کرتی ہوں ان سے۔۔۔ اب تک تو وہ آفس پہنچ گئے ہوں گے۔ مجھے ان سے یہ بھی پوچھنا ہے کہ وہ ایک دو دن میں نکاح کا بندوبست کر رہے تھے۔ اس بات کو کتنے دن ہو گئے ہیں؟“

”یہ میرا فیصلہ ہے۔“ شیما نے کہا۔

”میں نے بتایا تھا تمہیں کہ وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔“

دونوں قرض دینے والے رقم ساتھ لائے تھے۔ وہ برا سامانہ بنا کے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ سودا منسوخ ہو گیا تھا جس کا انہیں غصہ بھی تھا اور صدمہ بھی۔۔۔ لیکن شیما کو لگتا تھا

”اور میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ وہ اسلام آباد نہیں گئے تھے۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

حامد کسی زخم خوردہ ناگ کی طرح بل کھا کے اٹھا اور غصے میں دروازے کو دھڑ سے مار کے باہر نکل گیا۔

شیما قہقہہ مار کے ہنسی۔ اسے اندازہ تھا کہ حامد کا رد عمل یہی ہوگا۔ ایک جھوٹ نے جیسے اچانک اس کی

چاہیے... اوئے احمق، تم احسن کے پاس رہو گی اور کہاں؟“

”مگر تایاجی... اس کی بیوی اور بچے...“

”کیا اس نے شادی کر لی ہے؟ سو رہا ہے... باپ کو نہیں بتایا اور تجھے بتا دیا۔ بچے بھی ہو گئے خیر سے اور داداجی کو پتا ہی نہیں میں ابھی خبر لیتا ہوں اس کی...“ انہوں نے مصنوعی غصے میں مسخرے پن کا اظہار کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ تایاجی کتنی شفقت اور محبت سے خفا ہوتے تھے۔

اس کے لیے امیدوں کے نئے افق روشن ہو گئے تھے۔ حالات نے یوں پلٹا کھایا تھا کہ تدبیر پر تقدیر کی دانگی بالادستی کا ایک اور ثبوت سامنے آ گیا تھا۔ یکلخت سب کچھ بدل گیا تھا اور ایسے بدلا تھا کہ جو اس کے خواب و خیال میں نہ تھا، وہ از خود ہو گیا تھا۔ علاج کے لیے انڈیا کے بجائے اب وہ مخالف سمت میں لندن جا رہے تھے۔ علاج کے لیے گھر بیچ کے دس لاکھ حاصل کرنے کی ضرورت اچانک ختم ہو گئی تھی۔ دستِ غیب کی طرح تایاجی نے سارا انتظام کر دیا تھا۔ برسوں کے ٹوٹے رشتے پھر یوں ملے تھے جیسے کبھی ٹوٹے ہی نہ تھے۔ کہتے ہیں کہ رشتے کی پہچان مصائب و آلام میں ہی ہوتی ہے۔ خوش وقتی میں تو سب ہی اپنائیت کے دعویدار نظر آتے ہیں۔ حالات کی آزمائش میں حامد کا اصل خود غرض چہرہ سامنے آ گیا تھا۔ ہوس پر دو نمبر مال کی طرح لگی ہوئی محبت کی مہر صداقت اتر گئی تھی۔

شیماجتنا حامد کے بارے میں سوچتی تھی، اتنا ہی اس کی شخصیت کا اصل روپ سامنے آتا جاتا تھا۔ صدیوں پرانی بات میں کیسی بنیادی حقیقت سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دی گئی تھی۔ سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے... کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔ دل کی بات از خود حامد کی زبان تک آ گئی تھی جب اس نے مرحوم باپ کو عاقبت نا اندیش اور عقل سے پیدل قرار دیا تھا، اگر وہ اصول پرست نہ ہوتا تو حامد کی نظر میں عقل مند کہلاتا۔ ماں جس نے زمانے سے لڑ کے اپنی عزت کے دامن پر دھبا نہیں آنے دیا تھا اور حامد کو پڑھا لکھا کے وکیل بنا دیا تھا اس کے نزدیک اخلاقیات کے چکروں میں نہ پڑتی تو آج وہ گارمنٹس فیکٹری کا وارث اور مالک ہوتا۔ اقدار کے پیمانے جیسے بالکل الٹ گئے تھے۔ قابلِ صد ستائش صرف وہی تھا جو دولت مند تھا۔ دولت حاصل کرنے کے ذرائع غیر اہم تھے اور حامد کی فطرت کے اسی نظر نہ آنے والے پہلو نے بالآخر شیماء کی نظر میں اس کی دلفریب شخصیت

آنکھوں پر پڑے ہوئے سارے پردے اٹھا دیے تھے۔ حامد نے احمد صاحب کے عدالتی پیشی کے سلسلے میں اسلام آباد جانے کا جھوٹ کیوں بولا تھا؟ جواب صرف ایک تھا اور بہت واضح تھا اب وہ شیماء سے نکاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا اور اس تعلق کو ایسے ہی چلانا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں احمد صاحب سے اس نے کیا جھوٹ بولا ہوگا کہ شیماء سے نکاح تو اب نہیں ہو سکتا۔ اس نے الزام خود شیماء پر رکھ دیا ہوگا کہ وہ کوئی شریف لڑکی نہیں ہے۔ یہ مجھے اب پتا چلا ہے۔

جو شخص اپنی ماں کے بارے میں ایسے خیالات رکھ سکتا ہے کہ وہ اپنی آبرو کو اتنا عزیز رکھنے کی حماقت نہ کرتی تو وہ ایک گارمنٹ فیکٹری کی مالک بن سکتی تھی۔ اس کے لیے کسی کارپینٹر کی مچی آبادی میں رہنے والی غریب لڑکی کی آبرو کیا ہے۔

شاید تم یہ سمجھ رہے ہو گے کہ سستے چھوٹے... نہیں حامد، اپنے جرم کی سزا تو تمہیں ضرور ملے گی۔

☆☆☆

اس وقت اسے پھر کسی کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے تایاجی کو بتا دیا تھا کہ وہ برٹش ہائی کمیشن کے آفس میں ویزے کی درخواست کے ساتھ اپنے پاسپورٹ جمع کرا آئی ہے۔ انہوں نے تین گھنٹے پہلے کال کیا تھا۔

”ٹکٹ تو نہیں ملے۔“ تایاجی نے پوچھا تھا۔

”ابھی تک تو نہیں ملے، مل جائیں گے۔“

”او بے وقوف لڑکی... کوئی ٹکٹ لے کر تیرے گھر نہیں آئے گا۔ ٹریولنگ ایجنٹ سے لینے تجھے خود جانا ہوگا۔“

”کس ٹریولنگ ایجنٹ سے تایاجی؟“

”میں نے نام نہیں بتایا تھا تجھے... میری بھی مت ماری گئی ہے بڑھاپے میں۔ غلطی اپنی اور ڈانٹ رہا ہوں تجھے... اچھا نام لکھ لے اور سن احسن آج کمالے کی ساری ہسٹری برٹش ہائی کمیشن کو بھیج چکا ہوگا۔ ویزے میں زیادہ دیر نہیں ہوگی، کمالا کیسا ہے؟“

”ویسے ہی تایاجی، آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”تو پوچھ... اجازت لینا ضروری ہے۔“

”وہ تایاجی، لندن میں ٹھہرنے کا کیا انتظام ہوگا میرا اور ماں کا... کسی سستے سے ہوٹل میں قریب ہی...“

تایا بگڑ گیا۔ ”مجھے پتا چلا تھا ابی اے میں فرسٹ کلاس لی ہے تو نے... غلطی ہو گئی یونیورسٹی والوں سے... ایسی بے وقوفی کی بات کرنے والی لڑکی کو تو پاس بھی نہیں کرنا

کے سارے کچے رنگ حالات کی پہلی بارش میں دھل گئے تھے اور ان سے مسٹر بلیک اینڈ وائٹ کا اصل روپ عیاں ہو گیا تھا۔

اب جبکہ وہ حقائق کی صحیح تصویر دکھانے والی عینک سے جائزہ لینے پر قادر تھی اور جذبات پر دوبارہ عقل کا غلبہ تھا، وہ بہت کچھ دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی۔ جیسے اندھیرے میں سائے کچھ اور مفہوم رکھتے ہیں مگر روشنی میں اپنی ہیئت ہی تبدیل کر لیتے ہیں۔ شاید مکان بیچ کے بارہ لاکھ وصول کرنے میں اس کا بھی کوئی پوشیدہ مفاد ہوگا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مکان کی اصل قیمت بارہ سے زیادہ ہو۔ خود اس نے تو کسی سے پوچھا ہی نہیں تھا۔ اس نے سودا کیا ہو کہ ایک پارٹی مجبوری میں گھر بیچ رہی ہے۔ میں سستا دلا سکتا ہوں مگر میرا حصہ کیا ہوگا۔ فرض کرو مکان تھا پندرہ کا۔ وہ بارہ میں فروخت کر دیتا تو تین لاکھ کے منافع میں برابر کا حصہ دار بھی بن سکتا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ ایک بار ہاتھ سے نکل جانے والا مکان انہیں واپس نہیں ملے گا۔ اگر حامد کا کردار اور ایمان ایسا ہی ہے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ مکان کی ساری رقم خرید کر جاتا۔ وہ شیماء کا ہی نہیں پوری فیملی کا مکمل اعتماد حاصل کر چکا تھا۔ رقم کی منتقلی، حفاظت، تحویل سب شیماء کے لیے مشکل مرحلے تھے، حامد ہی سب کرتا۔

یہ سب بدگمانی کے کرشمے تھے کہ شیماء بھی دیکھ رہی تھی جو ہوا نہیں تھا۔ خوف، وسوسے، اندیشے آج سامنے آرہے تھے اور وہ اکیلی تھی تو ڈر رہی تھی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مہذب شہری معاشرے میں بھی اکیلی عورت کو تحفظ کی کوئی ضمانت حاصل نہیں۔ وہ باپ ہو، بھائی، شوہر ہو یا بیٹا۔ اس کا حفاظتی حصار نہ ہو تو بھیڑ جیسی معصومیت رکھنے والے بھی بھوکے بھیڑیے اسے ہر طرف سے کیوں گھیر لیتے ہیں۔ سنا ہے گوروں کے دیس میں ایسا نہیں ہوتا۔ عورت اکیلی رہ سکتی ہے۔ اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ ملک ایران میں عورت آدمی رات کو اپنی ٹیکسی لے کر سواری اٹھانے جاسکتی ہے اور اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ حجاب کے ساتھ ملائیشیا میں عورت ہر وہ کام کر رہی ہے جو مرد کر رہے ہیں۔

فون کی گھنٹی پر وہ چونکی اور اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی دیر سے آنکھیں کھولے صرف سوچ رہی ہے۔ ورنہ اسے تو لائٹ آف کر کے لیٹنے کے بعد خواب کی دنیا میں پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگتے تھے۔ اس نے اندھیرے میں روشن

کے کوڑ معلوم ہو گئے تھے۔
”ہیلو۔“ اس نے محتاط مگر پُر اعتماد انداز میں پوچھا۔
”کون بولا ہے؟“ کسی نے بدتمیزی سے اکٹھ لہجے میں سوال کیا۔

”آپ نے کس کو فون کیا ہے، کس سے بات کرنی ہے؟“
”مجھے سوچی چوہیا سے بات کرنی ہے، ہیروشیماء سے۔“ وہ ہنسا۔
”احسن، بدتمیز، ابھی تک بڑے نہیں ہوئے تم... موٹے کدو۔“

”ارے چھوڑو، کیا کرنا ہے بڑے ہو کے، اسکا پ نہیں ہے؟“

”ہے، میں آن کرتی ہوں، ایک منٹ۔“
چند سیکنڈ بعد احسن کا صحت مند مسکراتا ہوا چہرہ اسکرین پر آ گیا۔ ”شاید غلط نمبر مل گیا تھا مجھ سے... اور جھوٹ بولا ہے تم نے، تم وہ نہیں ہو سوچی چوہیا۔“
”ارے، جب نمبر میرا ہے تمہیں بتا یا جی نے دیا ہو گا۔“

”مگر وہ تو اتنی خوب صورت نہیں تھی بلکہ ذرا بھی خوب صورت نہیں تھی۔ اچھا وہ قسم کھاؤ جو ہم کھاتے تھے۔“
وہ ہنس پڑی۔ ”قسم سلی چھتری والے کی اب تو یقین آیا؟“

”آیا، لیکن بائی گاڈ ہیروشیماء... واٹ اے چیچ۔“
شیماء مسکرائی۔ ”مگر تم موٹے کدو ہی ہو، ڈاکٹر ہونے کے باوجود۔“

”یار کیا کروں، جاگنگ مشین بھی لی تھی، استعمال بھی کی کچھ دن... فرصت نہیں ملتی۔“

”تو ملازم رکھ لو اس کے لیے... مجھے بتایا نے بتایا کہ تم سرجن بن گئے ہو بہت بڑے... مجھے یقین نہیں آتا۔“

”تم آؤ گی تو دیکھ لینا، اچھا اب میری بات غور سے سنو، کل نکٹ لو۔ مجھے امید ہے تین چار دن میں ویزا لگ جائے گا۔ اب دیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔“
”ابا جی ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟“

”انشاء اللہ... ہم دوا کے ساتھ دعا پر ایمان رکھنے والے لوگ ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ ڈاکٹر کے ہاتھ میں زندگی اور موت نہیں ہے، وہ کوشش کرتا ہے، شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں ڈاکٹرز کے ایک ٹیمل نے کیس ہسٹری دیکھی

تھی۔ وہ پُر امید ہیں۔ میں تم سے روز رابطے میں رہوں گا۔ مجھے وہاں کی پروگریس بتانی رہو، رپورٹ میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔ چاچا جی کو ہم سیدھا اسپتال لے جائیں گے۔ ان کو داخل کرانے کے بعد باقی کام... میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ اسٹوڈیو پارٹمنٹ... ایک بیڈروم والا، تم اپنی ای کے ساتھ بیڈروم میں رہنا، میں لاؤنج میں رہوں گا۔

”احسن، تمہیں تکلیف ہوگی۔ اگر ہمارے رہنے کا اور کوئی بندوبست ہو سکتا ہے...“

”میرے رہنے کا ہو سکتا ہے۔“

”ہاں، کسی گرل فرینڈ کے پاس جگہ نکل آئے تو... اچھا ہے۔“

”آخر ہونا وہی مڈل کلاس کی جاہل لڑکی... جو اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتی۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

شیمہ کو اپنی بات پر افسوس ہوا۔ بے شک اس نے جو کہا مذاق کی بات تھی مگر کہنے کی بات نہیں تھی۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے یوں اس کے کردار کو مشکوک بنانے کا... وہ نیک نیتی میں سب کچھ تو کر رہا ہے... سوری کہنے کے لیے اس نے خود کال ملائی مگر دوسری طرف اس نے غصے میں خفا ہو کے فون آف کر دیا تھا۔ قصور شیمہ کے اس ذہن کا تھا جو نچلے طبقے کے روایتی طور پر فرسودہ ماحول میں پرورش پا کے یورپ، امریکا جانے والوں کے بارے میں اور وہاں کی زندگی کے طور طریقوں کے بارے میں اسی انداز میں سوچنے کا عادی تھا کہ وہ جنسی اخلاقیات میں مادر پدر آزاد معاشرہ ہے جس میں پہنچ کے یہاں کے طالب علموں کے قدم فوراً بہک جاتے ہیں اور کسی گوری چمڑی والی بے حیا میم کے دام الفت میں گرفتار ہو کے شادی کر بیٹھنا تو ایک عام بات ہے۔ گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈز بلوغت کی عمر سے بہت پہلے ہی جنسی تجربات کرتے پھرتے ہیں اور پینا پلانا تو ایسا ہی ہے جیسے یہاں چائے اور کولڈ ڈرنک... چنانچہ اس نے پہلے تایا جی سے سوال کر لیا تھا کہ احسن کے گھر میں تو اس کے بیوی بچے بھی ہوں گے اور اسے شرمندگی سے زیادہ حیرانی ہوئی تھی کہ ولایت میں ڈاکٹر بن کے رہنے والے نے ابھی تک کسی گوری میم سے شادی نہیں کی۔ آج پھر اسے خفت اٹھانا پڑی تھی جب مذاق کی بات میں اس نے احسن کو طعنہ دے دیا تھا کہ اس کے سونے کا کیا ہے کسی بھی گرل فرینڈ کے پاس چلا جائے۔ حالانکہ اس کی پیشکش روایتی مشرقی آداب مہمان نوازی کے عین مطابق تھی۔

کسی دشواری کے بغیر اسے ٹریول ایجنٹ سے تین

ٹکٹ مل گئے اور ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ کے شائع کردہ کچھ پمفلٹ بھی جن میں لندن آنے والوں کے لیے مفید اور دلچسپ معلومات تھیں۔ اس نے کونسلیٹ میں ویزا کی درخواست کے ساتھ پاسپورٹ جمع کرائے تو کاؤنٹر پر ہی اسے ایک خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب پیچھے بیٹھی ہوئی پاکستانی لڑکی نے کمپیوٹر پر چیک کرنے کے بعد کہا۔

”اوہ، آپ فادر کو علاج کے لیے لے جا رہی ہیں۔“

میڈیکل رپورٹ کی فائل شیمہ کے ہاتھ میں ہی رہ گئی۔ ”جی یہ فائل...“

وہ مسکرائی۔ ”میں نے سب ریکارڈ دیکھ لیا ہے کمپیوٹر پر مس شائلہ، آپ کا کیس ترجیحی بنیادوں پر ڈیل ہوگا۔“

اب محاورے کے مطابق سات سمندر پار بیٹھے بھائیوں، اس کے اور تایا جی کے علاوہ احسن کے ساتھ رابطہ معمول کی بات ہو گیا تھا۔ سیٹلائٹ کمیونیکیشن کی وجہ سے فاصلوں کا وجود بے معنی ہو گیا تھا۔ کوئی لوکل کال کرنا اور لندن یا امریکا بات کرنا ایک ہی جیسی بات تھی۔ شیمہ کو اچانک گمشدہ رشتوں کا خزانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اسے بھی اور کمال دین کو بھی۔ بڑے بھائی کی محبت اور مدد نے اس کا آدھا مرض تو ویسے ہی دور کر دیا تھا۔ احسن پہلے دن کی بات بالکل بھول گیا تھا بلکہ اس نے دوسرے دن خود معذرت کی تھی کہ شیمہ کے مذاق پر اس نے بداخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

حامد کا رویہ اس کے برعکس رہا۔ شیمہ کو یقین تھا کہ وہ اپنے طرز عمل پر شرمندہ ہوگا اور معمول کے مطابق اس سے ملنے بھی آئے گا لیکن دو دن تک اس کی طرف سے مکمل خاموشی رہی تو شیمہ کا شک یقین میں بدلنے لگا کہ حامد کے بارے میں اس کے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے، موقع پاتے ہی اس نے قطع تعلق کا بہانہ بنا لیا ہے۔ شیمہ کو اس کی محتاجی نہیں رہی تھی اور صرف اپنے شبہات کی تصدیق کے لیے اس نے تیسرے دن خود فون کیا۔

”کیا بات ہے، تم کیوں روٹھے بیٹھے ہو؟“

اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”محض وہم ہے تمہارا میں مصروف تھا۔“

”لگتا ہے تم نے میرے مکان فروخت نہ کرنے کے فیصلے کا برا مان لیا ہے۔ حالانکہ میرے ساتھ تمہیں بھی خوش ہونا چاہیے تھا...“

”بات برا ماننے یا خوش ہونے کی نہیں ہے۔ چلو اچھا ہوا تمہارا گھر بیچ گیا۔ لیکن میری پوزیشن بہت خراب ہوئی۔ میں بڑی مشکل سے انہیں لایا تھا اور انہیں تمہاری ضرورت

دین کے درمیان شیما کی ماں رہی جہاز اٹھا تو شہر پہنچے ڈوبتا چلا گیا۔ پھر بادلوں کے پردے میں غائب ہو گیا۔ اس نے اپنے سامنے والے اسکرین پر ایک فلم بھی لگالی مگر پھر ایک سین پر گھبرا کے بند کر دی۔ باقی وقت وہ گانے سنتی رہی اور باہر دیکھتی رہی۔

لندن تک کا سفر کسی انوکھے ست رنگے خواب جیسا تھا۔ وہ ننھے سمندروں، بادلوں اور کبھی ان دھبے جیسے جزیروں کو دیکھتی رہی جو مختلف ممالک تھے۔ جہاز کے اندر کی دنیا الگ تھی۔ خوش حال خوب صورت مسافر، اتر ہوٹس، سر، میڈم کہتی، ہر فرمائش پوری کرتی، اور ایک احساس کہ حرکت کا پتا نہ چلنے کے باوجود ہزاروں فٹ کی بلندی پر ایک بہت بڑے ہال میں بیٹھے سیکڑوں لوگوں کے ساتھ اڑ رہی ہے۔ اسکرین پر لکھا ہوا آج آتا تھا کہ ان کی بلندی کیا ہے۔ رفتار کتنی ہے اور باہر کا درجہ حرارت کتنے ڈگری منفی سینٹی گریڈ ہے۔ کمال دین کی تکلیف وقتی طور پر کم تھی۔ اس کا مرض اندر ہی اندر پھیل رہا تھا۔ یوں جیسے دیمک پرانے درخت کے مضبوط تنے کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرتی جاتی ہے اور ایک دن اچانک ہوا کا ایک جھونکا اسے گرا دیتا ہے۔ وہ دوائیں کھا رہا تھا۔ فرط جذبات میں وہ ہنس کے کہتا تھا کہ میری بیماری تو ایسے ہی ٹھیک ہو گئی ہے۔ بھائی صاحب سے ملوں گا تو بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا اور پھر میرا بھتیجا خود اب بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا۔

لندن کا ایئر پورٹ، اس کی وسعت، رونق اور چکا چوند دیکھ کے شیما دنگ رہ گئی۔ ہزاروں لوگ ادھر سے ادھر بھاگے جا رہے تھے۔ کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ گورے کالے، عورت، مرد، بے شمار لائسنس، سیکڑوں جہاز جو شفاف شیشے کی دیواروں کے پیچھے اترتے چڑھتے دکھائی دیتے تھے۔ احسن خود ان کو لینے کے لیے موجود تھا۔ پہلے کے مقابلے میں ایک بہت صحت مند اور ہینڈسم جوان آدمی... لی شرت اور جینز میں وہ ذرا بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔ وہ چاچا جی سے گلے ملا اور پھر چاچا جی کے سامنے جھک گیا کہ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھیں۔ پھر اس نے مسکرا کے شیما کو دیکھا اور اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے ہنسا۔ ”تم تو... بہت بدل گئی ہو۔“ غالباً عادت کے مطابق... وہ ”خوب صورت ہو گئی ہو“ کہتے کہتے رک گیا۔

”بھائی جی نہیں آئے؟“ کمال دین کچھ مایوس تھا۔ ”چاچا جی، امریکا سے بارہ چودہ گھنٹے لگتے ہیں اور اب ان کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی۔“ وہ سامان سمیت باہر

مندی پر قائل کرنے کے لیے بہت منت سماجت کی تھی۔ ”حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی اور پھر قصور تو میرا تھا۔“ وہ جاہل لوگ تھے، انہوں نے مجھے بہت بے عزت کیا اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا، میں دیکھ رہا ہوں کہ قبلہ بدلتے ہی تمہارا رویہ بھی بدل گیا ہے۔ اب تمہیں میری ضرورت نہیں رہی۔“

”ضرورت تو تمہیں میری اس حد تک تھی کہ تم احمد صاحب کو سفارش کے لیے ساتھ لائے تھے۔ یہ تو زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کی بات تھی۔ لندن آنا جانا تو ایک ہنگامی ضرورت ہے۔“

”میں تمہیں بڑے مضبوط کردار کی لڑکی سمجھتا تھا...“ شیما بھڑک اٹھی۔ ”اچھا، الٹا چور کو تو ال کو ڈانٹے... اگر میں دروازہ نہ کھولتی اور تمہارے منہ پر تھپڑ مارتی... تم نے صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور اب الزام مجھے دے رہے ہو کہ میں نے کمزوری دکھائی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ نتائج بھگتنے سے بچ گئی میں... تمہارا رویہ اس کے بعد ہی بدلا ہے...“

اچانک اسے احساس ہوا کہ دوسری طرف کی خاموشی اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ وہ اکیلی بولے چلی جا رہی تھی۔ حامد فون بند کر چکا تھا۔ غصے اور صدمے سے اس کا برا حال ہو گیا۔ اس نے فون کو بیڈ پر پھینکا اور تکیے میں منہ چھپا کے رونے لگی۔ باپ کو کم عقل اور ماں کو نادان قرار دینے والا اب اسے بھی بدکردار قرار دے چکا تھا۔ اس کے نزدیک سارے رشتے ضرورت کے رشتے تھے۔ مفاد پرستی کی اہمیت اخلاق و کردار سے زیادہ تھی۔ دنیا داری میں جذبات کی حیثیت دولت سے زیادہ نہیں تھی۔

☆☆☆

لندن تک ہوائی سفر اس کے لیے ایک طلسماتی تجربہ تھا۔ ایلس ان ونڈر لینڈ وہ خود ہو گئی تھی۔ اس کے باپ کا چہرہ بیماری کے باوجود امید اور خوشی کے جذبات سے دمک رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کی خاموش ماں کے جذبات اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ خاموش آنسو جو بہت کچھ کہتے تھے۔ جن کو الفاظ کی زبان کی ضرورت ہی نہ تھی۔ شیما نے قدم قدم پر کوئی ایسی بات کی جس نے باقاعدگی سے ہوائی سفر کرنے والوں کو مسکرا نے پر مجبور کر دیا لیکن بالآخر ان کو جہاز میں ایک ساتھ تین سیٹوں پر بٹھا دیا گیا۔ اسے کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ دے دی گئی۔ اس کے اور کمال

کی طرف چل پڑا۔ ”گھر سے بھی کم ہی نکلتے ہیں۔“

”کیوں؟ بھائی جی کو کیا ہوا ہے؟“

”جو سب کو ہوتا ہے اس عمر میں... بڑھاپا... وہ اب ستر کے قریب ہیں لیکن صحت کا خیال نہیں رکھتے اور انہوں نے تو نہیں بتایا ہوگا وہ بہت زیادہ پینے لگے ہیں۔“

کمال دین چلتے چلتے رک گیا۔ ”بھائی جی شراب پیتے ہیں؟“

”چلو چا چا جی، یہاں سب ہی پیتے ہیں، حد میں رہ کر پینے سے کچھ نہیں ہوتا۔“

کمال دین کا صدمہ چہرے سے عیاں تھا۔ ”تو بہ تو بہ... پھر تو وہ خنزیر بھی کھاتے ہوں گے؟“

”اب ایسی بات بھی نہیں...“ اس نے ایک لمبی چوڑی کار میں سامان رکھا۔ ”آپ اور چاچا جی پیجھے بیٹھیں۔“

شیمہ چپ چاپ لندن کی سڑکوں کی گہما گہمی دیکھتی رہی۔ اس کا یہ خیال تو غلط ثابت ہوا تھا کہ وہاں سب عورتیں فلموں کا وہی برائے نام لباس پہنے گھومتی ہوں گی۔ بیشتر عورتیں ٹی شرٹ اور جینز میں تھیں۔ ہاں اسے کمر میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے کے سہارے چلتے یا بوس و کنار کرتے

کچھ نوجوان ضرور نظر آئے۔ یہ گورے کالے اور پیلے لوگوں کا ملا جلا ہجوم ہر جگہ تھا۔ وہ سیدھے اسپتال گئے۔ ان کا سامان گاڑی میں رہا۔ شیمہ اور اس کی ماں کو ایک ویٹنگ روم میں بٹھا کے احسن اندر چلا گیا۔ کمال دین کو اسپتال کی دو

زبیں ایک کرسی پر بٹھا کے پہلے ہی لے جا چکی تھیں۔ شیمہ دو گھنٹے تک بے قراری سے پہلو بدلتی رہی۔

آتے جاتے مریضوں یا مردوں کو دیکھتی رہی۔ کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا۔ کوئی بے وجہ بولتا ہی نہ تھا۔ اسپتال کے اندر

موبائل فون بھی بند تھے۔ احسن دو گھنٹے بعد مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ ”چلو، چاچا جی کو وارڈ میں لے گئے ہیں۔ ہم پہلے کچھ

کھائیں گے۔“ وہ بولا۔

”ہم انہیں مل نہیں سکتے؟“ شیمہ نے کہا۔

احسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہاں یہ سب نہیں ہوتا۔ اسپتال والے کہتے ہیں کہ مریض کو ہمارے سپرد کریں اور

جائیں۔ آگے ہمارا کام ہے اور ہم پر اعتبار نہیں تو لے جائیں اپنے مریض کو۔“

”کیا مطلب؟ اب اباجی سے ملاقات ہی نہیں ہو گی؟“

”ہوگی... سرجری کے بعد جب ڈاکٹر اجازت دیں گے۔“ احسن نے کہا۔ ”فکر مند ہونا چھوڑ دو سوچی چوہیا۔ وہ

بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“

شیمہ اس بے موقع مذاق پر مسکرائی بھی نہیں۔ اس کی

ماں کو بہت فکر تھی کہ کھانے پینے میں حرام شے نہ آجائے۔

احسن نے اسے تسلی دی۔ ”یہاں تیس لاکھ پاکستانی اور انڈین ہیں اور وہی کھاتے پیتے ہیں جو اپنے ملک میں کھاتے

تھے۔ ہاں گھروں میں کھانا کم پکتا ہے۔ روٹیاں تھوپنا اور بھون بھون کے مرغن کھانے بنانا یہاں نہیں ہوتا۔“

احسن کا اپارٹمنٹ دیکھ کے اسے مایوس ہوئی۔ اس سے بڑا تو ان کا کراچی والا گھر تھا۔ احسن نے بتایا کہ یہاں

مکان بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ چار چھ بیڈ روم اور ایجنج ہاتھ والی عیاشی امیروں کو بھی میسر نہیں۔ پانی کم ہے۔ ضائع

نہیں کیا جاتا۔ وہ بہت دیر تک بتاتا رہا کہ لندن میں رہنے کے طور طریقے کیا ہیں۔ اپارٹمنٹ میں ہر چیز بھی اور بجلی سے

چلتی تھی۔ اس کا اپنا بیڈ روم بارہ فٹ لمبا چوڑا ہوگا۔ لاؤنج اس سے کچھ کم تھا۔ اس کے آخر میں اوپن کچن تھا اور ان

سب کے لیے چار بائی چار فٹ کا ہاتھ روم... لیکن اتنے بڑے شہر کے اتنے چھوٹے گھر میں رہنا ان کی مجبوری تھی۔

احسن نے سارا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کوشش نہ کرتا تو شاید انہیں چھ ماہ انتظار کرنا

پڑتا۔ چھ دن کمال دین کا آپریشن تھا تو شیمہ کا تایا آپہنچا۔ شیمہ اسے دیکھ کے حیران رہ گئی۔ وہ بہت موٹا ہو گیا تھا اور

چلتے ہوئے یا بات کرتے ہوئے بھی ہانپتا تھا۔ وہ اسپتال کے ویٹنگ روم میں بیٹھ کے بھی پیتا رہا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر

بعد جیب میں سے ایک چھٹی سی بوتل نکال کے گھونٹ بھر لیتا تھا۔

”یہ تم نے کیا لت لگالی ہے بھائی جی؟“ شیمہ کی ماں نے کہا۔

”یہ تو ٹانک ہے، سب پیتے ہیں یہاں... تو بھی پینے لگے گی یہاں رہ کے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ اس نے اپنی بیوی اور

بچوں کے بارے میں سرسری بات کی۔ ”سب مست ہیں۔ اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ بس میں فارغ ہوں، مجھے احسن

نے بلایا تو آنا پڑا۔“

”اچھا ہے بھائی سے بھی مل لو گے۔“

”اور کیا، تم کو اتنی دور سے بلانے اور خود اتنی دور سے آنے کا اور مقصد کیا ہے۔ تم لوگوں کا تو خون سفید ہو گیا ہے

مگر بڑا بھائی تو ہوتا ہے باپ کی جگہ... میں نے تو ہمیشہ کوشش کی کہ سب ساتھ رہیں۔“

شام کو احسن نے آ کے بتایا کہ اس نے باری باری

جائیں گے۔ واپس پاکستان جانے کے لیے۔
وہ کچھ نہیں بولا۔ بس شیمہ کو دیکھتا رہا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اپنے آنسو پینے کی سخت جدوجہد کر رہا ہے۔ ”اپنا خیال رکھنا ہیروشیمہ... احسن بہت اچھا لڑکا ہے۔ تجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گا۔“

شیمہ کی سمجھ میں یہ آخری بات نہیں آئی تھی مگر اسی وقت نرس نے جھانک کے کہا۔ ”یورٹائم از اوور پلیز۔“ وہ پلٹ گئی۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے دوبارہ باپ کی طرف مڑ کے نہیں دیکھا۔ وہ بہت کمزوری محسوس کر رہی تھی اور لگتا تھا کہ بے ہوش ہو کے گر جائے گی۔ باہر نکلتے ہی اس نے سہارے کے لیے احسن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ احسن نے سنبھال لیا۔ ایک ہاتھ شیمہ کی کمر میں ڈال کے وہ اسے وینٹک روم تک لے گیا۔ ”حوصلے سے کام لو۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم بہادر لڑکی ہو، تم سے زیادہ ہمت والی تو چاچی ہے۔“ وہ صوفے پر گر گئی اور ماں کے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی۔ اس کے اندر کا خوف جو پہلے شیمہ کے کان میں سرگوشی کرتا تھا۔ اب لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلا رہا تھا۔ تم اپنے باپ کو آخری بار دیکھ چکی ہو۔ اب اسے پھر زندہ نہیں دیکھو گی۔ احسن نے اس وقت ڈاکٹر ہونے کا ثبوت دیا۔ اسے اندازہ ہو گا کہ ان دواؤں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس نے نرس کو بلا کے اسے ایک انجکشن دیا۔ نرس نے انجکشن شیمہ کو لگا دیا۔ اس نے چاچی کو بھی دو گولیاں کھلا دیں۔

رات کو شیمہ کی آنکھ پھر احسن کے اپارٹمنٹ میں اس کے بیڈ پر کھلی۔ اس کی ماں ہر روز کی طرح ساتھ تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی تو رات کے تین بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سات گھنٹے سوتی رہی تھی۔ اسے اپنے باپ کا خیال آیا۔ شاید اب تک اس کا آپریشن ختم ہو گیا ہو گا مگر وہ کہیں آئی سی یو میں بے ہوش پڑا ہو گا۔ اس کے بدن سے ٹیوبس اور تار منسلک ہوں گے اور مختلف مشینیں اس کے اندر کی ساری کیفیت دکھا رہی ہوں گی۔

پیاس محسوس ہوئی تو وہ بیڈ سے اتر کے باہر آئی۔ کاؤچ پر احسن کی جگہ اس کا تایا سیدھا پڑا ہوا تھا اور منہ کھول کے سانس لے رہا تھا۔ اپارٹمنٹ میں چوتھے آدمی کے لیے جگہ ہی نہیں تھی۔ وہ خود نہ جانے کہاں جا کے سویا ہو گا۔ پھر اسے یاد آیا کہ آج وہ ٹائٹ ڈیوٹی دے گا جو پورا ہفتہ چلے گی۔ وہ دوبارہ سو گئی۔ انجکشن کا تھوڑا بہت اثر ابھی باقی تھا۔ اس کی آنکھ پھر کھلی تو باہر سے اس کی ماں اور تایا جی کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان کے چہرے دیکھ کر

سب کی چاچا جی سے ملاقات کا بندوبست کیا ہے۔ ”ان کو یہاں ایک کمرے میں لار ہے ہیں۔ سب ایک ساتھ نہیں مل سکتے۔ اباجی پہلے آپ آجائیں۔ پانچ منٹ کی ملاقات ہو گی۔ بعد میں شاید تین چار دن موقع نہ ملے۔“

شیمہ بے چینی سے اپنی باری کا انتظار کرتی رہی۔ جمال دین برسوں بعد چھوٹے بھائی سے مل کے آیا تو رو رہا تھا۔ وہ صوفے پر گر کے بھی ہچکیاں لیتا رہا اور پیتا رہا۔ اس کے بعد شیمہ کی ماں گئی اور شیمہ بے قراری سے وینٹک روم کے اندر ٹپکتی رہی۔ اس کی ماں واپس آئی تو احسن کے تسلی دینے اور سمجھانے کے باوجود کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں، وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

”چلو تم آ جاؤ۔“ احسن نے شیمہ کو اشارہ کیا۔ وہ احسن کی حوصلہ افزائی کے باوجود سخت زورس تھی۔ اسے ایک کمرے میں جا کے لباس اور جوتے سب بدلنے پڑے۔ پھر ایک نرس نے اس کے ہاتھ دھلائے اور اسے پیردھو کے چپل پہننے کو دی۔ آخری چیز کپڑے کا ایک ماسک تھا جو نرس نے اس کے منہ پر یوں چڑھا دیا کہ سوائے آنکھوں کے اس کا سارا چہرہ اور بال اس میں چھپ گئے۔ ”کسی سرجری کے مریض سے ملنے کے لیے یہ تمام احتیاطی تدابیر معمول کا حصہ تھیں۔ شیمہ سے کہا گیا کہ وہ مریض کے بیڈ سے دور رہے۔ باپ کے کمرے میں جا کے اسے اندازہ ہوا کہ قریب جانا ویسے بھی ممکن نہیں۔“

کمال دین آپریشن کے کپڑوں میں اسٹریچر پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ درمیان میں دو فٹ کے فاصلے پر شیشے کی دیوار تھی جو چار فٹ اونچی تھی۔ اس سے لگ کر شیمہ نے آنسو روکتے ہوئے کہا۔ ”کیسے ہیں آپ اب؟“

وہ ہمت سے کام لے کر مسکرایا۔ ”بالکل ٹھیک... بھائی جی تو بڑے کم ہمت ہیں۔ رو رہے تھے بچوں کی طرح۔“

شیمہ نے کہا۔ ”وہ بہت جذباتی ہیں آپ کے لیے بھی۔“

”اور تیرے لیے بھی... کہہ رہے تھے کہ شیمہ میری ہے... مجھے میرا وعدہ یاد دلار ہے تھے۔“

سمجھ جانے کے باوجود شیمہ نے بات کو ٹال دیا۔ ”آپ کے ٹھیک ہونے تک وہ لندن میں ہی رہیں گے۔“ ”ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اسپتال سے ایک ہفتے بعد چھٹی ملے گی۔“

”ایک ہفتہ بھی گزر جائے گا۔ آپ بالکل ٹھیک ہو

وہ ٹھنک گئی۔ وہ خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

”کیا ہوتا یا جی، اسپتال سے کوئی خبر ملی؟“

”ہاں، احسن نے بتایا کہ آپریشن تو ہو گیا۔۔۔

مگر۔۔۔“

”مگر کیا تا یا جی؟“ وہ چلائی۔

”ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ میں احسن کی بات بتا رہا

ہوں۔ اس نے کہا کہ جسم کا دفاعی نظام نئی چیز کو کم قبول کرتا ہے۔ جیسے گردے میچ کر جائیں پھر بھی ٹل ہونے کا خطرہ

رہتا ہے۔ اس کے لیے دوائیں تمام عمر کھانی پڑتی ہیں۔“

شیمادہیں بیٹھ گئی۔ ”یہ کب معلوم ہوگا۔۔۔ کہ سب

ٹھیک ہے؟“

”شام تک۔۔۔ اچھا تو دیکھ یہ جو چھوٹا سا کیبنٹ

ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔ چائے، کافی، پتی۔۔۔ اور فریج

میں بھی کچھ ہوگا تو ذرا ناشتا بنا۔۔۔ بنا لے گی یا میں بناؤں؟

دراصل یہاں سب کچھ الیکٹرک ہے۔“

تایا کے اصرار پر اور ماں کی خاطر اس نے ناشتا کیا

ورنہ اس کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

”میں نے ابھی تیری ماں سے بات کر لی ہے۔“ تایا

اچانک بولا۔ ”کوئی نئی بات نہیں، سب پہلے سے طے تھا۔“

وہ چونکی اور ماں کی طرف دیکھا۔ ”تایا جی کیا کہہ

رہے ہیں ماں؟“

ماں چپ رہی۔ تایا نے کہا۔ ”تیرا رشتہ احسن سے

طے تھا۔ بھابی جانتی ہے اور کمالے کو بھی پتا ہے۔ اسے بھی

کوئی اعتراض نہیں، میں نے بھابھ کو سب سمجھا دیا ہے۔“

”کچھ مجھے بھی سمجھائیے تایا جی۔“ اس نے دبے

دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

”پتر ہیروشیما، اب پہلے میری ساری بات سن لے

اور سمجھ لے پھر جو کہنا ہے ابھی کہہ دینا۔ اتنی سیانی تو بھی تھی

جب ہم گھر سے گئے تھے۔ پہلے سعودی عرب پھر امریکا۔۔۔

معلوم ہوگا تجھے بھی۔ جب تمہارے یہاں آنے کا ہوا تو

احسن نے مجھ سے بات کی اور کہا کہ ایسا ہو جانا چاہیے۔ موقع

اچھا ہے۔ تو میں نے اور تیری تائی نے بھی یہی مناسب

سمجھا۔ پہلے میں نے کمال سے بات کی۔ اس سے کہا کہ

ہیروشیما سے پوچھ لے تو اس نے مجھے بتایا کہ زبانی بات

ہو چکی ہے کسی دیکل سے۔۔۔ مگر نہ اس کے ماں باپ کا پتا ہے

نہ گھر ٹھکانا ہے اور تو جانتا ہے کہ احسن کے ساتھ بات پکی

ہے تو پھر مجھے بتائے بغیر تو نے کہیں اور بات کیسے کی۔ اس

نے اپنی غلطی مانی اور مجھ سے کہا کہ بات ہمارے تمہارے

درمیان ہوئی تھی۔ بہت پہلے جب بچے چھوٹے تھے۔ اب

ان کی کیا مرضی ہے۔ میں نے کہا کہ مرضی کے گھوڑے۔۔۔

احسن مجھ سے زیادہ مایوس ہے کہ چاچا جی نے ایسا کیوں

کیا۔ خیر فیصلہ یہ ہوا کہ لندن آنے کے بعد دونوں کی مرضی

پوچھ لیں گے۔ احسن کا تو مجھے پتا ہے۔ اس نے کہا کہ شیماکا

مجھے پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے اب اسے برسوں پہلے طے ہونے

والا رشتہ قبول نہ ہو اور وہ کہے کہ میری بات تو خود آپ نے

طے کی ہے اس وکیل کے ساتھ۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔

حامد۔۔۔ اب تو بول تیری کیا مرضی ہے۔ تیرا ابا تو یہی چاہتا

ہے کہ جو پہلے طے ہوا تھا، وہی ہو۔“

شیمادم بخود بیٹھی رہی۔ ”میں کیا بولوں تایا جی۔۔۔ یہ

کون سا موقع ہے۔“

”تو موقع کو چھوڑ۔۔۔ غلطی میری بھی کہ میں نے رابطہ

نہیں رکھا اور دوبارہ بات کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ جب

وقت آیا تو ہم احسن کے ساتھ آجائیں گے پاکستان اور تجھے

لے آئیں گے۔ اس کھوتے نے فرض کر لیا کہ اتنا عرصہ

بات نہیں ہوئی تو وہ بات بھی ختم۔۔۔ حالانکہ یہ زبان کے قول

ہی ہوتے ہیں۔ اب میں اور کمالا راضی۔۔۔ تیری ماں

راضی۔۔۔ احسن راضی۔۔۔ زبردستی کوئی نہیں، تو اس وکیل

سے ہی شادی کرنا چاہے تو تیری مرضی۔۔۔ ورنہ احسن کی

بات طے تھی۔“

وہ فرش کو دیکھتے ہوئے پیر کے انگوٹھے سے قالین کو

کریدتی رہی۔

”بولتی کیوں نہیں۔ کہہ دے ہم نے بے وقوفی کی

تھی۔۔۔“ تایا گرم ہونے لگا۔

”میں۔۔۔ انکار کیسے کر سکتی ہوں تایا جی۔۔۔ اگر ابا

راضی ہے اور اس کی یہی خوشی ہے لیکن۔۔۔ یہ کون سا موقع

ہے کہ میں شادی رچاؤں؟“

”پھر کیا دوبارہ آئے گی یا تو چاہتی ہے ہم بینڈ باجے

کے ساتھ برات لے کر آئیں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔

میں کمالے کی بات نہیں کر رہا۔ اپنی بھی کر رہا ہوں۔ دوبائی

پاس ہو چکے ہیں میرے بھی۔“

شیمانے نظر اٹھائی۔ ”اور اس کے باوجود۔۔۔ آپ

پتا نہیں چھوڑتے، احسن منع نہیں کرتا۔“

وہ ہنسا۔ ”اوئے پتر، ایک شعر کسی نے پڑھا تھا

میرے سامنے۔ چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ اس

کابس چلے تو میرا کھانا بھی بند کر دے۔ کہتا ہے وزن کم کرو،

میں نے کہا کہ کھاتے پیتے رہنا اچھا ہے۔ اب میری بات

کمال دین نے بیوی اور بیٹی کو دیکھ کر صرف ہاتھ ہلایا تھا اور بیک وقت آنسو بہاتے اور مسکراتے ہوئے دو انگلیوں سے وی فارو کٹری کا نشان بنایا تھا۔ دوسری بار ان کو چند منٹ کے لیے بابت کرنے کی اجازت ملی تھی۔ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ طبیعت کا حال پوچھنے کے بعد شیمانے باپ سے براہ راست سوال کر لیا تھا کہ کیا وہ احسن کے ساتھ بچپن میں ملے ہونے والے رشتے پر قائم رہنا چاہتا ہے اور کمال دین نے اسے سر جھکانے کو کہا تھا۔

”چاہتا تو ہوں ہیروشیما۔“ اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”لیکن تیری رضامندی ضروری ہے۔“

شیما کو یہ سوال اس لیے کرنا پڑا تھا کہ ماں اور تایا کی طرف سے اس پر نکاح کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اب وہ پرسکون اور مطمئن تھی۔ ایک احساس یہ تھا کہ اس نے بزرگوں کا فیصلہ تسلیم کر کے سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ اس سے تایا کو شاید وہ خوشی نہ ملی ہو جو اس کے باپ کو ملی تھی۔ وہ بڑے بھائی سے کیے گئے عہد کو نبھانے میں کامیاب رہا تھا۔ خون کے رشتے پھر پہلے جیسے مضبوط ہو گئے تھے اور اس پر نہ وعدہ خلافی کا الزام آیا تھا نہ احسان فراموشی کا۔ اور یہ سب شیما کی قربانی کا نتیجہ تھا۔ کم سے کم کمال دین یہی سمجھتا تھا کہ حامد سے محبت کرنے والی شیمانے اپنی خوشی کی قربانی دی تھی۔

شیما کے دل پر سے ایک بوجھ تھا جو ہٹ چکا تھا۔ اس کی روح کا یہ زخم رفتہ رفتہ ماضی کی گرد کے نیچے دفن ہو جائے گا۔ حامد کی غرض پرستی اور رشتوں کی اقتدیس کے بارے میں افسوسناک روتیہ شیما کو اس سے دور لے گیا تھا۔ احسن سے ملنے کے بعد اور زندگی کا ایک نیا سفر شروع کرنے سے اس کے لیے ماضی کے اس تلخ تجربے کو بھلانا بہت آسان ہو گیا تھا۔

اسپتال سے واپسی پر احسن بہت خوش تھا اور اس کی خوشی شیما کو نیا اعتماد عطا کر رہی تھی۔ قدرت کے کھیل بھی کیا نیارے ہیں کہ آگ لینے کو جائیں اور پتھر بری مل جائے۔ یہ اس کے باپ کی بیماری تھی جو شیما کو وہاں لے آئی تھی جہاں اسے آنا تھا۔ کیونکہ نوشتہ تقدیر میں ایسا ہی تھا اور بدلائیں جاسکتا تھا۔ اس نے حامد کو چاہا، اس سے عہد وفا کیا اور نصیب ہوئی احسن کا۔ اس نے باپ کو علاج کے لیے انڈیا لے جانے کا فیصلہ کیا اور وہ لیٹا ہوا تھا لندن کے ایک اسپتال میں۔

”کس سوچ میں گم ہیں سرکار؟“ احسن نے ڈرائیو

سن۔ تیرا ابا اسپتال سے آجائے تو ٹھیک... ورنہ نکاح کرانے کے لیے میں ہوں اور تیری ماں ہے۔“

”تایا جی، میرا ویزا تین مہینے کا ہے اور باقی سب کا بھی۔“

”اس کی فکر تو مت کر، یہاں نکاح کے ساتھ رجسٹریشن بھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد تیرا مسئلہ تو خود بخود حل ہو جائے گا۔ احسن برطانوی شہری ہے۔ تو بھی ہو جائے گی۔ اب کمالے اور بھابی کا یہ ہے کہ پہلے ویزا بڑھائیں گے۔ سال بھر کے لیے۔ ویسے تو یہاں دس لاکھ افراد بغیر ویزا کے رہتے ہیں۔ کبھی جا کے دیکھ بریڈ فورڈ... لگے گا کراچی میں ہے یا لاہور میں۔ ایسٹ اینڈ سارا ایشیائی لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ انڈین، بنگلہ دیشی، سری لنکا والے، تجھے شہریت ملے گی تو تیرے ماں باپ کو خود بخود مل جائے گی۔“

”مجھے یہ سب نہیں معلوم تایا جی، یہ قانونی معاملات ہیں۔“

وہ ہنسا۔ ”قانونی معاملات احسن سنبھال لے گا تو اپنی بات کر... احسن کا خیال ہے کہ شادی کے بعد اگر تو اس کے اسپتال میں نرسنگ کورس جوائن کر لے تو تعلیم کے لیے چار سال ملتے ہیں اور پہلے سال کے بعد تجھے اچھی خاصی تنخواہ ملنے لگے گی۔ اور چار سال کا کورس پورا کر لیا تو پھر تیری تنخواہ بھی احسن سے کچھ ہی کم ہوگی۔ اب یہاں کا نظام ایسا ہے کہ میاں بیوی دونوں کام کرتے ہیں۔ ایک کی آمدنی سے گھر نہیں چلتا۔“

شیما خاموشی سے سنتی رہی۔ یہ سب تقدیر کے کھیل تھے جس میں اس کی حیثیت ایک تماشاخی جیسی ہو کے رہ گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے مستقبل کا ساکھی احسن ہوگا مگر پھر وہ مستقبل وقت کے ساتھ ماضی کی دھند میں گم ہو گیا تھا۔ وقت کے شاطر ہاتھ نے بساط پلٹ دی تھی۔ حامد ایک مہرے کی طرح پٹ گیا تھا اور اس کی جگہ احسن نے لے لی تھی۔ زندگی کا ہر دن ایک نیا خواب لے کر طلوع ہوتا تھا۔ ایک صبح اچانک اسے پتا چلا کہ اب وہ انڈیا نہیں لندن جا رہی ہے۔ اور آج کی صبح اسے یہ بتانے کے لیے طلوع ہوئی تھی کہ اب وہ واپس نہیں جا رہی ہے۔ معلوم نہیں تقدیر کے اس کھیل کا انجام کیا ہوگا۔ اس نے بے بسی سے سوچا۔

☆☆☆

آپریشن کے بعد چھ دن شیما کی اپنے باپ سے ملاقات ہوئی۔ اس سے پہلے وہ اسے شیشے کی شفاف دیوار والے کیمین میں دو بار دیکھ چکی تھی۔ پہلی بار کیمین میں لیٹے

کرتے کرتے شوخی سے پوچھا۔

شیمہ چونکی۔ ”یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”دیکھو، میں تمہارا نامزد مجازی خدا ہوں۔ تم کو مجھ سے سوال کرنے کا حق حاصل نہیں۔ جہاں چاہے لے جاؤں تمہیں۔۔۔“

وہ ہنسی تو اسے احساس ہوا کہ اچانک اس کا دل کتنا ہلکا ہو گیا ہے۔ ”ابھی سے حکم چلانا شروع کر دیا۔ ویسی لڑکی سب سن لیتی ہے، ولایتی ہوتی تو جواب دیتی۔“ اس نے بے تکلفی سے شیمہ کے شانے کے گرد ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف کھینچ کے چوم لیا۔

شیمہ نے گھبرا کے کہا۔ ”یہ... یہ کیا بد تمیزی ہے۔ ہم سڑک پر ہیں اور تم ڈرائیونگ کر رہے ہو۔“

وہ ہنسا۔ ”یہاں اظہارِ عشق کوئی جرم نہیں۔ اس پر چالان بھی نہیں ہوتا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اپنی وہ محبت مل گئی ہے جو بچپن سے میرے خواب و خیال میں بسی ہوئی تھی۔“

”ڈائلاگ مت مارو۔ میری جگہ ہوتی تا کوئی کالی کلونی موٹی بھدی اُن پڑھ... تو بھاگ جاتے رسی تڑا کے...“

”یہ تو ہے۔ اب میں اپنی قسمت پر ناز کیوں نہ کروں کہ ایک سوکھی چوہیا کو اللہ میاں نے کیا چیز بنا دیا میرے لیے۔“

”اگر میں انکار کر دیتی... پھر...؟“

”پھر کیا، میں سمجھ لیتا کہ قصور میرا ہے جو اتنا عرصہ لاتعلقی رہا۔“ اس نے گاڑی روک دی۔ ”یہ کہاں لے آئے ہو تم مجھے؟“ شیمہ نے اپنے کپڑوں پر نگاہ کی۔

”میں نے ایک اسٹیریشنورنٹ میں ٹیمبل بک کرائی تھی۔ ڈنر کے لیے۔“

”مگر میرے کپڑے...“

وہ ہنسا۔ ”ہاں کپڑے واقعی بہت زیادہ ہیں۔ ابھی تم دیکھ لو گی کہ جو یہاں آتے ہیں وہ صرف ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کے شیمہ کو اتارا۔

یہ شیمہ کے لیے خواب جیسا منظر تھا۔ اسٹیرڈریائے ٹیز کی لہروں پر سبک خرامی سے رواں تھا۔ اس کے کناروں پر میزیں لگی ہوئی تھیں جہاں سے پانی میں روشنیوں کا عکس چراغوں کی طرح جھللاتا تھا۔ درمیان میں بونے ڈنر کا اہتمام تھا اور ایک آرکسٹرا جس میں زیادہ تر ٹیگرو اور کچھ

لڑکیاں تھیں بہت مدہم نُسروں میں موسیقی بکھیرتا تھا۔ جو میزوں پر بیٹھے تھے بیشتر نو جوان یا نو عمر لوگ تھے اور احسن نے مذاق میں جو کہا تھا درست تھا۔ خواتین میں کم سے کم لباس پہننے کا مقابلہ سامحسوس ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے حسن و شباب کی رعنائی کی نمائش میں ذرا کنجوسی یا جھجک کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور وہ جو اُن پر فریفتہ تھے مزید فریفتہ ہو رہے تھے۔ لیکن جیسا کہ مہذب اور روایت پسند انگریز قوم کی عادت ہے کوئی کسی کی طرف گھور کے بھی دیکھے تو بد تمیزی... شیمہ کے چمکتے ستاروں والے بلیو شلوار قمیص اور دوپٹے پر... جسے اس نے سر کے گرد لپیٹ رکھا تھا، کسی نے نظر بھی نہیں ڈالی۔

”کھانا تو محض خانہ پُری کی رسم ہوتی ہے یہاں... دراصل تو لوگ دل کی بات کہنے اور سننے آتے ہیں اور یہی میں بھی چاہتا تھا۔“ ایک ویٹریس کی نگرانی میں اپنی ٹیمبل پر پہنچ کے بیٹھنے کے بعد وہ بولا۔

”یہ تم نے اچھا کیا۔ کیونکہ باتیں مجھے کہنی تھیں اور سننی تھیں۔“

”یہاں ڈنر سے پہلے کچھ پینے کا رواج ہے درمیان کے ڈرنکس الگ ہیں۔“

اس نے احسن کو حیرانی سے دیکھا۔ ”تم بھی پیتے ہو؟ کیونکہ سب پیتے ہیں؟“

اس کا لہجہ دیکھ کے احسن نے بات پلٹ دی۔ ”کیسی باتیں کرتی ہو۔ چلو پھر کچھ کھانے کو لے آئیں۔“

کھانے کے دوران میں شیمہ نے کہا۔ ”احسن! میں ایک روایتی مشرقی لڑکی ہوں۔ یہاں ابا کو علاج کے لیے لائی تھی۔ بڑوں نے شادی کا طے کر لیا۔ غلط نہیں کیا لیکن میں ڈری ہوئی ہوں۔“

”میں سمجھتا ہوں مگر اب تم اکیلی نہیں ہو۔“ احسن بولا۔

”ہاں، میں اکیلی نہیں ہوں۔ پہلا مسئلہ تو یہی ہے۔ وہ گھر تو بہت چھوٹا ہے اور ابھی مجھے اپنا پتا نہیں کہ حکومت رہنے کی اجازت دے گی یا نہیں۔ اماں ابا کو واپس جانا پڑا... پھر وہاں تو ان کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔“

”اپنی بات مت کرو۔ جب تم سزا حسن ہو جاؤ گی قانونی طور پر بھی... تو برطانوی حکومت کیسے کہہ سکتی ہے کہ تم یورپ میں رہو گے اور تمہاری بیوی ایشیا میں، اب رہی گھر کی بات... تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میرا ایک اور اپارٹمنٹ بھی ہے۔ وہ میں کرائے دار سے خالی کرالوں گا۔“

لیکن اب دو چار دن کی بات ہے۔ ابائی بھی واپس چلے جائیں گے۔ چاچا جی کو اسپتال سے چھٹی ملے گی تو وہ اور چاچا یہاں آجائیں گے اور ہم اپنے گھر میں... گڈ نائٹ۔“ اس نے لندن اسٹائل میں پھر شیما کو کب کب کیا۔ اب اسے اجازت جو مل چکی تھی۔

نکاح کی تقریب میں احسن کے دو ساتھی شریک ہوئے۔ دو پاکستانی ڈاکٹر۔ ان میں سے ایک کی ولایتی بیوی تھی مگر خوش مزاج تھی۔ دوسرا بار بار آپہنچتا تھا کہ اس نے شیما کو پہلے دیکھا ہوتا تو احسن کو قتل کر دیتا۔ اسی اپارٹمنٹ سے ایک انڈین جوڑے کو بھی مدعو کیا تھا۔ قریب کے ایک کیونٹی سینٹر کی مسجد سے آنے والا نکاح خواں بھی نو جوان تھا۔ شیما خاموشی سے آنسو پیتی رہی۔ اس کی شادی ہو رہی تھی اور وہ قریب میں تنہا تھی اور اجنبی تھی۔ اس کا باپ آئی سی یو میں لیٹا ہوا تھا اور ماں نے اصرار کے باوجود آنے سے انکار کر دیا تھا۔

نکاح سے پہلے ہی احسن نے شادی کی رجسٹریشن کی درخواست دے رکھی تھی۔ دو گواہوں کے ساتھ وہ آج رجسٹرار کے آفس پہنچی۔ احسن نے اسے تمام طریقہ کار سمجھا دیا تھا۔ وہ پھر بھی نروس تھی۔ لیکن وہاں یہ معمول کی دفتری کارروائی تھی جو دس منٹ میں ختم ہو گئی۔ اب وہ قانونی طور پر بھی احسن کی بیوی تھی۔ شیما خود کو بادلوں سے اوپر اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اب وہ لندن میں رہتی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی بیوی تھی۔ اسے بہت کچھ یاد آتا تھا۔ اپنا دو کمروں کا چھوٹا سا مکان جو نا جائز تعمیرات میں شمار ہوتا تھا۔ اپنی گلی اور وہ محلہ... وہ سڑک جس پر کباڑی قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ وہ گندگی اور لاقانونیت، راہ چلنے والے ہر شخص کے لیے کسی انجانے خوف کا احساس کہ نہ جانے کب اور کہاں سے کوئی اس کو لوٹنے آجائے گا۔ اس کے نصیب کی گولی دل میں اتر جائے گی۔ فساد اور ہڑتالیں اور خوف کا آسیب۔ نو جوان جائز اور ناجائز طریقے سے برطانیہ، امریکا اور آسٹریلیا جانے کا ضرور سوچتے تھے لیکن وہ تو خدا سے دعا بھی نہیں مانگ سکتی تھی کہ خداوند... تیری قدرت میں کیا نہیں، بس مجھے لندن پہنچا دے۔ مگر وہ بھی کیسا بے نیاز ہے، بن مانگے ہی دے دیتا ہے۔

☆☆☆

شادی کے چوتھے دن وہ اپنی ماں کے ساتھ تھی۔ احسن کا باپ تو نکاح کے بعد دوسرے دن ہی امریکا لوٹ گیا تھا۔ ماں تیسرے چوتھے دن گھر آ کے نہادھو لیتی تھی اور

وہاں ہم رہیں گے اور جہاں میں اب ہوں وہاں تمہارے والدین... چاچا اور چاچا۔“ شیما کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ ”چلو، یہ تو ٹھیک ہے مگر کیا انہیں اجازت ملے گی؟“

”وہ میں لے لوں گا۔ اس کے معقول اسباب ہیں۔ ایک تو یہ علاج جو چل رہا ہے۔ چاچا جی کا بار بار چیک اپ کے لیے آنا مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں ان کی دیکھ بھال کرنے والا اب کوئی نہیں ہوگا۔ سال بھر کا ویزا تو آسانی سے بڑھ جائے گا اور اس دوران میں ان کی ذمہ داری لوں گا۔ اسپانسر شپ... یعنی تمام اخراجات کی ذمہ داری... اب حالات بدل گئے ہیں۔ امریکا، برطانیہ میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ بوڑھے ایک بوجھ بن جاتے ہیں حکومت پر... ان کو لاوارث نہیں چھوڑا جاسکتا جیسے ہمارے ملک میں ہوتا ہے کہ بھیک مانگو یا فٹ پاتھ پر رہو۔ لیکن کسی کا اسپانسر ہو تو حکومت کو پھر کیا اعتراض؟ وہ اب یہیں رہیں گے۔“

شیما عام لڑکی تھی جسے پاکستان کے قوانین کا علم نہیں تھا تو برطانیہ کے امیگریشن لاز کا خاک علم ہوتا لیکن اس نے دیکھ لیا تھا کہ دونوں خاندانوں کے درمیان خون کا رشتہ کتنا پائدار ہے کہ درمیان میں حائل سات سمندر اس کو ختم نہ کر سکے۔ یہ غالباً خون کا اثر تھا کہ احسن ڈاکٹر بن جانے کے باوجود بچپن کی مٹگنی پر قائم تھا اور اس نے کسی میڈان انگلینڈ لڑکی سے رشتہ نہیں جوڑا تھا۔ خالق و مالک تقدیر کے احسان کا شکر ادا کرنے کے لیے شیما کے پاس الفاظ نہیں تھے جس نے اسے حامد جیسے ہوس پرست اور بے ضمیر شخص کے ہاتھوں لٹنے سے محفوظ رکھا اور وہ جس کی امانت تھی، اس کے پاس پہنچا دیا۔

جب احسن نے اسے دوسری بار چوما تو شیما نے مزاحمت نہیں کی۔ جیسا دیس ویسا بھیجیں۔ اظہار محبت کے زیادہ جذباتی مظاہرے وہ دیکھ ہی رہی تھی۔ اب یہاں رہنا ہے تو احسن کی خاطر اسے خود کو بدلنا تو پڑے گا۔ لباس، رہن سہن، زندگی کے معمولات، طور طریقے، آخر وہ اس کا شوہر ہے۔ اس نے رات دو بجے احسن کے ساتھ کار میں بیٹھ کے سوچا اور آہستہ سے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

اس نے اپارٹمنٹ کے سامنے گاڑی روکی تو شیما کو خیال آیا۔ ”تم کہاں ہوتے ہو آج کل؟“

”رات میں اسپتال... دن میں ایک دوست کے اپارٹمنٹ میں جا کے سو جاتا ہوں کیونکہ وہ ڈیوٹی پر جاتا ہے

کپڑے بدل کے واپس چلی جاتی تھی۔ اسپتال کے کمرے میں کسی کو مقررہ وقت کے علاوہ جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ وہ وینٹک روم میں بیٹھ بیٹھ کے تھک جاتی تھی تو باہر کا چکر لگاتی تھی یا بارنگ کی کسی بیچ پر جاتی تھی۔ اس پر کسی کے سمجھانے کا اثر نہیں ہوتا تھا آپریشن سے پہلے وہ رات کو فلیٹ میں آ کے سو جاتی تھی مگر اب اس کا خوف ایک پاگل پن بن گیا تھا۔ وہ رات بھی وینٹک روم میں گزارتی تھی اور کئی بار ایسا ہوا کہ وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی یا گر گئی۔ اسپتال کا عملہ اسے نکال سکتا تھا مگر ان میں کچھ انسانیت کی رمت باقی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس عورت کے پاس واقعی نہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے نہ ہوٹل میں قیام کی گنجائش۔

شیمانے پھر اسے سمجھانا چاہا۔ ”دیکھو ماں، ابا کا آپریشن کامیاب رہا۔ اب دو چار دن میں گھر آ جائے گا۔“

”پھر میں بھی گھر آ جاؤں گی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

شیمانے خفگی سے کہا۔ ”نہیں، پھر تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔ ذرا اپنی حالت دیکھو کیا ہو رہی ہے۔“

”کچھ نہیں ہو رہا ہے مجھے شیمانے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”تم برسوں کی بیمار لگتی ہو۔“

اس کی حلقوں میں دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں پرانی شکستہ قبروں جیسی تاریک اور بے جان تھیں جو بھی سنگ مرمر کی لوح اور بناوٹ رکھتی ہوں۔ شیمانے کو یاد تھا کہ اب سے دس سال پہلے بھی وہ اپنی عمر سے دس سال کم لگتی تھی اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی شیمانے کی بڑی بہن نظر آتی تھی مگر پھر پے در پے ہونے والے جذباتی صدموں نے اسے اندر سے بیمار کر دیا۔ ایک بیٹے سے جدائی کا غم وہ سہار گئی مگر دوسرے کا صدمہ اسے یوں لے کے بیٹھ گیا جیسے زلزلے میں کھڑی رہنے والی دیوار بعد میں آنے والے خفیف سے صدمے سے زمیں بوس ہو جائے۔

شیمانے کیسے اندازہ کر سکتی تھی کہ عورت کیسا محسوس کرتی ہے جب ایک ایک کر کے زندہ رہنے کے سارے بہانے ختم ہوتے جائیں۔ خوف اور اندیشوں کے بڑھتے ہوئے تاریک سایوں میں امید کی ایک روشن کرن بھی بجھتی نظر آئے۔ اس نے ایک وجود کو زندگی دی تھی مگر اسی کرۂ ارض پر کہیں موجود ہونے کے باوجود اتنا ہی اجنبی ہو جتنا لندن کی سڑک پر پھرنے والا کوئی بھی راہ گیر۔ وہ تو یہ بھی سوچتی ہو گی کہ انہی میں کہیں وہ نظر آئے اور پہچانا نہ جائے۔ دوسرے کو زندگی کے احساس سے خارج کر دینے کے بعد

اب اس کے لیے جینے کا کوئی بہانہ تھا تو وہ اس کا جیون ساتھی تھا۔ اب تو شیمانے پرانی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا جیون ساتھی اور زندگی کا مقصد سب الگ کر لیا تھا۔ ایسے میں یہ خوف بڑا سوہان روح تھا کہ کمال دین نہ رہا تو وہ کہاں رہے گی اور کیسے... اور یہ کہ کیوں رہے گی؟

ماں کا ہر وقت اسپتال میں شوہر کے قریب رہنا بے فائدہ تھا لیکن وہ کمال دین سے دوری کو محسوس کرتی تھی۔ اسے نہ کسی چیز کی ضرورت تھی نہ کسی تکلیف کا احساس تھا۔ شیمانے طے کیا کہ وہ احسن سے کہہ کے ماں کا بھی مکمل چیک اپ کرائے گی۔ اور ضروری ہوا تو علاج بھی۔ امید یہ تھی کہ اگلے ہفتے خود کمال دین کو بھی اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔ شیمانے کے لیے خود شادی کر کے یہاں بس جانا اور ماں باپ کو اکیلے رہنے کے لیے پاکستان بھیج دینے کا کوئی تصور نہ تھا۔ یہ تو احسن کی اور تایا جی کی یقین دہانی تھی اور ایک جذباتی دباؤ تھا جس کے تحت اسے فوری طور پر نکاح اور شادی کا فیصلہ قبول کرنا پڑا۔ ابھی تک اسے یقین تھا کہ ماں باپ بھی اس کے قریب ہی رہیں گے۔ لیکن بغرض محال ایسا نہ ہو سکا تو؟... یہ خیال ہی شیمانے کے قدم اکھاڑ دیتا تھا۔

اسی شام کمال دین جو اطمینان بخش طریقے پر صحت یابی کی طرف جا رہا تھا، اچانک مر گیا۔ پاکستان ہوتا تو لواحقین فرط جذبات میں ہنگامہ کرتے مگر یہاں یہ سب ناممکن تھا۔ شیمانے خود ان تجربہ کار قابل ڈاکٹروں سے کیا بحث کرتی جو کمال دین کی صحت یابی کے عمل میں اول تا آخر شریک تھے۔ وہ اپنا کام نیک نیتی اور تندہی سے کر رہے تھے۔ بے یقینی کا غیر متوقع عنصر تمام میڈیکل سائنس کی کرشمہ سازی میں موجود تھا۔

ایک قدرے عمر رسیدہ ڈاکٹر نے اسے روتے دیکھ کر نرمی سے کہا۔ ”یہ خدائی فیصلے ہیں۔ وہ اڑنے والا جہاز ہوا ٹریک پر دوڑتی ٹرین... کبھی اچانک غیر متوقع اور ناقابل تصور لمحہ آ جاتا ہے۔ ٹرین الٹ جاتی ہے جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ انسان کے جسم کی مشینری تو زیادہ کمپلیکس ہے۔“

دوسرے ڈاکٹر نے بات کو مختصر کیا۔ ”ہم دیکھیں گے کیا ہوا اور تمہیں بتا دیں گے اگر تم جاننا چاہو گی۔ اگرچہ وہ بہت پیچیدہ اور ٹیکنیکل رپورٹ ہو گی۔“

شیمانے کے لیے سب بیکار تھا۔ کہانی دو لفظوں کی تھی۔ ڈاکٹروں نے شفا کی کوشش کی اور ناکام ہو گئے۔ اسپتال میں زندگی اور موت کی یہ آنکھ پھولی دن رات جاری رہتی ہے۔ شیمانے کے لیے بھی یہی حادثہ تھا جس کے بارے میں وہ

آٹے کی بوری

مجسٹریٹ ملزم سے: ”تم نے آٹے کی ایک بوری کیوں اٹھائی؟“
ملزم: ”جناب میں ایک بوری سے زیادہ اٹھا نہیں سکتا تھا۔“

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

جائے؟“

شیمانے کہا۔ ”یہی بہتر ہے۔ اس طرح کبھی میں بھی جاسکوں گی ان کی قبر پر...“
اصل آزمائش کا مرحلہ شیمانے کی ماں کو بتانے کا تھا مگر انہیں بڑی حیرانی ہوئی جب یہ خبر سن کے اس کا کوئی خطرناک رد عمل سامنے نہیں آیا۔ وہ کچھ دیر خلا میں دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ ”کمالا مر گیا۔ مجھے پتا تھا اس نے مرجانا ہے۔“
خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد احسن بولا۔ ”چاچی! آپ نے تو اب ہمارے ساتھ ہی رہنا ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ چاچا جی کی تدفین یہیں مسلمانوں کے قبرستان میں کر دی جائے۔“

وہ ایک دم بگڑ گئی۔ ”لو، تم کون ہوتے ہو یہ فیصلہ کرنے والے، کمالے نے کہا تھا کہ وہ مرجائے تو اسے لاہور مزنگ والے قبرستان لے جانا... وہاں اس کا باپ اور دادا بھی دفن ہیں۔“

وہ رو رہی تھی اور نہ چیخ پکار کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے سب معلوم تھا کیا ہونے والا ہے اور اس کو کیا کرنا ہے۔ اب بحث سے کچھ حاصل تھا نہ تاخیر سے۔ احسن نے بڑی دوڑ بھاگ کی اور سارے مراحل طے کر لیے۔ تیسرے دن وہ واپس پاکستان جا رہی تھی تو اسے باہر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بس ایک بیکراں تنہائی کا خلا تھا جس میں زندہ آنے والا کمال دین لکڑی کے صندوق میں بند عام مسافروں سے الگ کولڈ اسٹوریج میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی جگہ احسن نے لے لی تھی۔

لاہور میں کمال دین کی مزنگ کے قبرستان میں تدفین بھی ایک میکانیکی عمل تھا۔ جس میں جذبات کا دخل نہ تھا۔ ائر پورٹ سے وہ ایک ائر کنڈیشنڈ ایسولینس کے پیچھے چلنے والی ائر کنڈیشنڈ کار میں تھے۔ وہ کار باہر کھڑی رہی۔ صرف چار افراد نے تابوت نکالا اور سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے قبرستان کی ایک دیوار میں بنے راستے سے اندر لے

سوچتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔

احسن نے اسے روک دیا تھا کہ فی الحال ماں کو کچھ نہ بتائے۔ ”پہلے ہم سوچ لیں اور طے کر لیں کہ جب اسپتال والے ڈیڈ باڈی ہمارے حوالے کریں گے تو ہم کیا کریں گے۔“

سکون آوردوا کے باوجود وہ کانپ رہی تھی۔ ”وہی جو سب کرتے ہیں، تدفین۔“

”اگر تمہاری ماں نے کہا کہ میں تو میت لے کر پاکستان جاؤں گی... پھر؟“

”پھر یہی کرنا پڑے گا۔“

”اس میں بہت سے قانونی مرحلے آئیں گے۔ خیر ان سے میں نمٹ لوں گا۔ اسپتال سے باڈی انٹرنیشنل فلائٹ کے لیے پاکس میں بند کر کے دی جائے گی پھر کارگو والوں سے بکنگ لینی ہوگی۔ تمہاری ماں ساتھ جائے گی۔“
”وہ اکیلی تو نہیں جائیں گی۔ ہم بھی ساتھ جائیں گے اور تمہاری دیکھ بھال کی ضرورت ماں کو راستے میں بھی ہو گی۔“

احسن نے کہا۔ ”شیمانے! اس وقت اسپتال میں ایمر جنسی ہے۔“

وہ چلانے لگی۔ ”میں یہ سب نہیں جانتی۔“

”آہستہ آہستہ... احسن نے اسے چکارا۔“ دیکھو ایک پرابلم ہے جو ہم مل کے حل کریں گے۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا خواہ مجھے نوکری چھوڑنی پڑے لیکن تمہاری ماں سفر کے قابل نہیں ہے۔“

”پھر؟ کیا ہم ڈیڈ باڈی کو کچھ عرصہ کولڈ اسٹوریج میں رکھ سکتے ہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ویزے پر آنے والوں کو یہ سہولت نہیں ملتی۔ ان کو فوراً واپس ان کے ملک بھیجنا ضروری ہے۔“

”احسن مجھے مت ڈراؤ، ماں کو راستے میں کچھ ہو گیا... پھر؟“

احسن نے کہا۔ ”اسی لیے ایک تجویز یہ ہے کہ چاچا جی کی تدفین یہیں کر دی جائے۔ وہاں اب کون ہے تمہارا جس کے لیے اتنا ترڈ کیا جائے۔ چاچا کو بعد میں یہیں رہنا ہے۔ یادہ جائیں اور شوہر کو دفن کر کے آئیں۔“

”شاید پاکستان میں تدفین کے بعد ماں نہ آئے، وہ میرے لیے مسئلہ ہوگا۔“

”گو یا تم اتفاق کرتی ہو مجھ سے کہ انہیں یہیں دفن دیا

گئے۔ شیمانے کار میں سے ”مزار غازی علم الدین شہید“ کا چھوٹا سا بورڈ اور لہرانے والا جھنڈا دیکھا۔ کسی زندہ لاش کی طرح اس کی ماں اپنے سامنے خلا میں گھورتی رہی۔ سارا راستہ اس نے کچھ بھی کھایا یا پیا نہیں تھا اور نہ کچھ بولی تھی۔

شیمانے کے دماغ میں بے ترتیب واقعات کی ایک فلم چل رہی تھی۔ اس کی زندگی میں جو کچھ ہو رہا تھا اس نے پہلے کسی کی زندگی میں ہوتا نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ اتنی بڑی دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ اس کی نظر میں وہ دن اور وہ منظر ٹھہر جاتا تھا جب اس نے باپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تھا کہ وہ حامد سے شادی کرنا چاہتی ہے اور وہ جیسے اسی وقت کا منتظر تھا کہ اجازت دے اور اپنی زندگی کی بساط لپیٹ دے۔ بعد میں جو ہوتا رہا، شیمانے کی مرضی اس میں شامل نہ تھی۔ اس کی تقدیر کے فیصلے دوسروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ علاج کے لیے انڈیا جانے کا، گھر بیچنے کا، پھر تاجی کا فون آنے اور ان کے لندن میں تمام انتظامات ہونے کا، اس کے بعد احسن سے ملنے اور شادی تک اور اب کمال دین کی لاہور میں ایسی تدفین تک... شیمانے اپنے تصور میں بھی ایسا سوچ سکتی تھی نہ کر سکتی تھی۔ اس نے گلی محلے میں متعدد جنازے اٹھتے دیکھے تھے۔ سوگواروں کے سوم، چہلم دیکھے تھے۔ ایک وہ تھی اور اس کی ماں کہ قبرستان کے باہر ایک آرکنڈیشنڈ کار میں بیٹھی تھیں جبکہ اندر کہیں کمال دین کو چار افراد جس میں تین کرائے کے اجنبی تھے۔ زمین میں دبا رہے تھے۔ تدفین کوئی ایسی ہوتی ہے؟ معلوم نہیں احسن کو نماز جنازہ کا خیال آیا کہ نہیں۔ کیا کوئی تدفین کے بعد دعائے مغفرت کرے گا؟ قبر پر پھول ڈالے گا۔ پچاس ساٹھ سال قبل لاہور سے فکرِ معاش میں کراچی جانے والا کمال دین واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کے باپ دادا کے علاوہ اس کو یہاں خوش آمدید کہنے والے نہ جانے کتنے ہوں گے۔ ایک طرف سے ٹھکن سے بے حال احسن نمودار ہوا اور گاڑی کی اگلی سیٹ پر گر گیا۔ اس نے ٹیکسی کیب کو کسی ہوٹل کا نام بتایا۔ ٹیکسی خاموشی سے آگے بڑھی۔ کمال دین پیچھے رہ گیا۔

”احسن تم نے نماز جنازہ کا بندوبست کیا تھا؟“ شیمانے نے پوچھا۔

”ہاں، اندر مسجد ہے۔ فاتحہ خوانی بھی ہو گئی تھی۔ ظہر کی نماز میں کچھ لوگ شریک تھے، وہ آگئے تھے۔“

شیمانے خاموشی سے روتی رہی۔ اس کی ماں زندہ لاش کی طرح پڑی اپنی سوالیہ نظریں ادھر ادھر گھماتی رہی۔ یہ سب

کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے آخر؟ کوئی مجھے بتائے گا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ وہ ایک دم ہنس پڑی۔ احسن چونکا اور اس نے گاڑی کو ایک کیمسٹ کی دکان کے سامنے روک لیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے پاس ایک سرنج تھی اور ایک انجکشن... شیمانے سے پوچھے بغیر اس نے مضبوطی سے چاچی کا بازو پکڑا اور اس میں انجکشن کی سوئی اتار دی۔ چاچی اس وقت بھی ہنس رہی تھی۔

انہوں نے ہوٹل میں دو کمرے لیے تھے۔ ایک ڈبل اور ایک سنگل۔ ڈبل میں ماں کے ساتھ رات بھر شیمانے ہی۔ وہ خود اتنی تھکی ہوئی اور صدمے سے بد حال تھی کہ رات کا کھانا کھاتے ہی سو گئی۔ باپ کی موت کے بعد سے اب تک اس نے سخت ذہنی اذیت جھیلی تھی لیکن... درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ بالآخر اس نے صورتِ حال کو قبول کر لیا تھا۔ باپ کی موت کے بارے میں پہلے تشویش تھی۔ پھر علاج کی سبیل ہوئی تو شک اور خوف کا عنصر اس میں ہمیشہ شامل رہا۔ لندن میں ڈاکٹر زیادہ بات نہیں کرتے تھے اور احسن خود ڈاکٹر تھا۔ اس نے کبھی حامد کے سفاک لہجے میں اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی۔ خواہ جانتا وہ بھی ابتدا سے ہو کہ ایسے کیس میں اور اس مرحلے میں کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا۔ خوف کا آخری مرحلہ گزر جانے کے بعد ڈرنے کو کیا رہ گیا تھا۔

شیمانے حقائق سے سمجھوتا کر لیا۔ یہی صورتِ حال اگر انڈیا میں پیش آتی اور ان کے ساتھ حامد ہی ہوتا تو کتنا برا ہوتا۔ اب کم سے کم وہ بے سہارا نہیں تھی۔ اس کے سامنے وہی مستقبل تھا جس کی آرزو اس کے باپ نے بہت پہلے کی تھی۔ مرنے سے پہلے وہ ایک مطمئن شخص تھا کہ اس کی بیٹی اپنوں میں ہے۔ اور اول تا آخر احسن نے رفاقت کا حق ادا کر دیا تھا۔ فکر اسے تھی تو صرف ماں کی... وہ صبح اٹھی تو اس نے ضد شروع کی۔ ”مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ یہاں میرا کون ہے؟“

ناشتا کرتے ہوئے احسن نے اس کی بات سنی۔ ”ہماری بنگلہ اسلام آباد سے ہے۔“

شیمانے نے کہا۔ ”فلائٹ جائے گی تو کراچی سے۔ ہم وہاں رک سکتے ہیں۔“

احسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے جاب چھوڑنے کی دھمکی دے کر چار دن کی چھٹی لی تھی۔ مجھے ہر حال میں کل جوائن کرنا ہے۔“

”اچھا تو تم جاؤ۔ میں تاریخ آگے بڑھوا لیتی ہوں،

شیمہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ڈائری لکھنے پر ماں کے گلے میں ایک نیپلس کے ساتھ جو وہ ہر وقت پہنے رہتی تھی ایک پلاسٹک کوننگ والا کارڈ لگا دیا تھا جو اس کی گردن کے پیچھے رہتا تھا۔ اس پر شیمہ کا نمبر بھی تھا اور لندن میں احسن کا بھی۔ یہ احتیاط اس لیے ضروری تھی کہ کہیں وہ دماغی رو بہک جانے سے باہر نکل جائے تو بھٹکتی نہ پھرے۔ یہ صرف احتیاط تھی۔ شیمہ نہیں سمجھتی تھی کہ اس کی ضرورت کبھی پیش آئے گی۔

شیمہ کی ماں کے لیے دوائیں کوئی علاج ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔ جب تک ان کا اثر باقی رہتا، وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی پھر بولنا شروع کر دیتی تھی۔ وہ فرض کر لیتی تھی کہ کمال دین زندہ ہے اور اس سے باتیں کرتی تھی یا شیمہ سے کہتی تھی کہ وہ کھانا بنانے میں دیر کیوں کر رہی ہے۔ اس کا باپ آنے والا ہے اور وہ سارا دن کا بھوکا ہوتا ہے۔ کسی خود کار طریقے پر اس کے حافظے سے لندن جانے آنے کا سارا واقعہ یوں صاف ہوا تھا جیسے پیش ہی نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر اسے شارٹ ٹرم ڈمیخیا کہتے تھے۔ لانگ ٹرم میں تین ماہ سے پہلے کی باتیں بھول جاتی تھیں۔

تیسرے دن صبح کے وقت شیمہ نے ماں کے بیڈ کو خالی پایا۔ اس نے آواز دی اور پھر اٹھ کے باہر دیکھا۔ مکان کی گلی کا نیات دو ہی کمرے تھے۔ وہ دوسرے کمرے میں بھی نہیں تھی جو پہلے اس کا اور کمال دین کا تھا۔ صحن کا دروازہ کھلا دیکھ کے شیمہ کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے گلی میں دیکھا۔ پاس پڑوس سے پوچھا اور سمجھ گئی کہ ماں رات کے کسی وقت گھر سے نکل گئی ہوگی۔ اتنے بڑے شہر میں اس کا کوئی ٹھکانا ہوتا تو شیمہ وہاں سے پوچھتی۔ وہ سیدھی پولیس اسٹیشن گئی۔ تھانے دار کی عدم موجودگی میں ایک محرر ہی تھانے دار بنا دوں گے رہا تھا۔

شیمہ کے سوال پر وہ ناراض ہونے لگا۔ ”لو جی تھانے دار صاحب کیا میرے ماتحت ہیں کہ مجھے بتا کے جاتے۔ سارے علاقے کے بادشاہ ہیں، گشت پر نکلے ہیں۔“ شیمہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اور تم موجود ہو تو سو رہے ہو۔“

”قاتلو بات مت کرو بی بی، کون ہو تم؟ کسی حوالاتی کی کچھ لگتی ہو؟“ اس نے اندر تاریک گلی کی طرف نگاہ ڈالی جس کے آخر میں سلاخوں کے پیچھے انسانی سائے سے متحرک تھے۔

”گل زیب خان۔“ شیمہ نے وردی پر سے اس کا

ایک ہفتے کے لیے۔“

اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلا دیا۔ ”اوکے، تم کراچی سے امارات کی فلائٹ بھی لے سکتی ہو۔ ٹریول ایجنٹ سب انتظام کر دے گا۔ اچھا ہے چاہی کو ایک ہفتے کا بریک مل جائے گا۔ ابھی ان کی حالت سفر کے قابل نہیں تھی۔“

☆☆☆

اپنے گھر پہنچ کے خود شیمہ کو ایک پُر آسب اجنبیت کے احساس نے گھیر لیا۔ یہ گھر جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا اور جس سے گزری ہوئی تمام یادیں وابستہ تھیں اب اسے کانٹے کو دوڑتا تھا۔ کمال دین کے انتقال کی خبر پہلی تو محلے کی عورتوں نے آنا شروع کیا۔ شیمہ کی ماں کے دماغ پر اثر تو لندن میں ہی ہو چکا تھا جب اس نے شوہر کی بیماری اور پھر موت کو برداشت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اب اس کا اثر بڑھتا جا رہا تھا جو شیمہ کے لیے بڑی تشویش کی بات تھی۔

اچانک اس کے ذہن نے پلٹا کھایا اور اس نے شوہر کی موت کی حقیقت کو جھٹلانا شروع کر دیا۔ اس نے گھر آنے والی عورتوں سے لڑنا شروع کر دیا۔ ”کون بکواس کرتا ہے کمال مر گیا۔ وہ تو کام پر گیا ہوا ہے۔“ وہ ہر ایک سے کہتی اور پھر انہیں کوستی کہ برا چاہنے والوں کا بیڑا غرق ہو۔ اسے بیوہ بنانے والی خود بیوہ ہوں۔ اس کی ذہنی کیفیت کو سب ہی سمجھتے تھے۔ احسن کی دی ہوئی دوائیں اپنا اثر کھور ہی تھیں۔ وہ تیسرے دن ماں کو بہلا پھسلا کے ایک اچھے نیوروفزیشن کے پاس لے گئی۔ ساری بات سن کے وہ بھی دوائیں ہی دے سکتا تھا۔ اس کی حالت ایسی بہر حال نہ تھی کہ اسپتال یا پاگل خانے میں داخل کرانے کا مشورہ دیا جائے۔

شیمہ کے پاس احسن کا فون ہر رات آتا تھا۔ اس صورت حال سے وہ بھی پریشان تھا۔ ”آخر کب تک ایسے رہو گی تم وہاں، بہتر ہے ماں کو ساتھ ہی لے آؤ۔“

”کیسے لے آؤں احسن، ایک تو ان کی حالت ایسی نہیں... دوسرے شاید ان کو پھر ویزا نہ ملے۔ یہاں کوئی ہے نہیں جس کے آسرے پر ماں کو چھوڑوں۔“ شیمہ نے ماں کی ذہنی کیفیت بتائی۔

”میرا خیال ہے انہیں وہاں لے جانا ہی غلطی تھی۔ خیر، اب کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ میری مانو تو ان کے لیے دوبارہ ویزا لو، مکان کو ٹھکانے لگا دو اور آ جاؤ۔ نہ وہاں تم اکیلی رہ سکتی ہو نہ یہاں تمہارے بغیر میں...“ احسن نے کہا۔

نام پڑھ کے کہا۔ ”میں لندن کے ڈاکٹر احسن جمال کی وائف ہوں، ایک برٹش نیشنل... مجھے اپنی والدہ کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانی ہے۔“

وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ ”خیر سے مجھے بتاؤ والدہ صاحبہ کب غائب ہوئیں۔ ان کی عمر اور دماغی حالت کیسی ہے؟“

”ان کی دماغی حالت اطمینان بخش نہیں ہے اور وہ صبح سے غائب ہیں۔“

وہ بال پوائنٹ رکھ کے پھر نیم دراز ہو گیا۔ ”صبح تو ابھی ہوئی ہے جی آپ بھی کمال کرتے ہو، آجائیں گی گھوم پھر کے واپس۔“

”تمہارا کام صرف رپورٹ لکھنا ہے جو میں لکھواؤں اور تمہارا کام ہے ان کو تلاش کرنا۔“

”او میڈم جی، یہ ولایت نہیں، پاکستان ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے سے پہلے تو گھر سے بھاگنے والی لڑکی کے اغوا کی رپورٹ نہیں لکھتے، کل آنا اگر والدہ صاحبہ لوٹ کے نہ آئیں۔ کل تک دیکھ لو خود انہیں کہ کہاں جاسکتی ہیں۔“

سخت پریشانی اور مایوسی میں اس نے حامد کو فون کیا۔ ”حامد میں شیما بول رہی ہو۔“

”کہاں سے، لندن سے... مگر نمبر تو پاکستان والا تھا۔“

”میں واپس آگئی ہوں۔ ابا کا آپریشن ناکام ہو گیا۔ ان کی تدفین لاہور میں ہوئی۔“

”اوہ آئی ایم سوری۔ ابھی تو میں کورٹ پہنچا ہوں، شام کو آ جاؤ۔“

اس نے جلدی سے کہا۔ ”حامد! میں تھانے گئی تھی ایک رپورٹ لکھوانے، امی لاپتا ہیں ان کے دماغ پر صدے کا اثر ہے۔ مگر تھانے والے کہتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے سے قبل گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھی جاسکتی۔“

”وہ ٹھیک کہتے ہیں، یہاں سنکسل کمزور ہے۔ تمہاری آواز کٹ کٹ کے سنائی دے رہی ہے۔ ہاں قانون یہاں کا ایسا ہی ہے۔ ہیلو، ہیلو شیما...“

”ہاں میں سن رہی ہوں۔“ شیما نے کہا مگر دوسری طرف سے ہیلو ہیلو کرنے والے حامد کی آواز بند ہو گئی۔

شیما تھانے کے سامنے والے فٹ پاتھ پر تنہا اور لاوارث کھڑی رہ گئی۔ اب وہ کیا کرے۔ کس سے مدد لے، اس نے مایوسی میں واپس گھر جانا ہی بہتر سمجھا۔ کیا پتا وہ کچھ دیر بھٹکنے کے بعد گھر لوٹ آئیں۔ اس نے ایک فضول سی

امید کا سہارا لیا۔ کیونکہ یہاں کھڑے رہتا بھی لا حاصل ہی تھا۔ اس نے گھر پہنچ کے وقت دیکھا۔ لندن میں صبح کے چھ بجے ہوں گے۔ کوئی بات نہیں۔ اسے ایک گھنٹا پہلے جگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایمر جنسی ہے۔ وہ مدد نہیں کر سکتا کم از کم اپنی بیوی کو تسلی تو دے سکتا ہے۔

دوسری طرف سے کسی عورت نے نیند کے خمار میں ڈوبی آواز میں کہا۔ ”ہے... لو...“

”کون...؟ آپ کون ہیں۔ شاید مجھ سے غلط نمبر مل گیا۔ مجھے ڈاکٹر احسن سے بات کرنی تھی۔“

”نمبر ٹھیک ہے ہنی... لو بات کرو۔“ وہ بولی اور شیما نے اس کی آواز سنی۔ ”آحسن... کال فار یو۔“

ریسیور میں احسن سوتے سوتے بولا۔ ”صبح صبح کون ہے۔ ٹال دینا تھا۔ ہیلو۔“

”احسن، میں شیما بول رہی ہوں... پاکستان سے۔“

وہ مستعد ہو گیا۔ ”ہاں شیما، خیریت ہے نا، صبح صبح یہ کال۔“

”احسن، امی لاپتا ہیں گھر سے نکل گئی ہیں رات کو۔ تم تو جانتے ہو ان کی ذہنی کیفیت۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”اوہ، سوری۔ پریشانی کی بات تو ہے، رپورٹ کی تم نے؟“

”میں گئی تھی مگر وہ چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد گمشدگی تسلیم کرتے ہیں۔ سب کہتے ہیں جاننے والوں کے گھر دیکھو مگر ہمارا کون جاننے والا ہے یہاں۔ ابھی میں گھر پر انتظار کر رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ گھوم پھر کے اسپتال اور ایڈمی ہوم وغیرہ میں دیکھوں... اور تصویر دے دوں... اپنے فون نمبر کے ساتھ۔“

”ہاں کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا اچھا ہے لیکن میری مانو تو لاہور جاؤ۔ میرا دل کہتا ہے وہ وہیں گئی ہوں گی۔ چاچا جی کی قبر پر۔“

احسن کی بات شیما کے دل کو لگی۔ ”یہ ہو سکتا ہے بلکہ یہی ہوا ہوگا۔ میں گھر کھلا چھوڑ کے کسی کو یہاں بٹھا جاتی ہوں اگر وہ آئیں جس کی امید کم ہے تو ان کو روک لے۔ سوری مجھے مزید دیر ہوگی واپسی میں۔“

”نو پرا بلیم، سوری کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔“

”احسن، یہ عورت کون تھی؟ جس نے فون ریسیو کیا؟“

”وہ... صفائی کرنے والی، آج بہت صبح آگئی۔

کہیں جانا تھا اسے۔“

”اس نے تمہاری کال کیوں ریسیو کی؟ اور پہلے تو

کوئی میڈ نہیں دیکھی میں نے جب میں وہاں تھی؟“

”اب تم نہیں ہو تو یہ نیا گھر صاف رکھنا پڑتا ہے۔ اس

کے لیے رکھی ہے۔ فون ذرا دور پڑا تھا اس لیے اس نے کال

ریسیو کر کے مجھے دے دیا۔ اچھا، خدا حافظ۔“

شیماء کے دل میں احسن کے جواب سے خلش اور بڑھ

گئی۔ کسی ملازمہ کی کیا مجال کہ کسی دوسرے کی کال ریسیو

کرے۔ وہ فون اٹھا کے ضرور دے سکتی تھی اور کام کرنے

والی صبح چھ بجے چہ معنی دارد... کہیں جانا تھا تو نہ آتی کام کے

لیے اور پھر اس کا لہجہ... نیند میں ڈوبا ہوا، شیماء کے لیے یہ

عذر گناہ بدتر از گناہ والی بات تھی۔ ضرور یہ کوئی سابق چہیتی

ہوگی۔ گرل فرینڈز کے بارے میں شیماء نے بھی بات نہیں کی

تھی مگر لندن میں یہ کون سی انوکھی بات تھی۔ چار دن بھی صبر

نہیں ہوا۔ کیا ایسے ہی ہوتے ہیں سب شوہر۔“

اس کے دل میں چبھا ہوا بے سکونی کا کاٹنا موجود رہا

جو اسے یاد دلاتا رہا کہ اب اسے واپس اپنے شوہر کے

پاس پہنچنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ وہ نظریہ

ضرورت کے تحت اپنی گرل فرینڈز یا کسی مہمان کو ہر شب

بلا تا رہے گا اور اس سے بھی جھوٹ بولتا رہے گا، اسی نظریہ

ضرورت کے تحت... شیماء دو مخالف دنیاؤں میں تقسیم ہو

کے رہ گئی تھی اور کسی ایک کو چھوڑنا اس کے اختیار کی بات

نہیں رہی تھی۔ اس نے وہ سارا دن چند سرکاری اسپتالوں

اور ایڈمی ہوم جیسے اداروں میں پھر کے گزارا۔ اس نے ہر

جگہ کسی منتظم کو اپنی ماں کی تصویر کی ایک کاپی دی جس کے

پیچھے اپنا فون نمبر تھا کہ وہ یہاں لائی جائے تو اسے مطلع کر

دیا جائے۔ وہاں اتنی افراتفری اور بے حسی تھی کہ انہوں

نے تصویر لے کر دراز میں ڈال دی اور شیماء سے کسی

ہمدردی کے بغیر ”اچھا جی“ کہہ دیا۔ ان کے نزدیک یہ کوئی

افسوسناک سانحہ تھا تو شیماء کے لیے۔ شہر میں ایک پاگل

بڑھیا کی کیا اوقات تھی جہاں ہر روز جوان بیٹے اور شوہروں

کے بور یوں میں سے بند لاشے ملنا ایک معمول تھا۔ کوئی

آخر کس کس کے لیے دکھی ہو۔

وہ رات کی فلائٹ سے لاہور جا سکتی تھی مگر اس کے

سامنے بہت سے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بھی ایک

معاشرتی البیہ تھا کہ تمام معتبر حوالے رکھنے کے باوجود وہ کسی

ہوٹل میں قیام کے لیے ایک کمر نہیں حاصل کر سکتی تھی۔ شام

...

کو وہ گھر کا چکر لگا کے احمد صاحب کی طرف چلی گئی۔ اسے

صاف محسوس ہوا کہ حامد محض رکی اخلاق برت رہا ہے۔ وہ

بھی شاید احمد صاحب کی وجہ سے۔ شیماء نے بھی اسے احسن

سے شادی کے بارے میں نہ بتانا ہی بہتر سمجھا۔ فرصت

ہوتے ہی احمد صاحب نے اسے بلا لیا۔

”بھئی شیماء، کیسی ہو۔ واپس آگئیں؟ تمہارے والد

کیسے ہیں اب؟“ انہوں نے ایک ہی سانس میں پوچھا۔

شیماء نے مختصر انہیں سب بتا دیا اور چائے پیتی رہی۔

احمد صاحب کے شفیق چہرے پر دکھ واضح نظر آیا۔

”بھئی بہت افسوس ہوا مجھے۔ حقیقت ہے لیکن یہ

خدا کی فیصلے ہیں۔ اب تم لاہور جا رہی ہو، خدا کرے ماں

تمہیں مل جائے لیکن نہ ملی تو کیا کرو گی تم؟“

”میں واپس چلی جاؤں گی سر... اپنے شوہر کے

پاس۔“

وہ چونکے۔ ”شوہر... گویا شادی بھی کر لی تم نے

لندن میں... کون ہے وہ؟“

”میرا کزن ہے سر، بچپن سے یہ معنی ملے تھے۔ وہ

ایک اسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا تھا

کہ میں ابا کو انڈیا کے اپالو اسپتال کے بجائے لندن لے

جاؤں۔“

وہ کچھ دیر چپ رہے۔ ”چلو، جو ہوا سو اچھا ہوا۔

شادی تمہارا بھی ذاتی معاملہ تھا اور حامد کا بھی۔ لیکن یہ حیرانی

ضرور تھی مجھے کہ حامد اس وقت مجھے ساتھ لے گیا تھا، اسے

جلدی تھی۔ دنیا واقعی ہم جیسے بوڑھوں کو بہت تیز رفتار لگتی

ہے۔ تم نے بھی دوسری جگہ شادی کر لی... اس نے بھی...

یقیناً تم نے اپنا فائدہ دیکھا، اس نے اپنا۔ پرانے وقتوں

کے قول و قرار اور عہد و پیمان محض جذباتی باتیں ہیں۔ نظریہ

ضرورت پر سب قربان ہو جاتا ہے۔ فائدہ زیادہ اہم ہے،

خیر، کیسے آتا ہوا؟“

صاف نظر آتا تھا کہ وہ ان دونوں سے خوش نہیں

جنہوں نے ان کی پریسنگ کو سفارش کے طور پر استعمال کیا اور

پھر ضائع کر دیا جیسے اس کی اہمیت ہی نہ تھی۔

”سرا ایک تو اگر آپ پولیس کے کسی اعلیٰ افسر سے کہہ

دیں تو وہ...“

”تو وہ حکم دیں اور سارا پولیس ڈپارٹمنٹ تمہاری

ماں کی تلاش میں نکل کھڑا ہو۔ لڑکی یہ پاکستان ہے۔ میں

جانتا ہوں وہ ہزار وعدے کریں گے مگر اپنی جگہ سے ہلنے

والا کوئی نہیں۔“

واقف نہ تھی۔ اسے صرف ایک بات یاد رہی تھی۔ اس کے باپ کو تدفین کے لیے جس راستے سے قبرستان کے اندر لے جایا گیا تھا وہاں غازی علم الدین شہید کے مزار کا سائن بورڈ اور جھنڈے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ اسے تو کمال دین کی قبر کی لوکیشن کا بھی علم نہ تھا جس پر کوئی کتبہ نہیں لگایا گیا تھا۔

وہ غازی علم الدین شہید کے مزار کے ایک دروازے سے اندر جانے لگی تو ایک عمر رسیدہ سفید ریش شخص سر پر رومال لپیٹے نکل آیا۔ ”باباجی، آپ ادھر ہی ہوتے ہو؟“ شیما نے اسے روک لیا۔

بوڑھا رک گیا۔ ”آہو پتر، اس مزار کی حفاظت اللہ نے مجھے سونپ دی ہے، کیا کروں۔“
”مجھے اس قبرستان کے گورکن سے ملنا تھا۔“
”گورکن تو کئی ہیں، اتنا بڑا قبرستان ہے سڑک کے دونوں طرف۔“

”نہیں جی، ابھی کچھ دن پہلے ایک تدفین ہوئی تھی۔ لندن سے ایک تابوت آیا تھا۔ صرف چار بندے تھے جو اسے اٹھا کے اندر لائے تھے۔“

اس نے سوچ کے سر ہلایا۔ ”ہاں، ظہر کی نماز کا وقت تھا نا؟ میں بھی شریک تھا۔“
”آپ بتا سکتے ہیں وہ قبر کہاں ہے۔ اس پر کتبہ کوئی نہیں۔ وہ میرے والد کمال دین تھے۔“

اس نے غور سے شیما کو دیکھا۔ ”ویسے تو مشکل تھا... مگر... پرسوں ایک انوکھی بات ہوئی۔ ادھر ایک جھلی آگنی پتا نہیں کدھر سے گھومتی پھرتی۔“

شیما چلائی۔ ”وہ میری ماں تھی۔ اسی کو تلاش کرنے آئی ہوں میں کراچی سے۔“

اس نے حیرانی سے زیر لب دہرایا۔ کراچی سے؟
اچھا آجا میرے ساتھ۔“

بڈھا شیما کو تقریباً سو گز دور لے گیا جہاں بہت سی نئی پرانی جگہ کی قبریں ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک جگہ وہ ٹھہر گیا۔ ”یہ ہے اس بندے... تمہارے والد کی قبر۔“

”اور... وہ کہاں ہے میری ماں؟“ شیما نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

بڈھے نے ساتھ بنی دوسری قبر کی طرف اشارہ کیا جس کی تازہ مٹی ابھی نم تھی۔ ”کل رات وہ مر گئی۔ پتا نہیں کس وقت، گورکن نے صبح دیکھا تو وہ اس قبر کے اوپر سر

”دوسرے میں چاہتی تھی کہ اپنا گھر بیچ دوں۔ پہلے حامد کسی کو لایا تھا جو پندرہ میں خرید رہے تھے۔“ شیما نے کہا۔

”دیکھو، تمہارے آس پاس ہی کئی پراپرٹی ڈیلر ہوں گے اخبار میں برائے فروخت کا اشتہار دو۔ وہ خود آئیں گے تمہارے پاس اور گا ہک بھی لائیں گے۔ تم لاہور جا رہی ہو تو اشتہار میں فون پر لکھوا دیتا ہوں۔ تفصیلات بولو۔“

جب وہ ناپسندیدہ مہمان کی طرح احمد صاحب کے آفس سے نکلی تو رات ہو چکی تھی۔ اسے باہر پھرتے سارا دن ہو گیا تھا۔ گھر جانے سے پہلے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ حامد سے ملے اور اسے بتا دے کہ اب وہ لندن کی اور برطانوی شہری کے منصب اعلیٰ پر فائز ہونے والی ہے اور اس کا شوہر کزن ہی نہیں ایک نامور سرجن بھی ہے۔ لیکن حامد کا کہیں خالی پڑا تھا۔ وہ شیما سے بچنے کے لیے بھاگ گیا تھا۔ تاہم شیما کو ذرا بھی شک نہ تھا کہ ایسا ہی فائدے کا سودا اس نے بھی کیا ہوگا۔ وہ گھانٹے کا سودا کرنے والا آدمی ہی نہیں تھا۔

شیما کو ابھی تک مالی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے پاس واپسی کا اوپن ٹکٹ تھا اور احسن سے زیادہ تائیاجی نے منہ دکھائی کی رسم میں اسے دس ہزار ڈالر دے دیے تھے۔ اس نے ہوائی جہاز سے جانے کا فیصلہ کیا۔ صبح معلوم کرنے پر پتا چلا کہ اس روز کی ہر فلائٹ بک ہے۔ سیٹ اگلے روز کی فلائٹ پر تھی۔ وہ ٹرین سے جاتی تب بھی اگلے دن ہی پہنچتی۔ اس نے دوسرے دن کی ریزرویشن لے لی۔

وہ سارا دن شیما کسی امید کے بغیر سرکاری اسپتالوں کے مردہ خانے اور ایڈمی ہوم کے کولڈ اسٹوریج میں جھانکتی پھری جہاں ایک اعصاب شکن ماحول اور دہشت ناک منظر دیکھنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ اسے اپنے کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔ صرف احسن تھا جو لندن سے خود فون کر کے اسے ہدایت کرتا رہتا تھا کہ اپنا خیال رکھے۔ یہ نہ ہو وہ خود بھی بیمار یا زروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو جائے۔

وہ شام کو لاہور پہنچی۔ لاہور اس کے لیے باپ دادا کی جنم بھومی ہونے کے باوجود اجنبی شہر تھا۔ آج جیسے گردش حالات نے اسے لندن پہنچایا تھا ایسے ہی نصف صدی قبل کمال دین کو کراچی پہنچا دیا تھا۔ اب اگر شیما کے دور بار کے چاچے مامے یا ان کی اولادیں کہیں تھیں تو اسے کسی کا پتا ٹھکانا معلوم نہ تھا۔ وہ تو کسی کے نام سے بھی

رکھے سو رہی تھی۔ مگر وہ مر چکی تھی۔ پولیس لاش لے گئی تھی
پوسٹ مارٹم کے لیے، ہم نے آج دوپہر دفن کر دیا۔“
شیمابت بنی کھڑی تھی مگر اس کا وجود زلزلے کی زد میں
تھا۔ آنسو خود بخود اس کی دونوں آنکھوں سے پھوٹ کے
رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

”گورکن نے بھی بولا تھا۔ میں نے بھی کہا تھا اس
سے کہ رات کو یہاں نہ رکے۔ اندر آ جائے لیکن وہ تو لگتا تھا
نہ سن رہی تھی نہ سمجھ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے
تھے۔ کپڑے میلے تھے۔ ہاں ایک نیپکس تھا اس کے گلے
میں۔ وہ سونے کا لگتا تھا۔ وہ قبر کی مٹی کو ٹھیک کرتی رہی اور
بولتی رہی۔ جیسے کسی زندہ آدمی سے باتیں کر رہی ہو۔ بالکل
جھلی تھی وہ۔ اسے سمجھنا مشکل تھا۔ ہم نے سوچا کہ صبح اسے
کہیں بھیج دیں گے۔ ایدھی ہوم یا دارالامان۔ ایسے قبرستان
میں کون رہ سکتا ہے۔ رات کا مجھے پتا نہیں کہ گورکن نے
اسے کھانے پینے کو کچھ دیا تھا یا نہیں۔ لیکن صبح وہ دونوں ہاتھ
قبر کے اوپر رکھے اور سر کو مٹی پر لکائے سوتی نظر آئی۔“

وہ خاموش ہو گیا اور کچھ دیر شیماکو ہچکیوں سے روتا
دیکھتا رہا۔ شیماکا دل اس خیال سے خون ہو رہا تھا کہ وہ ایک
دن پہلے پہنچ جاتی۔ اسے گزشتہ روز کسی فلائٹ پر سیٹ مل
جاتی تو وہ ماں کو ساتھ لے جاتی۔ پہنچی تو وہ صبح جگہ مگر اس
وقت جب نہ آتا ہی بہتر تھا۔ کم سے کم ماں کی اس کمپرسی کی
موت سے وہ بے خبر رہتی۔ مٹی کے ایک ڈھیر نے دل کا خون
کرنے والے ایک منظر کی پوری فلم سی اس کے تصور میں چلا
دی تھی۔

☆☆☆

ایک بار پھر وہ زمین آسمان کے درمیان بنی نظر نہ
آنے والی سڑک جیسے راستے پر سے اڑتی ہوئی گزر رہی تھی۔
ہوائی جہاز، اس کے مسافر، عملہ، اوپر آسمان کی اور نیچے
سمندر کی بیکراں وسعت سب وہی تھے۔ کوئی کیسے جان سکتا
تھا کہ صرف دو ماہ قبل یہی لڑکی پہلی بار اس راستے سے گزری
تھی تو اس کے پُر مسرت چہرے پر امید اور تجسس کے کیسے
دیکھتے ہوئے رنگ تھے اور آج وہ تنہا ہے تو اتنی افسردہ اور
مضمحل کیوں ہے۔ اس کی وہ چاندنی جیسی مسکراہٹ کہاں کھو
گئی ہے۔ اس کے رخساروں کے گلاب کیوں مرجھا گئے
ہیں۔ وہ ایک معصوم شباب کی اولین دہلیز پر دستک دینے
والی پُر امید لڑکی سے ایک دل شکستہ مایوس اور زندگی سے
تالاں عورت کیسے بن گئی ہے۔ نہ کسی کو یہ جاننے کی فرصت تھی
نہ ضرورت۔

شمالہ نے تیس دن میں تیس برس کے جذباتی بحران
گزار دیے تھے۔ سمندر میں کھڑی چٹان کی طرح جو مسلسل
غضبناک لہروں کے تھپڑ کھاتی رہتی ہے اور پتا بھی نہیں
چلتا کہ اس کا وجود کسی ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزر رہا ہے۔
کسی پریشانی یا بدحواسی کے بغیر وہ اپنے ٹرائی سوٹ کیس کو
کھینچتی ہیتھروڈائرپورٹ کے سارے مرحلوں سے گزر گئی۔
جانتے بوجھتے اس نے احسن کو اپنی آمد کی تاریخ اور فلائٹ
کے وقت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اچانک پہنچ کے نہ وہ احسن کو
حیران کرنا چاہتی تھی اور نہ اس کی خوشی کا اندازہ کرنا چاہتی
تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ شادی سے پہلے اور بعد والے
احسن کے جذبات کی دنیا میں اس کی اور کسی گرل فرینڈ کی
اہمیت کیا ہے۔ ایک بیوی اس کے لیے شریک حیات ہے یا
محض ایک اور عورت۔ جس پر اسے شرعی اور قانونی بالادستی
بھی حاصل ہے۔

اس نے پورے اعتماد کے ساتھ ٹیکسی لی اور اسے
احسن کے فلیٹ کا پتا بتا دیا۔ اب وہ جانتی تھی کہ اسے تردد
کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیب اسے بحفاظت صحیح جگہ پہنچا
دے گی۔ نہ کوئی اسے اغوا کر کے لے جائے گا نہ لوٹے گا
اور نہ اس کو گھما پھرا کے چارگنا کرایہ وصول کرے گا۔ خوش
مزاج نیگروڈرائیور نے اس کی درخواست پر سوٹ کیس بھی
زینے کے راستے فرسٹ فلور پر پہنچایا۔ ایک چابی شیماکے
پاس تھی۔ وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی اور رک گئی۔
لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ کے اور میز پر پاؤں پھیلا
کے کوئی رسالہ دیکھنے والی چالیں پچاس سالہ دہلی پتلی عورت
نے رسالہ رکھ دیا۔ ”تم کون ہو؟ اندر کیسے آگئیں؟“

شیمانے اسے چابی دکھائی۔ ”میں یہاں رہتی ہوں
کیونکہ یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ یہ چابی اس کا ثبوت
ہے۔“

”کیسی عجیب بات ہے کہ یہاں میں رہتی ہوں لیکن
مجھے نہیں معلوم کہ یہاں احسن کی دوسری بیوی بھی رہتی
ہے۔“ وہ حیران ضرور تھی مگر پریشان یا برہم نہیں تھی۔
شیماس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”دیکھنے میں تو تم میری
ساس لگتی ہو۔ احسن کی ماں۔“

”یہ تم انڈین لوگوں کا ڈھکوسلا ہے کہ شادی صرف ہم
عمر لوگ کر سکتے ہیں۔ تم نے کب شادی کی اس سے... ابھی
جب وہ انڈیا گیا تھا؟“
”میں پاکستان سے ہوں اور میری شادی لندن میں
رجسٹرڈ ہے۔“

”اس کی بیوی صرف میں رہوں گی۔ تمہارا اس پر لونی اخلاقی حق نہیں۔“ شائلہ مطمئن تھی کہ اس نے جذبات کے آتش فشاں کو پھٹنے نہیں دیا۔

”معاملہ قانونی ہے ڈیر، اخلاقی نہیں۔ تم مجھے سمجھا رہی ہو۔“

”ہم اس کا کوئی حل نکال سکتے ہیں۔ وہ تمہیں ماہانہ کتنی رقم ادا کرتا ہے؟“

”تین سو پاؤنڈ... لیکن وہ مجھے چھوڑے گا تو اس کو یہ گھر مجھے دینا ہوگا اور اس کے علاوہ...“

”دیکھو، کیا نام ہے تمہارا... میں شیما ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”میں جینی ہوں۔“

”جینی، اچھا ہوا اگر تم مجھ سے سودا کر لو۔ میں اپنے فادر کو علاج کے لیے لائی تھی یہاں مگر ڈاکٹر اسے نہیں بچا سکے اور اسی صدمے سے میری ماں بھی مر گئی۔ میں ان دونوں کی آخری رسوم کے لیے پاکستان گئی تھی۔“

”آئی ایم سوسوری۔“

”تم یہ اپارٹمنٹ لے لو۔ اسے دینا ہی پڑے گا۔“

اس کے بعد باہمی رضامندی سے الگ ہو جاؤ۔ قانونی طور پر۔ اس ماہانہ آمدنی کے بدلے میں تمہیں یکمشت ادا کی جاسکتی ہوں۔ بس میں تم سے کچھ رعایت مانگتی ہوں۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”میرا خیال تھا کہ دس ہزار پاؤنڈ لوں گی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے تم سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ اگر تم مجھے اس کی آدھی رقم دے دو، تو کوئی قانونی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا اور میں اسے چھوڑ دوں گی۔ وہ صرف تمہارا شوہر رہ جائے گا۔ اچھے موقع پر آئی ہو تم... کل ہی کوئی کہہ رہا تھا کہ ایک انڈین کو شہریت کے لیے شادی کرنی ہے، دیکھتی ہوں وہ کون ہے۔“

”دیٹ از گڈ، ابھی میں تم کو تین سو پاؤنڈ دے سکتی ہوں۔ تاکہ تم احسن کے آنے سے پہلے چلی جاؤ۔ باقی معاملات تم احسن کے ساتھ طے کر لو تو میں تمہیں پانچ ہزار پاؤنڈ بھی ادا کر دوں گی۔“

وہ شیما کو دیکھتی رہی۔ ”میں کس طرح تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔“

”بھروسہ تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔“ شیما نے سوٹ کیس میں سے تین سو پاؤنڈ نکال کے جینی کو پکڑائے۔

”اد کے ڈیر! اٹ اڑاے ڈیل...“ وہ اٹھی اور ایک بیگ کندھے پر لٹکا کے جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

☆☆☆

وہ بے یقینی سے شیما کو دیکھتی رہی۔ ”مجھے معلوم ہے یہ مسلمان دو بیویاں رکھتے ہیں۔ چار کی اجازت ہے انہیں مگر دوسری ان کے ملک میں ہی رہتی ہے۔ لندن میں یہ جرم ہے۔ اور تم سچ کہہ رہی ہو تو وہ جیل جائے گا۔“

وہ ہنسی۔ ”اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ اس کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اس کا یہ فلیٹ بھی مجھے مل جائے گا تم کہاں رہو گی اس کی فکر مت کرنا، اس کا دوسرا فلیٹ بھی ہے۔“

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔ شیما کا چھاپا کامیاب رہا تھا۔ اسے خیال ضرور آیا تھا کہ اگر اس کے بیٹے پر احسن کسی دوسری لڑکی کے ساتھ نظر آیا تو وہ کیا کرے گی؟ اور بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کی ساری کشتیاں وقت کے بے رحم ہاتھوں نے جلا دی ہیں۔ لندن نہ ہوا اپنے دیس کا معاملہ ہو تب بھی عورت کا تو کوئی گھر نہیں ہوتا۔ باپ کے گھر سے شوہر کے گھر اور اگر اس کے بعد قسمت میں ہو تو بیٹے کا گھر... شوہر کے گھر کی بات تو آج بھی وہی پتھر کی لکیر ہے کہ وہاں ڈولی جاتی ہے اور وہاں سے جنازہ ہی اٹھتا ہے۔

چنانچہ شیما نے کہا۔ ”تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ اس نے محبت کی وجہ سے تم سے شادی کی تھی۔“

اس نے سگریٹ کے کش کا دھواں اوپر چھوڑا۔ ”ظاہر ہے، اسے شہریت کے لیے کسی برطانوی نژاد عورت سے شادی کرنی تھی۔ وہ امریکا سے آیا تھا جہاں اس کے باپ کو ابھی شہریت نہیں ملی تھی۔“

شیما نے سچی سے کہا۔ ”اس سے پہلے کتنے شوہر ہوئے تھے اس کا روبرو میں۔“

”جھ... زیادہ ہو سکتے تھے لیکن میں محتاط تھی۔ زندگی سہولت سے گزر گئی۔“

”جب میں نے فون کیا تھا، تو ریسو کرنے والی تم تھیں؟ ابھی ہفتہ بھر پہلے؟“

وہ کچھ حیران ہوئی۔ ”میں کل شام کو آئی ہوں۔ احسن ماہانہ اخراجات کی ادائیگی کے معاملے میں گڑبڑ کرتا ہے پھر مجھے یہاں رکنا پڑتا ہے۔ اگر وہ آج حساب کرے تو میں چلی جاؤں گی۔ تم اس سے کہہ سکتی ہو کہ رقم مجھے ارسال کر دیا کرے۔ پھر مجھے یہاں آنے کی ضرورت کیا ہے۔ خوش رہیں سب... یہ سلسلہ چلتا رہے۔“

”یہاں نہیں ہو سکتا۔“ شیما نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

زندگی کا وہ دن بہت پیچھے رہ گیا تھا جب شیما نے اس پیسے سے جو وہ ساتھ لے کر آئی تھی، اپنے لیے بہت کچھ خریدا تھا۔ ایک اچھا شوہر، ازدواجی زندگی کا اعتماد۔ سیکورٹی کا یقین، خلاف توقع اس کا وہ گھر جس کے لیے حامد بڑی کوشش سے پندرہ لاکھ کا گاہک احسان کر کے لایا تھا، اس سے دینی قیمت پر کھڑے کھڑے بک گیا تھا۔ اس میں کوئی عدالتی اور قانونی چکر نہیں تھے۔ خریداروں نے اس بات کو یقینی بنایا تھا کہ مکان کا شیما کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں ہے۔ نہ حق وراثت کا عدالتی سرٹیفکیٹ... نہ تصدیق... نہ عدالتی کارروائی، بس ایک سل ڈیڈ بنی تھی جس کی رجسٹریشن کرانے کی ذمہ داری بھی خریدار نے لے لی تھی۔ اور رقم ہنڈی کے ذریعے اس کے سامنے رکھ دی گئی تھی۔ اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے بجائے اس نے تمام رقم ہنڈی کے ذریعے لندن بھجوا دی تھی اور جہاز میں بیٹھ کے پیا گھر سدھار گئی تھی۔ حامد کے بارے میں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا... جس غزالہ کی معرفت وہ حامد سے ملی تھی، اسی نے حامد سے شادی کر لی تھی۔ اس کے دولت مند باپ نے کالج کے لیے بھی بیٹی کو گاڑی خرید کے دے رکھی تھی۔ بعد میں وہ کوشی بھی اسی کو مل گئی تھی جس میں وہ رہتی تھی۔ اس کے اکلوتے بھائی نے بعد میں دینی میں کاروبار کیا تو وہیں رہنے لگا تھا۔

زندگی ایسے ہی نقد سودوں کا بیوپار بن گئی تھی۔ کامیابی صرف دولت مندی تھی۔ عزت صرف دولت سے تھی۔ اگر وہ جینی سے احسن کی شادی پر عام بے وقوف لڑکیوں کی طرح ہنگامہ کرتی تو بھی احسن کا اعتماد حاصل نہ کر پاتی۔ ان کے درمیان عدم اعتماد کی تلخی سے پیدا ہونے والی خلیج ہمیشہ حائل رہتی۔ اس دن وہ لوٹ کے آیا تو شیما کو بیڈ پر لیٹا دیکھ کے دم بخود رہ گیا۔ شیما نے اس کے چہرے پر جو خوشی دیکھی وہ مصنوعی نہیں تھی۔

جب شیما سے ہمدردی کے جذبات کا وقفہ گزر گیا اور وہ رات بھی گزر گئی تو شیما نے اسے جینی سے ملاقات کے بارے میں سب بتا دیا۔ وہ شرمندگی اور سکون کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ستارہا۔

پھر اس نے والہانہ اپنائیت کے ساتھ شیما کے ماتھے کو چوما۔ ”تم نے میری ساری ٹینشن ختم کر دی۔ ایک نہ ایک دن میں خود تمہیں بتانا۔ اس سے پہلے کہ حقیقت کسی انکشاف کی صورت میں تمہارے سامنے آئے۔ مگر میں ڈرتا تھا سوچتا رہا کہ ابھی نہیں۔ تمہاری پریشانی کو آڑ بنا کے اعتراف جرم

کے لمحے کو تار رہا۔“

شیما مسکرائی۔ ”حالات کی مجبوری میں سرزد ہونے والا جرم قابل معافی ہوتا ہے۔ تم سے پہلے بھی چھ نے شہریت حاصل کرنے کی مجبوری میں اس عورت کو بیوی بنالیا تھا جو کسی طرح بھی ان کے لائق نہ تھی اور اسے پھر کوئی لڑکا مل گیا ہے۔“

”وہ جائے جہنم میں، مجھے تم پھر سے مل گئی ہو۔ سات سمندر کی دوری کے باوجود مجھے اور کیا چاہیے؟“ وہ مسکرائی۔ ”جہنم جہنم کے ساتھ والی بات اتنی غلط بھی نہیں لگتی۔“

”ہاں جن کو ملنا ہو تقدیر انہیں خود ملا دیتی ہے۔“ یہ چار سال پرانی بات تھی۔ اب ان کا اپنا چھوٹا سا اسپتال تھا۔ ان کا ڈھائی سال کا بچہ اس مطمئن زندگی کا انعام تھا جس میں اپنے جذبات کو اس نے ہمیشہ عقل کے تابع رکھا تھا۔ اب اسے حامد کی باتیں ٹھیک ہی لگتی تھیں کہ جب وقت مہربان ہو تو اس سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔ اسے معلوم تھا کہ احسن بہر حال عام انسانی کمزوریوں سے متبرا نہیں۔ وہ پیتا بھی ہے اور موقع ملے تو ادھر ادھر منہ مارنے سے بھی نہیں چوکتا۔ بس اس نے خود کو شک سے دور رکھا تھا اور درگزر میں عافیت جانی تھی۔ بے شک گزر جانے والے وقت کے آسیب اب بھی اسے خوابوں میں دہشت زدہ کرتے تھے مگر وہ مطمئن تھی کہ آنے والا وقت تو اس کا ہے۔

کال بیل پر اس نے دروازہ کھولا۔ احسن نے اندر آ کے اسے چوما۔ ”تم ہمیشہ حسین لگتی ہو مجھے، آخر کیوں؟“ یہ جملہ وہ اسی وقت بولتا تھا جب اسے اپنے کسی احساس جرم کو خوب صورت پیار بھرے لفظوں سے دباننا ہوتا تھا۔

شیما نے اس سے ونڈ بیگ لے لیا۔ ”تم ایک پرائیویٹ کال پر گئے تھے۔ کیسا ہے وہ مریض؟“ اس نے ٹاکی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا ہے۔“

شیما نے اس کے کوٹ پر ایک لمبا سنہرا بال دیکھا۔ احسن کے قرب میں اسے ایک نامانوس خوشبو کا سراغ بھی ملا تھا مگر اس نے مسکرا کے کہا۔ ”تم فریش اپ ہو کے آ جاؤ۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ گڈ تو ابھی سویا ہے۔“

پرانے لوگ بھی کیا پتے کی بات کہہ گئے تھے کہ جو عورت محکوم بن کے رہنا جانتی ہے، وہی مرد پر حاکم ہوتی ہے۔ اس نے کھانا لگاتے ہوئے سوچا۔



ٹھنڈا انتقام

سلیم انور

دشمنی نبھانا اور انتقام لینا بھی ایک فن ہے... یہ فن ہر کسی کو نہیں آتا... اور جو اس میں ماہر ہو... پھر تو کیا کہنے... ٹھوٹ پھوٹ اور ریزہ بار ہو جانے والے جہاز کے خستہ حال مسافروں کے گر گھومتی دلچسپ اور دل کش کہانی... وہ موت سے بچ نکلی تھی اور اب زندگی کے تعیشات کو اپنے لیے پُریقین بنانا چاہتی تھی...

ٹھنڈا دینے والے موسم میں لہو کو گرمادینے والے عمل کا رد عمل...

میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ میری نظروں کے سامنے ایک سفید دیوار تھی... ایک ایسی دیوار جو یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے بہت بڑے سفید پتھروں سے بنی ہوئی ہو۔ مجھے ایسے پتھروں کے بارے میں معلوم نہیں تھا جو اتنے سفید ہوتے ہیں۔ گو میرا جسم گرم تھا لیکن مجھے کپکپی سی آگنی۔ صرف مجھے اپنا چہرہ ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے سوچنے کی کوشش کی لیکن میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ میں کہاں پر

وصیت زدہ

مال دار خاتون نے منونیت کے ساتھ اپنے معالج سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ہمیشہ میرا خیال رکھا، ہم اچھے دوست بن گئے ہیں۔ اب میں تم کو فیس کی حقیر سی رقم دے کر اس رشتے کی تحقیر نہیں کرنا چاہتی... لیکن مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہے کہ میں نے اپنی وصیت میں تمہارے لیے معقول حصہ رکھا ہے۔“

”اوہ... تم کتنی مہربان ہو۔“ ڈاکٹر جذبات سے مغلوب لہجے میں بولا۔ ”مطب سے میری آمدنی بہت محدود ہے... اب شاید میری زندگی بدل جائے۔“

چند ثانیوں تک گمبھیر خاموشی رہی پھر ڈاکٹر بولا۔

”ذرا وہ نسخہ دو جو میں نے ابھی تم کو دیا ہے... اس میں کچھ معمولی سی تہذیبی کرنی ہے۔“

انتقام

آخری سانس لیتے ہوئے شوہر نے بیوی سے کہا۔

”میرے مرنے کے بعد تم ائیل سے شادی کر لینا۔“

”ائیل سے؟“ بیوی نے تعجب سے پوچھا۔

”لیکن تم تو اس کے جانی دشمن ہو؟“

شوہر نے کہا۔ ”ہاں میں اس مردود سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔“

رجیم النسا بیگم... کوثری

مرد محفل

ایک بڑے صنعت کار نے پارلیمنٹ کے ممبروں کے ایک گروپ کو دعوت پر بلایا۔ کھانے پینے کے دوران میں مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب کے علم، حاضر جوابی اور زور بیاں سے صنعت کار خاص طور سے متاثر ہوا اور ان سے جان پہچان بڑھانے کے لیے ان سے پوچھ بیٹھا۔

”آپ کون سے انتخابی حلقے سے ہیں؟“

وہ صاحب بولے۔ ”میں پارلیمنٹ کا ممبر نہیں ہوں۔ میں تو اس بس کا ڈرائیور ہوں جو معزز ممبروں کو یہاں لے کر آتی ہے۔“

مرسلہ: نظیر سہروردی، انڈیا

پھر میں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو گھمایا پھر آیا۔ پھر دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور پھر بایاں ہاتھ۔ سب اعضاء کام کر رہے تھے۔ بس سر میں اٹھنے والے درد میں کوئی کمی نہیں ہو رہی تھی۔

”تم جاگ چکی ہو۔“ بوڑھی عورت نے کہا اور ایک پیالہ لے آئی۔ ”ہمیں کوئی شدید قسم کی چونٹیں دکھائی نہیں دیں۔ حتیٰ کہ کوئی ہڈی بھی نہیں ٹوٹی۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس شخص کی ہلاکت کا کیا سبب ہوا ہے۔ اس کے سر پر ایک گہرا گھاؤ ہے اور اس کا پیر ٹوٹا ہوا ہے۔“

بوڑھی عورت نے شوربے کا پیالہ نیچے چٹائی کے پاس فرش پر رکھ دیا اور اٹھ کر بیٹھنے میں مدد دیتے ہوئے دو ٹکے میرے پیچھے رکھ دیے۔ ”کیا تم خود سے پی لوگی؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے پیالہ اٹھا لیا اور چچہ اس میں ڈبو دیا۔ شور با مناسب گرم تھا اور مجھے واقعی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ چار چھ شوربا پینے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟ یہ بے حد لذیذ ہے؟“

”یہ ہرن کے گوشت کا اسٹو ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے جلدی جلدی شوربا ختم کر لیا۔

ناگی نے اپنی جیب میں سے ایک رول نکال کر مجھے تھما دیا۔ ”میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ اس نے خالی پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔

میں نے رول چبانا شروع کر دیا۔ وہ گرم گرم چائے لے کر آگئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جلدی جلدی چائے پی لی۔

”کیا تمہیں اب بھی یاد نہیں آ رہا کہ تم کون ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اب دیکھتے ہیں کہ تم چل پھر سکتی ہو یا نہیں۔ اگر تم اس شخص کو دیکھ لو تو شاید تمہیں سب کچھ یاد آ جائے۔“

”عہہ آئیڈیا ہے۔“

اس نے مجھ پر سے بھاری کھالیں اٹھانے میں میری مدد کی۔ پھر میں نے اپنے جوتے پہن لیے۔

میں نے جینز کے ساتھ لمبی آستین کا ہرا اور سفید رنگ کا دھاری دار سویٹر پہنا ہوا تھا۔ ناگی نے مجھے اسکیمو کا خصوصی لباس تھما دیا جو کھال کے کوٹ اور ٹوپ پر مشتمل تھا۔ اسکیمو کی زبان میں اس لباس کو پارکا کہتے ہیں۔ یہ لباس مجھے جانا پہچانا سا لگا۔ میں نے یہ لباس پہن لیا اور چٹائی کے پاس رکھی ہوئی اپنی اشیاء اٹھا کر اپنی جیبوں میں ڈال لیں۔ مجھے وہ اپنی جیب میں کچھ پتھر قسم کی شے محسوس ہوئی۔ اس پتھر

ہو گئی۔ میں کمزور قدموں سے واپس اندر آ گئی اور چٹائی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

ناگی اندر داخل ہوئی تو اس کے ہمراہ بھاری جسم کا ایک پستہ قد آدمی تھا۔ اس کے جسم پر بھی اسکیمو کا مخصوص لباس تھا۔ اندر داخل ہو کر ان دونوں نے اپنے پار کا کے ہڈ پیچھے کھسکا لیے تھے۔ مجھے ان دونوں میں مشابہت نظر آئی۔ البتہ اس شخص کی پاک سیدی تھی اور اس کا مساس کی پیشانی پر تھا۔ وہ شخص مجھے کھڑا دیکھتا رہا اور پھر وہ دونوں آگتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

”میں تانیکو ہوں۔ اس گاؤں کا سردار۔“ اس شخص نے کہا۔ ”ناگی نے مجھے بتایا کہ تمہیں یاد آنا شروع ہو گیا ہے اور وہ پائلٹ تمہارا شوہر ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”کیا تمہیں یاد ہے کہ جہاز کے کریش ہونے سے پہلے کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“ سردار تانیکو نے پوچھا۔

اس کے سوال کرتے ہی مجھے تیزی سے سب کچھ یاد آنے لگا۔ یہ کہ کس طرح میں نے اپنی جیب میں رکھا ہوا گول پتھر نکال کر اس سے اپنے شوہر کی پیشانی پر ضرب لگائی تھی۔ پھر جونہی میں نے وہ پتھر واپس اپنی جیب میں رکھا تو جہاز ڈولنا شروع ہو گیا تھا اور پھر رن وے پر اس کا رخ تیزی سے بدل گیا تھا۔ پھر وہ گھومتا ہوا ایک لمبی کھائی میں پلٹ گیا تھا۔ میں اس دوران آگے پیچھے جھٹکتے کھا رہی تھی اور پھر میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرا گیا تھا۔

اور اس کے بعد میری آنکھ اگلو ہی میں کھلی تھی۔
”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے صرف یہ یاد ہے کہ ہم پرواز کر رہے تھے اور وہ لینڈ کرنے جا رہا تھا پھر اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ یاد نہیں۔“

”تمہاری جیب میں ایک گول وزنی پتھر پایا گیا تھا۔ کیا تم جب بھی اپنے شوہر کے ہمراہ پرواز پر جاتی تھیں تو ہمیشہ یہ پتھر اپنی جیب میں رکھا کرتی تھیں؟“ تانیکو نے پوچھا۔
”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

ان دونوں کے چہروں پر حیرت کے تاثرات ابھر آئے۔
”یہ ایک لطیفہ ہے۔ میں ایک گول وزنی پتھر، بالوں کا برش اور چند سوڈا لٹریچر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اگر کبھی ہمارا جہاز کریش ہو جائے اور اس میں آگ لگ جائے تو میں پتھر سے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر خود کو جلتے جہاز سے نکال کر بچا تو سکتی تھی۔“ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا لیکن اس قہقہے میں لرزش تھی۔ ”میں اپنے بالوں کو برش سے سنوارے

سے ہاتھ نکراتے ہی میں سوچنے لگی کہ میں اپنی جیب میں یہ پتھر کیوں لیے پھر رہی تھی؟

ہم ایک تنگ سی راہداری سے گزرتے ہوئے ایک اور گول نما کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہاں فرش پر کچھی چٹائی پر ایک شخص لیٹا ہوا تھا۔ میں اسے بہتر طور پر دیکھنے کے لیے اس پر جھک گئی۔

وہ ایک پینڈسم شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ چالیس یا لیس رہی ہوگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اس لیے میں یہ نہ دیکھ سکی کہ ان کی رنگت کیا تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی اور موچھیں نفاست سے تراشیدہ تھیں۔ اس نے ٹخنوں سے اونچے بوٹ پہنے ہوئے تھے جو پولو کے کھلاڑی پہنتے ہیں۔ اس کی جینز کی رنگت پھمکی پڑ چکی تھی اور اس کا پار کا گہرے نیلے رنگ کا تھا۔

میں اسے پہچان نہیں پائی۔
میں اٹھنے لگی تو مجھے اس کے ماتھے پر ایک چھوٹے سے زخم کا نشان دکھائی دیا۔ اور تب مجھے تیزی سے یہ یاد آنے لگا کہ وہ کون تھا۔

میں نے فوری طور پر اپنے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکاتے ہوئے خود کو اس شخص کے اوپر گرنے سے بچا لیا۔
”تم جانتی ہو یہ کون ہے؟“ بوڑھی ناگی نے جھک کر مجھے کھڑے ہونے میں مدد دیتے ہوئے پوچھا۔
”میرا شوہر۔“ میں نے سرگوشی کے لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆

مجھے یاد نہیں کہ میں اگلو کے دوسرے حصے میں واپس کس طرح پہنچی تھی۔ لائنل کو دیکھنے کے بعد میں بے ہوش ہو گئی تھی اور مجھے کوئی آئیڈ یا نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہی تھی۔ جب مجھے ایک بار پھر ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس مرتبہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ میں سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ناگی نے میرے جوتے نہیں اتارے تھے اور پار کا چٹائی کے کنارے پر رکھا ہوا تھا۔

دروازے پر پہنچ کر میں رک گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ کوئی فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ تب اچانک میرا بھاگ جانے کا دل چاہا۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کس طرف جانا چاہیے اور نہ ہی یہ خیال تھا کہ میں کہاں جانا چاہتی ہوں۔ میں بس یہ جانتی تھی کہ میں یہاں اب مزید نہیں رہنا چاہتی تھی۔

اتنے میں مجھے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر سے دو افراد آتے دکھائی دیے۔ مجھ پر خوف و دہشت کی کیفیت طاری

حسین موسم سرما میں ذہن و دل کو گرماتا دسمبر 2015ء کا دل گداز پاکیزہ



کراچی

پاکیزہ

ماہنامہ

قیصرہ حیات کا ناول آخری امید جگمگاتے اختتام کی طرف گامزن

نگہت سیما اور در ثمن بلال کے دلکش ناولوں کی بھرپور قسط

شیریں حیدر نے زندگی خاک نہ تھی میں دکھایا دسوز انجام وفا

سکینہ فرخ کا خوب صورت مکمل ناول نبھانا ہے محبت سے

تابندہ نعیم کے پُر اثر انداز و بیان کا شاہکار ناولت کھونے کھونے لمحے

نیلیم احمد بشیر کی ایک چشم کشا حساس تحریر زندگی تماشا بنی

FM101 کی قابل رشک آواز

ربیعہ اکرم سے دلچسپ گفتگو

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

کارو حافی سفر یادوں کی مالا

Visit

Paksociety.com
To Download

اس کے علاوہ

شمیم فضل خالق، غزالہ عزیز، شبانہ شوکت، قرۃ العین خرم ہاشمی،

عاشفہ مسعود، شہناز وسیم و دیگر مشاق لکھاریوں کی دلکش تحریریں

تفریحی معلومات سے پُر اور متنوع مضامین کا مجموعہ صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کے لیے

بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس کی موت حادثاتی تھی۔“ تانیکو نے بتایا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”میں کب تک یہاں سے جا سکوں گی؟ اور اپنے شوہر کی لاش گھر لے جا کر دفن سکوں گی؟“

تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے شوہر کی موت پر ایک آنسو تک نہیں بہایا۔ شاید یہ بات انہیں پریشان کر رہی ہو یا شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ میں ابھی تک صدمے میں ہوں۔ میں بھی یہی امید رکھ رہی تھی۔

مجھے گھر واپس جانے کی کوئی زیادہ فکر نہیں تھی۔ لیکن یہاں کی سردی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میرے دانت بجنے لگے اور تب اچانک میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ تاسف اور نامرادی کے آنسو تھے کہ میں نے سوچا کیا تھا اور یہ کیا ہو گیا۔

میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے تانیکو کی طرف دیکھا۔

”تم جب بھی انتظامات مکمل کر لو یہاں سے فوری طور پر جاسکتی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے بے ساختہ بے حد اطمینان محسوس ہوا اور دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی جو میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ میں نے کوشش کی کہ میں نہ مسکراؤں۔

انصاف ہو چکا تھا اور میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

لیکن ابھی پورا انصاف نہیں ہوا تھا۔ ابھی ایسی دو عورتیں باقی تھیں جنہوں نے میرے شوہر پر ڈورے ڈال کر اسے مجھ سے بے وفائی کی ترغیب دی تھی۔ شاید الاسکا سے واپس اپنے شہر پہنچ کر مجھے ان سے نمٹنے کی ضرورت بھی پیش آجائے۔

میری انگلیاں بے ساختہ اپنی جیب میں موجود اس گول وزنی پتھر کو سہلانے لگیں لیکن پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ ایک عمدہ زندگی بسر کرنا بہترین انتقام ہے۔

اب اپنے شوہر کی تمام دولت اور بیمہ کی رقم سے میں ایک بھر پور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکتی تھی۔

اپنے شوہر کی بے وفائی کا اس سے بہتر انتقام اور کیا ہو سکتا تھا؟

رکھنے کی عادی ہوں... بغیر برش کیے بالوں سے مجھے شدید جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔“

”لیکن رقم صرف سو ڈالر؟ کوئی کریڈٹ کارڈ نہیں؟“

”یہ بھی ایک لطیفہ ہے۔ مجھے کبھی یہ توقع نہیں رہی کہ ہمارا جہاز کریش بھی ہو سکتا ہے۔ لائٹل ایک نہایت ماہر پائلٹ تھا۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ ماہر پائلٹ رہا ہو۔ لیکن اس مرتبہ اس کی مہارت کسی کام نہیں آئی۔“ تانیکو نے کہا۔ ”ہمارے مقامی مکینک جہاز کا مکمل معائنہ کر چکے ہیں۔ انہیں جہاز کے کریش ہونے کا کوئی سبب دکھائی نہیں دیا۔ سو یہ لازمی پائلٹ کی غلطی رہی ہوگی۔“

ہاں، یہ پائلٹ ہی کی غلطی تھی جس کے بارے میں مجھے ہمارے اس ٹرپ سے کچھ پہلے خبر ہوئی تھی کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہا تھا اور یہ اس کی بے وفائی کا پہلا واقعہ نہیں تھا۔ اس صدمے نے مجھے تقریباً تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اور شاید میں برباد ہو بھی جاتی کیونکہ میں نے اس بے وفائی کے واحد حل کے طور پر یہی فیصلہ کیا تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ ہلاک ہو جائیں۔ مجھے اسے ایک بے وفا کے روپ میں دیکھنا گوارا نہیں ہو رہا تھا۔ طلاق بے حد تکلیف دہ ثابت ہوتی۔ مجھے فوری طور پر سکون کی طلب تھی۔

جب اس نے مجھے اپنے الاسکا کے ٹرپ کے بارے میں بتایا جہاں وہ کچھ زمینیں چیک کرنے جا رہا تھا تو میں نے اس کے ساتھ جانے کا یہ بہترین موقع جانا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں اس کے گھٹیا معاشقوں سے واقف ہو چکی ہوں۔ اب میں اس کے ہونٹوں پر وہ اطمینان بخش مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی جو اپنی ان محبوباؤں کے تصور سے اکثر اس کے چہرے پر فحش کرنے لگتی تھی۔

اسی لیے میں نے اسے جہاز اڑانے کے دوران ہلاک کرنے کا پلان بنایا تھا لیکن پرواز کے دوران میری ہمت جواب دے گئی اور میرا ارادہ کمزور پڑ گیا۔ لیکن پھر میری ہمت اس وقت زور پکڑ گئی جب وہ جہاز کو لینڈ کر رہا تھا۔

اب وہ مر چکا تھا اور میں اب بھی زندہ تھی۔ مجھے کچھ یقین نہیں تھا کہ اس بارے میں، میں کیا محسوس کر رہی تھی۔

”جہاز کو کس حد تک نقصان پہنچا ہے؟“ میں نے جانا چاہا۔

”ناگز پتھر ہیں اور فریم کو کچھ نقصان ہوا ہے۔ نقصان زیادہ نہیں ہے۔ اسے ٹھیک کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تمہارے شوہر کی لاش کا طبی معائنہ کر لیا گیا ہے۔ یہ

PDFBOOKSFREE.PK

خاموش جنت

منظر امام

گوہر نایاب مچھلی کی طرح دریاؤں کی بالائی سطح پر نہیں بہتا... اسے گہرائیوں میں جا کے تلاش کرنا پڑتا ہے... وہاں جہاں بہاؤ تیز ہوتا ہے اور پانی بھی صاف شفاف... بعض لوگ اس کی تلاش میں پوری عمر گنوا دیتے ہیں اور کسی کو صرف ایک دن... ایک لمحے میں کامیابی کے خزانے مل جاتے ہیں... ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا... جو اجنبیوں کے درمیان داخل ہو کے شناسائی اجاگر کرنے کا ہنر رکھتا تھا... لمحوں میں اپنا بنا لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا... اور وہ اپنے اس ڈرامے میں اس حد تک کامیاب تھا کہ غیروں نے اسے اپنا سمجھ کے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا...

اپنوں سے دور رہ کے اجنبی دیواروں کے سنگ شب و روز گزارنے والے تنہا نشینوں کا دل گذر فسانہ

انہیں اولڈ ہاؤس بھی کہا جاتا ہے۔
خاموش جنت نام کا یہ اولڈ ہاؤس کلائسن شہر کی حدود
سے آگے جنوب کی طرف ایک سرسبز وادی میں ہے۔ یہ

ایک ریٹائرمنٹ ہوم کا نام ہے۔ اس قسم کے
ریٹائرمنٹ ہوم بوڑھوں کے لیے ہوتے ہیں جہاں وہ اپنی
زندگی کے آخری دن گزار سکیں۔ بہت سے علاقوں میں

جنت چونکہ کچھ نشیب میں ہے اس لیے اوپر سے گزرتی ہوئی گاڑیوں سے اسے دیکھا نہیں جاسکتا، وہاں تک جانے کے لیے ایک ذیلی سڑک موجود ہے۔

اس قسم کے اولڈ ہاؤسز عام طور پر ایسی ہی پر فضا جگہوں پر بنائے جاتے ہیں تاکہ یہاں داخل ہونے والے نفوس قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

لیکن میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ایسے مقامات خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پچھلے دنوں میں ایک ایسے ہی اولڈ ہوم میں کام کر رہا تھا جب میں نے ایک حادثہ دیکھا۔

ایک بوڑھا البرٹ اولڈ ہوم سے نکل کر دوڑتا ہوا روڈ پر آگیا اور ایک ٹینکر کی زد میں آکر مارا گیا۔

البرٹ نوے برس کی عمر کا تھا اور میں اسے پسند بھی کرتا تھا۔ اس کی باتیں بہت دلچسپ ہوا کرتیں۔ وہ اپنے پرانے قصے بہت مزے لے کر ستایا کرتا لیکن افسوس میں اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکا اور وہ مر گیا۔

اولڈ ہومز میں اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ گھبرائے ہوئے خوف زدہ، دنیا کی شکایتیں اپنے سینوں میں لیے ہوئے اداس لوگ۔ بہت سے مریض بھی ہوتے ہیں۔

ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو وحشت زدہ ہو کر بھاگ جانا چاہتے ہیں لیکن بے چارے بھاگ نہیں پاتے۔ میں نے پہلی نگاہ میں ”خاموش جنت“ کا جائزہ لے لیا تھا۔

یہ ایک پرانی عمارت تھی۔ ساتھ کی دہائی میں جس طرح کے بیکس بنائے جاتے تھے۔ یہ ویسی ہی تھی۔ اینٹوں سے بنی ہوئی کھیریل کی سرخ چھت۔ اس کے کئی حصے تھے اور اس کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی اولڈ ہوم نہیں ہے بلکہ ایک جیل ہے۔ جہاں بوڑھوں اور لاوارثوں کو اس لیے لاکر قید کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دن آرام سے گزاریں۔

اس قسم کی جگہوں کو پہلے نرسنگ ہومز کہا جاتا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اولڈ ہومز ہو گئیں اور اب ریٹائرمنٹ ہومز کے طور پر جانی جاتی ہیں۔

بہر حال ان کے نام جو بھی ہوں، میرے لیے بہت دلچسپی کا مرکز رہی ہیں۔ میں نے ہمیشہ انہیں ایک مشن کے طور پر لیا ہے ایک چیلنج سمجھا ہے۔

میں نے اپنی پرانی اور وفادار واکس وگین خاموش جنت کی پارکنگ میں کھڑی کی جہاں اس وقت کوئی گاڑی

نہیں تھی اور آثار بھی یہی تھے کہ شاید کوئی گاڑی اس طرف آئی بھی نہ ہو۔

میں نے انگلیوں سے اپنے الجھے ہوئے بال سنوارے۔ اپنی عینک صبح کی جس کافریم قیمتی تو تھا لیکن بہت پرانا ہو چکا تھا۔ اپنی ٹانگی کی گرہ درست کی اور گاڑی سے باہر آگیا۔

بلڈنگ کے طویل برآمدے میں کئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر میرے نئے دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب بوڑھے لوگ تھے۔ جو یوں ہی بیٹھے ہوئے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے لائق اور خود اپنی زندگی سے لائق۔

میں نے بڑی خوش دلی اور گرم جوشی کے ساتھ انہیں ہیلو کہا۔ لیکن سوائے ایک بوڑھی عورت کے کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن تھے۔

میں کمرے میں داخل ہوا۔

یہاں اسی مخصوص بو نے میرا استقبال کیا جو اس قسم کے اولڈ ہومز میں ہوا کرتی ہے۔ دواؤں کی بو، فائل کی بو اور اسپرے کی بو۔ میں اس قسم کی بو کا عادی ہو چکا تھا۔

کمرے میں ایک استقبالیہ کاؤنٹر تھا جس کے عقب میں ایک نرس بیٹھی تھی۔ کہنے کو وہ جوان ہی تھی لیکن اس تھکے ہوئے ماحول نے اسے بھی بوڑھا بنا دیا تھا۔

وہ کسی رجسٹر پر جھکی ہوئی کوئی کام کر رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو سہی لیکن کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔

”محترمہ!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”میری دس بجے کی اپائنٹمنٹ ہے مس ولما سے۔“ میں نے بتایا۔

اس نے سر اٹھا کے دوبارہ میری طرف دیکھا۔ اس نے بھی اس کے چہرے پر بیزاری کی کیفیت تھی۔ ”تمہارا نام؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دینے سے پہلے اس کے سینے پر گئے ہوئے سستے قسم کے پلاسٹک کے ٹیگ کو دیکھا جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا ”ٹروڈی۔“ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مس تھی یا مسز؟

”اپنا نام بتاؤ۔“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”گروئن۔“ میں نے بتایا۔ ”گروئن جیرالڈ۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے پلاسٹک کی کرسیوں کی ایک

قطار کی طرف اشارہ کیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹروڈی اپنی فائل اور کاغذات میں مصروف ہو گئی۔ میں نے اپنے

جوتوں کا جائزہ لیا۔ جوتے پرانے اور گرد آلود تھے۔ وہی حال میری پتلون کا تھا۔ وہ بھی پرانی ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی کاؤنٹر پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگتی اور ٹروڈی فون کا جواب دیتی۔ اس وقت اس کا لہجہ بہت نرم ہو جاتا تھا۔

دس منٹ کے بعد مس ولما نمودار ہوئی۔ ٹروڈی کی طرح اس نے بھی سفید یونیفارم پہن رکھا تھا۔ اس کے جوتے اور موزے بھی سفید تھے۔ ٹروڈی کی نسبت وہ بھاری بدن کی تھی۔

جب وہ قریب آئی تو میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ”گروئن جیرالڈ۔“ میں نے اپنا نام بتایا۔

”میں ولما۔“ اس نے رکی طور پر اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا۔

میں اس وقت کسی خوف زدہ لٹی کے بچے کی طرح ہورہا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے کہا اور ایک طرف بڑھ گئی۔

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے جوتوں کی نرم چاپ یوں محسوس ہورہی تھی جیسے دور سے آرہی ہو۔ ہال کے آخر میں رک کر میں نے ٹروڈی کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے تاثرات میں اپنے لیے ناپسندیدگی محسوس کی تھی اور اس وقت میں نے اپنی ہٹ لسٹ میں اس کا نام پہلے نمبر پر لکھ لیا تھا۔

ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ جس کی سجاوٹ بہت سستے انداز میں کی گئی تھی۔ دیواروں پر بوڑھے مردوں اور عورتوں کی تصاویر تھیں۔ ایک بڑی سی میز تھی جس کے دوسری طرف گھومنے والی کرسی تھی اور میز کے سامنے دو تین عام قسم کی کرسیاں تھیں جو میز کی سطح سے کچھ نیچے تھیں۔ اسی لیے ایک کرسی پر بیٹھ کر ولما کو دیکھنے کے لیے مجھے گردن اٹھانی پڑ رہی تھی جبکہ وہ اپنی گردن جھکا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

”تو تم نے یہاں ملازمت کے لیے درخواست دی تھی۔“ اس نے میز پر رکھی ہوئی میری درخواست اٹھالی۔

”جی ہاں، میں اسی لیے یہاں تمہارے سامنے موجود ہوں۔“

”اینڈنٹ کے طور پر۔ یعنی میل نرس کے طور پر۔“ اس نے کہا۔ ”تم نے لکھا ہے کہ تمہیں اس قسم کے اولڈ ہوم میں کام کرنے کا تجربہ ہے۔“

”جی ہاں، میں نے کئی اولڈ ہوم میں کام کیا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”تین کے تو سرٹیفکیٹ بھی درخواست کے ساتھ ہیں۔ تم دیکھ سکتی ہو اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھے کہیں سے ہٹایا نہیں گیا بلکہ میں خود ہی ہٹا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا ریکارڈ صاف ستھرا ہے۔“

میں جانتا تھا کہ اس قسم کی جگہوں پر اس قسم کی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو صرف کام کرنے والا چاہیے ہوتا ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اغوا کرنے والا۔۔۔۔۔ قاتل یا پھر مجھ جیسا ابھی ہوئی زندگی گزارنے والا۔

”ہمیں ایک اینڈنٹ کی ضرورت ہے رات کی شفٹ کے لیے۔“ اس نے بتایا۔ ”رات نو بجے سے صبح سات بجے تک۔ اس کا کام یہاں اولڈ ہوم اور مریضوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مریضوں کی دیکھ بھال کا کیا مطلب ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”انہیں وقت پر دوائیں دینا، انہیں کھانا کھلانا، جب وہ واش روم سے واپس آئیں تو واش روم کو صاف کرنا، ان کی گندگی صاف کرنا، ان کو نہلانا، ان کے کپڑے بدلنا، دل بہلانے کے لیے کتابیں پڑھ کر سنانا، ان کے لیے خطوط لکھنا، وغیرہ۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور غائب بھی ہو گئی۔

”تم کو مریضوں میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے یا اسکا جاتے ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

یہ ایک احمقانہ سوال تھا جو اکثر کیا جاتا ہے۔ یہاں آنے کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ درخواست دینے والا ذہنی طور پر اس قسم کے کاموں کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔

میری درخواست ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ ”عمر کیا ہے تمہاری؟“ اس نے پوچھا۔

”چوبیس سال۔“ میں نے بتایا۔ ”ویسے میں نے اپنی درخواست میں اپنی عمر لکھ دی ہے۔“

وہ میری طرف دیکھنے کے بعد پھر درخواست کی طرف متوجہ ہو گئی۔ شاید وہ یہ سوچ رہی ہوگی کہ چوبیس برس کے ایک آدمی کو ایسا پیشہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔

”ہم ایک گھنٹے کے چھ ڈالرزدیتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

اور یہی معاوضہ اس ہوم کے اشتہار میں بھی تھا۔ ایک

کھٹنے کے چھ ڈالر۔ خاموش جنت صرف ایک ہی جگہ نہیں تھی بلکہ ریاست کے کئی شہروں میں اس کی شاخیں تھیں۔ اس کمپنی کا کام بہت پھیلا ہوا تھا۔ اولڈ ہومز سے لے کر جائداد کے مقدمے تک۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ہامی بھرلی۔ ”میں تیار ہوں۔“

دیے بھی ایک کھٹنے کے چھ ڈالر اتنے بڑے نہیں تھے اور میں یہاں اس قسم کے معاوضوں کے لیے آیا ہی کب تھا۔

”تم نے پائی اسکول تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد کالج نہیں گئے؟“ اس نے کہا۔

”جی ہاں، زندگی نے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی مہلت نہیں دی۔“

”بہت بُرا ہے۔ تعلیم مکمل ہونی چاہیے۔“ اس نے طنزیہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ ”چاہے کام کوئی بھی ہو، آدمی کو تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیے جیسے میں۔ میں نے گریجویشن مکمل کر لی ہے۔“

اس کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے اس سے چڑی ہونے لگی۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی لسٹ میں اس کے نام پر ایک اور ٹک لگا دی۔

”تمہارا کوئی کمرٹل ریکارڈ تو نہیں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرا ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ معمولی سا جرم بھی نہیں کیا ہے میں نے۔ اور نہ ہی کسی معاملے میں عدالت میں جانے کی نوبت آئی ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے ایک ہنکاری لی۔ ”اور کلائسن میں کتنے دن رہے تھے تم؟“

میں جانتا تھا کہ وہ بیکار قسم کے سوالات کر رہی ہے۔ صرف وقت گزاری کے لیے۔ اور یہ بات میں بھی جانتا تھا اور اس کو بھی معلوم تھی کہ یہ جاب بالآخر مجھ ہی کو ملنے والی ہے کیونکہ میں خاموش جنت کا اشتہار گزشتہ دو مہینوں سے دیکھ رہا تھا اور ابھی تک ان کو کوئی ڈھنگ کا بندہ نہیں مل سکا تھا۔

”میں نے کلائسن میں کئی مہینے گزارے۔ اس کے بعد ٹو پیلو چلا گیا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”پھر ٹو پیلو کیوں چھوڑ دیا؟“ اس نے سوال کیا۔

”اوہ، وہاں کسی نے مجھ سے بے وفائی کی تھی۔“ میں نے بتایا۔ حالانکہ یہ میری غلط بیانی تھی لیکن یہ بہانہ کئی مواقع

پر کام آتا رہا ہے۔ ”اوہ، افسوس ہوا سن کر۔“ وہ سرسری انداز میں بولی۔ حالانکہ میں بھی جانتا تھا کہ اس کو افسوس و فوس کچھ بھی نہیں ہوا ہوگا۔

اس نے میری درخواست ایک طرف رکھ دی۔ ”تم کب سے کام شروع کرنا پسند کرو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”جب سے تم کہو۔“

”کل شام سے آ جاؤ۔“

میں اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔ مجھے ٹروڈی کے ساتھ بیٹھ کر فارم بھرنے اور دوسرے کاغذات لکھنے میں آدھ گھنٹا اور لگ گیا۔ اس موقع پر ٹروڈی کی تیوریاں چڑھی رہی تھیں۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ اس اولڈ ہوم میں مجھ سے برتر درجہ رکھتی ہے۔

باہر آ کر میں نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس اولڈ ہوم پر نظر ڈالی اور یہ سوچنے لگا کہ میں اس اولڈ ہوم میں کتنے دنوں کام کر سکوں گا۔ زیادہ سے زیادہ چار مہینے۔ کیونکہ یہی میرا ریکارڈ تھا۔

کلائسن میں میری عارضی قیام گاہ دو کمروں پر مشتمل تھی۔

وہ ایک پرانی خستہ عمارت تھی جبکہ اشتہارات میں اس کے حوالے سے دعوے کیے گئے تھے کہ جنت بے نظیر قسم کا مکان ہے اور ہر کمرے میں قیمتی اور آرام دہ فرنیچر بھی ہیں جبکہ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

ایک پرانی مسہری۔ ایک طرف ایک قدیم سی الماری۔ دیوار کے ساتھ ایک ایسا صوفہ جس کے کشن کے رنگ اڑ چکے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز۔

کونے میں ایک ریفریجریٹر بھی تھا جس کے چلاتے ہی گھر گھر کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ اس کے علاوہ چولہا شاید استعمال کے قابل ہی نہیں تھا۔

ان دو کمروں کا کرایہ بیس ڈالر ہفتہ وار تھا۔ اس کی مالکہ ایک ایسی عورت تھی جس کی صحیح عمر کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ شاید وہ پچاس اور اسی کے درمیان کی کوئی چیز تھی۔ روپی نام تھا اس کا۔

اس نے کمرے کی چابی دینے سے پہلے کہا۔ ”اس کمرے میں کوئی بھیٹر بھاڑ اور کوئی پارٹی وغیرہ نہیں ہوگی۔“

”بالکل نہیں ہوگی۔“ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”تم چونکہ پہلی بار آئے ہو اس لیے میری طرف سے



ذیروز تہارنی سالگرہ پر لیا تحفہ دوں ؟

ویسے تو تمہارے پاس میری ضرورت کی ہر چیز موجود ہے

ایک کمرے میں ایک ہی کور کھا گیا ہے۔

اس نے مریضوں کے نام بتائے، ان سے تعارف کروایا اور میں بغیر کسی حادثے یا واقعے کے اس مرحلے سے بھی گزر گیا۔

پھر اس نے مجھے کچن دکھایا جو اچھا خاصا بڑا تھا۔ پھر فارمیسی دکھائی۔ جہاں فوری دوائیں دستیاب تھیں۔ وہ بڑا کمرہ دکھایا جہاں یہ مریض کھانا کھایا کرتے اور ایک دوسرے سے گپ شپ کیا کرتے۔

اس نے مجھے ان مریضوں کے حوالے سے ہدایات دیں کہ مجھے ان کی دیکھ بھال کے سلسلے میں کیا کرنا ہے اگر کسی کے ساتھ کوئی ایمرجنسی پیش آجائے تو ایسی صورت میں کیا کرنا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو بلانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ویسے اس قسم کی باتیں میرے لیے نئی نہیں تھیں۔ میں پہلے بھی ایسے مراحل سے گزر چکا تھا۔ ہم پھر استقبالہ میں واپس آ گئے، جہاں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہو کر نینسی نے مجھے کچھ اور بتانا شروع کر دیا۔

اسی وقت ایک تیز بھونپ کی آواز سنائی دی۔ ایسا بھونپ جو کبھی ٹرک یا بھاری گاڑیوں میں لگایا جاتا تھا۔ ”دیکھو اسے۔“ نینسی چلائی۔

میں کمرے سے باہر آ گیا۔

طویل برآمدے میں ایک وکیل چیر تیزی سے دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ ایک بوڑھا شخص اس پر بیٹھا تھا۔ وہ بھونپ ایک پیسے کے پاس لگا ہوا تھا۔

اس بوڑھے کی عمر ساٹھ سے زیادہ ہی ہوگی۔ اس نے پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اس کی قمیص سے اس کا پیٹ جھانک رہا

ایک گلاس حاضر ہے۔“ اس نے کہا۔

وہ مجھے کافی روم میں لے آئی اور مجھے بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دو گلاس اور ایک بوتل لے آئی تھی۔

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک تنہا عورت ہے اور وہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کے ساتھ بیٹھے اور باتیں کرے۔

اس نے شہر اور آس پاس کے لوگوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا کہ کون کیا ہے۔ کس کا کیا نیچر ہے وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے مجھے ایسی باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اس لیے میں اس کی باتیں سنتا رہا اور بور ہوتا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اپنی بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد جب اس نے دوسرے گلاس کی بات کی تو میں نے نرمی سے انکار کر دیا اور اس سے اجازت لے کر کافی روم سے باہر آ گیا۔

نینسی نام تھا اس بوڑھی نرس کا جس کے ہونٹوں پر ایک خوش گواری مسکراہٹ ہوا کرتی اور جس کا لہجہ بہت شفیق تھا۔ اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ مجھے اس اولڈ ہوم سے متعارف کروادے۔ وہ مجھے ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لے جاتی رہی۔

وہ بہت بڑا اولڈ ہوم تھا۔ صفائی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

ہر جگہ مجھے ایک ہی جیسے تاثرات کے چہروں والے لوگ ملتے رہے۔ اداس اور پریشان لوگ۔ کسی کی آنکھوں میں گزرے ہوئے دنوں کی یادیں تھیں تو کسی کی آنکھیں بچھ گئی تھیں۔ شاید انہوں کی راہ دیکھتے دیکھتے۔ ان پریشان حال اور اداس لوگوں کو دیکھ کر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو زندگی گزار چکے تھے اور اب اپنے آخری دن کے انتظار میں تھے۔

ہر کمرے میں دو دو آدمی تھے۔ میں بڑی خوش دلی سے انہیں ہیلو کہتا چلا گیا لیکن ان کے چہرے سپاٹ ہی رہے۔

نرس نینسی پھر مجھے اولڈ ہوم کے ایسے حصے میں لے آئی جہاں عام طور پر ذہنی مریض رکھے جاتے تھے۔ ”یہ کچھ مشکل لوگ ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”اس لیے

رات کے کھانے سے پہلے دعا کروایا کرتا تھا۔ وہ نوے برس کا بوڑھا تھا لیکن اس کی آواز حیرت انگیز طور پر ابھی تک صاف اور بلند تھی۔ وہ بہت دیر تک دعائیں پڑھتا رہا۔ اس کی دعاؤں کے اختتام پر چھریوں اور کانٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پلاسٹک کی ٹریز میں کھانے سرو کیے گئے تھے۔

کھانے کے اختتام پر ایک شو تھا۔ شو کیا تھا۔ شہر کے کسی اسکول کے بچے وزٹ کرنے آئے ہوئے تھے۔ وہ بچے مریضوں کے لیے بسکٹ اور پھل وغیرہ لے کر آئے تھے۔ ان کی استانیاں اور استادان کے ساتھ تھے۔

اس مرحلے کے بعد انہیں کچھ گیت سنانے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب بڑے پیانو کے پاس جمع ہو گئے۔ نوے بارہ سال تک کے بچے بچیوں کا یہ گروپ گانے سناتا رہا۔

شو کے اختتام پر بچے واپس چلے گئے اور مریضوں نے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

اس وقت میں نے بھی اپنی ڈیوٹی کے طور پر کئی مریضوں کی وہیل چیئر کو ان کے کمروں تک پہنچایا۔ اس کے بعد ایک معاون کے ساتھ مل کر ڈائننگ روم کی صفائی کروائی۔ اس میں اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا۔

اب مجھے ایک اور مرحلہ تھا۔ یہ مرحلہ اس قسم کے ہر نرسنگ ہوم اور ہر اسپتال میں پیش آیا کرتا ہے۔ سونے سے پہلے ہر مریض کو دوا دینی۔

یہ دوا عام طور پر ان کے لیے خواب آور ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے اپنے گزشتہ دنوں کو یاد کرتے ہوئے سو جایا کرتے ہیں۔

جب وہ بھی کسی مریض کی تیمارداری کرتے تھے۔ بچہ بیمار ہو جائے تو اس کی دیکھ بھال کرتے تھے لیکن یہ بہت پرانی بات تھی۔ اب تو وہ بیمار بچہ تندرست ہو کر، بڑا ہو کر انہیں بھول بھی گیا ہے۔ اس لیے وہ اس اولڈ ہوم میں پڑے ہوئے ہیں۔

گولیاں کھالینے کے بعد سناٹا ہو جاتا ہے۔ سب کے سب سو جاتے ہیں۔ رات دس بجے روشنیاں گل کر دی جاتی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس پورے جنونی حصے کا اس وقت نگران صرف میں ہوں جبکہ شمالی حصے کا نگران کوئی اور ہوگا اور اس طرف یہاں مشکل قسم کے مریض ہوتے ہیں۔ وہاں دواور ہوں گے۔

تھا۔ ”رک جاؤ والٹر۔“ نینسی چلائی۔ ”کیوں شور کر رہے ہو؟“

اس وہیل چیئر کو دھکا دیتے ہوئے لایا جا رہا تھا۔ دھکا دینے والا بھی پچاس کے لگ بھگ ہوگا۔ برآمدے میں موجود دوسرے مریض ادھر ادھر سمٹ گئے تھے۔

”یہ والٹر ہے۔“ نینسی نے بتایا۔ ”اس کی یہی حالت ہے۔ اس کو اپنی وہیل چیئر سے بہت پیار ہے۔ دن بھر اس پر گھومتا رہتا ہے۔“

”اور اس کو دھکیلنے والا کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس کا نام ٹونی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ دونوں دن بھر میں کم از کم تیس چالیس چکر پورے برآمدے کے لگاتے رہتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لائٹ ڈرائیو پر نکلے ہیں۔ ایک بار وہیل چیئر سے گر کر زخمی بھی ہو چکا ہے۔“

وہ وہیل چیئر ہارن بجاتی ہوئی ہمارے برابر سے گزر گئی۔

ہم نے کوشش کی تھی لیکن بات نہیں بنی۔ اب مجھے اپنی ڈیوٹی سنبھالنی تھی لیکن ابھی نہیں۔ کم از کم تین گھنٹوں کے بعد۔ ابھی بہت وقت تھا۔ میں اپنے اپارٹمنٹ بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ یہاں سے بہت دور تھا اس لیے میں نے وہیں وقت گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ادھر ادھر بٹکتا رہا۔ لوگوں سے الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا۔

مس ولما سے باتیں کیں۔ جو ہمیشہ کی طرح مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ پھر کچن میں آ گیا۔ وہاں دو سیاہ قام خواتین کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

میں نے ان سے اپنا تعارف کروایا۔ گپ شپ کی اور ڈائننگ روم میں آ گیا۔ سات بجنے والے تھے۔ رات کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔

روم میں لوگ آ آ کر جمع ہونے لگے تھے۔ بہت سے لوگ کسی مددگار کے ساتھ آرہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو خود آرہے تھے۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ خاموش جنت میں اس وقت باون مریض ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے پاس جا کر اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ لوگوں کو اس وقت کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتادیں۔“

جب کھانا لگا دیا گیا تو دعائے تقریب ہوئی۔

یہ تقریب روزانہ ہوا کرتی۔ ریٹائرڈ پادری ڈان

یعنی اب اس طرف کے حصے میں میں اکیلا تھا اور اپنی کارروائی کر سکتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے استقبالیہ کاؤنٹر کے دروازوں اور الماریوں کا جائزہ لیا۔ مریضوں کی لسٹ دیکھی۔ لاگ بک اور چندے وغیرہ کی رسیدیں دیکھیں۔

ہاں ایسے موقعوں پر میرے پاس ایک پاکٹ سائز کیمرا ضرور ہوتا ہے جو ایسے موقعوں پر بہت کام آتا ہے۔ یہ گندے ہاتھ رومز، خستہ حال کچن، بے حال مریضوں وغیرہ کی تصاویر لینے میں کام آتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوا کرتا ہے۔

ہڈرڈ کاؤنٹی کورٹ ہاؤس شہر کے درمیان میں واقع ہے۔

اس عمارت کے ارد گرد کے لان بہت خوب صورت ہیں جن میں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے پیچھیں بنائی گئی تھیں۔ چوراہے کے وسط میں تانبے سے بنا ہوا کسی سپاہی کا بڑا سا مجسمہ ہے۔ جس کے ہاتھ میں ایک بندوق ہے اور جو سامنے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جیسے دشمنوں کو گھور رہا ہو۔

اس چوک میں ہر چار جولائی کو ایک شاندار پریڈ ہوا کرتی ہے اور تقریریں ہوتی ہیں۔ یہ تو باہر کا حال ہے۔

اور عمارت کے اندر زمینوں وغیرہ کے کاغذات اور ریکارڈ ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کے وصیت نامے آس پاس کی زمینوں کے حساب کتاب، انکم ٹیکس ریٹرن وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سارے کاغذات میرے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے بہت مفید ہیں۔

اس قسم کی عمارتوں میں داخل ہونے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وکیلوں جیسا حلیہ بنا کر جائیں۔ آپ کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔

آپ سے کوئی اس وقت بات نہیں کرتا جب تک آپ خود اس سے بات نہ کریں اور ظاہر ہے کہ میں کسی سے بات نہیں کرتا۔

میرا پہلا وزٹ سرسری سا ہوتا ہے۔ صرف ماحول کا اندازہ لگانے کے لیے۔ خوب اچھی طرح پورے اعتماد کے ساتھ۔

کسی بھی ادارے یا کسی بھی گھر کے بارے میں سن گن لینے کے لیے آپ کو اس ادارے یا گھر کے کسی بڑے سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس گھر کے عام ملازمین سے آپ اس ادارے یا گھر کے بھید لے سکتے ہیں اور اس

قسم کے عام ملازمین عام طور پر کچن میں پائے جاتے ہیں۔ کھانے بنانے والے باورچی، یہ بھی عام طور پر خواتین اور سیاہ فام ہوں تو زیادہ مناسب ہیں۔ ان سے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔

جہاں میں جاتا ہوں۔ اس قسم کے بھید حاصل کرنے کو اپنے لیے ایک پیلیج سمجھ کر قبول کر لیتا ہوں۔ طریقہ کار آسان ہوتا ہے۔

کچن میں جا کر ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنی اور ان کے بنائے ہوئے بد مزہ کھانوں کی بے حد تعریف کرنی، اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کو کریدتے رہنا، آہستہ آہستہ وہ کھل ہی جاتی ہیں۔

ہمارے ادارے میں کام کرنے والی روزیلی بھی ایسی ہی تھی۔

وہ ایک سفید فام عورت تھی۔ بھاس اور پچپن کے درمیان کی۔ شاید تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ اسی لیے مجھے اسے شیٹے میں اتارنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

میں اس کی مہربانیاں حاصل کرنے میں ناکام نہیں رہا تھا۔ جب میں سات بجے اپنی ڈیوٹی پر پہنچتا تو وہ میرے لیے انڈے اور کافی تیار رکھتی۔

صبح کا ناشتا بھی اس کے ساتھ کر کے میں سات بجے رخصت ہو جاتا تھا لیکن مکمل طور پر نہیں جاتا تھا۔ بلکہ اور کچھ دیر ادھر ادھر بھٹکتا رہتا۔

میں روزیلی کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں وقت سے پہلے اپنی ڈیوٹی پر پہنچتا اور وقت کے بعد وہاں سے روانہ ہوتا۔

روزیلی سے دوستی کرنے کے بعد یہ ہوا کہ مجھے وہاں کام کرنے والوں اور مریضوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا چلا گیا۔

اس نے ولما کے بارے میں کچھ بتایا۔ روبی کے بارے میں انکشافات کیے اور بھی کئی لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات اور مشاہدات بیان کرتی ہوئی وہ جب ایک بوڑھے مریض لائل پر آئی تو اس کا منہ بن گیا۔

”میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ کمینہ فطرت بوڑھا روئے زمین پر کوئی نہیں ہوگا۔“ اس نے بتایا۔

”وہ کیسے؟“

”وہ ایک نمبر کا جنسی مریض ہے۔ عورتوں کو دیکھتے ہی ان کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے وہ نرس ہو یا کوئی

مریضہ ہو، ایک بار تو اس نے گر جا گھر سے آئی ہوئی ایک نن پر بھی جنسی حملہ کر دیا تھا۔“

”اوہ، لیکن وہ تو بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔“

”ہاں، اس کی عمر چوراسی برس ہے۔“ روزیلی نے بتایا۔ ”لیکن اس کی حرکتیں وہی ہیں۔ حالانکہ اسے شوگر ہے۔ اس کی ایک ٹانگ زہر پھیلنے کی وجہ سے کاٹی جا چکی ہے لیکن اس کے دونوں ہاتھ تو سلامت ہیں نا، اور وہ ان ہی ہاتھوں سے عورتوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس لیے کوئی نرس اس کے قریب نہیں جاتی۔“

”اوہ، یہ تو بیڈ کہانی ہے۔“

”ہاں۔“ روزیلی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”ایک بار تو وہ کم بخت پکڑا بھی جا چکا ہے۔“

”میں نہیں سمجھا، کیسے پکڑا گیا تھا؟“

”ایک نرس کے ساتھ۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ نرس بھی ویسی ہی تھی۔ بد معاش قسم کی۔ دونوں پیچھے والے ایک کمرے میں پکڑے گئے تھے۔“

”کس نے پکڑا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دینے سے پہلے پھر اس طرح دیکھا جیسے کسی بڑے راز کا انکشاف کرنے جا رہی ہو۔ کچن میں موجود دوسرا کک کافی بنانے کی مشین سے الجھا ہوا تھا اور وہ اتنے فاصلے پر تھا کہ ہماری باتیں نہیں سن سکتا تھا۔

”اینڈی نے پکڑا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اینڈی کو تو جانتے ہوتا؟“

”ہاں، وہ جو پچھلے کمروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔“

”ہاں ہاں وہی۔۔۔۔۔ ایک بات اور بتاؤں۔ تم نے مسٹر لوک مالون کو تو دیکھا ہوگا؟“

”ہاں، وہ بے چارہ بوڑھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ نوے برس سے کم کا نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے چارہ ٹاپنا بھی ہے۔“ اس بوڑھے کی نگرانی میرے ہی ذمے تھی۔ اس لیے میں نے روزیلی کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔

”یہ اب سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ مسٹر لوک کی بیوی اپنے شوہر کو دیکھنے کے لیے آیا کرتی تھی۔“ روزیلی نے بتایا۔ ”وہ اپنے شوہر سے بہت کم عمر کی تھی اور ٹھیک ٹھاک تھی۔ نہ جانے کس طرح اس کم بخت بوڑھے لائل نے اس سے دوستی کر لی۔ یوں سمجھو کہ ان دونوں کا چکر ہی شروع ہو گیا۔“

”بہت دلچسپ، پھر کیا ہوا؟“

”ہونا کیا ہے۔ شوہر بے چارہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اس عورت کا انتقال ہو گیا۔“

دوراتوں کے بعد میں ایک میگزین لے کر روم نمبر چودہ میں داخل ہوا۔ وہ بوڑھا ہوس زدہ لائل اس کمرے میں ہوتا تھا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ ہر کمرے میں دو مریض رکھے جاتے تھے۔ دونوں کے بستروں کے درمیان خاصا فاصلہ ہوا کرتا تھا۔

میں اپنی ڈیوٹی پر تھا اور اس وقت میری ڈیوٹی یہ تھی کہ میں مریضوں کو نیند کی گولیاں کھلا دوں۔ لیکن اپنے ساتھ نیند کی گولیاں نہیں لایا تھا۔ بلکہ عام سے درد کی گولیاں تھیں۔ لائل کا ساتھی اس وقت بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے لائل کے پاس جا کر کہا۔ ”یہ لو، یہ گولی کھا لو۔ اس کے بعد تمہیں ایک تحفہ دوں گا۔“

تحفے کے لالچ میں اس نے جلدی سے وہ گولی نگل لی۔

”یہ لو۔“ میں نے میگزین اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”انجوائے کرو۔“

وہ فحش تصاویر والا میگزین تھا۔ لائل نے اس طرح اسے اچک لیا جیسے برسوں کا بھوکا روٹی پر جھپٹتا ہے۔

”خبردار، کسی کی نظر نہ پڑے۔“ میں نے تنبیہ کی۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”خاموش جنت“ کی حدود میں اس قسم کے میگزین لانا جرم تھا۔ یہاں شراب بھی نہیں پی جاسکتی تھی۔ سگریٹ پینے والے بھی عمارت سے باہر جا کر سگریٹ پیا کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں اس قسم کا کوئی میگزین لائل کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ ”کوئی بات نہیں۔“ میں نے اس کے شانے پر چھکی دی۔ ”بس ذرا احتیاط رکھنا۔“

میں نے اسے اپنا دوست بنا لیا تھا۔

میں اس کے بارے میں مواد جمع کرتا رہا۔ اس نے تین شادیاں کی تھیں۔ اس کی اولاد میں بھی تھیں لیکن شاید سب نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی زندگی اولڈ ہوم میں اچھی گزر سکتی ہے۔ اسی لیے اسے اولڈ ہوم میں داخل کر دیا تھا۔ لیکن آنے جانے والوں کی لاگ بک دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کو داخل کرانے کے بعد سب اسے تقریباً بھول گئے تھے۔



چو لہے سے دور رہو... تمہارے بال آگ پکڑ لیں گے

کیا۔ وہاں سے اچھے سے بسکٹ خریدے اور واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔

روبی اس وقت سو رہی تھی۔ جب میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد وہ آنکھیں ملتی ہوئی باہر آگئی۔

”روبی! میں تمہارے لیے بسکٹ لایا ہوں۔“
”بہت خوب!“ وہ مسکرا دی۔ ”تم کچن میں چلو، میں آکر کافی بنا دیتی ہوں۔“

کافی پینے کے دوران میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”میرے کمرے کے اوپر والے کمرے میں کون رہتا ہے۔“

”کوئی نہیں، وہ کمرہ تو خالی ہے۔“
”لیکن میں نے رات آوازیں سنی ہیں۔“
”اوہ، وہ ٹیسی ہوگی۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ جمعہ اور ہفتہ کی رات اپنے کسٹمرز کو لے کر آیا کرتی ہے۔“
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کون ہے یہ ٹیسی؟“

”میری ہی ایک کارکن ہے۔“
”کتنی لڑکیاں ہیں تمہارے پاس؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے تو اچھی خاصی تھیں۔ اب گنتی کی رہ گئی ہیں۔“
اس نے بتایا۔ ”ٹیسی کا شوہر ایک ٹرک ڈرائیور ہے۔ وہ جمعہ اور ہفتہ کی رات کو شہر سے باہر رہتا ہے تو ٹیسی یہاں آ جاتی ہے۔“

”ہوں۔“ میں نے ایک ہنکاری لی۔ ”تم نے اس

اس کی ایک شادی شدہ بیٹی تھی جس نے ایک دولت مند ٹھیکیدار سے شادی کی تھی۔ وہ صرف دو بار اس بوڑھے کو دیکھنے آئی تھی۔

لائل کا ایک بیٹا تھا جو کسی ریلوے کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس نے بھی کوئی کارڈ وغیرہ بھیجا تھا۔

لائل زندگی بھر بجلی کی مصنوعات کی ایک دکان چلاتا رہا۔ اس کے پاس سرمایہ یا جائیداد نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پھر اس نے تیسری شادی کی۔ اس عورت کے پاس کلشن میں سٹریکچر زری زمین تھی جو اس کی موت کے بعد لائل کے پاس آگئی تھی۔

میں نے یہ ساری معلومات حاصل کرنے اور زمین کے کاغذات وغیرہ کی تلاش میں کئی دن لگائے۔ یہاں وہی وکیل کے حلیے والا حربہ کام آیا تھا اور جب میری تلاش مکمل ہوئی تو اندازہ ہوا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی ہے۔

اس رات میرا آف تھا۔ اور مس روبی کی یہ خواہش تھی کہ میں اس کے ساتھ برگر کھانے چلوں۔ مس روبی کے پاس ایک پرانی کیڑی لاک تھی۔ جہازی سائز کی اس گاڑی کو چلاتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے میں کوئی بس چلا رہا ہوں۔

روبی اس دوران سگریٹ کے کئی کش لیتی اور بیڑ کے گھونٹ بھرتی رہی تھی۔ ہم نے ایک پوائنٹ سے روبی کی پسند کے برگر کھائے اور واپس آگئے۔ بہر حال اس کے ساتھ وقت اچھا گزرا تھا۔

روبی سے کئی بار کی ملاقاتوں اور باتوں کے بعد اس کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ بے چاری ایک تنہا عورت ہے۔ کوئی نہیں تھا اس کا۔

ایک دن جب میں نے روزیلی کو بتایا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ تو وہ شاک سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے سینے پر کراس بناتے ہوئے کہا۔ ”ہوش میں آؤ لڑکے، یہ تم کہاں رہنے لگے ہو؟ جتنی جلد ہو تم وہ جگہ چھوڑ دو۔ کیونکہ وہاں کے درود پوار پر شیطان کا قبضہ ہے۔“

اب پتا نہیں اس رات وہاں شیطان کا قبضہ تھا یا کچھ اور تھا۔ بہر حال میرے کمرے کی چھت کے اوپر یعنی اوپر والے کمرے سے ایک عورت اور ایک مرد کی آوازیں آتی رہی تھیں جبکہ میں یہ جانتا تھا کہ اوپر والا کمرہ بالکل خالی رہتا ہے۔

دوسری صبح بیدار ہو کر میں نے قریبی بیکری کا رخ

جگہ کے بارے میں پہلے سے کیوں نہیں بتایا؟“
 ”تم نے پہلے پوچھا ہی کہاں تھا۔“
 ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔
 ”ویسے تمہاری اس ٹیم کا معاوضہ کتنا ہوتا ہے؟“
 ”کوئی طے نہیں ہے۔ ویسے تمہاری سفارش کر سکتی ہوں۔“

”رہنے دو، بعد میں اس پر بات کروں گا۔“
 تین دن گزر گئے۔ تین دنوں کے بعد میں ولما کے سامنے بیٹھا ہوا اسے مشورے دے رہا تھا کہ کس طرح اس نرسنگ ہوم کو زیادہ بہتر طور پر چلایا جاسکتا ہے۔
 میں دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ ان تین دنوں کے دوران میرے خلاف کسی نے کوئی شکایت تو نہیں کی ہے۔
 لیکن سب ٹھیک تھا۔ میرے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ البتہ ولما کو اس بات پر حیرت تھی کہ میں ڈیوٹی ختم ہو جانے کے بعد بھی بہت دیر تک یہیں رہتا ہوں۔
 ”اور ہاں، یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ تم کچن میں اچھا خاصا وقت گزارتے ہیں۔“ اس نے کہا۔
 ”میڈم، کیا یہ یہاں کے کسی اصول کے خلاف ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے لیکن ایسا چونکہ ہوتا نہیں ہے۔ اس لیے حیرت ہوئی تھی۔“
 ”بس میڈم یونہی۔ وقت گزارنے کے لیے مپ شپ کر لیتا ہوں۔“ میں نے بتایا۔
 ”ایک بات اور، بوڑھے لائل کے بستر کے پیچھے سے ایک خوش قسم کا میگزین ملا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ایسا میگزین اسے کس نے لا کر دیا ہوگا۔“
 ”نہیں میڈم، مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا ہوتا۔“

”میں نے پوچھا تھا لیکن وہ کوئی جواب دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔“ ولما نے بتایا۔
 ”میرا خیال ہے کہ اگر وہ بوڑھا لائل اپنے آپ کو بہلانے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہے تو اسے اس کی اجازت ہونی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

ولما نے کہا تو کچھ نہیں۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک باریک سی لکیر نمودار ہو گئی۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔
 ”مسٹر گروئن! تمہاری اب تک کی رپورٹ میرے سامنے ہے۔ تمہاری کارکردگی اچھی ہے۔“
 ”شکریہ مس ولما۔“

میں کچن واپس آ گیا۔ جہاں روزیلی نے میرے لیے کافی تیار کر رکھی تھی۔ ولما سے باتیں کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ اتنی بری نہیں ہے جتنا میں نے پہلی بار خیال کیا تھا۔
 میں نے اس کا نام ہٹ لسٹ سے نکالا تو نہیں لیکن تیسرے نمبر پر رکھ لیا۔

میں نے کچھ اور دن لگا کر، کچھ اور محنت کر کے اپنی ریسرچ مکمل کر لی۔ مجھے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ اس کے لیے میں نے پرانے ریکارڈز چھانے، فائلیں دیکھیں اور برسوں پرانے اخبارات کا مطالعہ کیا۔ تب جا کر بہت کچھ معلوم ہو سکا۔

ایک مسٹر پلانک تھے جن کی تین سوا یکڑ کی زمین کلنٹن شہر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ پلانک نے وصیت نامہ مرتب تو کر لیا تھا لیکن وہ ابھی تک کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکا تھا۔ اس کی بیوی کا انتقال بھی گیارہ برس پہلے ہو چکا تھا۔
 دوسرا بوڑھا لائل تھا۔ اس کے پاس بھی بہت زمین تھی۔ لائل کے حالات میں بتا چکا ہوں۔ اور ہاں، اس مکان کی مالکہ روبی تھی، میں جس مکان میں کرائے پر کمرہ لے کر رہ رہا تھا۔

اس کے بارے میں ریسرچ کرنے کے بعد اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس نے تین شادیاں کی تھیں جو سب ختم ہو گئیں۔ اس کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ اس کے پاس قابل ذکر جائیداد وغیرہ بھی نہیں تھی۔ سوائے اس مکان اور اس پرانی کیڑی لاک کے۔

اس کے باوجود اس میں میری دلچسپی کم نہیں ہوئی تھی۔

وہ اکثر مجھے اپنے ساتھ بیٹھ کر پینے کے لیے کہتی اور میں اس کی بات مان لیتا۔ اس دوپہر کو بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے مجھے دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔

میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا۔ ”مس روبی! کیا میں کبھی تمہاری گاڑی استعمال کر سکتا ہوں۔“
 ”کیوں، تمہاری گاڑی کے ساتھ کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ کچھ پریشان کر رہی ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”خیریت تو ہے۔ کیا تمہیں کہیں دور جانا ہے؟“
 ”تم یہ بتاؤ کیا تم کسی لائل نام کے آدمی کو جانتی ہو؟“
 میں نے پوچھا۔

”لائل۔“ اس نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ ”نہیں،

”میری لینڈ لیڈی۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔“
اس کی مالکہ ہے۔“

”نہیں، نہیں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“
میں نے گاڑی روٹی کے مکان کے گیٹ پر روک
دی۔ ہارن دینے پر وہ فوراً ہی اس طرح باہر آ گئی جیسے بالکل
انتظار میں بیٹھی ہو۔

لائل پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ان دونوں کا
آپس میں تعارف کروا دیا۔ لائل نے بڑی گرم جوشی سے
ہاتھ ملایا تھا۔

گاڑی آگے چلی تو روٹی نے لائل کو آفر کی۔ ”مسٹر
لائل! کیا خیال ہے بوربن کے بارے میں؟“
”نہیں، میں وہ نہیں پیتا۔“

روٹی نے اپنا بڑا سا بیگ کھول کر اس میں سے ایک
بوتل نکالی اور گھونٹ لینے لگی پھر اچانک اس نے کہا۔ ”میرا
خیال ہے کہ راستے سے چیز برگر اور فرائز لیتے ہوئے
چلیں۔“

”اچھا خیال ہے۔“ مجھ سے پہلے لائل بول پڑا۔
میں نے گاڑی ایک ایسے اسپاٹ پر روک دی جہاں
کا چیز برگر بہت مشہور اور لذیذ ہوا کرتا تھا۔ ہم نے برگر
خریدے اور آگے بڑھ گئے۔
ابھی کچھ فاصلہ باقی تھا کہ لائل نے بیر کی خواہش
ظاہر کی۔

میں نے ایک شاپ پر گاڑی روکی اور چھ ڈبوں کا
ایک بیگ خرید کر لے آیا۔ روٹی اپنے چیز برگر کے ساتھ
اچھی ہوئی تھی۔

ہمارا رخ جس سنہاں کی طرف تھا وہ اوپن ایر تھا
اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے فلم دیکھی جاسکتی تھی۔ بس یہ ہوتا تھا
کہ مائیکروفون گاڑی کے اندر کھینچ لیا جاتا۔ جس سے
آوازیں سنائی دیا کرتیں۔

فلم شروع ہوئی۔ میں ان دونوں کے بارے میں تو
نہیں جانتا لیکن مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں ان دونوں
کو داش روم کا کہہ کر گاڑی سے باہر آ گیا۔

ہماری گاڑی کے ٹھیک پیچھے ایک دوسری گاڑی تھی
جس میں تین نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ فلم سے بھرپور
لطف اندوز ہو رہے تھے اور جب بھی کوئی زوردار منظر
اسکرین پر آتا وہ ترمک کے عالم میں ہارن بجانے لگتے۔

میں اس طرف آ گیا جہاں داش روم بنے ہوئے تھے
اور ایک چھوٹا سا کینٹین تھا۔ میں نے وہاں سے پاپ کارن

اس وقت تو یاد نہیں آ رہا۔ کیوں کیا بات ہو گئی؟“

”وہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اولڈ
ہوم میں ہے۔ میرا پسندیدہ مریض ہے۔ میں اسے اپنے
ساتھ فلم دکھانے لے جانا چاہتا ہوں۔“
”کون سی فلم؟“

”وہی، جیسے دوسری قسم کے لوگ دیکھتے ہیں۔“ میں
نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

روٹی مسکرا دی۔ ”بدمعاش، آدمی ہوتا ہے۔ اس قسم کی فلم
دکھانے ایک بوڑھے کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے؟“
”ہاں، میں اسے زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا
ہوں۔“ میں نے بتایا۔

روٹی مسکرا دی۔ میں نے اولڈ ہوم میں اس بوڑھے
لائل کے حوالے سے اب تک جو کچھ بھی سنا تھا، وہ اسے بتا
دیا۔ وہ بہت مزے لے لے کر سنتی اور ہنستی رہی بلکہ میرا
اندازہ ہے کہ وہ خود بھی اس سے ملنے کی خواہش کر رہی ہو
گی۔

میں نے اپنے طور پر انتظامات مکمل کر رکھے تھے۔
اس لیے مجھے مس آٹھنٹی کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ آٹھنٹی
دوسری شفٹ کی انچارج تھی۔ وہ اپنے آپ کو بہت لیے
دیے رکھتی۔ اس کا لہجہ بھی سخت ہوا کرتا تھا۔
اس نے لائل کو باہر لے جانے کی تجویز یکسر رد کر دی
تھی۔ ”نہیں، تم اسے نہیں لے جاسکتے۔ یہ اصول کے خلاف
ہے۔“

”لیکن میں نے ولما سے باقاعدہ تحریری اجازت
لی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم قائل میں دیکھ سکتی ہو۔“
اس نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے قائل دیکھی اور
لائل کو لے جانے کی اجازت دے دی۔

کچھ دیر بعد ہم روٹی کی لمبی چوڑی کیڑی لاک کی اگلی
نشتوں پر تھے۔ لائل کسی بچے کی طرح خوش دکھائی دے
رہا تھا۔

اس نے اس وقت وہی کوٹ پہن رکھا تھا جس کو وہ
نہ جانے کتنے برسوں سے استعمال کرتا چلا آ رہا ہوگا۔ میں
نے کچھ دور جانے کے بعد اس سے دریافت کیا۔ ”اگر میں کسی
کو ساتھ بٹھالوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“
”کس کو بٹھاؤ گے؟“

”ایک عورت ہے۔“ میں نے بتایا۔
عورت کے نام پر اس کی بوڑھی ہوس زدہ
آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ ”کون عورت ہے؟“

کا ایک پیک خرید اور آہستہ آہستہ چباتا ہوا کچھ فاصلے پر ایک بیچ پر جا کر بیٹھ گیا۔
میں کبھی کبھی اچھتی ہوئی نگاہ سے اسکرین کو دیکھ لیتا پھر پاپ کارن کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد جب پاپ کارن ختم ہو گئے تو میں ٹھہلتا ہوا گاڑی کی طرف آ گیا۔

روبی اگلی سیٹ پر نہیں تھی۔
وہ پیچھے لائل کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دونوں ہنس رہے تھے۔ دونوں کی آوازیں اس طرح بوجھل ہو رہی تھیں جیسے نشے میں ہوں۔

میری ڈیوٹی ساڑھے نو بجے سے شروع ہوتی تھی۔
وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے گاڑی کے پاس جا کر بلند آواز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ میری ڈیوٹی کا وقت شروع ہونے والا ہے۔“
دونوں کچھ بڑبڑانے لگے پھر چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

میں نے راستے میں روبی کو اس کے مکان کے گیٹ کے سامنے ڈراپ کیا اور اولڈ ہوم کی طرف گاڑی دوڑا دی۔
میرے پاس ابھی بھی وہی کیڈی لاک تھی اور ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد اسی پر مجھے واپس آنا تھا۔
اس کے بعد اور کئی دن گزر گئے۔

میں نے لائل سے ڈھیر ساری باتیں کیں اور اس نے بھی مجھے اپنے گزارے ہوئے دنوں کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔

اس کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی فوج سے تھا اور وہ خود فوج میں رہ چکا تھا اور اسی حوالے سے باتیں کیا کرتا۔
دشمن کی فوج، اپنی فوج، جنگی محاذ، میدان جنگ، گولہ بارود، ہتھیار، پلاٹون اور بھی وہ تمام اصطلاحات جو جنگ کے دوران یا فوج میں سامنے آیا کرتی ہیں۔

اس کو تحریک دلانے کے لیے میں نے بھی بازار سے فوجی ساز و سامان اور دوسری جنگ عظیم وغیرہ کے واقعات کی کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ تاکہ گفتگو کرتے ہوئے اس کو یاد دلا سکوں کہ ایسا بھی ہو چکا ہے اور فلاں محاذ پر فلاں جرنیل لڑ رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ انیس سو بتیس اور چونتیس کے واقعات بتاتا، جب ہیڈ فورڈ کے جنگلات میں گھمسان کی جنگ ہوئی تھی۔ اس میدان جنگ سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔
اس محاذ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بھی ہوئی آنکھوں

میں روشنی پیدا ہو جاتی۔

ایک بار میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں اپنی یادیں تازہ کرنے کے لیے اس محاذ کو دوبارہ دیکھنا ہوگا۔“
”کاش ایسا ہو سکتا۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔
”اس جگہ پر دوبارہ جانا میرا خواب ہے۔“
”یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ میں تمہارا یہ خواب پورا کر دوں گا۔“

میں وہاں اپریل کے مہینے میں جانا پسند کروں گا۔“
اس نے کہا۔ ”میں دیکھنا چاہوں گا کہ موسم بہار میں وہ جنگل کیسا لگتا ہے۔“

”ضرور، میں ہر حال میں تمہیں لے جاؤں گا۔“ میں نے دوبارہ وعدہ کیا۔

”لیکن تم ایسی باتوں میں کیوں دلچسپی لیتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا تعلق ایک ایسی سوسائٹی سے ہے جو اس قسم کی یادگار کو محفوظ رکھتی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”یہ ایسی سوسائٹی ہے جو حکومت سے ایک پائی نہیں لیتی۔ مخیر لوگوں کے ڈنیشن سے کام چلاتی ہے۔ حالانکہ میں ایک غریب سا آدمی ہوں۔ اس کے باوجود ہر سال کچھ نہ کچھ بھیج ہی دیتا ہوں۔“

”ہوں۔“ اس نے ہنکار لی لیکن خاموش رہا۔
میں نے بات آگے بڑھائی۔ ”مسٹر لائل! یہاں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی پوری وصیت ایسی سوسائٹی کے نام کر دی ہے۔“

لائل اس پر بھی خاموش رہا۔ کوئی تاثرات نہیں۔
میں اسے اس کے کمرے میں لے آیا۔ بستر پر بٹھانے کے بعد جب میں جانے لگا تو اس نے مجھے آواز دی۔ ”مسٹر گروئن! میں ایک بات بتا دوں۔ میرا کوئی وصیت نامہ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے مجھے بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ بے پناہ مایوسی، لیکن میں نے اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور اس کو خدا حافظ کہہ کر اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔

صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں دوسری جنگ عظیم پر ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھا کہ کسی کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ مس ڈیفن تھی۔ چوراسی پچاسی برس کی ایک بوڑھی عورت۔ جس کو پچھلے کمروں میں رکھا جاتا تھا اور ان کمروں

حضور والا تیار! ہم حاضر ہیں



دیا گیا۔ ولما اور نرس آٹھلی بوکھلائی بوکھلائی ہی گھوم رہی تھیں۔

دوسرے دن ایک آدمی آٹھلا۔ اس کا نام ڈکلیٹر تھا۔ وہ ان وکیلوں میں سے تھا جن کو اس قسم کے کیس لڑنے میں بہت دلچسپی ہوتی ہے اور وہ کسی بھی ادارے کی خامیوں اور کمزوریوں کی سوچتے پھرتے ہیں۔

وہ بہت دیر تک مجھ سے اور گرے سے سوالات کرتا رہا کہ مس ہیئرٹ کے ساتھ آخر ہوا کیا تھا۔ میں نے اشاروں میں اسے بتایا کہ میں اس کے پاس آکر بتاؤں گا۔ ہیئرٹ کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس کے سر میں ٹانگے آئے تھے اور بہت سا خون ضائع ہو گیا تھا۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔

دو چار دنوں کے بعد پتا چلا کہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی ہے اور وہ پیٹ بھر کے کھا بھی رہی ہے۔

ایک دوپہر کو میں ڈکلیٹر کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ ”میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

”اسی لیے میں کام پکا کر کے آیا ہوں تمہارے پاس۔“

میں نے ساری تصویریں اور ریکارڈ وغیرہ اس کے سامنے کر دیے۔ یہ تصویریں مس ہیئرٹ کی اس وقت کی تھیں

کہ دروازے آسانی سے نہیں کھلتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کمرے سے کیسے نکل آئی تھی۔

”کیا بات ہے مس ڈیفرن؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہیئرٹ کو دیکھو، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ فرش پر پڑی ہوئی ہے۔“

میں کتاب ایک طرف رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں مس ڈیفرن کو چھوڑ کر پچھلے کمرے کی طرف دوڑا۔

میں نے اپنا کارڈ منج کیا جس سے دروازہ کھلا کرتا تھا۔

میں دروازے سے گزر کر تقریباً دوڑتا ہوا مس ہیئرٹ کے کمرے میں پہنچ گیا۔

اس کی عمر بھی اچھی خاصی تھی۔

اس وقت وہ فرش پر بے ہوشی کے عالم میں پڑی تھی۔ اس کے جسم پر لباس بھی نا کافی تھا۔ وہ اپنی غلاظت میں لتھڑی ہوئی تھی۔

میں ایسے موقعوں کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔ میں نے اپنی جیب سے اپنا چھوٹا کیمرہ نکالا اور جلدی جلدی چار پانچ تصویریں لے لیں۔

پچھلے کمرے کی ڈیوٹی پر ایک نرس ریٹا ہوا کرتی تھی لیکن اس وقت ریٹا کا پتا نہیں تھا۔ میں نے دوسری طرف سے ایک مددگار گرے کو ساتھ لیا اور دوبارہ اسی کمرے میں پہنچ گیا۔

ہم نے ماسک باندھ لیے تھے اور چمڑے کے دستانے پہن لیے تھے۔ گرے اور میں نے مل کر ہیئرٹ کو بستر پر لٹا دیا۔

میں صفائی کرنے میں مصروف ہو گیا جبکہ گرے اسے گاؤن پہنانے لگا۔ مس ہیئرٹ کو گرنے سے چوٹیں بھی آئی تھیں جس سے زخم پیدا ہو گیا تھا۔ گرے اس کے زخم پر دوائیں لگانے اور پٹی باندھنے لگا جبکہ میں نے اس پاس پھیلی ہوئی غلاظت صاف کر دی تھی۔

گرے کو اپنے کام میں مصروف چھوڑ کر میں تیزی سے اس طرف آیا جہاں ہرمریض کے بارے میں روزانہ کی بنیاد پر رپورٹ تیار کی جاتی تھی۔

میں نے جلدی جلدی رپورٹ دیکھی۔ ہیئرٹ گزشتہ اٹھارہ گھنٹوں سے بھوکی تھی۔ اس کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ اس کو اینڈ کرنے والوں کی بے پروائی تھی۔

میں نے جلدی جلدی اس رپورٹ کی بھی تصویریں لیں۔ اسی دوران شور مچاتی ہوئی ایسبوالینس بھی آ پہنچی تھی۔

مس ہیئرٹ کو ایسبوالینس میں ڈال کر اسپتال روانہ کر

جب وہ فرش پر گندگی کے درمیان پڑی تھی اور وہ ریکارڈ تھا جو ہیرٹ کے حوالے سے تھا کہ کس طرح اس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

ڈکلیئر یہ سب کچھ دیکھ کر اچھل پڑا پھر ہم دونوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا۔ ایک ڈیل ہو گئی۔

☆☆☆

اولڈ ہوم میں خوشی اور جشن کا موقع اس وقت ہوتا ہے جب کسی کی برتھ ڈے منائی جاتی ہے۔

اس وقت اسٹاف اور دوسرے لوگ کیفے ٹیریا میں جمع ہو جاتے ہیں۔ موم بتیاں روشن کی جاتی ہیں۔ کیک کاٹا جاتا ہے۔ سب مل کر گانا گاتے ہیں اور زندگی ایک بار پھر ان کے درمیان لوٹ آتی ہے۔ کچھ ہی دیر کے لیے سہمی۔

ان دنوں ولما مجھ سے بہت خوش رہا کرتی۔ کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ جب ہیرٹ گری بڑی تھی تو میں نے اس تک پہنچنے میں کتنی پھرتی دکھائی تھی۔

تو میں یہ بتا رہا تھا کہ اس قسم کے اولڈ ہومز میں کسی کی سالگرہ کا کیا مطلب ہوتا تھا۔ کتنی خوشیاں ان لمحوں سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔

اس شام بوڑھے لائل کی برتھ ڈے تھی۔ وہ پچاس برس کا ہو چکا تھا۔ اس شام اس کی بیٹی بھی سالگرہ کی مبارک باد دینے آئی تھی۔

اس کے ساتھ اس کے دو چھوٹے بچے بھی تھے جو اپنے نانا کے لیے تحفے وغیرہ لے کر آئے تھے۔

ان تحائف میں کچھ چاکلیٹس، بسکٹ، ایک دو جوڑے کپڑے اور اسی قسم کی دیگر چیزیں تھیں۔ اس کے دونوں بچے.... ادھر ادھر شور کرتے پھر رہے تھے۔ وہی رکی سی تقریب ہوئی جو ایسے مواقع پر ہوا کرتی ہے۔ یعنی کیک کاٹا گیا اور بوڑھے لائل کے لیے دعائیں کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیٹی نے اپنی بے سُری آواز میں سالگرہ کا گیت بھی سنایا اور یہ تقریب ختم ہو گئی۔

آنے والے واپس چلے گئے پھر پہلے جیسا سنا ہوا گیا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ خوشی کا لمحہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ اب میں نے اپنا تحفہ پیش کیا۔

یہ تحفہ لائل کی پرانی تصویروں کا تھا۔ جنہیں میں نے بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ اخبارات میں دیکھ کر ان کی فوٹو کاپیاں بنا کر ایک خوب صورت البم میں سجایا تھا۔

میں نے جب وہ البم لائل کو پیش کیا تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان تصویروں میں لائل گھڑ سواری

کر رہا تھا۔ فوجی وردی میں تھا۔ پریڈ کر رہا تھا۔ گالف کھیل رہا تھا۔ یہ سب اس کی یادیں تھیں جو میں نے اسے لوٹا دی تھیں۔

اب اسے اس رات دوسرا تحفہ دینا تھا۔ اس کے لیے میں نے تیاری کر رکھی تھی۔ میں نے روبی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی کسی لڑکی کو تیار رکھے۔ اسے بوڑھے لائل کے پاس پہنچانا ہے۔

دوسری تیاری یہ تھی کہ لائل کے ساتھ جو دوسرا بندہ رہتا تھا، اسے خواب آور گولیوں کی بھاری مقدار دینی تھی تاکہ وہ صبح تک آرام سے سوتا رہے۔

اس کے گہری نیند میں جانے کے بعد میرا کام آسان ہو گیا۔ میں نے روبی کے پاس سے جس عورت کو لیا اس کا نام ڈولی تھا۔

اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسے کسی بوڑھے کے پاس پہنچایا جا رہا ہے یا کسی جوان کے پاس۔ اسے بس اپنے معاوضے سے مطلب تھا جو میں نے پہلے ہی ادا کر دیا تھا۔

لائل کے کمرے کا ساتھی بے خبر سو رہا تھا جب میں نے ڈولی کو لائل کے کمرے میں پہنچایا، لائل حیران رہ گیا تھا۔ ”یہ.... یہ کون ہے۔“

”تمہاری سالگرہ کا تحفہ۔“

میں یہ کہہ کر باہر چلا آیا۔

اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ اب ہم رات کو دیر تک پوکر کھیلتے رہتے۔ اسے مجھ پر بے حد اعتماد ہو گیا تھا۔

ایک رات اس نے کہا۔ ”گروئن! میں نے ایک دن شاید تمہیں اپنے وصیت نامے کے بارے میں بتایا تھا کہ میں نے وہ ابھی تک تیار نہیں کیا ہے۔“

”ہاں بتایا تو تھا۔“ میں نے سرسری انداز میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر کیے بغیر کہا۔

”لیکن اب میں وصیت نامہ لکھنے کی سوچ رہا ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”لیکن کس کے نام۔ میرا ایک بیٹا ہے اور برسوں سے اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ایک بیٹی ہے تو اس کے پاس پہلے ہی سے بہت دولت ہے۔ میں اسی الجھن میں ہوں۔ ہاں یاد آیا۔ تم نے شاید کسی سوسائٹی کے بارے میں کہا تھا۔ اس کا کیا طریقہ ہوتا ہے۔“

میرا چہرہ ابھی تک ساٹا ہی رہا تھا۔ حالانکہ وہ آہستہ آہستہ میرے مطلب پر آ رہا تھا۔

”اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو ساری جائیداد کا ٹرسٹی بنادیا جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور وہی اس کے مفادات کی دیکھ بھال کیا کرتا ہے اور ہر مہینے یا ہر سال اس سوسائٹی کو رقم پہنچاتا رہتا ہے۔“

”میرے پاس کچھ زمینیں ہیں گروئن۔“ اس نے بتایا۔

”کتنی ہوں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”چھ سو ایکڑ۔“ اس نے بتایا۔ ”اور اس وقت ایک ایکڑ کی قیمت ہزار ڈالر ہے۔“

میں ابھی بھی سپاٹ ہی رہا۔ حالانکہ لائل نے بہت بڑی خبر سنا دی تھی۔

”گروئن! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری زمینوں کے ٹرسٹی بن جاؤ۔“

اس نے وہ بات کہہ دی جو میں سننا چاہتا تھا۔

دوسرے دن یہ افواہ گرم تھی کہ وکیلوں کی ایک ٹیم اس خاموش جنت کا معائنہ کرنے آرہی ہے۔ اس ٹیم کو شہری حکومت کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

ظاہر ہے اس ٹیم کا سربراہ ڈکلیئر تھا۔ اس دن خاموش جنت میں ہچل پچی ہوئی تھی۔ صفائی ستھرائی کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ پلاسٹک کے پھولوں کی جگہ اصلی پھول منگوا کر لگائے گئے تھے۔

میری ڈیوٹی گرچہ رات نو بجے سے ہوتی تھی لیکن میں اس وقت بھی وہیں بھٹک رہا تھا اور کسی نے توجہ اس لیے نہیں دی کہ ڈیوٹی ٹائم کے بعد بھی ادھر ادھر بھٹکتا میرا معمول تھا۔

میں کئی مہینوں سے اسی دن کے لیے اتنی محنت کر رہا تھا۔

ڈکلیئر۔۔۔۔۔ کی ٹیم میں ایک لڑکی اور دو مرد تھے۔ پروفیشنل لوگ، کالے لباس والے، انہوں نے بڑی جاں فشانی سے پورے اولڈ ہاؤس کا دورہ کیا۔ مریضوں کو دیکھا۔ صحت اور صفائی کے انتظامات کا جائزہ لیا۔ ریکارڈز دیکھے۔

ہیرٹ کے گھر والوں کی طرف سے ڈکلیئر ہی کو وکیل مقرر کیا گیا تھا۔

شام کے کھانے کے وقت جب سب کیفے ٹیریا میں جمع ہوئے تو میں نے رضا کارانہ طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ میری ڈیوٹی کا وقت نہیں تھا لیکن یہ بھی کمیل کا حصہ تھا۔

لائل اب تک اپنے کمرے میں تھا۔

جب میں اس کے کمرے میں پہنچا تو اس کے ہاتھ میں وہی وصیت نامہ تھا جو ڈکلیئر نے تیار کر کے مجھے دیا تھا۔ یہ ایک مکمل وصیت نامہ تھا۔ جس میں دنیا بھر کی قانونی موٹگافیاں کردی گئی تھیں۔

”لائل! تم نے وصیت نامہ پڑھ لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا

”تو پھر آؤ میرے ساتھ۔“

میں اُسے سہارا دے کر ہال میں لے آیا۔ ڈکلیئر اور اس کے دونوں ساتھی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے لائل کو ان کے سامنے پیش کر دیا۔

انہوں نے لائل سے قانونی باتیں شروع کر دیں۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس نے یہ وصیت نامہ اپنی مرضی ہی سے لکھا ہے یا کسی دباؤ کے تحت لکھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

لائل لمبے چوڑے قانونی دلائل اور نکات سے اکتانے لگا۔ پھر اس نے وصیت نامے پر دستخط کر دیے۔

جس کے تحت میں اس کی جائیداد کا مکمل نگران تھا پھر گواہان کے دستخط ہوئے۔ یہ گواہان وہی ڈکلیئر کی ٹیم کے لوگ تھے۔ ایک بڑا مرحلہ سر ہو چکا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ڈکلیئر نے مجھ سے ملاقات کی۔

”گروئن! تمہارے دیے ہوئے ثبوت بہت کام آرہے ہیں۔ کمپنی ولما اور نرس آجکل کو ہٹانے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی چار لاکھ ڈالر کا ہر جانہ بھی دے رہی ہے۔“

”اور میرے کمیشن کا کیا ہوگا؟“

”وعدے کے مطابق دس فیصد۔“ اس نے بتایا۔

”دس فیصد بھی بہت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں بوڑھے لائل کی جائیداد بھی مل رہی ہے۔ اب یہ بتاؤ، اس میں میرا کیا حصہ ہے؟“

”وہی دس فیصد۔“

ہم دونوں ہنس پڑے۔

اس شہر اور اس اولڈ ہوم ”خاموش جنت“ میں میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ مجھے اب دو چار مہینے آرام کرنا تھا۔ اس کے بعد کسی اور جنت کی تلاش میں نکل جانا تھا۔

امریکا بہت بڑا ہے اور اس قسم کے سیکڑوں ادارے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

گلوریا

سکندر سلیم

عورت واقعی ایک پہیلی ہے... پھول... شبنم... خوشبو... تو
کبھی... آگ... شعلہ... زہریلی ناگن... یہ اس کے مختلف روپ
ہیں... محبتیں نچھاور کرنے پر آئے تو... خاک ہو جائے...
چالاکی و عیاری کا لبادہ اوڑھے تو... سانس لینا مشکل بنادے...
ایسی ہی شبنم و شعلہ کا بھڑکتا... سلگتا... شاپانہ کا رنامہ

جامع و مکمل ڈرامے کا چونکا دینے والا کلاسیکس۔



دھیرے دھیرے اپنے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے اپنی اس
مینگ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دو گھنٹے قبل ڈومنگو کے
ساتھ ہوئی تھی۔

ڈومنگو نے دو سال قبل مجھے اپنی سکیورٹی اور نگہبانی
کے لیے ملازم رکھا تھا۔ وہ ٹس برگ میں ریسٹورنٹس اور
اسٹریپ کلبس کی ایک چین کا مالک تھا جس سے اس کے
سرمائے میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے اس

الماری کے بند دروازوں کے درمیان کوئی جھری
نہیں تھی اس لیے میں انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا، البتہ ان کی
آوازیں یقینی طور پر مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں
پورے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے
جیسے ہالی ووڈ کی کسی فلم کا جذباتی منظر فلما یا جا رہا ہو۔
لیکن مجھے ان کی موجودہ بیجانی کیفیت کی قطعی کوئی
پروا نہیں تھی۔ میں اپنے سائلنسر لگے ریوالور کی نال سے

بات کی وضاحت بھی ہو جاتی تھی کہ ڈومنگو شہر میں کوکین اور ہیروئن کا نصف کاروبار کیوں کر چلا رہا تھا۔

اسٹریپ کلبس کی وجہ سے اس کی چوتھی شادی کی وضاحت بھی ہو جاتی تھی۔ اس کی پہلی شادی اپنی ہائی اسکول کی ساتھی اور محبوبہ کے ساتھ ہوئی تھی جس سے اس کے تین بچے تھے۔ پھر اپنے کلب کی رقاصہ کی خاطر اس نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا تھا اور اس رقاصہ سے شادی کر لی تھی۔ پانچ سال بعد اس نے دوسری بیوی کو بھی طلاق دے دی تھی اور تیسری شادی رچالی تھی۔ اس کی ہر بیوی کی ازدواجی زندگی کی اوسط مدت پانچ سال ہوا کرتی تھی۔

سوائے اس کی موجودہ بیوی گلوریا کے جو اس وقت مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر بیڈ پر فرطِ طرب میں ہم آغوش تھی۔ ازدواجی مدت کے پانچ سال پورے ہونے میں کچھ ہی رخصت رہ گیا تھا۔

لیکن ڈومنگو کے ساتھ ہونے والی میری اس میٹنگ کا خیال کسی طرح بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہو رہا تھا۔

میری اس سے ملاقات اس کے اسٹریپ کلب کے عقبی حصے میں واقع دفتر میں ہوئی تھی۔ وہاں کمرے میں صرف ایک خستہ دھاتی میز اور ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ کمرے میں ٹالکیم پاؤڈر اور پسینے کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ میں وہاں کھڑا اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ کوکین کی تھوڑی مقدار سونگھنے اور جونی وا کر بلیو کا ایک پیگ حلق سے نیچے اتارنے سے فارغ نہیں ہوا۔

ڈومنگو ایک وضع دار شخص تھا پھر وہ میری جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے اپنی سوجی ہوئی براؤن آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ چیٹنگ کر رہی ہے۔“ اس کا اشارہ اپنی موجودہ اور چوتھی بیوی گلوریا کی جانب تھا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم خوش اسلوبی کے ساتھ اس کا کام تمام کرو۔ وہ ساؤتھ سائڈ میں واقع ہمارا سیف ہاؤس استعمال کر رہی ہے۔“

”تم واقعی چاہتے ہو کہ میں اس کا کام تمام کر دوں؟“

”ہاں۔“ اس نے اپنی ناک رگڑتے ہوئے کہا۔

”میں علیحدگی کے بعد کسی چیٹنگ کرنے والی کتیا کو رقم ادا کرنا گوارا نہیں کر سکتا اور اس کا جو ساتھی ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اسے بھی قتل کر دینا۔“ اس نے اطمینان سے اپنی دلی خواہش بیان کی۔

”جائے وہ جو کوئی بھی ہو؟“ میں نے کہا۔

ڈومنگو کا منہ لٹک گیا کیونکہ اسے حیرانی ہوئی تھی کہ

میں سب کچھ جانتا ہوں۔

جو شخص ڈومنگو کی ستائیس سالہ بیوی کے ساتھ بے ہودہ پن میں ملوث تھا، وہ کوئی اور نہیں بلکہ ڈومنگو کا اپنا بیٹا ڈومنگو جونیئر تھا جو اس کی پہلی بیوی سے تھا۔ وہ اس سال اکیس برس کا ہونے والا تھا۔

ڈومنگو کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا، اب بند ہو گیا۔ اسے اپنے چہرے کے تاثرات معمول پر لانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

”کوئی بھی شخص میری بیوی کے ساتھ گل چہرے نہیں اڑا سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ حتیٰ کہ میرا اپنا خون بھی نہیں۔“

”اور تم چاہتے ہو کہ میں اسے قتل کر دوں... ڈومنگو جونیئر کو! کیا تم سو فیصد یہی کہہ رہے ہو اور یہی چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بالکل سو فیصد یہی کہہ رہا ہوں۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور یہی چاہتا ہوں۔“

اسی وجہ سے میں ڈومنگو جونیئر اور گلوریا کی سیف ہاؤس آمد سے پون گھنٹا قبل وہاں بیڈروم کی الماری کے اندر چھپ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جب ان دونوں کی بیجانی آوازوں کی شدت کچھ کم ہوئی تو میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ڈومنگو کے ساتھ ہونے والی میری اس میٹنگ کی کوئی بات مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ اس کی ڈھیروں وجوہات تھیں۔ بات تو احمقانہ لگتی ہے لیکن یہ حقیقت تھی کہ میں نے عراق کے بعد کبھی کسی عورت کو گولی نہیں ماری تھی۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں خود کو پہلے سے بہتر بنالوں گا اور کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔

اور سچی بات تو یہ تھی کہ میں گلوریا کو پسند کرتا تھا۔ وہ بھی مجھ پر توجہ دیتی تھی۔ جب ہم باتیں کیا کرتے تھے تو وہ اس دوران بار بار ہامیرے بازو کو چھو چکی تھی اور اس بات پر بھی کبھی برا نہیں مانتی تھی جب میں اس کے لباس میں کھوجنے کی کوشش کرتا تھا۔

ابھی ایک ہفتہ قبل اس نے مجھے ایک اسپیشل قسم کا کولون تھفے میں دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اسے کس طرح لگایا جاتا ہے۔ اس دوران میں اس کی انگلیاں میرے کانوں اور میری گردن کے چاروں طرف گردش کرتی رہی تھیں۔ اس بات کا خیال آتے ہی مجھے اپنے جسم میں حدت سی محسوس ہونے لگی۔

نکتے کی بات یہ تھی کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جب

شگوفے

ٹھک کرنے والی بیوی نے میکے سے شوہر کو کال کی۔

بیوی: ”کہاں ہو تم؟“

شوہر: ”گھر پر ہوں۔“

بیوی: ”جو سر مشین چلا کے سناؤ مجھے۔“

شوہر: ”لو سنو، گھر... گھر... گھر... گھر...“

بیوی: ”او کے ٹھیک ہے، بائے۔“

اگلے دن بیوی سر پر انڈینے اچانک گھر پر آ جاتی

ہے اور دیکھتی ہے بیٹا اکیلا ہے تو پوچھا۔ ”بیٹا آپ کے

ڈیڈی کدھر ہیں؟“

بیٹا: ”پتا نہیں امی کل سے ڈیڈی جو سر لیے گھوم

رہے ہیں کہیں۔“

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

انکشاف

انکاش قلم کا ہیرو ایک پاکستانی قلم دیکھ رہا تھا کہ ایک سین دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ سین کچھ اس طرح تھا کہ ہیرو کے پستول میں گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ ولن نے گولی چلائی تو ہیرو نے گولی کیج کر لی اور اپنی بندوق میں ڈال کر فائر کر کے ولن کو مار ڈالا۔

کاش! سورج کی بھی کوئی بیوی ہوتی کچھ تو اسے کنٹرول میں رکھتی۔

☆☆☆

کچھ لوگ یہ نکتہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اردو شاعری میں محبوب کے لیے صرف مذکر کا صیغہ ہی کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟ اس اعتراض کا ایک شاعر نے کیا تسلی بخش جواب دیا ہے۔ شاعر نے کہا کہ صرف ایک شعر میں محبوب کو ”مونث“ کر کے دیکھ لیں آپ کو وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔ تبدیلی کے بعد کا شعر ملاحظہ ہو۔

تم میرے پاس ”ہوتی“ ہو گویا
جب کوئی ”دوسری“ نہیں ہوتی

محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال

ڈومنگو پر سے جانی واکر کا نشہ ہرن ہو جائے گا اور اسے احساس ہوگا کہ اس کا اکلوتا بیٹا مر چکا ہے تو وہ اس شخص سے شدید نفرت کرے گا جس نے اس کے بیٹے کو گولی ماری ہو گی۔ میں یہ بات گارنٹی سے کہہ سکتا تھا۔ اور یہ میرے دو سالہ لیکن غیر آئیڈیل کیریئر کا سب سے زیادہ گھناؤنا منظر ہوتا جن کا میں نے اب تک سامنا کیا تھا۔

ڈومنگو جونیر کو بالآخر قرار آ گیا۔ میں اس کی سانسیں دوبارہ سے نارمل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ چونکے۔ اٹھلیک بدن کا مالک تھا اس لیے اسے نارمل ہونے میں کچھ وقت لگ گیا۔ پھر مجھے بیڈ کے چرچانے کی آواز سنائی دی۔ اب مجھے اپنے پلان بی پر عمل کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ڈومنگو جونیر کو ڈرا دھمکا کر بھاگنے پر مجبور کر دوں گا۔ ساتھ ہی گلوریا کو بھی فرار ہونے کا موقع فراہم کر دوں گا۔ ڈومنگو سینئر ہرگز ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن گلوریا کے فرار ہونے کے بعد شاید وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو معاف کر دے اور میرا مزید ممنون ہو جائے کہ میں نے اس کے بیٹے کو شوٹ نہیں کیا۔

جب میں نے الماری سے نکل کر باہر قدم رکھا تو گلوریا اپنا لباس پہن چکی تھی اور دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ایک قسم کی گہری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی جیسے کوئی خاص بات سوچ رہی ہو۔ اس نے اتنی تیزی سے اپنا لباس کس طرح پہنا تھا، یہ میرے قیاس سے باہر تھا۔ دوسری جانب ڈومنگو جونیر نے مجھے دیکھتے ہی ایک چیخ ماری اور کروٹ بدلتے ہوئے نیکے کے نیچے چلا گیا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں کسی ہتھیار کی جھلک سی دکھائی دی۔

’او کے! مجھے واپس اپنے پلان اے پر جانا ہوگا‘ میں نے پلک جھپکتے میں فیصلہ کیا۔ میں نے لگا تار دو فائر کر دیے۔ ڈومنگو جونیر کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھر آئے۔ ساتھ ہی وہ پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اس کے سینے میں تازہ دو سوراخوں سے تیزی سے خون ابلنا شروع ہو گیا۔ پھر میں نے اپنا ریوالور گلوریا کی جانب گھما دیا۔ لیکن وہ جا چکی تھی۔ مجھے نچلے زینے پر اس کے دوڑتے قدموں اور پھر داخلی دروازے کی ایک جھلک کے ساتھ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

’یہ بُرا ہوا‘ میں نے سوچا۔ اب پیچیدگیاں شروع ہو جائیں گی۔

میں نے بیڈ شیٹ کا ایک کنارہ پھاڑا اور اس سے

ڈومنگو جونیر کے سینے کے سوراخوں کو بند کر دیا اور اسے کھینچ کر ہاتھ روم میں لے گیا۔ میں نے اس کی لاش کو اٹھا کر ہاتھ مٹ میں رکھ دیا۔ پھر میں واپس بند پر آ کر بیٹھ گیا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

گلو ریا کے زیرِ جامے نیچے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ جیسی تو اس نے اتنی جلدی اپنا لباس پہن لیا تھا جس پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ لیکن اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے یہ معلوم تھا کہ میں وہاں موجود ہوں۔ اور یہ بات میرے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔

میں نے اس تمام معاملے کو اپنے ذہن میں دہرانا شروع کر دیا۔ اب گلو ریا کو معلوم ہو گیا تھا کہ ڈومنگو سینئر اس کی جان کے درے سے۔ لہذا اس کے پاس اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ نکلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ راہ فرار اختیار کرنے ہی میں اس کی عافیت ہے۔

میں ڈومنگو سے کہہ دوں گا کہ میں نے اس کے تعاقب کا پلان تیار کر لیا ہے اور کچھ دنوں کے بعد میں اسے بتا دوں گا کہ میں نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہے۔

یہ مناسب رہے گا بلکہ درحقیقت میں اس کے متعلق جتنا سوچ رہا تھا، یہ مجھے اتنا ہی زیادہ بہتر لگ رہا تھا۔

میں نے الماری میں سے ڈسکاؤنٹ اسٹور پلاسٹک ریپ اور ڈسٹ شیپ کا سب سے بڑا رول نکالا اور ڈومنگو جونیر پر کام کرنے چلا گیا۔

مجھے ڈومنگو جونیر کی لاش کومی کی طرح تیار کرنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ میں نے سوچا کہ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے میں بعد میں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ پھر میں نے ڈومنگو کو فون کیا۔

”کام ہو گیا۔“ میں نے اس کے جواب دینے پر اسے بتایا۔ ”لیکن مجھے گلو ریا کا پیچھا کرنا پڑے گا۔“
”وہ کتنا عجیب کرکس طرح نکل گئی؟“
”یہ اس کی خوش قسمتی تھی لیکن میں اسے پکڑ لوں گا۔“
”تم سے چوک ہو رہی ہے۔“

فون پر دھماکے کی آواز نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا پھر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

میں اس آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔ وہ اعشاریہ تین آٹھ ریوالور کے فائر کی آواز تھی۔ میں نے یہ آواز اس لیے پہچان لی تھی کہ میرا ایک اپ اعشاریہ تین آٹھ کا ایک پرانا ریوالور تھا جو کہ میرے باپ کی ملکیت تھا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ اپنا فون بند کیا اور سیزدھیاں اتر کر داخلی دروازے پر

آ گیا۔

میں نے محتاط انداز میں باہر سڑک کا دونوں طرف کا جائزہ لیا۔ پھر اطمینان کرنے کے بعد پیدل چلتا ہوا دو بلاک کا فاصلہ طے کر کے اس مقام پر آ گیا جہاں میں نے اپنی کار پارک کی ہوئی تھی۔

مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا لیکن میرا کام ڈومنگو کی نگہبانی کرنا تھا۔ سو میں واپس اس کی جانب چل دیا۔

ڈومنگو، پنس برگ کے شیڈی سائنڈ نامی اعلیٰ درجے کے رہائشی علاقے میں رہتا تھا۔ علاقے کا نام اس کے کاروباری معاملات کے لحاظ سے نہایت موزوں تھا۔ مکان کی تمام روشنیاں بجھی ہوئی تھیں سوائے گراؤنڈ فلور پر واقع ڈومنگو کے دفتر کے جہاں روشنی نظر آرہی تھی۔

اندر پہنچ کر میں نے نہ تو روشنیاں آن کیں اور نہ ہی کوئی آواز دی۔ مجھے آوازین سنائی دیں تو میں نے ان کے خاموش ہونے کا انتظار نہیں کیا اور ان آوازوں کے تعاقب میں ڈومنگو کے دفتر کی جانب بڑھنے لگا۔ یہ مکان سو سال سے زیادہ پرانا تھا اور اس کے لکڑی کے فرش یوں چرچراتے تھے جیسے آپ خزاں زدہ سوکھے پتوں پر چل رہے ہوں۔

میں نے ڈومنگو کے دفتر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں گلو ریا ڈومنگو کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈومنگو اس بات کا برا نہیں منا رہا تھا کیونکہ وہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں کمرے کی چھت پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی پیشانی کے عین درمیان ایک سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔

ڈومنگو کا وکیل ولیم اسٹون میز پر گلو ریا کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو سوڈالر کے سوٹ میں ملبوس وہ وکیل میری جانب گھوم گیا اور اپنی موٹی گول شیشوں والی عینک کی اوٹ سے سر تا پا میرا جائزہ لینے لگا۔

”ویل، دیکھو کون حاضر ہوا ہے۔“ گلو ریا نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ اس کے جسم پر ابھی تک وہی لباس تھا جو اس نے سیف ہاؤس سے فرار ہوتے وقت پہنا تھا۔ میری نظریں اس کے دلکش جسم پر بھٹکنے لگیں۔ بلاشبہ وہ ایک متاثر کن جسم کی مالک تھی۔

اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا، گلو ریا نے دوبارہ بولنا

”یہ میرا ایشیہ تین آٹھ کار یو ایلور ہے۔ میرا بیک آپ۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہی جو تمہارے باپ نے تمہیں دیا تھا۔“ میرے عقب میں موجود لوئس نے کہا۔ ”اور یہ تمہارے نام پر رجسٹرڈ ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔“

”اور بالکل یہی وہ پستول ہے جس سے ڈومنگو سینئر کو شوٹ کیا گیا ہے۔“ گلوریا نے بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ میں آنکھیں پھاڑے گلوریا کو تک رہا تھا۔

”یہ تو اچھا ہوا کہ لوئس یہاں موقع پر آ گیا۔“ گلوریا دوبارہ گویا ہوئی۔ ”اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور کسی طرح تم پر قابو پایا تاکہ ہم پولیس کے یہاں آنے تک تمہیں یہاں تھا رہے رکھیں۔“

اس دوران میں میرا ہولسٹر ہلکا اور کھوکھلا ہو گیا کیونکہ لوئس نے عقب سے میرا آٹو میٹک نکال لیا تھا۔ اب میں نہتا ہو گیا تھا۔

”میں نے تمہیں بچ نکلنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ میں یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔“ میں نے گلوریا سے ہکلاتے ہوئے کہا۔ میرے الفاظ یوں ادا ہو رہے تھے جیسے کسی اور کے منہ سے نکل رہے ہوں۔ ”میں نے اس طرح ڈومنگو کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔“

”اسی بنا پر تو تم میری اس نئی تنظیم کے لیے درست آدمی نہیں ہو۔“ گلوریا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ مجھے وہ لوگ چاہئیں جو حکم کی تعمیل کرتے ہیں... حکم عدولی نہیں۔“ اس دوران میں دور سے سائرین کی آواز سنائی دی۔ جو بتدریج نزدیک آتی جا رہی تھی۔

”مزید ایک اور بات۔“ گلوریا نے کہا۔ ساتھ ہی وہ اپنے مخصوص بھرپور انداز میں مسکرانے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ مسکراہٹ صرف میرے لیے ہے۔ ”اس کولون کو لگانے کا شکر یہ جو میں نے ایک ہفتہ قبل تمہیں تحفے میں دیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تم اسے لازمی استعمال کرو گے۔ جیسی تو جب میں سیف ہاؤس کے بیڈروم میں ڈومنگو جونیر کے ساتھ بیڈ پر تھی تو اس کولون کی مہک نے جو کمرے کی فضا میں پھیلی ہوئی تھی، مجھے یقین دلادیا تھا کہ تم الماری کے اندر چھپے ہوئے ہو۔“ ایک بار پھر وہ جان لیوا انداز میں مسکرائی۔

شروع کر دیا۔

”ڈومنگو جونیر کو تم نے عمرگی سے ٹھکانے لگا دیا۔ وہ اسی انجام کا مستحق تھا۔“

”میرا تو خیال تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔“ میں نے کہا۔ لیکن جب گلوریا کی آنکھوں میں مصنوعی خوف کی جھلک دیکھی تو بات بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یا کوئی اور بات رہی ہوگی۔“

”مجھے بس ڈومنگو سینئر کو ایک پیغام بھیجنے کی ضرورت تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کوئی قدم اٹھائے۔ اس کا وہ قدم تم تھے جس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے تمام گندے کام تم سے کر دیا کرتا تھا۔ لیکن میں ڈومنگو جونیر کو راستے سے ہٹانا چاہتی تھی تاکہ وارث میں بن جاؤں۔“

”تو تم نے ڈومنگو کو گولی مار دی؟ اس طرح تو یہ کام نہیں بنے گا کہ وراثت تمہیں مل جائے۔“ میں نے کہا۔ گلوریا نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور حیرانی سے بولی۔ ”اے میں نے گولی ماری ہے!“ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ کسی بنا پر اس مرتبہ مجھے اس کا اس انداز سے مسکراتا کسی طور اچھا نہیں لگا۔

میں نے نظریں گھما کر ڈومنگو کی جانب دیکھا۔ میں یہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ اس کی پیشانی پر سوراخ کیا حقیقت میں گولی لگنے کا ہی ہے! میں نے چیک کیا تو یہ ایک حقیقت ہی تھی۔

”گلوریا اب ایک غم زدہ بیوہ ہے۔“ وکیل ولیم اسٹون نے اپنے سر کے مہین بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس دہرے سانچے سے دوچار ہوئی ہے جس میں اقتدار کے بھوکے ایک جھپے نے اس کے شوہر اور اس کے سوتیلے بیٹے دونوں کو مہلک حملوں کا نشانہ بنایا ہے۔“

میں ابھی اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے اپنی پیٹھ میں کسی شے کی چھن کا احساس ہوا۔

”ہائے۔“ مجھے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہ لوئس تھا۔ وہ بندہ جسے چند ماہ قبل میں نے سیکورٹی میں اپنی مدد کے لیے ملازم رکھا تھا۔ میں نے پلٹنے کی کوشش کی تو میری پیٹھ میں گڑے ہوئے اسلحے کے زور پر مجھے آگے دھکیل دیا گیا اور میں حقیقت میں قدرے لڑکھڑا گیا۔

”یہ کیا مذاق ہے، لوئس؟“

”یہ واقعی مذاق ہے۔“ گلوریا نے کہا۔ پھر اس نے میز کی دراز میں سے ایک بیگ نکال کر نمایاں کرتے ہوئے

بولی۔ ”اے پہچانتے ہو؟“



طاہر جاوید معنل

جھٹی قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوٹ ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر پولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیر داری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھپکا لیا تھا۔ مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطحِ سطر رنگ بے لقی نہ، ایک لہر رنگ اور
دل گداز داستان...



میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ لیکن یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تباہ کر دیا۔ میں نے سربراہ ایک ایسے زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکرا کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و نا انصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو مجھے کلکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے لے آیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور کلکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرات کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر رکھ دیا گیا اور وہ خود ہشت گرد قرار پا کر جیل بھیج دیا گیا۔ اب انسپکٹر قیصر چودھری اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرا ماضی کیا ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں WWF کا یورپی چیئرمین تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن اپنے وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچا زاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر چودھری شدید زخمی ہو کر اسپتال ٹھیس ہوا۔ کلکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی "غلطی" کی تھی۔ میں نے کلکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ عاشرہ اور عارف کو میں نے بیرون ملک بھجوا دیا تاکہ وہ تحفظ کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کر سکیں۔ میں خود بھی بیزار ہو گیا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں کچھ نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا غذا صفت منگیترا اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والدین محمد کے گرد گھیرا لگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرایا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آئے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ مولوی فدا جو پہلے زبردستی کی شادی کو غلط قرار دے رہے تھے، اب نامعلوم وجہ سے اسحاق کی حمایت کرنے لگے تھے۔ اسی دوران میں کسی نے تاجور کے گھر آئی ہوئی مہمان نبرداری کو بڑی طرح زخمی کر دیا۔ اسحاق کے ہمنواؤں نے اس کا الزام بھی تاجور پر لگانے کی کوشش کی، لیکن میں نے کھوج لگانے کی ٹھانی۔ مجھے شک گزرا کہ اس کام میں مولوی فدا یا اس کا کوئی شاگرد ملوث ہے۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھانپا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آگئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلہ بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکرم کو کندھے پر لاد لیا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نبرداری کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ پتا چلا کہ یہ مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا ہے۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے مجھے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجادول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس "بلیک میلنگ" سے نکالنے کا عہد کیا، مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ میں نے ان کا تعاقب کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈکیت سجادول سے بدلہ لینے جا رہے ہیں۔ وہ ایک دیرانے میں پہنچے۔ یہاں سے گانے کی آواز آرہی تھی۔

میں درختوں میں دُکا بٹھا رہا اور گانے کی آواز سننا رہا۔ ہوا کی لہروں پر تیر کر یہ آواز کبھی تیز اور کبھی مدھم ہو جاتی تھی۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ سجادول سیالکوٹی کا ڈیرا ہے اور یہ ڈکیت یہاں رخصت و سرور کی محفل جمائے بیٹھا ہے۔ اب عالمگیر اپنے ساتھیوں سمیت اس ڈیرے تک پہنچ چکا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اپنے مقتول بھائی کا بدلہ لینے کے لیے عالمگیر، سجادول سیالکوٹی پر حملہ کرے گا۔ عنقریب مجھے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے سکتی تھیں۔ یہ فائرنگ شدید خون خرابے کا آغاز بھی ہو سکتی تھی۔

قریباً دس پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ مجھے فائرنگ۔ بانی نہیں دی۔ نہ ہی کسی اور طرح کی ہلچل محسوس ہوئی۔ شاید عالمگیر کے ساتھی بہتر موقع کی تلاش میں گھات لگائے بیٹھے تھے یا پھر اس طرح کا کوئی اور معاملہ تھا۔ اب ایک اور گیت کے بول ابھر رہے تھے اور سردرات کی خاموش تاریکی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔

رات بھر جام سے جام نکلے گا
جب نشہ چھائے گا، تب مزہ آئے گا
مخمور مردوں کے پُر نشاط قہقہے بھی گاہے بگاہے فضا میں ابھرتے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا تو میرے ذہن میں شبہات پیدا ہوئے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جھاڑیوں کے درمیان بڑی احتیاط سے چلتا ڈیرے کی طرف بڑھا۔ میری جیکٹ میں اعشاریہ 38 کا بھرا ہوا ہسٹول تھا۔ پندرہ بیس فالتو راؤنڈ بھی جیکٹ کی اندرونی جیب میں موجود تھے۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے عالمگیر کی جیب نظر آئی۔ یہ وہی جیب تھی جسے میں نے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے چلنے کے قابل بنایا تھا۔ یہ دیکھ کر میں مزید چونکا کہ جیب کو درختوں میں چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ یہ جیب ڈیرے سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر مہل جگہ کھڑی تھی۔ ڈیرے کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ چار پانچ کمروں پر مشتمل نیم پختہ سی جگہ تھی۔ برآمدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ارد گرد اور صحن میں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑاگا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بے آباد جگہ ہے مگر... کم از کم آج کی رات تو یہ بے آباد ہرگز نہیں تھی۔ اندر روشنی تھی۔ ٹھنڈی دھند کی جھنکار تھی، بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو تھی اور پُر کیف قہقہے تھے۔ مخفیہ کی آوازاں مزید واضح ہو چکی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں سازندے وغیرہ موجود نہیں ہیں بلکہ ٹیپ ریکارڈر پر گانا بولنے کے اس پر رقص کیا جا رہا ہے۔

ایک ایک مجھے اپنی بائیں جانب آہٹ کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا مگر دیر ہو چکی تھی۔ ایک شخص توپ کے گولے کی طرح مجھ سے آنکرایا۔ ہم اوپر نیچے گرے۔ گہری تاریکی میں، میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ بس اتنا اندازہ ہوا کہ وہ طاقت ور شخص ہے اور اس کے جسم سے شراب کی بو آرہی ہے۔ اس شخص کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس کے ساتھ ایسا ہوگا اور اتنی تیزی سے ہوگا۔ میں نے نیچے پڑے پڑے سر کی طوفانی ضرب اس کی پیشانی پر بائیں جانب لگائی۔ مارشل آرٹ کی زبان میں بعض لوگ ایسی چوٹ کو "راؤنڈ امپیکٹ" کا نام دیتے ہیں۔ یہ معزوب کے دماغ کی چولیس اس طرح ہلاتی ہے کہ اسے زمین و آسمان گھومتے محسوس ہوتے ہیں۔ میرے بدن مقابل کی مزاحمت بھی آنا فانا دم توڑ گئی۔ وہ اپنے منہ سے آواز تک نہیں نکال پایا تھا۔ میں نے مزید تسلی کے لیے نیچے لیٹے لیٹے اس کی کپٹی پر ایک اور زوردار ہاتھ جمایا اور اسے مکمل انٹا غفل کر دیا۔ اسے اپنے اوپر سے ہٹا کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دھیان سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ وہ سجادول سیالکوٹی کا کوئی ساتھی تھا۔ اس کی کمر کے گرد گولیوں والی بیلٹ بندھی ہوئی تھی۔ ایک ٹرپل ٹورائفل اس کے پاس ہی گری ہوئی تھی۔ غالباً وہ یہاں پہرے پر تھا اور میری آہٹ سن کر اپنی بد قسمتی کے طفیل اس طرف چلا آیا تھا۔

میں نے اس کو گھسیٹ کر گھنی جھاڑیوں کے اندر کر دیا اور اس کی رائفل بھی خالی کر کے ایک گڑھے میں پھینک دی۔ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا میں ڈیرے کے پہلو میں پہنچا اور دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ میری تمام حیات پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے میں بالکل تیار تھا۔ مجھے ایک ادھ کھلا دروازہ ملا تو میں اس کے اندر چلا گیا۔ یہ شاید کسی وقت اس کھنڈر گھر کا باورچی خانہ رہا ہوگا مگر اب اس میں جالے لگے ہوئے تھے اور سیلن کی بو تھی۔ میں بے آواز قدم اٹھاتا ہوا ایک ساتھ والے کمرے میں پہنچا۔ یہاں بس دو تین چار پائیاں پڑی تھیں اور ایک ٹرنک رکھا تھا۔ اندازہ ہوا کہ ان لوگوں نے بس وہ دو تین کمرے ہی صاف کر رکھے ہیں جہاں یہ محفل برپا ہے، باقی گھر اسی طرح اجاڑ پڑا ہے اور جالوں سے اٹا ہوا ہے۔ لکڑی کے ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کے سوراخ سے میں نے آنکھ لگا کر دیکھا تو ٹھنک کر رہ گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں محفل جھی ہوئی تھی۔ یہ شاید کوئی برآمدہ ہی تھا جسے بعد میں کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہاں گیس لیمپس کی

روشنی تھی۔ دو انگلیشیوں میں کوئلے دھک رہے تھے۔ فرش پر ایک بڑی دری بچھی تھی جس پر کم دبیش پندرہ افراد موجود تھے۔ یہ سب کے سب دیواروں سے ٹیک لگائے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ تین چار ”معتبر“ افراد نے گاؤں کے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ ایک رقاصہ پاؤں میں گھونگر و باندھے بڑی مشاقی سے ناچ رہی تھی۔ ٹیپ ریکارڈر پر گانا پلے ہو رہا تھا۔ تماش بین نشے میں جھوم رہے تھے اور گاہے بگاہے رقاصہ سے چھیڑ چھاڑ بھی کر رہے تھے۔

میں نے سجادول سیالکوٹی کو دیکھا نہیں تھا مگر اس کا حلیہ اچھی طرح معلوم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے پہچاننے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ خاکستری قمیص شلوار والا وہ نومند شخص بڑے ٹھاٹھ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی پیشانی پر پرانی چوٹ کا نشان نمایاں تھا۔ پیشانی کے نیچے بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ کرخت نقوش اور کانٹے دار داڑھی نے اسے ایک سکہ بند ڈکیت کا روپ دے رکھا تھا۔ مجھے جس چیز نے ششدر کیا وہ یہ تھی کہ لبوترے چہرے والا عالمگیر بھی یہاں موجود تھا۔ وہ سجادول سیالکوٹی کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔۔۔ اور رقاصہ پر نوٹ نچاؤ کر رہا تھا۔

یہ حیران کن ماجرا تھا۔ سیالکوٹی کے ساتھیوں نے عالمگیر کے چھوٹے بھائی کو قتل کیا تھا اور یہ خونی واقعہ ہوئے چند روز ہی گزرے تھے۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب عالمگیر آتشیں آنسو بہا رہا تھا اور اس کے قریبی عزیز بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ پچھلے کئی دن سے عالمگیر کسی بگولے کی طرح چکرا رہا تھا اور لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے بھائی کے قاتل سیالکوٹی کو ڈھونڈ رہا ہے لیکن یہاں کچھ اور ہی سین تھا۔ سجادول نے رقاصہ کو کھینچ کر آغوش میں لیا تو عالمگیر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا بدبودار گلاس رقاصہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ رقاصہ نے ہونٹ بھیج لیے اور انکار میں سر ہلانے لگی۔ سجادول نے ایک نازیبا حرکت کرنے کے بعد رقاصہ کو چھوڑ دیا اور وہ پھر محو رقص ہو گئی۔

رقص ختم ہوا تو وہ بدست تماش بینوں سے بدن چرا کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی لیکن وہ بھی تو اسی چار دیواری میں۔ ان بیکے ہوئے مردوں کے لیے اس کی حیثیت گھڑے کی پھلی جیسی تھی۔ وہ جب چاہے اس کو پکڑ سکتے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر پر گانا پلے ہوا۔ جہانگیر یا پہنادو۔۔۔ بندیا بھی لگا دو۔۔۔ ایک اور چمکتی دکتی رقاصہ اندر آ گئی۔ اس نے نہایت مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ پوری

کمر اور کندھوں پر ریشمی ڈوریاں سی نظر آ رہی تھیں۔ کانوں میں بڑے بڑے آویزے تھے۔ اس نے اپنے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اس نے گانے پر رقص شروع کیا۔ یہ حیرت کا دوسرا ریلہ تھا جس نے مجھے جھنجھوڑا۔ یہ رقاصہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ وہی جاناں نامی لڑکی تھی جو ماڈلنگ وغیرہ بھی کرتی رہی تھی۔ اس سے میری ملاقات پاشا کی شاندار کوٹھی میں ہوئی تھی۔ پاشا نے اپنی ٹیچر بیوی ناہید کو ٹھیکل داراب کے حوالے کر دیا تھا اور اس کے عوض خود موج مستی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس پاشا کو آڑے ہاتھوں لینے کے لیے جب میں لاہور میں اس کے گھر میں گھسا تھا تو وہاں میری ملاقات پاشا کی اس رکھیل جاناں سے ہوئی تھی۔ وہ ٹی وی کی ٹائوی اداکارہ تھی اور رسالوں وغیرہ کے اشتہارات میں بھی دکھائی دیتی تھی۔ ایک قانونی چکر میں پھنس کر وہ پاشا کے گھنچے میں آ گئی تھی۔ اب غیر متوقع طور پر وہ لاہور سے قریباً دو سو میل دور مجھے یہاں اس دیرانے میں دکھائی دی تھی۔

سیالکوٹی کی محو آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے اپنے کسی ساتھی سے کہا۔ ”اوئے کبوتر! وہ دو جاگنا لگا۔ پتنگ دانگوں مینوں سجتاں۔۔۔ اڑائی جاڑائی جا۔“

سیاہ چہرے والے کارندے نے ادب سے اثبات میں سر ہلایا اور ٹیپ ریکارڈر سے چھیڑ چھاڑ کی۔ فلمی گانے کے بول فضا میں بلند ہونے لگے۔ جاناں نے گانے کی موسیقی سے مطابقت پیدا کی اور پھر رقص کی کوشش کرنے لگی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ پہلی رقاصہ کی طرح اس کام میں ماہر نہیں ہے۔ وہ الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں سپینک رہی تھی اور ڈری ڈری سی کوشش کر رہی تھی۔ بہر حال تماش بینوں کو اس کی یہ ناچنگل اور گھبراہٹ بھی لطف دے رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ اگر جاناں یہاں موجود ہے تو پھر کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کا تعلق پاشا اور ٹھیکل وغیرہ سے بھی ہوگا۔ وہی قبضہ گروپ جو مراد پور کے علاقے میں زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کے رقبوں سے محروم کر رہا تھا اور رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے زندگیاں آجاڑ رہا تھا۔

وہ سارے ولدوز مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے جو پہلے مراد پور اور پھر لاہور میں نظر آئے تھے۔ ہماری آبائی حویلی پر دولت کے پجاریوں کی حریص نظریں۔ چچا حفیظ کو ملنے والی خفیہ اور اعلانیہ دھمکیاں، پھر حویلی میں سازش کے تحت لگنے والی آگ، میری چچا زاد بہن فائرہ اور چچی کی

گھر کے ہر فرد کے لیے
بے مثال تحریریں کا مجموعہ

کراچی

پاکیزہ

ماہنامہ

میں نیا دل گداز سلسلے وار ناول

گم شدہ محبت

آپ کی ہر دلی عزیز اور مایہ ناز مصنفہ

انجم انصار

کے ماہرانہ قلم کا شاہکار..... شوخ و چنپل..... جملوں
سے سجا..... معاشرتی و نفسیاتی گرہیں کھولتا یہ ناول
محبت کے ایک نئے اور بے حد خوب صورت رنگ سے
بھی روشناس کرائے گا

بہت جلد نجات کی زینت بنے جا رہا ہے

المناک موت۔ ولید کا زخمی اور گرفتار ہونا، میرا غم و غصے سے
دیوانہ ہونا اور پھر داؤد بھاؤ کے تعاون سے فائزہ اور چچی
کے دہرے قتل کا انتقام لالہ نظام سے لینا، ان کی کار کو ہیوی
لوڈر سے پکھلنا... اس کے بعد نو جوان سیاست داں شکیل
کے سنگین کرتوت کا کھوج لگا کر اسے اپنی گرفت میں لانا اور
عارف کی محبت عاشرہ کی جان شکیل سے چھڑانا... سب
مناظر ایک فلم کی طرح میرے تصور کے پردے پر چلنے
لگے۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ شاید یہاں بھی وہ لوگ کسی
نہ کسی طور پر موجود ہیں۔

عالمگیر کا ساتھی سا قانشے کی ترنگ میں اٹھ کھڑا ہوا۔
اس نے شراب کی بوتل اپنے سر پر رکھی اور جاناں کے ارد گرد
بھونڈے انداز میں ڈانس کرنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ
سے اپنی شلوار کا پانچا اونچا کیا ہوا تھا اور بے ہودہ انداز میں
ٹھمکے لگا رہا تھا اور یہ وہ شخص تھا جو تا جو رجیمی خوب صورت
روشن کتاب کے سارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرنا چاہتا
تھا۔ اس کے جسم و جان کا مالک بننا چاہتا تھا۔

میرے سینے میں چنگاریاں سی پھوٹ گئیں۔ ساتے
کا ڈانس اور اشتعال انگیز حرکات دیکھ کر عالمگیر بھی جوش میں
آ گیا۔ وہ ڈمگاتا ہوا اٹھا اور بھنگڑے کے انداز میں ناچنے
لگا۔ تماش بینوں نے بھڑکیں ماریں اور رقاصہ پر نوٹ
نچھاور کیے۔ عالمگیر نے ہلکی پھلکی جاناں کو اپنے کندھے پر
اٹھالیا اور اسی طرح رقص کرتا رہا۔ میری حیرت بڑھ رہی
تھی۔ یہ شخص چاند گڑھی میں زہر پلے سانپ کی طرح پھنکار
رہا تھا اور اپنے بھائی کے قاتلوں کو عبرت کا نشان بنانے کی
قسمیں کھا رہا تھا مگر یہاں وہ قاتلوں کے ساتھ بیٹھا داد عیش
دے رہا تھا۔ مطلب یہ کہ صورت حال وہ نہیں تھی جو دکھائی
دیتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ عالمگیر کے بھائی کا قتل عالمگیر کی منشا
پر ہی ہوا ہو... وہی بات کہ... ہیں کواکب کچھ نظر آتے
ہیں کچھ۔

اچانک مجھے اپنے قریب آہٹ محسوس ہوئی۔ میں
جلدی سے ایک کھڑی چارپائی کی اوٹ میں ہو گیا۔ اندر
آنے والا ایک رانفل بردار تھا۔ اس نے ٹریک میں سے
انڈین شراب کی دو بوتلیں اور سگریٹس کے چند پیکٹ نکالے
اور جیسے جھومتا ہوا آیا تھا، ویسے ہی باہر نکل گیا۔ میں اپنی جگہ
ساکت بیٹھا رہا۔ بہر حال اس کے بعد میں نے ایک بوسیدہ
سامیز پوش احتیاطاً اپنے چہرے اور سر کے گرد لپیٹ کر
مضبوط گرہ لگالی۔

میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں ایک چھوٹا سا لیکن

طاقتور اسپائی کیسرا موجود تھا۔ یہ اسٹل فونو گرائی کے علاوہ مووی بھی بناتا تھا۔ میں نے کیسرا نکال کر دروازے کے سوراخ میں لگایا اور بڑے اطمینان سے تصویریں کھینچ لیں۔ بے شک اندر روشنی بہت تیز نہیں تھی مگر کیمرے کی خوبی یہی تھی کہ وہ نیم تاریکی اور کم روشنی میں بھی واضح فونو لے سکتا تھا۔ تصویر کشی کے بعد میں نے ایک ایک منٹ کے دو تین کلپس بھی بنائے۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ عالمگیر گاؤں والوں کو ڈکیت سجاد کے سلسلے میں دھوکا دے رہا ہے، یہ بڑے ٹھوس ثبوت تھے۔

دفعۃً آہٹ دوبارہ ہوئی۔ ایک بار پھر وہی شخص نمودار ہوا جو اس سے پہلے بوتلیں اور سگریٹ لے کر گیا تھا۔ شاید وہ مزید لوازمات لینے آیا تھا۔ وہ اپنی ترنگ میں ایک خوش سا گیت گنگنا تا داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بکرے کی چانپ کی ایک بڑی بوٹی تھی۔ گنگنانے کے ساتھ ساتھ وہ اسے نوچ بھی رہا تھا۔ اس مرتبہ بالکل غیر متوقع طور پر وہ آگے آگیا۔ میں چارپائی کے پیچھے تھا۔ ہمارے درمیان بمشکل دو ڈھائی فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ میں نے سانس تک روک لی۔ اس نے ٹارچ جلائی اور ٹوٹے پھوٹے فرش پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ کھڑی چارپائی کی ادواین سے گزر کر میرے پاؤں پر پڑا۔ وہ شخص بڑی طرح چونکا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنی پنڈلی کی طرف گیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ وہ کوئی تیز دھار آلہ نکالنے جا رہا ہے۔ میں لپک کر چارپائی کے پیچھے سے نکلا۔ میری لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ الٹ کر کاٹھ کباڑ پر گرا۔ میں نے اس پر جھپٹا مارا مگر اس دوران میں وہ بڑے ماہرانہ انداز میں اپنی پنڈلی سے ایک خم دار خنجر نکال چکا تھا۔ یقیناً وہ خنجر زنی میں ماہر بھی تھا۔ مجھے پیچھے ہٹنے میں ایک لمحے کی دیر بھی ہوتی تو وہ بے دریغ میرا پیٹ چاک کر دیتا۔ خنجر کی نوک میری جیکٹ کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ میں اسے دوسرا وار کرنے کا موقع دیتا تو یہ میری سنگین غلطی ہوتی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن پر اس جگہ وار کیا جہاں چوٹ لگنے سے سانس رک جاتی ہے اور ریزہ کی ہڈی تک ضرب کا اثر ہوتا ہے۔ پہلی ضرب درست جگہ پر نہیں لگی۔ وہ سہہ گیا اور چلا یا۔ ”رحمو... شو کے... رحمو۔“ دوسری ضرب نے اس کی بولتی بند کردی اور وہ مردہ چھلکی کی طرح ایک طرف ڈھ گیا۔

صورت حال نازک ہو چکی تھی۔ میں نے پستول نکالا اور مڑ کر دروازے کی طرف گیا۔ ناچ گانے والے کمرے

میں پہنچ چکی ہوئی تھی۔ سجاد کی سیالکوٹی کی پات دار آواز گونجی۔ ”اوئے کون ہے؟ دیکھو ذرا جلدی سے۔“

بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ میں چار دیواری کے قریب پہنچا تو ایک دراز قد شخص نے ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکنے کی کوشش کی۔ میں نے بھاگ کر اس کے سینے پر ٹانگ جھائی۔ ”مومینٹم“ کی وجہ سے یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ مقابل کی پسلی ٹوٹنے کی واضح آواز آئی۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر اوندھے منہ گرا۔ مزید لوگ پہنچ رہے تھے۔ میں نے پھرتی سے دیوار پھاندی اور جھاڑیوں میں اندھا دھند بھاگتا اس سمت بڑھا جہاں میری موٹر بائیک موجود تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کئی افراد میرے پیچھے آرہے ہیں۔ پھر جی تھری رائفل کی خوفناک فائرنگ سنائی دی۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی لیکن مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

مجھے جھاڑیوں کے اندر ایک اور ایسی چیز دکھائی دی جس نے مجھے مزید چونکنے پر مجبور کیا۔ اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ میری پوری توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ میں اپنی بائیک تک پہنچ جاؤں۔ میری یادداشت نے درست کام کیا اور میں ایک جوہڑ کے سرکنڈوں کے اندر بھاگتا بائیک تک پہنچ گیا۔

ہوا کے دوش پر تیر کر ایک گرج دار آواز مجھ تک پہنچی۔ کسی نے ہانپتے لہجے میں گالی دی اور پکار کر بولا۔ ”زیادہ دور نہیں گیا... دیکھو اس طرف۔“

بائیک اسٹارٹ کرنے میں خطرہ تھا۔ میں کافی دور تک بائیک کو ویسے ہی کھینچ کر لے گیا۔ دس پندرہ فٹ اونچے سرکنڈے مجھے مکمل آؤ فرام کر رہے تھے پھر دور سے آنے والی آوازوں سے پتا چلا کہ میں محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا ہوں۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور تیزی سے چاند گڑھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے راستوں کا علم نہیں تھا لیکن سمت کا اندازہ تھا۔ یہ بالکل بے آباد جگہ تھی۔ خود رو جھاڑیوں، ٹیلوں کے درمیان اور کچے دشوار راستوں پر میں بائیک کو دوڑاتا چلا گیا۔

☆☆☆

میں جو کچھ دیکھ کر آ رہا تھا وہ بہت انکشاف انگیز تھا۔ انیق میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ میری کٹی ہوئی جیکٹ دیکھ کر حیران ہوا اور اسے پتا چلا کہ وہاں ہونے والی لڑائی مارکٹائی کتنی سنگین نوعیت کی تھی۔ ہم نے کیمرے کی سنٹی سے اسکرین پر وہ تصویریں اور کلپس دیکھے جو میں نے

کترینیں

ایک سردار کو ”تیرا بھائی“ کہنے کی بُری عادت تھی۔

شادی کی رات دلہن کے کمرے میں داخل ہوا اور گھونگٹ اٹھا کر بولا۔ ”کیسا لگ رہا ہے تیرا بھائی؟“
دلہن نے فوراً جواب دیا۔ ”الو کا پٹھا۔“

☆☆☆

پہلا طالب علم: ”مجھے انگریزی والے پروفیسر بہت پسند ہیں۔ ان کی یہ عادت بھی کیا خوب ہے۔“
دوسرا طالب علم (حیران ہو کر): ”کون سی عادت؟“

پہلا طالب علم: ”وہ کلاس میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری طرف دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی کلاس سے باہر نکال دیتے ہیں۔“

☆☆☆

ساس نے بہو کو کام سمجھاتے ہوئے کہا: ”میں اس گھر کی ہوم اور فنانس منسٹر ہوں۔ سسر فارن منسٹر ہیں۔ تمہارے شوہر منسٹر آف ڈیمانڈ اور سپلائی چلاتے ہیں اور میری بیٹی کے پاس پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ منسٹر ہے، اب بتاؤ تم کون سی منسٹر سنبھالو گی؟“

بہو مسکراتے ہوئے بولی: ”لیڈر آف اپوزیشن۔“
جینا ہو گا مرنا ہو گا
دھرتا ہو گا دھرتا ہو گا

☆☆☆

ایک صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے کچھ دن بعد ایک صاحب نے ایک کان کے ڈاکٹر کے پاس جا کر کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب، میری بیوی کم سنتی ہے۔ اس کا علاج کیجیے۔“

ڈاکٹر صاحب نے کچھ مشورے دیے۔ اس کے بعد ان صاحب نے گھر آ کر دیوان خانے میں سے کہا۔ ”بیگم! کیا کر رہی ہو؟“ کوئی جواب نہیں ملا تو انہوں نے ہال میں جا کر کہا۔ ”بیگم! کیا کر رہی ہو؟“ پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد انہوں نے کمرے میں جا کر کہا۔ ”بیگم! کیا کر رہی ہو؟“ تب بھی کوئی جواب نہیں ملا تو انہوں نے چوٹی بار باورچی خانے میں جا کر غصے سے کہا۔ ”بیگم! آخر تم کر کیا رہی ہو؟“

”کتنی بار پوچھو گے، میں یہاں چائے بنا رہی ہوں۔“ ان کی بیوی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔ ”تم بہرے ہو گئے ہو، علاج کراؤ اپنے کانوں کا۔“

فیاض الحق فیاض، ایبٹ آباد

دروازے کے سوراخ میں سے بنائے تھے۔ سب کچھ بہت واضح تھا۔ آوازیں بھی ریکارڈ ہوئی تھیں۔ اینق نے کہا۔ ”لگ تو یہ رہا ہے کہ عالمگیر نے خود ہی بھائی کو مردایا ہے۔“
”ہاں، اندر خانے کی کوئی دشمنی لگتی ہے۔“

”ایک ایسا واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا ہے شاہ زیب بھائی۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو قتل کرایا اور پھر ایسا چکر چلایا کہ خود ہی اس کا خون بہا وصول کر کے قاتل پارٹی سے صلح بھی کی۔“

”ہمیں یہ صورت حال گاؤں والوں کے سامنے لانی ہے۔ تم کل ہی لاہور چلے جاؤ اور تصویروں کے پرنٹ تیار کرواؤ۔“

اینق نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا۔ ”آپ کے جانے کے بعد یہاں ایک اور واقعہ ہوا ہے۔“
”کیا؟“

”مولوی جی کی بیٹی زینب کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے کر گئے ہیں۔“
”کیا ہوا اسے؟“

”وہی جو ہوتا ہے۔ پہلے جی خراب ہونے کی شکایت کرتی رہی پھر زمین پر گر کر تر پنے لگی۔ آخر منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور بے ہوش ہو گئی۔ پہلوان حشمت، ماسٹر جی اور مولوی صاحب کا ایک عزیز اسے گاڑی پر ڈال کر لے گئے ہیں۔ فی الحال تو وہ ڈسکہ جائیں گے۔ وہاں سے لاہور جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب کی بیوی بھی ساتھ ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ لاہور جانے والی بات تو اچھی ہے۔ تم بھی لاہور جا رہے ہو، سامنے آئے بغیر تم ان لوگوں کو گائیڈ کر سکتے ہو۔“

”ممکن ہے کہ مولوی جی کی بیوی کے پاس وہ ایڈریس بھی ہو جو آپ نے مولوی جی کو دیا تھا۔ میرا مطلب ہے ڈاکٹر کا اتا پتا۔“

”بالکل ایسا ہو سکتا ہے اور اگر نہیں بھی تو تم دوبارہ یہ ایڈریس ان تک پہنچا سکتے ہو۔“

اینق اور میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اینق کو بتایا۔ ”مجھے ایک اور شبہ بھی ہو رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ ہمارے لاہور والے ”دوست“ بھی چاند گڑھی کے آس پاس موجود ہوں اور ان سے پھر ملاقات ہو جائے۔“

”میں سمجھا نہیں جی۔“
”شرابی پاشا اور شکیل داراب وغیرہ۔ میں نے تمہیں

جن ڈانسرز کا بتایا ہے ان میں سے ایک وہی جاناں نام کی لڑکی تھی جس سے پاشا کی لاہور والی کونھی میں ملاقات ہوئی تھی۔“

انیق حیران رہ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی اور پھر اس خاص چیز کا ذکر بھی کیا جو مجھے وہاں بھاگتے ہوئے جھاڑیوں میں دکھائی دی تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”تمہیں وہ گاڑی تو یاد ہوگی جسے میں نے ہیوی لوڈر کے ساتھ ٹکرماری تھی۔ وہ بالکل تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ سفید رنگ کی مرسیڈز تھی۔ مجھے بالکل ویسی ہی گاڑی وہاں جھاڑیوں میں بھی نظر آئی ہے۔“

”امیزنگ۔“ انیق نے حیران ہو کر کہا۔
”میں اس کا نمبر ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا۔ مجھے تو نمبر بھی ملتا جلتا ہی لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لالہ نظام کے چھوٹے بھائی لالہ وریام کی گاڑی ہو۔ یعنی دونوں بھائیوں کے پاس ایک جیسی گاڑیاں ہوں۔“

”آپ کہنا چاہتے ہیں کہ لالہ نظام کی فیملی میں سے کوئی اور شخص بھی وہاں ناچ گانے کی محفل میں موجود تھا؟“
”بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ رقصہ لڑکی جاناں یہاں موجود ہے اور لالہ نظام کی گاڑی جیسی گاڑی یہاں موجود ہے تو پھر ان لوگوں کی یہاں موجودگی بھی ناممکن نہیں۔“

”اس کا مطلب ہے، آپ کی بات درست ہے۔ لاہور والے دوستوں سے پھر ملاقات ہونے والی ہے۔“ انیق نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن جیسے گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا، بہت سے خیالات ذہن پر یلغار کر رہے تھے۔

میں نے روائگی کے وقت کھیتوں میں عالمگیر اور اس کے ساتھیوں کی جو گفتگو سنی تھی اس کے مطابق انہیں صبح منہ اندھیرے واپس چاند گڑھی پہنچ جانا تھا مگر ان کی واپسی دن گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ انیق نے مجھے جگا کر بتایا کہ عالمگیر کی کھناراجیب گاؤں میں داخل ہو رہی ہے۔ میں نے دیکھا جیب دھول اڑاتی آرہی تھی۔ یقیناً یہ لوگ اب تک مجھے تلاش کرنے کے چکر میں ہی رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ ارد گرد کے ٹیلوں اور جنگل میں بھٹکتے رہے ہوں۔ میں نے دور ہی سے عالمگیر کا لبوتر اچہرہ دیکھا۔ وہ پریشانی کے سبب کچھ اور لمبا نظر آ رہا تھا۔ اسحاق بھی کم صم بیٹھا تھا۔ وہ لوگ میرے سامنے سے گزرے۔ مجھے یہ سوچ کر مزہ آیا

کہ میں ان کے روبرو ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہوں۔

☆☆☆

انیق نے لاہور میں اپنا کام بڑی تیزی سے کیا۔ نہ صرف اس نے منی کیمرے سے تصویروں کے شاندار پرنٹ نکلوا لیے بلکہ مولوی جی کی بیٹی زینب کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر لیں۔ میرا یہ اندازہ درست تھا کہ زینب کی سوتیلی والدہ کے پاس وہ ایڈریس موجود تھا جو میں نے مولوی جی کو دیا تھا اور وہ 20 ہزار روپيا بھی جو میں نے اصرار کر کے مولوی جی کو زینب کے علاج کے لیے مہیا کیا تھا۔ زینب کی یہ سوتیلی والدہ... حقیقی والدہ ہی کی طرح اس کی ہمدرد اور غم گسار تھی۔ انیق نے پس پردہ رہتے ہوئے مطلوبہ کلینک اور ڈاکٹر تک پہنچنے میں ان لوگوں کی مدد کی۔ زینب کا فوری علاج شروع ہو گیا۔ یہ علاج اسلام آباد کے ایک اچھے پرائیویٹ کلینک میں ہو رہا تھا۔ علاج شروع ہو جانے کے بعد انیق فوراً چاند گڑھی واپس پہنچ گیا۔ انیق نے یہ بھی بتایا کہ شکیل داراب ابھی تک اپنے وعدے کی پاسداری کر رہا ہے۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا ہے اور میرے چچا زاد ولید کو جیل بھجوانے کے بجائے ابھی تک اسپتال میں ہی رکھا گیا ہے۔ چچا حفیظ مراد پور میں جلی ہوئی حویلی کو اسی طرح دوبارہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں یہی معلوم تھا کہ میں پاکستان سے واپس جا چکا ہوں۔ انیق کا اہم کام یہی تھا کہ اس نے مطلوبہ تصویروں کے بہترین پرنٹ نکلوائے تھے۔

میں نے تصویریں دیکھیں۔ زبردست تھیں۔ پانچ چھ تصویریں تو اتنی واضح تھیں کہ شک شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ عالمگیر اور سجاول سیالکوٹی نے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں دھسکی کے گلاس چمک رہے تھے۔ ایک تصویر میں وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار رہے تھے اور کھل کر ہنس رہے تھے۔ کئی تصویروں میں نیم عریاں جسم والی جاناں بھی صاف پہچانی جاتی تھی۔ اسحاق اس کے ساتھ ناچ رہا تھا، اور بیک گراؤنڈ میں سیالکوٹی اور عالمگیر دکھائی دیتے تھے۔

ہم تصویریں دیکھ رہے تھے جب دور سے پہلوان حشمت آتا دکھائی دیا۔ وہ بھی آج ہی اسلام آباد سے واپس آیا تھا۔ انیق کے ساتھ حشمت کی گاڑھی چھننے لگی تھی اور وہ سب بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ ہم نے تصویریں فوراً

انکارے

عی مولوی جی کو مسجد کی سیڑھیوں سے دھکا دے کر مار دیا ہو۔“

پہلوان حشمت کے چہرے پر ایک رنگ سالہرا گیا۔ اس نے ذرا پریشانی سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ شام کے ٹھنڈے سائے قرب و جوار کو ڈھانپ رہے تھے۔ کہیں سے بانسری کی آواز آرہی تھی۔ کھیت کے کنارے کنارے دو کھیت مزدور سروں پر سبز چارائٹھائے گھروں کی طرف جارہے تھے۔ پہلوان حشمت نے دبی آواز میں کہا۔ ”دھیان رکھو بھائی! ایسی بات اونچی آواز میں نہ کہو۔ دیواروں کے بھی کان ہوت ہیں اور چاند گڑھی میں تو یہ کان کچھ زیادہ ہی تیز ہیں۔ وہ کیا فرمایا ہے علامہ اقبال نے بات بندے سے کہتی ہے کہ تم مجھے منہ سے نکالو، میں تمہیں گاؤں سے نکالوں گی۔“

انیتق نے حیرت سے دیدے گھمائے۔ ”حشمت بھائی! یہ علامہ اقبال نے کہا تھا؟“

”تو کیا تیرے کسی رشتے دار نے کہا تھا۔ ایسی بڑی باتیں بہت بڑے لوگ ہی کہہ سکتے ہیں۔“

اسی دوران میں میری نظر کھڑکی سے باہر ایک بچے سجائے خوب صورت تانگے پر پڑی۔ تانگے میں عالمگیر بڑے ٹھاٹ سے بیٹھا تھا۔ اس کی بغل میں گورا چٹا نو عمر چودھری تھا۔ چودہ پندرہ سالہ چودھری کی پگڑی کا شملہ کوئی دو فٹ اونچا تو ضرور رہا ہوگا۔ پچھلی سیٹ پر بھی تین افراد موجود تھے۔ میں نے انیتق اور حشمت کی توجہ اس منظر پر مبذول کرائی۔ انیتق نے حشمت سے پوچھا۔ ”یہ سواری کدھر جا رہی ہے؟“

حشمت نے گہری سانس لی اور بڑے تدبر سے بولا۔ ”سمجھو کہ شیر کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوت ہیں۔“

”ہاتھی کے دانت۔“ انیتق نے صحیح کی۔

حشمت سنی اُن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”اوپر اوپر سے تو عالمگیر اپنے بھائی کی موت پر غم زدہ ہے مگر حقیقت میں اس کو کوئی ایسی سوگوار بھی نہیں ہے۔ کل چودھری نیاز کی پیدائش کا دن ہے۔ پچھلے سالوں میں یہ دن گاؤں کے اندر ہی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ ساری ساری رات کنجر خانہ لگا رہا تھا مگر اب چونکہ مولوی جی اور پرویز والا واقعہ ہو گیا ہے، اس لیے یہ لوگ باہر جا رہے ہیں۔“

”کہاں... کس لیے؟“

”میرا خیال ہے کہ ڈسکہ جاویں گے۔ وہاں عالمگیر کا

چھپا دیں۔ حشمت جھومتا ہوا سا اندر آ گیا۔ وہ چلتے میں ذرا دشواری محسوس کر رہا تھا۔ غالباً اس کی وجہ وہی گہری خراشیں تھیں جو کانٹے دار جھاڑیوں میں گرنے سے اس کی پشت پر آئی تھیں، اور جن کی ”لوکیشن“ بتا کر وہ خود ہی ہنسنے لگتا تھا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ہمیں سفر کی روداد سناتے لگا۔ اس نے اپنے تئیں ہم پر انکشاف کیا کہ بچی زینب کی بیماری بالکل اور طرح کی چیز نکلی ہے، یہ آسیب یا جادو ٹونے والا چکر نہیں ہے، بلکہ اس کو کسی نے خاص طرح کی نشہ آور دوا کھلائی ہے اور کئی ماہ تک کھلائی ہے۔ اب جب وہ اس دوا سے محروم ہوتی ہے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اسلام آباد کے ڈاکٹروں نے پورا پورا کھوج لگا لیا ہے۔

انیتق نے کہا۔ ”حشمت بھائی! اگر ایسا ہوا ہے تو کس نے کیا ہے؟“

”یہی سوچنے کی بات ہے۔ عالمگیر کے گھر کے علاوہ اس بے چاری کا کہیں آنا جانا نہیں تھا۔ لگت تو یہی ہے کہ یہ بد عادت اس کو عالمگیر کے گھر سے ہی لاگی ہے۔ کیا پتا اس میں عالمگیر کا ہی ہاتھ ہو مگر عالمگیر پر اس طرح کا الزام لگانا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ چودھری نیاز تو ابھی بچہ بچو نکڑا ہے۔ چاند گڑھی کا اصل چودھری اور کرتا دھرتا تو یہی عالمگیر ہے۔“ پہلوان حشمت کے لہجے میں زہر تھا۔

انیتق نے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہی نکلا کہ عالمگیر اور اسحاق وغیرہ اس بچی کے ذریعے اللہ بخشے مولوی جی کو بلیک میل کر رہے تھے اور تاجور کے سلسلے میں اپنی زبان بولنے پر مجبور کر رہے تھے۔“

”دھیان تو یقیناً اسی طرف جاوت ہے بھیا مگر یہ بات اپنی زبان پر کون لاوے؟ جو لاوے گا اس کا حشر نشر ہو جاوے گا۔ ویسے بھی اب مولوی صاحب تو اس دنیا میں ہیں نا ہیں، اب ان کے بارے میں کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں چاند گڑھی میں ہی بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو آنکھیں بند کر کے عالمگیر اور پیر ولایت جیسے لوگوں پر یقین کرتے ہیں۔“

مولوی جی کے ذکر پر حشمت ایک دم اداس ہو گیا اور یہ صرف اکیلے حشمت ہی کی بات نہیں تھی، گاؤں کی اکثریت نے مولوی جی کی ناگہانی موت کا گہرا دکھ محسوس کیا تھا۔

انیتق نے نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”حشمت بھائی! اگر عالمگیر وغیرہ مولوی جی کو بلیک میل کر رہے تھے تو پھر تو یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ اپنا بھید کھلنے کے ڈر سے انہوں نے

ایک امیر کبیر یار ہے۔ اس کی کوٹھی پر جشن وغیرہ کر لیں گے۔ یعنی موج میلے سے باز ناہیں آنا، چاہے مرنے والے کا کفن بھی میلانہ ہوا ہو۔“

”ناج گانا ہوگا؟“ انیق نے پوچھا۔

”سب کچھ ہو دے گا۔“ حشمت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا۔ ”بچی بات تو یہ ہے بھیا کہ عالمگیر نے چودھری نیاز کا اس چھوٹی سی عمر میں بیڑا غرق کر دیا ہے۔ شراب تو رہی ایک طرف، عورت تک لگا دی ہے اسے۔“

”عورت لگا دی ہے؟ کیا مطلب؟“

”یہ ناچنے والیاں... اس چھوٹی سی عمر میں اسے ان کے ڈانس دکھاوت ہے اور پھر اسے ان کی عادت بھی ڈالت ہے۔ اس کا ارادہ یہی ہے کہ یہ لڑکا کسی کام کا نہ رہے اور اصلی چودھراہٹ کے مزے یہ خود ہی لیتا رہے۔“

یہ بڑی حیران کن اور سنگین صورت حال تھی۔ کچھ دیر اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ عالمگیر کے کئی کروتوت سامنے آئے۔

انیق نے حشمت سے پوچھا۔ ”کیا عالمگیر اور اس کے مقتول بھائی میں جھگڑا وغیرہ بھی تھا؟“

”ایسے جھگڑے اکثر گھروں میں رہتے ہی ہیں۔ مقتول کی بیوی اور عالمگیر کی بیوی میں زیادہ چپقلش تھی۔ کوئی مکان کا معاملہ بھی تھا۔“

حشمت کی باتوں سے پتا چلا کہ مقتول پرویز کے سسرال والے ٹکڑے لوگ ہیں اور چاند گڑھی میں ہی رہتے ہیں۔ اس کے دو سالوں نے کچھ عرصہ پہلے جیل بھی کاٹی ہے۔ خاص طور سے اس کا بڑا سالا صولت ٹوانہ جو نائب تحصیل دار بھی ہے، بڑا دنگ بندہ ہے۔ یہ گفتگو سننے کے بعد میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اس وقت جو تصویریں میرے ٹکے کے نیچے رکھی ہیں وہ آج رات تک مقتول پرویز کی بیوی یا پھر اس کے بھائی صولت ٹوانہ تک پہنچ جائیں گی۔

عالمگیر ایک خبیث دشمن کے طور پر سامنے آیا تھا اور اپنے دشمن کو کسی بھی طرح کمزور کرنا لڑائی کا حصہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

انیق شام کو ہی سروے کر آیا۔ اس کی صلاحیتیں اب کھل کر سامنے آرہی تھیں۔ میں جو کام اسے سونپتا تھا نہایت خوش اسلوبی اور چالاکی سے انجام دیتا تھا۔ داؤد بھاؤ نے یقیناً اپنا ایک ہیرا ہی میرے حوالے کیا تھا۔ انیق نے نہ

صرف نائب تحصیل دار صولت کا گھرد کچھ لیا تھا بلکہ یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ گاؤں میں ہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص کام اس نے یہ کیا تھا کہ صولت کا موبائل فون نمبر بھی حاصل کر لیا تھا۔ یہ نمبر اسے پٹواری کے ملازم سے مل گیا تھا۔ کام اب اور آسان ہو گیا تھا۔ رات ساڑھے دس بجے میں نے انیق سے کہا کہ وہ تصویروں والا لفافہ صولت ٹوانہ کے گھر کی چھت پر پھینک آئے۔

انیق یہ کام کر کے سردی میں ٹھٹھرا ہوا واپس آ گیا۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے انیق کے نمبر سے صولت کو کال کی۔ دوسری طرف سے ایک بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ شاید اس شخص نے پیگ وغیرہ لگایا ہوا تھا۔ ”کون؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہارا ایک ہمدرد۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”سیدھی سیدھی بات کرو۔ کون ہو تم؟“ نہایت خشک لہجے میں کہا گیا۔

”سیدھی بات تو یہ ہے کہ ایک بہت سیدھی بات تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ اس کا تعلق تمہارے بہنوئی پرویز اور اس کی موت سے ہے۔“

”تمہاری بات میرے لیے نہیں پڑ رہی اور تم ہو کون؟“ ذرا چونکے لہجے میں پوچھا گیا۔

میں نے کہا۔ ”میرے بارے میں جاننے سے تمہیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ مگر جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں وہ تمہارے بہت فائدے کی ہے۔ تمہارا بہنوئی، ڈکیت سیالکوٹی کے بندوں نے نہیں مارا۔ اسے ان بندوں کے ذریعے مروایا گیا ہے اور مروانے والا کوئی اور نہیں... تمہارے مقتول بہنوئی کا بڑا بھائی عالمگیر ہے۔“

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر لرزاں آواز میں پوچھا گیا۔ ”تم اپنے ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا بات کر رہے ہو اور... اور اس کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟“

”تمہارے آخری فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید تمہارے دل کے کسی دور دراز گوشے میں بھی اسی طرح کا شک موجود ہے اور میں تمہیں پورے یقین کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ یہ شک سو فیصد درست ہے۔ عالمگیر نے سیالکوٹی سے ملی بھگت کر کے تمہارے بہنوئی کو مارا ہے اور تمہاری جوان بہن کو بیوہ کیا ہے۔“

ایک بار پھر اسی لرزاں آواز میں پوچھا گیا۔ ”کون ہو تم؟“

جمع

ایک نہایت بیدار، ادیب و عمر اور غیر شادی شدہ خاتون سے لفظ مرد کی جمع پوچھی گئی تو بے ساختہ جواب آیا۔ ”مردودا“

جنگلے

☆ پھولوں کی چادر پر سو رہے ہوں تو یہ آپ کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات ہے اور پھولوں کی چادر اوپر پڑی ہو تو زندگی کی آخر رات گزر چکی ہے۔
☆ موم بتی جلا کر مرے ہوئے لوگوں کی یاد منائی جاتی ہے اور موم بتی بجھا کر سالگرہ منانے کا آغاز کیا جاتا ہے۔

☆ دنیا کی ہر عورت شب و روز دوسری عورتوں کی برائیاں کرتی ہے اور مرد اتنے فراخ دل ہوتے ہیں کہ اپنی بیوی کے سوا دوسری تمام عورتوں کی تعریف کرتے نہیں سمجھتے... مرد زندہ باد!

☆ ایک عورت ایک گھنٹے میں دو ڈریس تیار کرتی ہے تو چار عورتیں چوبیس گھنٹوں میں کتنے ڈریس تیار کریں گی؟ سوال سیدھا لیکن جواب مشکل ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکیں گی۔ فہمت اور باتوں سے فرصت ہی نہیں ملے گی۔

محمد اقبال، کراچی

انٹق کی لاشوں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔ چاند گڑھی کی زمین ہمیں یوں نگل جائے گی جیسے کبھی ہمارا وجود ہی نہ تھا۔

ڈرانے والے ہمیشہ ڈراتے رہے ہیں اور عشق کی راہ میں آگے بڑھنے والے ہمیشہ آگے بڑھتے رہتے ہیں اور یہاں تو ڈر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اگر مجھے کوئی شدید خطرہ محسوس ہوتا تو میں انٹق کو فوراً یہاں سے نکال دیتا اور خود چاند گڑھی کی زمین میں دفن ہونے کو تیار ہو جاتا۔ اس کی چوڑیوں کی ایک چھٹک اور اس کی پیشانی کی ایک جھلک کے لیے میں اپنے جسم میں سیکڑوں کانٹے پرونے کو تیار تھا۔

ایک آواز نے مجھے خیالوں سے چوٹکایا۔ کوئی دیہاتی زور سے بولا۔ ”جلدی کرو... خون نکل رہا ہے۔ ہڈی بھی باہر آرہی ہے۔“

ایک دوسرا بولا۔ ”پہلی (کھیت) کے اندر سے ہی نکل چلو۔“

”خدا کی فوجدار۔ چاند گڑھی کے کچھ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان میں مولوی جی کا شاگرد طارق... رام پیاری اور وکرم وغیرہ شامل ہیں۔“

”تت... تم وہی پگڑی والے (ڈھانٹے والے) ہو؟“

”چلو جو بھی نام دے لو۔ لیکن میں وہی ہوں اور جو بات کہہ رہا ہوں پورے ثبوت سے کہہ رہا ہوں۔“

”کیا ہے ثبوت؟“

”تصویریں اور اگر چاہو تو موقع آنے پر باقاعدہ ویڈیو بھی دی جاسکتی ہے۔“

”تم کن تصویروں کی بات کر رہے ہو؟“

”وہ تمہارے گھر کی چھت پر لگی والی منڈیر کے پاس سفید لفافے میں پڑی ہیں۔ ابھی جا کر دیکھ لو۔ مزید تصدیق چاہتے ہو تو عالمگیر کے سامنے ساقے سے بات کر لو۔ ذرا مرد بن کر پوچھو گے تو وہ چچہ بھی سب کچھ بتا دے گا۔“ میں نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

صبح بڑی سہانی تھی۔ میں کمرے سے باہر ایک کچی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ دور تک سبز کھیتوں کے سلسلے تھے۔ ہریالی پر ہلکا ہلکا کہرا تھا اور گھاس پر اوس کے قطرے تھے۔ کوپن ہیگن اور لندن وغیرہ میں ایسی تازہ ہوا کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ چند لمبی بچیاں اسکول جانے کے لیے میرے پاس سے گزریں تو میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور اشارے سے سلام کیا۔ کیا گلفتہ کلیوں جیسے چہرے، کیا معصومیت تھی۔ وہ گلے میں بستے لٹکائے ہاتھوں میں لکڑی کی تختیاں لہراتی، میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں تو چڑیوں کا ایک جھنڈ بھی فرائے مار کر زمین سے اڑا اور فضا میں گم ہو گیا۔ یہ لڑکیاں بھی تو چڑیوں کا جھنڈ ہی ہوتی ہیں، اکٹھی دانہ دنگا چکتی ہیں، پھراڑ جاتی ہیں اور بکھر جاتی ہیں۔

اڑنے اور بکھرنے سے میرا دھیان تاجور کی طرف چلا گیا۔ کیا وہ بھی اڑ کر کسی گھونسلے کی زینت بننے والی ہے اور ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہونے والی ہے۔ اس سے میری آخری ملاقات کافی مایوس کن رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں جلد از جلد یہاں سے چلا جاؤں اور دوبارہ ادھر کا رخ نہ کروں۔ وہ اس بات پر بھی سچ پا ہوئی تھی کہ میں نے اس سے اظہار محبت کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بارود کے بہت بڑے ڈھیر کو چنگاری دکھانے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر یہ چنگاری چمک گئی تو یہاں میری اور

میں نے مز کر دیکھا۔ سات آٹھ افراد تیز قدموں سے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے لکڑی کی ایک کرسی اٹھا رکھی تھی۔ کرسی پر کوئی لہولہان حالت میں پڑا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، یہ تاجور کا دعویدار اسحاق تھا۔ لگتا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس کی خوب ٹھکانی کی ہے۔ اس کے چہرے پر نیلگوں ابھارتے۔ سر پھٹا ہوا تھا اور ایک بازو شاید ٹوٹ گیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ اسے پہلوان شہت کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔

اتنے میں انیق بھی کمرے سے نکل کر میرے پاس آن کھڑا ہوا۔ ”سبحان اللہ!“ اس نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے کہ آپ کی اتاری ہوئی تصویروں نے کام دکھانا شروع کر دیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ... اب بات اور آگے بڑھے گی۔“ میں نے کہا۔

”انشاء اللہ! مجھے تو جیمو بانڈ کی ایک پرانی فلم یاد آتا شروع ہو گئی ہے۔ اس میں شان کوزی نے ایسے ہی اپنے دو مخالف گروہوں کو آپس میں لڑا دیا تھا اور خود اپنا مطلب حاصل کر لیا تھا۔“

”یعنی تم مجھے مطلب پرست قرار دے رہے ہو؟“

”تو بہ تو بہ... میری یہ جرات؟“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”ہم جنگ لڑ رہے ہیں اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ دشمن کی کمزوری اپنی طاقت بنتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اسحاق کی یہ حالت مقول پرویز کے سرالیوں نے بتائی ہے اور اس سے اصل بات اگوالی ہے۔“

اسی دوران میں حق نواز بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی ہم دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ حق نواز کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس کو ابھی اسحاق کے زخمی ہونے کی خبر نہیں ملی۔ وہ ٹوانوں کی حویلی اور احاطے میں نظر آنے والی پھل کی بات کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”مجھے کوئی گڑبڑ والی گل لگ رہی ہے ایچے! شاید تحصیل دار کی حویلی میں کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ وہاں تین چار تانگے آئے ہیں۔ ان میں سے بری بری شکلوں والے بندے اترے ہیں۔ ان میں بہت سوں کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔ پھل کا پتا چل رہا ہے۔“

انیق نے پوچھا۔ ”کیا تحصیل دار کی کسی سے دشمنی وغیرہ بھی ہے؟“

”چھوٹی موٹی دشمنیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ بڑی دشمنی تو اسی بندے سے ہو سکتی ہے جس نے تحصیل دار کی بہن کو بیوہ

کیا ہے۔ میرا مطلب ہے پرویز کو قتل کرنے والا سجاوٹ سیالکوٹی۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو سجاوٹ سیالکوٹی کا کوئی کھوج کھرا لگ گیا ہو اور اب وہ اس پر ہلا بولنے جا رہے ہوں۔“

وہ بے چارہ نہیں جانتا تھا کہ سیالکوٹی کا کھوج ملنا اتنا آسان نہیں، ہاں سیالکوٹی کے کچھ ساتھیوں کا پتا ٹوانوں کو چل گیا ہے اور وہ ساتھی اس گاؤں کے کرتادھرتا عالمگیر وغیرہ ہی ہیں۔

انیق نے حق نواز سے کہا۔ ”شہت پہلوان کی طرف جاؤ۔ وہاں کچھ لوگ زخمی ساتے کو لے کر گئے ہیں۔ پتا کرو کیا ہوا ہے اس کے ساتھ۔“

حق نواز کی واپسی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہوئی۔ اس نے حیرت زدہ لہجے میں بتایا۔ ”بڑی بری خبریں ہیں۔ تحصیل دار صاحب اور ان کے دو ساتھی فجر کے وقت ساتے کو اس کے گھر سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اپنے ڈیرے پر جا کر انہوں نے اس کی بڑی چنگی مرمت کی ہے۔ پتا نہیں کہ کس طرح کا شک تھا ان کو اس پر۔ عالمگیر کے دو ملازم ساتے کو چھڑانے کے لیے ڈیرے پر گئے تو ان کو بھی چھڑیں ماری گئیں۔“

اچانک گاؤں کے وسطی حصے کی طرف سے قاترنگ کی زوردار آواز آئی۔ یہ آٹو جنگ رانفل کا ایک کڑا کے دار برست تھا۔ پرندے درختوں سے اڑ گئے۔ میرے عین سامنے سے دو بگیاں بدک کر کھیتوں میں گھس گئیں۔ رانفل کے پہلے برست کے بعد چند سنگل قاتر ہوئے اور پھر ایک دم جیسے کسی سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ اندھا دھند قاترنگ ہونے لگی۔ چھوٹے بڑے ہتھیار آزادانہ استعمال ہو رہے تھے۔

”یا اللہ خیر!“ ملازم حق نواز نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

اس دوران میں حق نواز کی بیوی نذیراں بھی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ”ہائے میں مر گئی، ہائے ربا، کیا وہ مرن جو گے پھر آگئے ہیں؟“ اس کا دھیان یقیناً ڈاکوؤں کے حملے کی طرف چلا گیا تھا۔

چار پانچ مسلح گھڑسوار انتہائی تیزی سے گھوڑے بھگاتے عالمگیر کے ڈیرے کی طرف سے آئے اور گاؤں میں داخل ہو گئے۔ ان کے عقب میں ایک تیز رفتار ٹریکٹر ٹرائی اچھلتی کودتی آرہی تھی۔ اس میں بھی دس پندرہ افراد سوار تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں رائفلیں اور کچھ کے ہاتھ میں کلہاڑیاں تھیں۔ یہ لوگ بھی گھڑسواروں کے پیچھے لپکتے

ہوئے گاؤں کے وسطی حصے کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے معنی خیز نظروں سے انیق کی طرف دیکھا۔ وہی ہو رہا تھا جس کی توقع تھی۔ دفعتاً ایک خوفناک دھماکا ہوا اور زینب گرتے گرتے ہنسی۔ آواز اتنی شدید تھی کہ ایک گھوڑی رساڑا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ دھماکا ڈیرے سے صرف سوڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر سنائی دیا تھا۔ یہ دستی بم کا دھماکا تھا۔ میں نے بہت سی دھول اور گرد و غبار فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ اس گرد و غبار میں کسی ٹوٹے ہوئے دروازے یا کھڑکی وغیرہ کے ٹکڑے بھی تھے۔ دھماکے کے فوراً بعد تار بڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے رساڑا آنے والی گھوڑی کو گرتے اور تڑپتے ہوئے دیکھا۔ مطلب تھا کہ لڑائی کا دائرہ پھیل رہا ہے۔ ہم لپک کر کمرے کے اندر چلے گئے۔

پورے گاؤں میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ قریبی میدان میں کچھ بچے ربر کی گیند سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ بھی ڈر کر بھاگے۔ یقیناً ان میں سے بہت سوں نے یہی سمجھا تھا کہ شاید پھر سیا لکوٹی کے گھڑ سواروں نے ہلا بول دیا ہے۔ بچوں کا ڈر کر چاروں طرف بھاگنا اور چلانا ایک دلدوز منظر تھا۔ ایک بچے کی ٹانگ میں گولی لگی مگر ایک بڑی عمر کا لڑکا اسے سہارا دے کر گھسینا ہوا ایک گھر میں گھس گیا۔

فائرنگ مسلسل جاری تھی۔ حق نواز نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ”سمجھ نہیں آرہی کہ اس گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔“

انیق نے پر خیال لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے دونوں طرف کے لوگ مور چابند ہو کر فائرنگ کر رہے ہیں۔ پولیس کہیں نظر نہیں آرہی۔“

”ایسے موقعوں پر یہاں کی پولیس نظر آتی بھی نہیں۔ یہ پولیس تو ہم جیسے غریبوں کو چھتر مارنے کے لیے رہ گئی ہے۔“

فائرنگ کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ گھروں میں دبک کر رہ گئے تھے۔ جو کھیتوں کھلیاؤں میں تھے، انہوں نے وہیں پر دبکے رہنے میں عافیت سمجھی تھی۔ اسی دوران میں دستی بموں کے دو اور زوردار دھماکے ہوئے۔ ان دھماکوں کے فوراً بعد کہیں آگ لگ گئی، گاڑیاں دھواں فضا میں بلند ہونے لگی۔ ہم نے دیکھا گاؤں کی طرف سے دو زخمی افراد دوڑتے ہوئے کھیتوں کی طرف آئے لیکن ابھی وہ ہمارے ڈیرے سے کافی دور تھے کہ ان کے عقب میں تین مسلح افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے ٹرپل ٹو اور سیون ایم

انگوارے

ایم رائفلوں سے بے دریغ برسٹ چلائے۔ ایک زخمی تو جان بچا کر کھیتوں میں گھس گیا دوسرا وہیں مردہ گھوڑی کے پاس گر کر ڈھیر ہو گیا۔ مرنے والا عالمگیر کے ساتھیوں میں سے تھا۔ اب اس بات میں شک شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ مقتول پرویز کے سرالی اور عالمگیر کا گردہ پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے گئے ہیں۔

اچانک مجھے کہیں پاس سے کسی بچے کے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ انیق اور حق نواز نے بھی یہ آوازیں سن لیں۔

”لگتا ہے آواز سامنے والے کنوئیں سے آرہی ہے۔“ حق نواز نے کہا۔

”کون ہو سکتا ہے؟“ انیق نے پریشانی ظاہر کی۔

”شاید بھاگتے ہوئے کوئی بچہ کنوئیں میں گر گیا ہے۔“

بچہ مسلسل دلدوز انداز میں چلا رہا تھا۔ ”ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔“ انیق نے کہا۔

”لیکن کیسے؟“ سامنے فائرنگ ہو رہی ہے۔“ حق نواز بولا۔

کچھ دیر بعد بچہ خاموش ہو گیا۔ یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا، کچھ دیر بعد وہ پھر چلانے لگا۔ اچانک میرے پورے جسم میں ایک تیز سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مجھے لگا یہ آواز میرے لیے نئی نہیں ہے۔ یہ تاجور کے چھوٹے بھائی کی آواز ہے۔ اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ شک یقین میں بدل گیا۔ کنوئیں میں گرنے والے بچے کی مدد کرنے کے لیے میں پہلے ہی پر تول رہا تھا مگر اب مجھے فیصلے تک پہنچنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی۔ انیق بھی میرے تاثرات سے جان گیا کہ میں کچھ کہنا یا کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے حق نواز سے کہا۔ ”نواز بھائی! اپنی دونوں بکریوں کو اندر باندھ دو۔ کہیں گھوڑی کی طرح ان کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔“

حق نواز باہر نکلا تو میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”انیق مجھے شک ہو رہا ہے کہ کنوئیں میں گرنے والا بچہ تاجور کا بھائی چھوٹو ہے۔“

”مگر کرکٹ کھیلنے والے بچوں میں مجھے وہ تو نظر نہیں آیا۔ ان دونوں بھائیوں کو تو گاؤں کے بچے اپنے ساتھ کھیلنے ہی نہیں دیتے۔“

”لیکن... جو بھی ہے وہ بچہ تو ہے۔ ہمیں مدد کرنی چاہیے۔“

”اس میں تو کوئی دورائے ہو ہی نہیں سکتیں۔“ انیق نے کہا۔

انیق نے حق نواز سے کہہ کر ایک لمبا سا منگوا لیا۔ میں کمرے سے نکلا اور پیٹ کے بل ریگلتا ہوا کنوئیں کے کنارے پہنچ گیا، بیضوں کے لیے استعمال ہونے والے رے کو گرہیں دے کر لمبا کیا گیا تھا۔ بہر حال اس طویل رے کی زیادہ ضرورت نہیں پڑی۔ کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے لوہے کے چوکور ڈبوں کا ایک بیضوی دائرہ سا کنوئیں کے اندر جاتا تھا۔ پنجابی میں ان ڈبوں کو نڈیں کہا جاتا ہے۔ کنواں چونکہ بند تھا اس لیے نڈوں کا یہ سلسلہ بھی بے حرکت تھا۔ میں نے گہرائی میں جھانکا۔ قریباً پندرہ فٹ نیچے پانی چمک رہا تھا اور اس پانی میں لبو لہان بچہ سینے تک ڈوبا ہوا مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ یہ چھوٹو ہی تھا۔ اسفند عرف چھوٹو۔

مجھے دیکھ کر اس نے اپنے ننھے منے ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور پورے زور سے پکارا۔ ”گونگے بھائی... گونگے بھائی۔“

میں نے اوندھے لیٹے لیٹے ہاتھوں کے اشارے سے اسے تسلی دی اور آہنی ڈبوں کی لڑی کا سہارا لیتے ہوئے نیچے اترا، میرا حوصلہ اور اطمینان دیکھ کر اسفند کی دہشت میں بھی تھوڑی سی کمی واقع ہوئی۔ میں جونہی نیچے پہنچا وہ مجھ سے کسی چھپکلی کی طرح چٹ گیا۔ زیادہ چوٹ اس کے ایک پاؤں اور سر پر آئی تھی۔ پانی بخ بستہ تھا۔ وہ خوف اور سردی کی وجہ سے تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس کی شلوار قمیص جسم سے چپک کر رہ گئی تھی۔ میں نے اسے پشت پر سوار کیا اور اشاروں میں سمجھایا کہ وہ اپنی ٹانگیں مضبوطی سے میری کمر کے گرد لپیٹ لے اور بازو گلے میں ڈال لے۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے رے کا ایک ٹکڑا بھی اپنے اور اس کے گرد کس دیا۔ میں آہنی ڈبوں کے سہارے اوپر چڑھنے لگا تو مجھے پانی میں اسفند کا کرکٹ بیٹ تیرتا نظر آیا۔ میں نے وہ بھی اٹھا کر رے کی بندش میں اڑس لیا۔

فائرنگ کی خوفناک آوازیں قرب وجوار کو مسلسل لرزہ رہی تھیں۔ میرے خیال میں کنوئیں سے نکلنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا نکل کر ڈیرے کے کمرے تک پہنچنا۔ بہر حال یہ دونوں کام خوش اسلوبی سے ہو گئے۔ کنوئیں سے نکل کر میں نے نرم و نازک اسفند کو اپنی اوٹ میں لیا اور جھک کر بھاگتا ہوا چار دیواری تک پہنچ گیا۔ انیق نے ہم دونوں کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

اسفند عرف چھوٹو مسلسل رو رہا تھا۔ ہم نے اسے چار پائی پر لٹایا۔ اس کا پاؤں بری طرح چمک گیا تھا اور اس میں سخت قسم کی موج بھی آگئی تھی۔ کنوئیں کا آہنی ڈبا لگنے کی وجہ سے اس کے سر پر بھی گہری چوٹ آئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ انیق نے چوٹ لگنے کی راکھ سے سر کے زخم کا خون بند کیا۔ میں نے پاؤں پر پٹی باندھی۔ وہ مسلسل باجی اور باجی کو پکار رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس کے گھر والے بھی سخت پریشان ہوں گے۔

انیق نے حق نواز سے کہا۔ ”دین محمد صاحب کو اطلاع دینا بہت ضروری ہے۔ وہ بہت پریشان ہوں گے۔“

”لیکن باہر کیسے نکلا جائے۔ ہر طرف گولیاں چل رہی ہیں۔“ حق نواز نے کہا۔

”میں شہر سے ایک موبائل فون لایا ہوں اور میرا خیال ہے کہ دین محمد صاحب کے پاس بھی ایک فون ہے۔ اس پر کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔“ انیق نے کہا۔

”ہاں مالک کے فون کا نمبر تو میں نے ادھر دیوار پر لکھا ہوا ہے۔“ حق نواز نے بتایا۔

انیق اور حق نواز نے کوشش کی۔ قسمت اچھی تھی، وہ رابطہ کرنے میں کامیاب رہے۔ دوسری طرف سے تاجور نے ہی بات کی۔ وہ یقیناً رو رہی تھی۔ باقی گھروالوں کا بھی بہت برا حال تھا لیکن جب انیق نے انہیں بتایا کہ اسفند بالکل خیریت سے ہے اور ڈیرے پر ہمارے ساتھ ہے تو ان کی جان میں جان آئی۔

وہ بڑی مڑ خطر شام تھی۔ چاند گڑھی میں جیسے غیر اعلانیہ کرفیو لگ گیا تھا۔ گاہے بگا ہے فائرنگ کی آواز بھی آنے لگتی تھی۔ خبریں آرہی تھیں کہ دونوں طرف کے لوگ مورچا بند ہیں اور کم از کم آٹھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ ان میں سے تین چار لاشیں ابھی تک کھلی جگہ پر پڑی تھیں اور کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر انہیں اٹھائے۔ ان میں سے ایک لاش عالمگیر کے اسی ساتھی کی تھی جسے تحصیل دار ٹوانہ کے ساتھیوں نے ٹرپل ٹھوراکفل کا برسٹ مارا تھا۔ یہ سب کچھ دہلا دینے والا تھا۔

اسفند متواتر درد سے کراہ رہا تھا اور باجی کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا۔ رات تک اسے تیز بخار بھی ہو گیا۔ میں مسلسل اس کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے چین کھر کھلائی اور اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھیں۔ تاجور کا فون دو دفعہ مزید آیا۔ وہ اسفند سے بات کرنا چاہتی تھی۔ انیق نے ایک دفعہ اسفند سے اس کی تھوڑی سی بات

”آج کل جو کچھ یہاں چاند گڑھی میں ہو رہا ہے، وہی کر رہا ہے۔ پہلے تو لوگوں کو صرف شک تھا پر اب یقین ہو گیا ہے۔ اس نے رام پیاری اور وکرم کی جان مارواڑیوں سے بچائی تھی۔ اپنے پلے سے رقم دے کر مولوی جی کی بیٹی کو شہر بھی اسی نے بھجوا دیا ہے۔ اب عالمگیر اور نوانہ کا بیڑا غرق بھی وہی کر رہا ہے۔“

”آ... آپ اس کالی پگڑی والے کی بات کر رہے ہیں؟“ انیق نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

حشمت نے اپنا تر بوز جیسا سر بڑے یقین کے ساتھ اثبات میں ہلایا۔ ”یہ یاسر ہی ہے۔ سو فیصد یاسر ہی ہے۔ کوئی ایک سال ہو گیا ہے وہ گاؤں سے غائب ہو گیا تھا مگر سب جانتے تھے کہ وہ گاؤں کے آس پاس ہی کہیں ہے اور گاؤں کے حالات کے بارے میں خبر رکھتے ہیں۔“

انیق نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا، اس کا کریڈٹ یہاں کسی یاسر نام کے بندے کو دیا جا رہا تھا۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ میں جو کچھ کر رہا تھا بے لوث کر رہا تھا اور اس کے پیچھے صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ تاجور کی مشکلات ختم ہو جائیں۔

یاسر نامی اس بندے کے بارے میں انیق نے پہلوان حشمت سے تفصیل پوچھی تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں جو کچھ بتایا وہ مختصر آیوں تھا۔ ایف اے میں فیل ہو جانے والے ایک لڑکے نے اپنے باپ کی جمع پونجی سے گاؤں میں ہی کریمانے کی ایک دکان کھولی تھی۔ اس نے دن رات محنت کر کے یہ دکان چلائی۔ چاند گڑھی کے باہر سے بھی لوگ اس کے پاس سودا سلف لینے کے لیے آنے لگے۔ اسی دوران میں عالمگیر کے کچھ چچوں نے بالے نامی اس لڑکے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی دکان سے مفت بوتلیں اور سگریٹ وغیرہ پینے لگے۔ بالا پہلے تو برداشت کرتا رہا لیکن جب کام حد سے بڑھا تو اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ دبے لفظوں میں منع کر دیا۔ عالمگیر کے چچے انکار سننے کے عادی ہی نہیں تھے۔ انہوں نے بالے کو بری طرح مارا پیٹا اور یہیں پر بس نہیں ہوا۔ اس بے چارے کو حکم دیا کہ اب وہ خود بوتلیں اور سگریٹ وغیرہ ڈیرے پر پہنچایا کرے۔ لوگوں نے بالے کو سمجھایا کہ وہ چون و چرا نہ کرے۔ اسی میں اس کی خیریت سے مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ایک دن بالے کو پھر کسی بات پر عالمگیر کے چچے ساتے کانپڑ سہنا پڑا۔ وہ آنسو بہاتا ہوا یاسر کے پاس پہنچا۔ بالے

کرائی اور پھر میرے اشارے پر کال منقطع کر دی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اسفند تفصیل سے اپنی تکلیف کا ذکر کر کے گھر والوں کو مزید پریشان کرے۔ اس بے چارے کا پاؤں سو ج کر کپا ہو گیا تھا۔ اور سر کا زخم بھی تکلیف دے رہا تھا۔ وہ نیم غنودگی میں گا ہے بگا ہے بڑا بڑا لگتا تھا۔ ”ڈاکو آگئے، گولی مار دیں گے... گولی مار دیں گے...“

رات گئے پولیس کی بھاری نفری تین چار گاڑیوں پر چاند گڑھی پہنچ گئی۔ پولیس کی آمد سے ذرا پہلے شدید فائرنگ ہوئی لیکن پھر یہ سلسلہ رک گیا۔

صبح حالات کچھ بہتر نظر آئے۔ وہ لاش بھی ہٹائی جا چکی تھی جو کل ہمیں کھڑکی سے نظر آرہی تھی۔ اسفند کو پاؤں کی چوٹ سخت تکلیف دے رہی تھی۔ انیق گیا اور پہلوان حشمت کو بلا لایا۔ پہلوان کے پاس گاؤں کے بارے میں تازہ ترین خبریں موجود تھیں۔ اس نے کہا۔ ”عالمگیر اور صولت نوانہ دونوں گرفتار ہو گئے ہیں۔ دونوں طرف کے پندرہ بیس اور بندے بھی گرفتار ہوئے ہیں۔ پولیس نے دونوں طرف کے لوگوں کے ہتھیار بھی جمع کر لیے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات ناہیں ہے۔ دونوں پارٹیوں کے آٹھ بندے جان سے گئے ہیں۔ زخمی ہونے والے بھی بیس کے لگ بھگ ہیں۔ سچ کہوت ہیں بھیا! خدا کی ”تکوار“ بے آواز ہوت ہے۔“

”لیکن... یہ ہوا کیسے حشمت بھائی؟“ انیق نے انجان بن کر پوچھا۔

”جب لوگ طاقت کے نشے میں حد سے بڑھ جاوت ہیں تو پھر کچھ نہ کچھ تو ہوت ہی ہے۔ عالمگیر اور نوانہ دونوں اپنے ارد گرد کے لوگوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ اب یہ آپس میں ہی بھڑبھٹتے ہیں۔“

”مگر یہ سب ہوا کیسے حشمت بھائی، کوئی وجہ تو بنی ہو گی؟“

”یہ سب یاسر احمد کا کیا ہوا ہے۔“ حشمت نے بڑے معاملہ فہم انداز میں کہا۔

”یاسر احمد؟ یہ کون ذات شریف ہیں؟“ انیق نے پوچھا۔

”تم اس گاؤں کے ناہیں ہو، اس لیے اسے ناہیں جانت ہو۔ پورا گاؤں اس کو جانت ہے۔ کھاتے پیتے زمیندار گھر کا ہے۔ بڑا جی دار بندہ ہے۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا ہے۔“

”اس نے کیا کیا ہے حشمت بھائی؟“

”جی مالک۔“ حق نواز نے کہا۔ ”جب گولیاں چلنا شروع ہوئیں تو میدان میں کھیڑنے والے منڈے ڈر کر بھاگے، اپنا اسفند بھی بھاگا اور کچھڑ میں پھسل کر اندر گر گیا۔“

دین محمد نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا پھر لڑاں۔۔۔ آواز میں بولے۔ ”پھر نکلا کس طرح؟“

حق نواز نے میری طرف دیکھا اور ساری روداد کہہ سنائی۔ بتایا کہ کس طرح میں قاترنگ کے دوران میں کنوئیں تک گیا اور اسفند کو نکالا۔

دین محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بے ساختہ آگے جھک کر مجھے اپنے ساتھ لگایا اور میرا سر چوما پھر انہوں نے دوبارہ اسفند کو اپنے ساتھ لپٹایا اور اس کی پیشانی اور گالوں پر بوسے دینے لگے۔

وہ اور حق نواز زخمی اسفند کو گود میں اٹھا کر گھر لے گئے۔ میں اور حشمت وہیں ڈیرے پر رہے۔ انٹی اور حشمت میں گاؤں کے بدلے ہوئے حالات کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ حشمت کا خیال تھا کہ عالمگیر اور اس کے قریبی ساتھیوں کے گرفتار ہونے سے عام لوگوں کا خوف کم ہوا ہے اور اب ہو سکتا ہے کہ مولوی جی کے حادثے والے معاملے پر بھی بات ہونے لگے۔۔۔ اور غائب ہو جانے والے مؤذن لڑکے کا کھوج بھی سرگرمی سے لگایا جائے۔

پہلوان حشمت کا یہ قیافہ جوتھے پانچویں دن بالکل درست ثابت ہو گیا۔ اس دن مولوی جی کی نوجوان بیوہ پروین شہر سے گاؤں آئی تھی۔ بچی زینب ابھی تک اسپتال میں داخل تھی اور اس کا علاج بڑی کامیابی سے جاری تھا۔ پروین اپنا اور بچی کا کچھ سامان وغیرہ لینے کے لیے ایک دن کے لیے آئی تھی۔ دوپہر کو میں ٹریکٹر کا ڈیزل لینے کے لیے ڈپو کی طرف گیا تو مسجد کے قریب شور سنائی دیا۔ نئے امام صاحب کے علاوہ دیگر کئی افراد بھی دروازے کے قریب جمع تھے۔ ایک چادر پوش عورت بلند آواز میں بول رہی تھی۔ میں ٹریکٹر سے اتر کر موقع پر پہنچا۔ عورت کی صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ لیکن میں نے پہچان لیا۔ وہ مولوی جی کی بیوہ ہی تھی۔ وہ بیجانی انداز میں چلا رہی تھی۔ ”میں اللہ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر کہہ رہی ہوں، زینب کا یہ حال کرنے والا وہ خبیث عالمگیر ہے۔ اسی عالم نے مولوی جی کی جان لی ہے۔۔۔ اسی نے لی ہے۔“

اس کی آواز بیٹھ گئی لیکن وہ اپنے جسم کی پوری قوت جمع کر کے چلاتی رہی۔ ”وہی ہے مجرم۔ مولوی جی نے ایک دن پہلے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ جانور ہے درندہ ہے۔“

کی ماں یاسر کے گھر میں برتن وغیرہ دھوتی تھی۔ یاسر بھی اس سارے معاملے سے باخبر تھا۔ وہ آگ بجولا ہو کر اٹھا اور بالے کے ساتھ عالمگیر کے ڈیرے پر پہنچا۔ اس روز وہاں زبردست لڑائی ہوئی۔ چاقو چلے اور قاترنگ بھی ہوئی۔ یاسر نے مفت خوری کرنے والے ایک چچے کی دونوں ٹانگیں توڑ دیں۔ ایک چچہ جان بچانے کے لیے بھاگا اور چھت سے کود گیا۔ بھینسوں کے لیے گاڑا گیا ایک کھوٹا اس کے سینے میں لگا اور وہ وہیں دم توڑ گیا۔ مرنے والا پورے گاؤں کے لیے ایک ولن کی طرح تھا۔ بہر حال یہ قتل کا کیس بن گیا تھا۔ یاسر، بالے سمیت موقع سے فرار ہو گیا اور وہ اب تک فرار ہی تھا۔

یہ روداد سنگین اور دلچسپ تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چاند گڑھی والے دل ہی دل میں یاسر نامی اس بندے کے کردار کو سراہتے ہیں۔ اب ان میں سے اکثر یہ سوچنے لگے تھے کہ چاند گڑھی میں ڈھانٹے والا جو شخص نظر آ رہا ہے وہ نہ ہو یا سر ہی ہے۔

پہلوان حشمت نے کہا۔ ”جہاں تک میری ”سی آئی ڈی“ کام کرت ہے، یاسر نے بڑی ہوشیاری سے سجادول سیالکوٹی اور عالمگیر کی کچھ تصویریں اتاری ہیں۔ ان تصویروں میں وہ دونوں اکٹھے موج میلہ کر رہے ہیں۔ اس موج میلے سے یہ بات ثابت ہوت ہے کہ دونوں میں ملی بھگت ہے اور پرویز کا قتل بھی اسی ملی بھگت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب پرویز کے سسرالی بچے جھاڑ کر عالمگیر پر چڑھ دوڑے ہیں۔“

ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ دین محمد صاحب وہاں پہنچ گئے۔ اسفند چار پائی پر سویا ہوا تھا۔ دین محمد نے اسے سینے سے لگایا، چوما۔ وہ اس کی چوٹیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ حشمت نے اسفند کے پاؤں کی بڑی اچھی طرح مرہم مٹی کر دی تھی۔ اس نے کہا۔ ”بھائی دین محمد! آپ گھبراہٹیں نہیں، ہڈی کو کچھ ناہیں ہوا۔ فقط ٹخنے میں موج آئی ہے۔ انشاء اللہ تین چار بیٹوں میں بالکل ٹھیک ہو جاوے گا، سر کا زخم بھی اب بہتر ہے۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن یہ چوٹیں اسے لگیں کس طرح؟“

دین محمد نے پوچھا۔

انٹی نے میری طرف دیکھا پھر مودب انداز میں بولا۔ ”مالک! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اسفند کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ یہ کنوئیں میں گر گیا تھا۔“

”کنوئیں میں؟“ دین محمد کی آنکھیں کھل رہ گئیں۔

وہ زینب کو نشہ پلاتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ بڑی حرکتیں کرتا رہا ہے۔ اس بد بخت کو اللہ نے موقع نہیں دیا، ورنہ پتا نہیں وہ کیا کر گزرتا، اپنا بھید کھلنے کے ذریعے اس نے مولوی جی کی جان لی ہے۔ میں اس کے خلاف گواہی دوں گی، ہر جگہ گواہی دوں گی۔“

وہ بکا رہی تھی اور اس کی آواز جیسے پورے چاند گڑھی میں گونج رہی تھی۔ امام صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”ہمیں تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے بیٹی... لیکن الزام کے ساتھ ثبوت بھی چاہیے ہوتے ہیں۔“

”ہیں میرے پاس ثبوت۔ ڈاکٹروں نے پوری رپورٹ دی ہے۔ زینب کو جو نشہ دیا جاتا رہا ہے، اس میں سانپوں کا زہر ہے اور یہ پیر ولایت کی کارستانیاں ہیں۔ میں اس کے خلاف بھی چرچہ کٹواؤں گی اور زینب سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا۔ وہ خود گواہی دے گی اس بد بخت عالمگیر کے خلاف۔“

لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ ان میں سے زیادہ تر پر دین کے ہمنوا ہیں۔ اس کی بات کو درست سمجھ رہے ہیں۔ چاند گڑھی کے لوگوں پر سے جمود ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے دل کی آوازیں، ان کے ہونٹوں تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ جمود ایسے ہی ٹوٹا کرتے ہیں، خوف کے سائے ایسے ہی سمٹا کرتے ہیں۔ جب جبر و ستم کی سیاہ چٹان میں دراڑیں پڑتی ہیں تو عوامی غیظ و غضب کا سیلابی پانی اسی طرح ان دراڑوں میں گھستا ہے اور چٹان کو ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔

اس شام میں نے خود کو بے حد پُرسکون محسوس کیا، اسی گلابی شام میں، میں سبز کھیتوں کے کنارے کنارے دور تک چلتا گیا۔ پرندوں کی چپکاریں، مویشیوں کے گلے کی گھٹیاں، رہٹ کی آوازیں، میرے کانوں میں کسی موسیقی کی طرح گونجتی رہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا... اے کوہن ہینگن والو... مشینوں کے شور اور گاڑیوں کے دھومیں میں زندہ رہنے والو! آؤ میرے دیس کی اس خوش رنگ شام کو دیکھو اور محسوس کرو۔ زندگی کا اصل حسن کہاں ہے۔ تمہارے نائٹ کلبوں کے تھرکتے جسموں میں یا اس پگڈنڈیوں پر قطار میں جاتی ہوئی دیہاتی دوشیزاؤں کے لہراتے آنچلوں میں؟

آج میں تاجور کی طرف سے بھی مطمئن تھا۔ اس

کا دعویٰ دار اسحاق عرف ساقا، صولت ٹوانہ کے ہاتھوں شدید زخمی اور ذلیل ہو کر اسپتال میں پڑا تھا اور اس کی ”شادی خانہ بربادی“ کا دور دور پتا نہیں تھا۔ یہ بات بھی عین ممکن تھی کہ وہ عالمگیر کے ساتھ ہی مولوی جی کے قتل والے کیس میں پھنس جاتا۔ یہ لوگ وہی کچھ کاٹ رہے تھے جو انہوں نے بویا تھا۔

رات کا کھانا شام کے ایک گھنٹے بعد ہی کھالیا جاتا تھا۔ ڈیرے کے کمرے میں لائٹیں کی روشنی تھی۔ میں اینق، سونگی اور حق نواز اکٹھے ہی کھانا کھا رہے تھے۔ آلو گو بھی کاچٹ پٹا سالن تھا۔ ساتھ میں دودھ کی مکین لسی تھی۔ حق نواز کی بیوی نذیراں گرم گرم روٹیاں اتار کر لارہی تھی۔ کھانے کے ساتھ ساتھ دوپہر والے واقعے پر بھی بات ہو رہی تھی اور مولوی جی کی بیوہ کی انکشاف انگیز باتوں پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ سونگی نے بڑا سالقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے اب تو سب کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ پنڈ میں یہ جو سکھ کی ہوا چلی ہے اس میں یا سر بھائی کا ہاتھ بھی ہے۔ بڑا جی دار بندہ ہے۔ لوگ پہلے ہی کہتے تھے کہ وہ کہیں گیا نہیں۔ پنڈ کے آلے دوالے ہی ہے اور یہاں کی اونچ نیچ پر پوری نظر رکھے ہوئے ہے۔“

حق نواز نے کہا۔ ”ہاں، پڑھا لکھا منڈا ہے۔ مولوی جی و چارے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ ہنگی پر سایہ وغیرہ ہے۔ یہ اسی نے مولوی جی کو شہر کا رستہ دکھایا تھا۔ اب تو یہ گل ثابت ہو گئی ہے۔“

سونگی نے کچی لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”کیا پتا اب وہ کھل کر سامنے بھی آجائے۔ عالمگیر تو اب اتنی جلدی باہر نہیں نکلے گا۔“

اسی دوران میں دین محمد صاحب کے کھٹکار نے کی آواز سنائی دی۔ ہم سب ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ دین محمد صاحب اندر داخل ہوئے اور میری طرف دیکھ کر اشارے سے بولے کہ ”چلو۔“

میں سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے اشاروں سے مجھے بتایا کہ گھر جانا ہے۔ اشاروں کے ساتھ ساتھ وہ وضاحت کے لیے بول بھی رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ”تھوٹو کا بخار نہیں اتر رہا۔ بے ہوشی میں بار بار تمہارا نام لے رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ گوٹے بھائی جان کو بلاؤ۔ تم دیکھ بھال کرتے رہے ہونا اس کی...“

میں دین محمد صاحب کی ساری باتیں سن رہا تھا لیکن ظاہر یہی کیا جیسے ان کے اشاروں سے بس تھوڑا بہت ہی سمجھ

انکار ہے

میرے ”اظہارِ محبت“ کے بعد یہ پہلی بار تھی کہ وہ مجھے دکھائی دی گئی اور اچھے انداز میں دکھائی دی گئی۔ اس کا یہ انداز دل کی گہرائی میں دور تک اتر گیا مگر ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس نے میری گستاخی پر مجھے معاف کیا ہے یا نہیں۔ وہ اندر آگئی اور موڑھے پر بیٹھ گئی۔ پورا کمر جیسے اس کی خوشبو اور روشنی سے بھر گیا۔ یہ پیرس کے کسی میٹکے پر فیوم کی خوشبو نہیں تھی۔ نہ ہی یہ روشنی مصنوعی لائٹس کی تھی، یہ خوشبو اور روشنی اس کی ذات کی سادگی اور پاکیزگی سے ابھرتی تھی۔

ماں نے تاجور کے سامنے ایک بار پھر میرے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور تاجور سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ”ہمارے لیے تو یہ رحمت کا فرشتہ ہی ثابت ہوا ہے۔ پہلے سیالکوٹی والے واقعے میں اس نے تجھے بچایا اور ان خبیثوں سے لڑ جھگڑ کر تجھے نکال لے گیا۔ اب اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اسفند کو بچایا۔“

تاجور نے اقرار میں سر ہلایا اور ایک بار نرم نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں لالعلق سا بیٹھا تھا جیسے کچھ بھی سن نہیں پارہا ہوں۔ انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔ ”دیکھو کتنا سادہ اور معصوم سا ہے لیکن دلیر بھی ہے۔“

سادہ اور معصوم کے الفاظ میرے کانوں میں گونج کر رہ گئے۔ اس بے چاری کو کیا پتا تھا کہ یہ سادہ اور معصوم ڈنمارک اور انگلینڈ جیسے ملکوں میں کیا گل کھلاتا رہا ہے۔ کیسے کیسے ماحول کا حصہ رہا ہے اور اب بھی اگر وہ یہاں آیا ہے تو اس کی بیٹی کی خاطر۔ اس کے عشق میں ڈوب کر۔ اور اس کے ”ارادے“ بہت آگے کے ہیں۔ انہوں نے اشارے کنائیوں میں مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اور میرے ماں باپ کہاں ہیں؟

میں نے مبہم سے اشارے دیے اور بے بسی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ذرا تاسف سے بولیں۔ ”کتنا جوان ہے، سو ہوتا بھی ہے پر اللہ نے زبان نہیں دی۔“ تاجور نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ہر کام میں اللہ نے کوئی بہتری رکھی ہوتی ہے امی۔ ہو سکتا ہے کہ زبان ہوتی تو اس کا استعمال کیسے کیسے ہوتا۔“ تاجور کی والدہ نے اپنی ناک کو انگلی سے چھو کر مجھ سے پوچھا کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟

میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ تاجور ذرا شوخی سے بولی۔ ”امی، میرا خیال ہے آپ لڑکی ڈھونڈنا شروع کر

پارہا ہوں۔ اسفند قریباً چوبیس گھنٹے میرے پاس رہا تھا۔ وہ پہلے بھی مجھ سے انسیت محسوس کرتا تھا، میری ہمارداری نے اسے مجھ سے مزید مانوس کر دیا تھا۔ یہ میرے لیے خوش آئند بات تھی۔

میں دین محمد صاحب کے ساتھ گھر روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے سیدھا اسی اندرونی کمرے میں لے گئے جہاں اسفند چارپائی پر نیم بے ہوش لیٹا تھا۔ اس کا پاؤں کافی سوجا ہوا تھا۔ پہلوان حشمت ابھی ابھی اس کی ہڈی بدل کر گیا تھا۔ لائین کی روشنی میں جو کمزور عورت اس کے سرہانے بیٹھی تھی، وہ اس کی والدہ تھی۔ میں آج انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ عمر پینتالیس سے اوپر ہی رہی ہوگی۔ چہرے پر بیماری کی نقاہت تھی۔ تاہم بیٹے کو تکلیف میں دیکھ کر وہ اپنی تکلیف بھول چکی تھیں۔ مجھے حیرانی ہوئی جب انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے سے لگایا اور میرا ماتھا چوما۔ پھر فوراً ہی مجھے وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ میں نے ایک نہایت مشکل وقت میں ان کے بچے کی مدد کی تھی۔ وہ لرزتی آواز میں بولیں۔ ”ہم تمہارا احسان نہیں دے سکتے پتر، تم اسے کھوہ سے باہر نہ نکالتے تو پتا نہیں کیا بیت جاتی اس پر۔“

میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر عاجزی کا اظہار کیا اور جیسے خاموشی کی زبان میں بتایا کہ یہ تو میرا فرض تھا۔ انہوں نے پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولیں۔ ”گولیاں چل رہی تھیں پتر، تو نے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی، کسی بڑی جنگی ماں کا لال ہے تو۔ اللہ تجھے حیاتی دے۔“

انہوں نے چادر سے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے الفاظ کو اشاروں کی زبان سے واضح کرتے ہوئے بولیں۔ ”یہ دوپہر سے بار بار تیرا نام لے رہا ہے۔ اس کے پاس بیٹھ... اس کو دوا وغیرہ کھلا۔ یہ تجھے دیکھے گا تو اسے بڑا آسرا ملے گا۔“

میں نے نیاز مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پھر مجھے دعا میں دینے لگیں۔ مجھے کبھی کبھی افسوس بھی ہوتا تھا کہ میں اتنے اچھے اور مہربان لوگوں کو دھوکے میں رکھ رہا ہوں اور خود کو ان کے سامنے بے زبان ظاہر کر رہا ہوں۔ لیکن اب یہ ایک مجبوری بن گئی تھی۔

دفعتاً آہٹ ہوئی۔ دروازے پر تاجور کی صورت میں چاند چمکا۔ اس کے پہلو میں کا کا کھڑا تھا جس طرح چھوٹو کا اصل نام اسفند تھا، اسی طرح کا کے کا اصل نام راحیل تھا۔ تاجور نے ممنونیت بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

”اب تو اس نے ساقے کے دیاہ کی گل نہیں کی ہو گی؟“ تاجور کی والدہ نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔
”نہیں، اب کس منہ سے کرے گا۔“ دین محمد نے جواب دیا۔

”اور مولوی جی کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں کیا کہتا ہے وہ؟“ تاجور نے پوچھا۔
”کہتا ہے کہ اس سے بھی میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ کہتا ہے کہ سانپوں کے زہر سے بنائی گئی زکام ریشے کی ایک دوائی اس کے پاس ضرور ہے، اگر عالمگیر نے یا کسی اور نے اس دوائی میں کچھ اور ملا کر کوئی نشہ وغیرہ بتالیا ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

کچھ دیر تک دین محمد اپنے اہل خانہ کے پاس بیٹھ کر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے یہ پتا بھی چلا کہ عالمگیر اور تحصیل دار ٹوانہ کے درمیان جو سنگین جھگڑا شروع ہوا ہے وہ عارضی طور پر ختم تو کیا ہے لیکن یہ دشمنی اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔ پولیس کی بھاری نفری گاؤں میں موجود ہے اس لیے دونوں طرف کے لوگ کوئے کھدروں میں دبکے ہوئے ہیں۔

اتنے میں کوئی دین محمد صاحب سے ملنے آگیا، وہ باہر چلے گئے۔ تاجور کی والدہ نے میرے سامنے ہی تاجور سے بات کی کہ اب کیا کرنا ہے، وہ بولیں۔ ”کم از کم آج کی رات تو شاہ زیب کو یہیں رہنا پڑے گا لیکن جو کچھ بھی ہے یہ غیر بندہ ہے، تھوڑی سی احتیاط کرنا پڑے گی۔“
”چلیں دیکھ لیتے ہیں۔“ تاجور نے کہا۔ ”اگر رات گیارہ بارہ بجے تک اسفند کی طبیعت اچھی ہوگئی تو پھر یہ واپس بھی جاسکتا ہے۔“

”نہیں، آج کی رات تو یہ یہیں رہ لے۔ لیکن ایسا کرتے ہیں کہ اسفند کی چارپائی بیٹھک میں بچھا دیتے ہیں۔ وہاں تخت پوش بھی پڑا ہے، اگر شاہ زیب نے کمر سیدھی کرنی ہوگی تو اس پر لیٹ جائے گا۔“

دو چار منٹ ماں بیٹی میں مشورہ ہوا پھر ہم نے مل کر اسفند والی چارپائی اٹھائی اور گھر کی کشادہ بیٹھک میں لے آئے۔

تاجور کی والدہ کی طبیعت خراب تھی۔ تاجور نے بہت اصرار کر کے انہیں دوا کھلائی اور سونے کے لیے بھیج دیا۔ میں اور تاجور، اسفند کے پاس بیٹھے رہے، گاہے بگاہے دن محمد صاحب بھی چکر لگاتے رہے۔ کچھ دیر مجھ سے عنودگی بھری باتیں کرنے کے بعد اسفند... سو گیا تھا۔ میں نے

دیں۔ یہ بھی نیکی کا کام ہوگا۔“
کا کاچک کر بولا۔ ”امی، بابے نتھے کی دونوں بیٹیاں کوگی ہیں۔ چھوٹی تو شکل کی بھی چمکی ہے۔“

والدہ نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”چل دے، اتنا سو ہتا... گبرو ہے۔ اس کے لیے دبی رہ گئی ہے۔ یہ دل کا نیک ہے۔ اللہ اس کے لیے بھی چنگا کرے گا۔“
میں نے تاجور کی طرف دیکھا، اتفاقاً تب وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی، اس نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔ میرے سینے میں مٹھا مٹھا درد ہلکورے لینے لگا۔ اسی دوران میں اسفند کسمایا اور زور سے کراہ کر پکارنے لگا۔
”ہائے، امی... ہائے باجی... ہائے باجی۔“

تاجور تڑپ کر اس کے سرہانے پہنچی اور اس کے منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے پککارنے لگی۔ ”میں یہاں ہوں اسفند... اور یہ دیکھ... تیرے گونگے بھائی جان بھی آئے ہیں۔“ اسفند عرف چھوٹو نے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں بخار کی حدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت ابھری۔ تاجور نے مجھے اشارے سے کہا کہ میں اس کے سرہانے بیٹھ جاؤں۔ میں نے بیٹھ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کا ماتھا دبائے لگا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

اسی دوران میں دین محمد صاحب کھنکھارتے ہوئے اندر آگئے۔ ”کہاں گئے تھے؟“ تاجور کی والدہ نے پوچھا۔

”ذرا باہر کی خبر لینے گیا تھا۔“ دین محمد نے کہا۔ ”پھر ذرا توقف سے بولے۔“ پتا ہے کیا ہوا ہے؟“

تاجور اور اس کی والدہ سوالیہ نظروں سے دین محمد کی طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے اپنا چہرہ ساٹ رکھا اور جوں کا توں بیٹھا رہا۔ ظاہر ہے میں تو ”گونگا بہرا“ تھا۔ دین محمد نے کہا۔ ”پھر ولایت بڑا خچرا نکلا ہے۔ بالکل گرگٹ کی طرح رنگ بدلا ہے اس نے۔ کہتا ہے کہ عالمگیر سے میرا ملنا جلنا ضرور رہا ہے پر ان کی کسی کارستانی سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ پولیس والے ابھی شام سے پہلے اس کے پاس گئے تھے پوچھ کچھ کے لیے۔ اس نے ان کو بتایا ہے کہ وہ بھی سجادول سیالکوٹی کو اتنا ہی برا سمجھتا ہے جتنا پنڈ کے دوسرے لوگ۔ وہ دن رات سیالکوٹی کے لیے بددعا کرتا ہے اور اپنے پنڈ کی خیر مانگتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر عالمگیر اور ساقا وغیرہ قصور وار ہیں تو انہیں اس کی سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔“

اس کے شفاف چہرے پر رنگ سا آکر گر گیا۔ اس نے چونکی ہوئی نظروں سے دونوں چھوٹے بھائیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں ہی سو رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے دین محمد صاحب کی کھانسی بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ لگتا تھا کہ ان کی غنودگی بھی نیند میں بدل گئی ہے۔ دور کی کسی گلی سے آوارہ کتوں کا مدھم سا شور سنائی دے رہا تھا۔

”آپ کو کیا کرنی ہے اپنی بات؟“ وہ نرم لہجے میں بولی۔

”میں تو ماضی کی بات ہی کروں گا۔ بس وہی دو دن... جو میں کبھی بھولا نہیں اور نہ بھول سکوں گا۔ سچ تاجور! ایسا لگتا ہے، وہ دن میرے دل پر کسی نے کندہ کر دیے ہیں۔ گہرائی تک کھود دیے ہیں۔ اب شاید موت بھی انہیں مٹا نہ سکے۔“

”آپ کو کتنے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔

”چلو، کسی طور اچھا تو لگتا ہوں۔“

وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”شاہ زیب! آپ واقعی بہت اچھے ہیں، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ آپ نے جو کچھ میرے لیے اور میرے بھائی کے لیے کیا ہے، میں اسے زندگی بھر بھول نہیں سکوں گی لیکن پلیز... آپ یہاں سے چلے جائیں۔“

میں نے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”کیا اس وقت تک رہنے کی اجازت بھی نہیں جب تک یہاں کے حالات کچھ ٹھیک نہ ہو جائیں؟“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”میں اجازت دینے یا نہ دینے والی کون ہوتی ہوں۔ میں تو صرف گزارش کر سکتی ہوں۔“

لائین کی روشنی مدھم ہو گئی تھی۔ اچانک کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ بجھ گئی۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ ”مم... میں موم بتی دیکھتی ہوں۔“ تاجور نے جلدی سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

وہ لکڑی کی الماری کی طرف بڑھی تو اسے ٹھوکر لگی اور وہ میرے اوپر گرتے گرتے پٹی۔ اس کا گداز جسم ایک لمحے کے لیے میرے شانے سے ٹکرایا۔ جب اس نے سنبھل کر سیدھا ہونا چاہا تو وہ نہیں سکی۔ اس کے چہرے پر ہر وقت جھولنے والی بالوں کی دوٹیوں میں سے کوئی ایک لٹ میری جیکٹ کے بٹن میں اٹک گئی تھی۔

سرگوشی میں تاجور سے کہا کہ وہ بھی جا کر آرام کر لے لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔ راحیل کو نے میں بھی چارپائی پر نیم دراز تھا اور لائین کی روشنی میں اپنے کورس کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسی طرح پڑھتے پڑھتے وہ سو گیا۔ موقع غنیمت جان کر میں نے سرگوشی میں تاجور سے کہا۔ ”مبارک ہو، سا قاف اپنے شیطانی ارادوں سمیت تم سے کافی دور جا چکا ہے، اگر میں غلط نہیں ہوں تو شادی میرا مطلب ہے جبری شادی کا خطرہ مستقل طور پر تمہارے سر سے نکل گیا ہے۔“

”اس میں یاسر بھائی نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔“ وہ بھی مدھم آواز میں بولی۔ ”اگر وہ اس طرح زینب کی بیماری کی اصلیت نہ بتاتے... اور پھر عالمگیر کا کچا چٹھا، سیالکوٹی کے بارے میں نہ کھولتے تو کیا بھی اس طرح نہ پلٹتی۔ انہوں نے تصویروں کے ذریعے عالمگیر اور سیالکوٹی کی دوستی کا بھانڈا پھوڑا اور نتیجے میں عالمگیر کی پکڑ ہو گئی۔“

جی چاہا اسے بتا دوں کہ وہ جس شخص کی تعریفیں کر رہی ہے اس بے چارے کو تو شاید اس سارے معاملے کا پتا بھی نہ ہو۔ اصل ”ہیرو“ تو تمہارے سامنے بیٹھا ہے اگر کوئی مٹھا بول بولتا ہے تو میرے بارے میں بولو۔ لیکن ابھی یہ ساری باتیں افشا کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی۔ ”یاسر بھائی، اماں برکتے کے بیٹے ہیں۔ بڑے چٹکے اخلاق کے ہیں۔ پنڈ والوں کو ہمیشہ ان کی طرف سے کوئی اچھی امید ہی ہوتی ہے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”بالکل... بندہ اچھا ہوتا اس سے اچھی امید خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ اب یاسر بھائی پنڈ بھی واپس آ جائیں گے۔ دیکھا جائے تو انہوں نے دونوں پارٹیوں کی کمر توڑ دی ہے۔ میرا مطلب ہے عالمگیر اور تحصیل دار ٹوانہ... دونوں پکڑے گئے ہیں اور دونوں پر پرچے شہرچے بھی کئے ہیں۔“

”اور تیسری پارٹی؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”تمہارا دعویدار اسحاق صاحب، سنا ہے جناب کو ٹوانہ کے بندوں نے خوب مار لگائی ہے۔ کمر تو خیر اس کی نہیں ٹوٹی لیکن کلائی ٹوٹ گئی ہے۔“

تاجور کے چہرے پر نفرت اور کراہت کے آثار نمودار ہوئے، وہ بولی۔ ”چھوڑیں اس بات کو۔“

”تو کس کی بات کریں؟ میرا مطلب ہے... میں

”ہائے اللہ۔“ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ
سکاری نکلی۔

جیکٹ کے کالر پر لگے ہوئے ستارہ نمائش نے اسے
رکوع کے بل جھکے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے بٹن کو ٹٹولا
اور اس کی لٹ کو آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کی گرم
خوشبودار سانسیں میرے چہرے سے ٹکرار ہی تھیں۔ پتا نہیں
کیسے میں نے بے ساختہ اپنے سر کو حرکت دی اور اپنے گرم
ہونٹوں سے اس کی تابندہ پیشانی چوم لی۔ لٹ آزاد ہو چکی
تھی۔ وہ تڑپ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ یہ سب کچھ چار پانچ
سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ وہ باہر نکل گئی۔

میرادل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ جو کچھ ہوا اتنا آنا
قاتم تھا کہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ میرے ہونٹوں پر
ابھی تک اس کی پیشانی کا بے مثال لمس تھا۔

وہ لوئی تو اس کے ہاتھ میں شمع تھی۔ میں نے اس کا
چہرہ دیکھا اور شپٹا گیا۔ وہ سخت غصے میں نظر آتی تھی۔ اس
نے شمع دروازے کے قریب طاق میں جمائی اور میری
طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”شاہ زیب صاحب! آپ میرے
اور اپنے حال پر رحم کریں۔ آپ یہاں سے چلے جائیں...
اگر کہتے ہیں تو میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی ہوں۔“

”سوری تاجور، میں شرمندہ ہوں۔“

”میں آپ سے زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں آپ کو...
یہاں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتی۔“ اس نے انتہائی روکھے
پن سے کہا اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔

مجھے لگا کہ اگر میں نے ایک لفظ بھی اور کہا تو شاید وہ
ہر اندیشے کو نظر انداز کر کے چلا اٹھے... اور گھر والے بیدار
ہو جائیں۔

اس کا ردِ عمل میری توقع سے زیادہ شدید تھا۔ میں گم
صم اپنی جگہ بیٹھا رہا اور گاہے بگاہے اسفند کی پیشانی کو سہلاتا
رہا۔ ایک دو بار اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھولیں اور میری
طرف دیکھ کر دوبارہ بند کر لیں۔ اسے جیسے اطمینان تھا کہ
میں اس کے پاس موجود ہوں۔ تھوڑی دیر بعد تاجور کی
والدہ کے کھانسنے کی آواز آئی اور وہ تسبیح لے کر میرے پاس
آن بیٹھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تہجد کا وقت ہونے والا
ہے۔

وہ دعائیہ انداز میں بولیں۔ ”یا اللہ سب کی خیر، سب
کا بھلا۔ پتا نہیں اس پنڈ کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ہر روز کچھ نہ
کچھ برا سننے کو مل رہا ہے۔“

پرسوں والے خونی واقعے نے جیسے ابھی تک انہیں

ہراساں کر رکھا تھا اور یہ خوف و ہراس چاند گڑھی کے اکثر
لوگوں کے چہروں پر نظر آتا تھا۔ مگر اسرار واقعات اور گاؤں
میں دو بد صورت عورتوں کی موجودگی والی باتیں پہلے ہی ان
لوگوں کے لیے سوہانِ روح تھیں، اب لاشیں گرنا بھی شروع
ہو گئی تھیں۔

تاجور کی والدہ نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں چار پائی
پر لیٹ کر آرام کر لوں۔ مگر میں نے اشاروں کنایوں میں
بتایا کہ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ نہیں مانیں اور مزید
اصرار کر کے مجھے لٹا دیا۔

میں زیادہ دیر نہیں سویا۔ اٹھا تو رات کا اندھیرا دن
کے اجالے میں بدل رہا تھا۔ صحن کی طرف چڑیاں چپکار رہی
تھیں۔ تاجور اور اس کی والدہ اسفند کو دوا پلا رہی تھیں۔
تاجور نے میری طرف دیکھا تک نہیں اور اسفند کو دوا دینے
کے بعد تیزی سے باہر چلی گئی۔ میں اسفند کے پاس آ بیٹھا
اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی طبیعت اب بہتر تھی۔ وہ
میری ٹھوڑی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ”آپ بہت
اچھے ہیں گو ننگے بھائی۔“

تاجور کی والدہ نے سرزنش کے انداز میں کہا۔
”گو ننگے بھائی نہیں کہتے... صرف بھائی کہا کرو... بھائی
جان۔“

اسفند نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”پھر ذرا چوتک کر
بولا۔“ بھائی جان! آپ بول بھی لیتے ہیں؟ میں نے رات کو
آپ کی آواز سنی تھی۔“

میرادل اچھل کر رہ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے
تاجور کی والدہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مسکرا کر اسفند
کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”نہیں پتر، یہ نہیں بول سکتے۔ تجھے بخار
کی بے ہوشی تھی نا اس لیے الٹی سیدھی آوازیں سن رہا تھا۔
اپنے ابا جی کو ماسٹر جی کہہ کر بلارہا تھا۔“

”نہیں امی، یہ بول رہے تھے۔ باجی سے بات
کر رہے تھے۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے کر رہے تھے بات۔“ والدہ نے
اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ”اب زیادہ باتیں
کرے گا تو منہ پھر سوکھنے لگے گا۔ سو جا تھوڑی دیر۔“ ننھا
اسفند ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس
کی پلکیں دوا کے اثر سے بوجھل ہونے لگیں۔

میں اپنے جسم میں ابھی تک سنسناہٹ محسوس کر رہا
تھا۔

ناشا میں نے دین محمد صاحب کے گھر پر ہی کیا۔

انکار

جانا ہے۔ تم دین محمد صاحب سے کہو کہ قصبے سے فون آیا ہے۔ میرے والد اور چچا میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ بات بڑھ گئی ہے، میں والد کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے جانا پڑے گا اگر دو چار ہفتے میں معاملہ ٹھیک ہو گیا تو ہو سکتا ہے کہ پھر آ جاؤں۔“

”شاہ زیب بھائی... تاجور باجی سے کوئی اُن بن ہو گئی ہے؟“

”پار تفصیل میں نہ جاؤ، جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔“

میں نے اُٹل لہجے میں کہا۔ کچھ دیر بعد میں اور انیق باہر آئے۔ انیق نے سب کچھ دین محمد کے گوش گزار کر دیا۔ دونوں آپس میں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ آخر دین محمد صاحب نے افسردہ دلی کے ساتھ مجھے جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ میری کمی بے حد محسوس کریں گے اور میں نے جس طرح ان کی فیملی کی مدد کی ہے وہ اسے بھول نہیں سکتے۔ انہوں نے الفاظ اور اشاروں کنایوں کے ذریعے مجھ سے کہا کہ وہ کوئی نیا ملازم ابھی نہیں رکھیں گے اور امید کریں گے کہ میرے حالات ٹھیک ہو جائیں اور میں ایک دو ہفتے میں واپس آ جاؤں۔

میں نے نیاز مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ انہوں نے مجھے اور انیق کو آدھے صبح کے بجائے پورے صبح کی تنخواہ دینے کا کہا اور یہ بھی کہا کہ مجھے جب بھی جانا ہو راحیل، اسفند اور باقی گھروالوں سے مل کر جاؤں۔

رات کو میں نے انیق سے سامان وغیرہ باندھنے کا کہا۔ وہ بھی خاصا کنفیوژ تھا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ میں نے ایک اکیلی بستر بوریا کیوں سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ حق نواز اور اس کی بیوی نذیراں بھی افسردہ سے تھے۔ انیق کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”آپ نے پرانی انڈین فلم ”حقیقت“ دیکھی ہوئی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میرے اندر تیری طرح کوئی بڑھی روح نہیں مٹی ہوئی۔ اگر کبھی دیکھنی ہو تو نئی فلم دیکھتا ہوں۔“

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”اس میں ایک گانا ہے۔ میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا... کہ وہ روک لے گی منالے گی مجھ کو۔ ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن... کہ دامن پکڑ کر بٹھالے گی مجھ کو... قدم ایسے انداز میں اٹھ رہے تھے کہ آواز دے کر بلا لے گی مجھ کو۔ لیکن پتا ہے جی کہ ہوا کیا تھا؟“

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے اپنی جیکٹ ٹرنک نما صندوق میں رکھتے ہوئے کہا۔

”نہ کسی نے لہراتا ہوا دامن پکڑا تھا، نہ آواز دی تھی،

تاجور مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کی آواز تک سنائی نہیں دی۔ جانے کس کو نے کھد رے میں چھپ گئی تھی۔ مجھے بار بار اس کا نہایت روکھا لہجہ یاد آتا تھا اور سینے میں کچوکا سا لگتا تھا۔ دس بجے کے قریب میں اپنے کام پر واپس آ گیا۔ آج ایک کھیت میں ٹریکٹر کے ذریعے سہاگا پھیرنا تھا اور یہ کام آج ہی کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ کل بویا کی ہونا تھی۔

میں شام تک کام میں جتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہن میں ایک پروگرام بھی جتا رہا۔ جب میں نے انیق کو بتایا کہ کل ہم چاند گڑھی سے واپس جا رہے ہیں تو وہ حیران رہ گیا۔ ”کیوں، کیا ہو؟“ اس نے بھاڑ جیسا منہ کھول کر پوچھا۔

”بس یہاں ہمارا دانہ پانی اتنا ہی تھا۔“

وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ”کیا بات ہے شاہ زیب بھائی! آج تو آپ فلم دل لگی کے ندیم نظر آ رہے ہیں... وہ کیا گانا تھا... کل کسی وقت شام سے پہلے، میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔“

”نہیں بھئی، میں سنجیدہ ہوں۔“ میں نے کہا۔

اسی دوران میں اتفاقاً دین محمد صاحب بھی حقہ گڑ گڑاتے ہوئے ہماری طرف آ گئے۔ انیق سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”کیوں بھئی، کیا گل ہے۔ شاہ زیب نے حق نواز سے کہا ہے کہ کام چھوڑنا ہے۔“

انیق سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

دین محمد صاحب نے کہا۔ ”کیا کسی سے کوئی ناراضگی وغیرہ ہو گئی ہے یا پھر کوئی اور بات ہے؟“

میں نے اشاروں کنایوں میں وضاحت کی۔ انیق نے میری ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ”مالک! یہ کہہ رہا ہے کہ اس کی کیا مجال کہ آپ سے ناراض ہو۔ دراصل یہ کسی کام کی بات کر رہا ہے۔ ابھی مجھے بھی پوری طرح بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں اس سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔“

”تو ابھی پوچھ لو نا۔ میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ اگر کوئی تنخواہ کا یا پیسوں کا معاملہ ہے تو مجھے بتاؤ بھئی۔“

انیق نے کہا۔ ”آپ دو منٹ یہاں بیٹھیں مالک۔ میں اس سے پوچھتا ہوں۔“

دین محمد حقہ لے کر ڈیرے کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ انیق مجھے لے کر اندر کمرے میں آ گیا۔ ”کیا چکر ہے شاہ زیب بھائی؟“ اس نے تیز سرگوشی میں پوچھا۔

”بس وہی بات جو تم سے کہی ہے۔ ہمیں یہاں سے

نہ روکا تھا۔ وہ چلتی ہی آیا تھا اور جناب عالی! جدا ہو گیا تھا کہیں اور بھی ایسا ہی نہ ہو۔“

اچانک کمرے کی عقی کھڑکی پر بہت مدھم دستک ہوئی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ انیق نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھولی۔ سلاخوں کے دوسری طرف تاجور کا ہیولا نظر آیا۔ میرے سینے میں جیسے جلتی ہوئی بج اٹھی۔ پاؤں سے سر تک ایک دلکش لہریں دوڑ گئی۔ میں کھڑکی کے پاس پہنچا۔ انیق معاملہ نہیں کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً باہر چلا گیا۔ تاجور نے شال مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ دونوں سرکش لٹیں حسب معمول رخسار کو چھوری تھیں۔ اس کے عقب میں کچھ قاصدے پر درختوں کے نیچے ایک اور ہیولا نظر آیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ یہ ملازمہ فوری تھی۔ وہ اس طرح کھڑکی تھی کہ اگر گاؤں کی طرف سے کوئی شخص ڈیرے کی طرف آتا تو وہ فوراً دیکھ لیتی اور تاجور کو آگاہ کر دیتی۔ اس کا مطلب تھا کہ تاجور اسی مقصد سے اسے اپنے ساتھ لائی ہے۔ تاجور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”میں بنے سنا ہے، آپ جانے کی بات کر رہے ہیں؟“

”جانے کی بات نہیں کر رہا، میں صبح جا رہا ہوں۔ اب میرا جانا ہی جتا ہے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اور انیق؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ بھی جا رہا ہے۔“

”ابا جی کہہ رہے تھے، کئی کام اٹکے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں چلے گئے تو انہیں مشکل ہو جائے گی۔“

”بے روزگاری بہت ہے۔ ملازم ڈھونڈنا کون سا مشکل ہے۔ ایک ڈھونڈ تو ہم جیسے دس ملتے ہیں۔“

تاریکی میں جھینگڑ کی آواز دور تک پھیل رہی تھی۔ چند سیکنڈ خاموشی رہی۔

”اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے...“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

شاید اس کا خیال تھا کہ میں اسے فقرہ مکمل کرنے کو کہوں گا لیکن میں بھی خاموش رہا۔ اسے خود ہی بولنا پڑا۔

”اسفند بھی ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں۔ سویرے بھی آپ کا پوچھ رہا تھا۔“

”کوئی بات نہیں، ایک دو دن میں بہل جائے گا۔ بچہ ہے، بس توجہ مانگتا ہے۔“ وہ جیسے لہو کا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

چند سیکنڈ ہم دونوں کے درمیان گھبر خاموشی رہی۔ وہ جیسے سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ آخر ایک بار پھر طویل سانس

لے کر بولی۔ ”شاید، میں کل رات کچھ زیادہ بول گئی...“

سوری۔ ”اس کے بعد وہ تیزی سے واپس پلٹ گئی۔“

”سوری۔“ اس کا یہ لفظ جیسے میری سماعت سے کل کر میرے پورے جسم میں اور ارد گرد کی ساری فضا میں گونجنے لگا۔ اس ایک لفظ میں بہت کچھ تھا۔ میں نے اندھیرے میں اس کی پیشانی کے ساتھ جو ”جسارت“ کی تھی اس کی معافی بھی تھی۔ مجھ سے ابھی یہیں رہنے کی درخواست بھی تھی اور شاید کہیں بہت گہرائی میں، میری تھوڑی سی حوصلہ افزائی بھی تھی۔

میں ادھ کھلی کھڑکی سے اس کا دور جاتا ہیولا دیکھتا رہا۔ اس کے ہیولے کے ساتھ ساتھ جاتا دوسرا ہیولا فوری کا تھا۔ وہ جب تک اپنے گھر کے قریب نہیں پہنچ گئیں، میں نے ان پر نظریں جمائے رکھیں۔

چند منٹ بعد انیق بھی آن وارد ہوا۔ ”ہاں جی، سامان باندھنا ہے یا کھولنا ہے؟“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”نی الحال تو کھولنا ہی ہے...“

وہ بولا۔ ”لگتا ہے کہ آپ نے سامان زیادہ کس کر باندھا ہے؟“ آپ کو پہلے ہی یقین تھا کہ اسے کھولنا پڑے گا۔

”میری بات ہی یقین کی ہوتی ہے میاں...“

انیق نے کہا۔ ”یعنی یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم۔“

پہلوان حشمت نے اندر داخل ہوتے ہوئے شعر مکمل کیا۔ ”جہاد زندگانی میں، یہ ہیں مردوں کی شمشیریں... واہ کیا خوب صورت شعر کہا ہے اپنے استاد مرزا غالب صاحب نے۔“

انیق اور میں نے ایک ساتھ ٹھنڈی سانس لی۔ کوشش کے باوجود انیق اپنی زبان کی کھجلی کو نہیں روک سکا، بولا۔

”حشمت بھائی، یہ حکیم الامت علامہ اقبال کا شعر ہے۔ مرزا غالب کا نہیں۔“

”اس بارے میں تمہاری معلومات ٹھیک ناہیں ہیں۔“ پہلوان حشمت پورے وثوق سے بولا۔ ”یہ شعر اصل میں غالب کا ہی ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کو درست کرنے کے لیے دیا تھا اور حضرت علامہ اقبال نے اسے اتنے اچھے طریقے سے درست کیا کہ مرزا غالب نے خوش ہو کر انہی کو دے دیا۔ بعد میں حضرت علامہ نے اس وزن پر ایک شاندار غزل لکھی۔ یہ سب کچھ میرے دادا حضور کی موجودگی میں ہوا تھا۔“

ہے۔ ہاں ہفتے کے روز میں ایک دودن کے لیے جاؤں گا۔
یہ اطلاع دین محمد صاحب کے لیے کسی خوش خبری سے
کم نہیں تھی۔ انہوں نے میری پیٹھ ہلکی اور بولے۔ ”تم لوگ
ملازم نہیں، میرے بیٹوں کی طرح ہو۔ کسی طرح کی ضرورت
ہو تو مجھے بے جھجک بتایا کرو۔“

میں نے نیاز مندی سے سر ہلایا۔
رات کو پھر میرے لیے گھر سے بلاوا آ گیا۔ حق نواز
نے آکر بتایا۔ ”اسفند کو پھر ہلکا سا بخار ہے، ضد کر رہا ہے۔
تمہیں بلارہا ہے۔ مالک نے کہا ہے کہ تم آ جاؤ۔“
اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اسی وقت
جیکٹ پہنی اور تاجور کے گھر پہنچ گیا۔ اسفند کی چارپائی آج
بھی بیٹھک میں ہی رکھی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔
دین محمد نے بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”لو بھی حمیدہ! دیکھو
تمہارے پتر کا آدھا بخار تو شاہ زیب کو دیکھ کر ہی اتر گیا
ہے۔“

”آ جا پتر بیٹھ جا، یہاں کرسی پر۔“ تاجور کی والدہ
حمیدہ بی بی نے کہا پھر میرے کندھے پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔
”اس کو اپنا ہی گھر سمجھ۔ شرم وغیرہ نہ کیا کر۔“
دین محمد نے تاجور کو آواز دی۔ ”تاجاں پتر! گرم
دودھ لے آتھوڑا سا مٹھا ڈال کر۔“

دودھ شاید پہلے سے ہی گرم تھا۔ وہ پلیٹ میں گلاس
رکھ کر اندر لے آئی اور پلیٹ میز پر رکھ دی۔ دین محمد اطلاع
دینے والے انداز میں بولے۔ ”تاجاں پتر! اب شاہ زیب
واپس نہیں جا رہا۔ اس کے والد اور چاچے میں صلح صفائی ہو
گئی ہے۔“

”یہ تو بڑی چنگی کل ہے ابا جی، پر اتنی جلدی لڑائی اور
اتنی جلدی صلح؟“

”پتر! دل صاف ہوں نا۔۔۔ تو پھر لڑائیاں اتنی لمبی
نہیں ہوتیں۔“

”ہاں جی۔۔۔ دل تو واقعی صاف ہونے چاہئیں۔“
تاجور نے ذرا معنی خیز انداز میں کہا اور باہر چلی گئی۔

اسفند اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دوا نہ کھانے کی ضد
کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے اس نے دوا بھی کھالی پھر ہم
لوڈ کھینے لگے۔ کا کا یعنی راحیل بھی ہمارے ساتھ شریک ہو
گیا۔ تاجور گا ہے بگا ہے کمرے میں آتی رہی لیکن وہ ٹک کر
ہمارے پاس نہیں بیٹھی۔ اس نے اوڑھنی بھی مضبوطی سے سر
پر لپیٹ رکھی تھی۔

تاہم رات گئے اسفند کا بخار تیز ہو گیا۔ میں نے

”حشمت بھائی! مرزا غالب تو 1867ء میں فوت
ہو گئے۔ علامہ اقبال کوئی دس سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ وہ
مرزا غالب کے شعر کی اصلاح کس طرح کر سکتے ہیں۔ (اس
بات پر پہلوان حشمت گڑبڑا گیا لیکن پھر جلد ہی سنبھل گیا)
”یہ عشق اور روحانیت کی باتیں ہیں۔ تمہاری سمجھ میں
ناہیں آویں گی بچے! اور نہ ہی سمجھیں ان سے کوئی فائدہ
ہو دے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ بندر کیا جانے۔۔۔ آنگن
نیزھا۔“

اینق بولا۔ ”حشمت بھائی، کم از کم اس شعر کے
بارے میں تو آپ کو ضرور غلط فہمی ہو رہی ہے۔“
”لگت ہے کہ تمہاری عقل گھاس چرنے کو چلی گئی
ہے جو چشم دید گواہ کے پوتے کو غلط فہم کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں
اپنے دادا جی کے ہاتھ کا لکھا ہوا روزنامہ دیکھا سکتا ہوں اور
مجھے لگت ہے کہ تم پیدائش کی تاریخوں میں بھی گڑبڑی
کر رہے ہو۔“

یہ بیکار بحث طول کھینچ سکتی تھی لیکن اسی دوران میں
سولنگی سردی میں ٹھٹھرتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے انگلیٹھی پر ہاتھ
سنکے اور بولا۔ ”پولیس کے بڑے افسر کے حکم پر عالمگیر،
تحصیل دار ٹوانہ اور ان کے گرفتار ہونے والے ساتھیوں کو
گوجرانوالہ پہنچا دیا گیا ہے۔ دراصل پولیس کو خطرہ تھا کہ
سجاول سا لکھنوی نہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔“
”کیسی گڑبڑ؟“ اینق نے پوچھا۔

”وہ ہلا بول کر عالمگیر کو چھڑانے کی کوشش کر سکتا تھا۔
ایک دفعہ پہلے بھی یہ لوگ اسی طرح اپنے دو ساتھیوں کو چوکی
سے چھڑا کر لے گئے تھے۔ یہ تھانیدار سجاد جوہم جیسے غریبوں
کے لیے فرعون بنا ہوا ہے، منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔“

پہلوان حشمت نے بیزار لہجے میں کہا۔ ”چھوڑو یار،
مجھے تو پورا پورا شک ہے یہ تھانیدار بھی اندر خانے سجاول سے
یارانہ جوڑے ہوئے ہے۔ اب بڑے افسر آگئے ہیں ہو
سکتے ہیں کہ اس کا بھانڈا بھی پھوٹ جاوے۔“

سولنگی بولا۔ ”بے شک عالمگیر کو یہاں سے لے گئے
ہیں پھر بھی پنڈ میں لوگ ڈرے ہوئے ہیں۔ ان کو خطرہ ہے
کہ باہر سے آنے والی پولیس واپس چلی گئی تو سجاول پنڈ
والوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

اگلے روز اینق نے میری طرف سے دین محمد صاحب
سے بات کی اور انہیں بتایا کہ قصبے میں میرا مسئلہ کسی حد تک
حل ہو گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے میرے والد اور چچا کے
درمیان صلح کرا لی ہے۔ اب میرا واپس جانا ضروری نہیں

اشاروں سے تاجور کو بتایا کہ وہ والدہ اور والد کو بتا کر
خواتین پریشان نہ کرے۔ والد سو گئے تھے اور والدہ
لیٹی ہوئی تھیں۔ میں خود ہی اسفند کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی
کی پٹیاں رکھتا رہا۔ میں نے اس کے سر کے زخم کی پٹی بھی خود
ہی بدلی۔ زخم اب بہتر ہو رہا تھا۔ پٹی بدلنے میں تاجور نے
بھی میری مدد کی۔

دو بجے کے قریب اسفند کا بخار اترنا شروع ہو گیا۔
تاجور نے اسے تھوڑا سا دلیا بھی کھلایا۔ وہ سو گیا۔ میں نے
تاجور سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ ”اب بخار جلدی اتر
جاتا ہے، لگتا ہے ایک دو دن میں اسفند بالکل بھلا چنگا ہو
جائے گا۔“

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا
اشارہ دیا۔ یقیناً اسے دو دن پہلے والی بات یاد آگئی تھی جب
اسفند نے والدہ کے سامنے کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں بول
سکتا ہوں۔

خطرات کے پیش نظر چاند گڑھی میں ٹھیکری پہرا دیا
جا رہا تھا۔ پانچ چھ بندوں کی ایک ٹولی گاؤں میں گشت کرتی
تھی۔ تین گھنٹے بعد ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔ گشت والی ٹولی بیٹھ
کر نگرانی کرتی تھی اور دوسری ٹولی گشت کرنے لگتی تھی۔
پہرے داروں کی آوازیں گاہے بگاہے تاریک فضا میں
ابھرتی تھیں۔ کسی پاس والے گھر میں شاید کوئی عاشق مزاج
فحص جاگ رہا تھا اور ٹیپ ریکارڈر پر میوزک سن رہا تھا۔
خاموش فضا میں ایک حسب حال گیت ابھر رہا تھا۔ نہ تم
ہمیں جانو، نہ ہم تمہیں جانیں مگر لگتا ہے، کچھ ایسا، میرا ہم
مل گیا ہے۔۔۔

میں گاہے بگاہے کن انکھوں سے اسے دیکھ لیتا تھا۔
بالوں کی دونوں لٹیں دلکش انداز میں مل کھا کر اس کے رخسار
کو چوم رہی تھیں۔ لائین کی روشنی میں رخسار قدحاری انار
کی طرح دہکے نظر آتے تھے۔ قریب ہی راحیل کی ہوم ورک
والی رف کاپی اور پین پڑا تھا۔ میں نے ایک خالی صفحے پر
لکھا۔ ”پیار“ اور کاپی اس کی طرف کھسکادی۔

اس نے دیکھا اور پیشانی پر ناگواری کی شکن
ابھری۔ میرے لکھے ہوئے لفظ پر قلم پھیر کر اس نے کاپی
میری طرف کھسکادی۔

میں نے لکھا۔ ”میں اپنے پیار میں تم سے کبھی کچھ
مانگوں گا نہیں، لیکن خاموش پیار کرتے رہنے کا حق تو مجھے
ہے۔“

نقرہ پڑھ کر وہ کچھ دیر شدید تذبذب میں نظر آئی پھر

اس نے لکھ دیا۔ ”نہیں۔“
میں نے پھر لکھا۔ ”چلو پیار نہ سکی۔ کوئی نرم گوشہ۔۔۔
کوئی تھوڑی بہت گنجائش تو میرے لیے دل میں ہے نا؟“
اس نے نقرہ پڑھا۔ پھر کاغذ کاپی سے علیحدہ کر کے
پھاڑا اور انگلیٹھی میں پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ اٹھ
کر چلی جائے گی لیکن وہ اٹھ کر بھی نہیں گئی۔۔۔ ہاں عورت
ایک پھیلی ہے۔ وہ یونہی بے وجہ اسفند کی دواؤں کا ڈاکٹری
نسخہ پڑھنے لگی۔

میں بھی رومانی موڈ میں تھا۔ میں نے کاپی پر لکھا۔
”پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارے دل میں
میرے لیے تھوڑی بہت گنجائش موجود ہے۔ ایک کام کرتے
ہیں۔ اگر تم لکھ کر یا بول کر اقرار نہیں کرنا چاہتیں تو ایک
اشارہ دو۔ تمہارے بالوں کی دو لٹیں تمہارے چہرے پر
جھول رہی ہیں اگر تم انہیں ہاتھ سے ہٹا کر اپنے کان کے
پچھے اڑس لوگی تو میں سمجھوں گا کہ۔۔۔ ہاں تھوڑی بہت
گنجائش موجود ہے۔“

نقرہ پڑھ کر اس نے پھر کاغذ پھاڑ کر انگلیٹھی میں
جھونک دیا۔ میں امید بھری نظروں سے تاجور کی طرف
دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

سینے میں دھواں سا اکٹھا ہونے لگا۔ میرا دل گواہی
دے رہا تھا کہ وہ ایک مشکل لڑکی ہے۔ میں اس کے حوالے
سے سخت مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہوں۔ اس کی والدہ
کی غنودگی بھری آواز ابھری۔ ”تاجاں! جاگ رہی ہے؟“
”ہاں امی۔“ کمرے سے اس کی آواز آئی۔

اسفند کا بخار اتر گیا ہے نا؟“
”ہاں امی، ٹھیک ہے اب، سویا ہوا ہے۔“
”میری کھانسی نہیں رک رہی، تھوڑی سی چائے بنا
دے مجھے۔ شاہ زیب بھی پی لے گا۔“

”اچھا امی۔“ تاجور کی آواز ابھری۔ پھر کچن میں
تھوڑی دیر برتن کھڑکھڑاتے رہے۔ آخر چائے کی خوشبو
آئی۔ چائے کے ساتھ گھر میں بنے ہوئے خستہ نمک پارے
بھی تھے۔ وہ دونوں چیزیں میز پر رکھ کر اور اسفند کی پیشانی
ہاتھ سے چھو کر واپس چلی گئی۔ بالوں کی لٹیں بدستور اس کے
چہرے پر جھول رہی تھیں۔ کام کاج کے دوران میں وہ جیسے
انہیں بھول ہی جاتی تھی۔ مجھے بھی اس کشمکش میں لطف آرہا
تھا۔ میں نے چائے اور نمک پاروں کی طرف دیکھا بھی
نہیں۔

کچھ دیر بعد اس نے اندر جھانکا۔ دونوں اشیاء جوں کی

باقی گھروالوں کو بہت محفوظ خیال کر رہی ہے۔
میں جاتے جاتے رک گیا۔ دین محمد چلے گئے۔ لکنا تھا
کہ گاؤں کے اکثر گھروں میں لوگ جاگ گئے ہیں اور
صورت حال جاننے کے لیے باہر آ گئے ہیں۔ درحقیقت
گاؤں کے باسی اس شدید نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو چکے تھے
کہ سجاد سیالکوٹی چاند گڑھی پر ایک اور شدید حملہ کرے گا
اور اس مرتبہ شاید لاشیں بھی گریں گی۔۔۔ ٹوانے تو مر رہے
ہی ممکن ہے کہ عام لوگ بھی اس رگڑے میں آ جائیں۔

پندرہ بیس منٹ بعد دین محمد واپس آئے۔ انہوں نے
بتایا کہ بندہ تو بھاگ گیا ہے، پر اس کی گھوڑی درختوں میں
بندھی ہوئی مل گئی ہے۔

انہوں نے کہا۔ ”اس نسل کی گھوڑیاں سجاد کے
ساتھیوں کے پاس ہیں۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ یہ سجاد کا
بندہ تھا۔ شاید پنڈ کی سن گن لینے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔“

چاند گڑھی میں وہ رات کافی بے چینی سے گزری۔ شہر
سے آنے والی پولیس واپس جا چکی تھی اور اب گاؤں کے
لوگ خود کو عدم تحفظ کا شکار محسوس کر رہے تھے۔ کچھ گھراپے
ٹھے جو زیادہ پریشانی کا شکار تھے اور ان میں دین محمد کا گھر
بھی تھا۔ اسحاق عرف ساقا، عالمگیر کے خاص چچوں میں سے
تھا اور ساقے کو تاجور کا رشتہ نہ ملنے کی سخت رنجش تھی۔ سجاد
کے غیظ و غضب کا رخ دین محمد کے گھر کی طرف بھی ہو سکتا تھا
اور دین محمد کے گھر میں وہ ہستی بھی تھی جس کی حفاظت کے
لیے میں جان لڑا سکتا تھا۔ یہاں کے لوگ مجھے جانتے نہیں
تھے، نہ اچھے جانتے تھے، نہ بُرے جانتے تھے اور میری
خواہش تھی کہ وہ مجھے نہ ہی جانیں، میرا دوسرا روپ اس
روپ سے بہت مختلف تھا۔ میں جب اس روپ کے بارے
میں سوچتا تھا تو میرے ذہن میں جھماکے سے ہوتے تھے۔
خون اچھلتا تھا، دھماکے ہوتے تھے، لاشیں گرتی تھیں۔ میں
نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔ ایک دو افراد کو نہیں، آٹھ
دس افراد کو بھی نہیں۔ ان کی تعداد درجنوں میں تھی۔ میں نے
اس زندگی کو خیر آباد کہا تھا۔ ایک نئی زندگی شروع کی تھی اور
میں چاہتا تھا کہ میری اس نئی زندگی میں پرانی زندگی کی
جھلکیاں نظر نہ آئیں۔ اب تک میں بس ایک بار اپنے
ارادے میں کچھ ناکام ہوا تھا جب میں نے فائرہ اور پچی
کے قاتل کو ٹرک کے نیچے کچلا تھا۔ اس کے بعد اب تک
خبریت ہی گزر رہی تھی۔

”صبح ایک پُر تکلف ناشتے نے استقبال کیا۔ ویسی بھی
کے پراٹھے، انڈوں کا آلیٹ، دہی کی گاڑھی میٹھی لسی اور

توں پڑی تھیں۔ میں واضح طور پر کم صم نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو
یوں لگا کہ وہ بھی ناراضگی دکھائے گی لیکن پھر اس نے محل کا
ثبوت دیا۔ میری طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی اور بالوں
کی لٹوں کو چہرے سے ہٹا کر کان کے پیچھے اڑس لیا۔ شرم کی
سرخی نے اس کے چہرے کو ڈھانپا اور وہ تیزی سے پلٹ گئی
مگر دو چار قدم چل کر ہی رک گئی۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ
چائے تو ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ وہ دوبارہ اندر آئی اور ٹھنڈی
چائے والا کپ اٹھالیا۔

”میں اور بناتی ہوں۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”تھینک یو۔“ میں نے بھی جذباتی سرگوشی کی۔ وہ
نظریں ملائے بغیر باہر چلی گئی۔

دفعہ گاؤں کے شمالی حصے سے فائرنگ کی زوردار
آواز آئی۔ یہ آٹومینک رائفل کا برسٹ تھا۔ میرے
اندازے کے مطابق ”اے کے 47“ تھی۔ یہ خطرے کی
گھنٹی تھی۔ یہ تو ملے ہوا تھا کہ ٹھیکری پہرے دار آدمی رات
کے بعد دو تین دفعہ وقفے وقفے سے ہوائی فائر کریں گے لیکن
یہ بھی ملے تھا کہ یہ سنگل شاٹ ہوں گے۔ برسٹ کیوں چلایا
گیا تھا؟ چند سیکنڈ بعد پھر برسٹ چلا، اس آواز نے تاجور
کے گھر میں سب کو جگا دیا۔ تاجور کی والدہ حمیدہ بی بی بلند
آواز میں آیت الکرسی پڑھنے لگیں، بچے بھی سہم گئے۔ تاجور
کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں کہا کہ
میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔

”نہیں کوئی لوڑ نہیں۔“ دین محمد نے مجھے سختی سے منع
کر دیا اور دروازے کی کنڈیاں چیک کرنے لگے۔

لوہے کا یہ دروازہ انہوں نے شاید کل ہی لگوا یا تھا،
اس سے پہلے گھر کا داخلی دروازہ لکڑی کا تھا۔

دو برسٹ چلنے کے بعد فائرنگ تھم گئی۔ دین محمد کے
اڑوس پڑوس والوں نے اب ان کا بائیکاٹ ختم کر دیا تھا اور
بات چیت بحال ہو گئی تھی۔ ساتھ والے پڑوسی کی آواز آئی
تو دین محمد نے بلند آواز میں پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے بشیر محمد؟“
بشیر محمد نے بھی پکار کر کہا۔ ”اللہ نے خیر کی ہے بھائی
جی۔ کوئی ایسی ڈر والی گل نہیں۔ کوئی مشکوک بندہ تھا۔
فائرنگ کے بعد بھاگ گیا ہے۔ تین چار لڑکے اس کے پیچھے
گئے ہیں۔“

میں اور دین محمد بھی دروازے کی طرف بڑھے۔
میری نگاہیں ایک لمحے کے لیے تاجور کی نگاہوں سے
ٹکرائیں۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں التجا کر رہی تھی کہ
میں گھر سے باہر نہ جاؤں، وہ میری موجودگی میں خود کو اور

بادام کا حلہ۔ میں نے اسفند کو اپنے ہاتھ سے لقمے دیے۔ وہ بہت خوش تھا۔ پانی کی موٹر پھر خراب تھی، وہ میں نے ٹھیک کر دی۔ ایک استری ٹھیک کی۔ لوہے کے نئے دروازے کو بند کرنے میں مشکل پیش آتی تھی۔ اسے بھی فیکس کیا۔ مجھے لگا کہ میں دین محمد صاحب اور ان کے گھر والوں کی ضرورت جتا جا رہا ہوں۔ یہ میرے لیے بڑی خوش آئند بات تھی۔

سارا دن عجیب سی ترمک میں گزرا۔ میں نے خود کو کسی کھنڈرے لڑکے کی طرح محسوس کیا۔ جی چاہا ہوا میں چھلانگیں لگاؤں۔ اپنے دونوں بازو پھیلاؤں اور کھیتوں کھلیانوں کے درمیان بھاگتا چلا جاؤں۔ پھر کسی ویران جگہ پہنچ کر کھڑا ہو جاؤں۔ اپنا چہرہ شفاف نیلے آسمان کی طرف اٹھاؤں اور پکار کر کہوں۔ ”تیرا شکر یہ یارب، مجھے وہ مل گیا جو میں نے چاہا تھا۔ میں نے اسے پالیا، جسے ان گنت زمانوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ مجھے مل گئی ہے اور اس کے دل میں میرے لیے گنجائش بھی موجود ہے۔ تیری کرم نوازی شامل حال رہی تو میں گنجائش کو محبت میں بدل دوں گا میرے مالک۔۔۔

زندگی میں پہلی بار مجھے خدا کے وجود کا احساس اتنی شدت سے ہوا اور اس سے مانگنے کو بھی اتنی شدت سے دل چاہا۔ رات ہوئی تو میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میں اپنی تاجور کو اور اس کے گاؤں کو ذمیت سجاول کے خوف سے آزاد کر دوں گا جس طرح عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کے جبر کے سائے اس کے سر پر سے سٹے ہیں، سجاول کا سایہ بھی سمٹ جائے گا۔۔۔ ناپید ہو جائے گا۔

میں وہ ٹھکانا اچھی طرح دیکھ چکا تھا جہاں چند دن پہلے سجاول اور عالمگیر نے رقص و سرور کی بے ہودہ محفل جمائی تھی۔ میں نے رات کا کھانا کھانے کے بعد انق سے کہا۔ ”آج پھر ایک مہم پر نکل رہا ہوں۔“

”کس مہم پر؟“ انق نے چونک کر پوچھا۔

”اس ٹھکانے کی طرف جہاں میں نے سجاول اور عالمگیر کو دیکھا تھا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے، وہ اب بھی وہاں محفل جما کر بیٹھے ہوں گے اور آپ کا یا پولیس کا انتظار کر رہے ہوں گے؟“

”لیکن کوئی چانس تو بن سکتا ہے نا، ہو سکتا ہے کوئی کھوج کھرا مل جائے۔“

”میرا خیال ہے کہ میرا کچھ کہنا سنا فضول ہے، آپ

پکا ارادہ کر چکے ہیں۔ لیکن ایک ہفتہ میری بھی مان لیں۔ اس خاکسار کو کچھ بھی ساتھ لے چلیں۔ کبھی کبھی کھونا سکھ بھی کام آجاتا ہے۔“

”تم کھونے نہیں ہو، اس لیے تو سنبھال سنبھال کر رکھ رہا ہوں، کہیں ضائع نہ ہو جاؤ۔“

وہ اصرار کرنے لگا کہ ساتھ جائے گا۔ میں چونکا اپنے پوشیدہ روپ میں لٹکنا چاہتا تھا، اس لیے انق کی بات نہیں مانی۔ میں نے پتلون نکالی، ڈھانٹا نکالا، جیکٹ الٹ کر پہنی اور دیگر تیاری کر کے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ وہی روپ تھا جس میں مقامی لوگ مجھے یا سر سمجھنے لگے تھے۔ حق نواز کے بھائی کی کھناراموٹر سائیکل آج پھر میری ہمسفر بننے والی تھی۔ اسپاکی کیمرہ، ڈکٹا فون، بے ہوشی کا اسپرے اور اس طرح کی دیگر اشیاء میری جیکٹ کی اندونی جیب میں یوں سما جاتی تھیں کہ آسانی سے ان کا کھوج نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ جب ٹھیکری پہرے والے گاؤں کی دوسری جانب تھے میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے نکل کھڑا ہوا۔ سردرات میں اونچے نیچے راستوں پر موٹر سائیکل کا سفر آسان کام نہیں ہوتا، پھر جب یہ خطرہ بھی ہو کہ کسی بھی وقت کسی نادیدہ دشمن سے ملاقات ہو سکتی ہے تو صورت حال اور کبھیر ہو جاتی ہے۔ قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں ڈیرے کے قرب و جوار میں پہنچ گیا۔ اس مرتبہ میں نے موٹر سائیکل کافی فاصلے پر ہی روک دی اور اسے درختوں کے جھنڈ میں چھپا کر پیدل آگے بڑھا۔ میری جیکٹ کی جیب میں اعشاریہ 38 کا سلی بخش بوجھ موجود تھا۔ ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے میری حسیات پوری طرح بیدار تھیں۔

انق کی بات کی بازگشت میرے کانوں میں گونجی۔ اس نے کہا تھا۔ ”یہ ہو سکتا ہے جی کہ سجاول اور اس کے ساتھی اس ڈیرے پر تو نہ ہوں لیکن ان کے ایک دو بندے چھپ کر ڈیرے کی نگرانی کر رہے ہوں۔ انہیں توقع ہو کہ ان کی تصویریں کھینچنے والا پھر وہاں پہنچے گا اور کیا پتا پولیس نے بھی سادہ کپڑوں میں اپنا کوئی تجربہ وہاں چھوڑ رکھا ہو۔“

انق کی کہی ہوئی بات میں وزن تھا۔ اسی لیے میں ضرورت سے زیادہ محتاط بھی تھا لیکن اگلے آدمے گھٹنے میں میرے یہ سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ یہ ٹھکانا بالکل خالی تھا، ارد گرد بھی کسی کے آثار نہیں تھے۔ عین ممکن تھا کہ پولیس والوں نے دو چار روز اس جگہ کی نگرانی کی ہو لیکن اب اس ٹھٹھرے ہوئے ویرانے میں ان کا بھی کوئی

وجود نہیں تھا۔ میرے پاس پنسل ٹارچ موجود تھی لیکن میں نے وہ بھی روشن نہیں کی۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں چند روز پہلے رقص و سرور کی محفل برپا تھی۔ وہاں اب بھی شراب کے ٹوٹے ہوئے گلاس، چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور مرجھائے ہوئے گجرے پڑے تھے۔ آدم نہ آدم زاد۔ میرے کانوں میں اس شب کی بدست آوازیں گونجنے لگیں۔ گھٹکروؤں کی جھنکار، شیشے کی کھٹا کھن، سرشار قہقہے... اور رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا۔ جب نشہ چھائے گا، تب مزہ آئے گا۔ نشہ چھا گیا تھا اور ”مزہ“ بھی آ گیا تھا۔ مزہ لینے والے جسمانی ریمانڈ پر تھے اور یہاں بس تاریکی تھی اور جھینگروں کی آواز تھی۔ میں اس جگہ کے خستہ حال کمروں میں گھومنے لگا۔ عقبی سمت میں احاطہ تھا اور آگے کھلی جگہ تھی۔ یہاں گھنی جھاڑیاں تھیں اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے بھی تھے۔ اچانک ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔ پہلے تو لگا کہ شاید میرے کان بجے ہیں مگر جب دوسری بار آواز ابھری تو میں چوکنا ہو گیا۔

یہ کسی عورت کے کھانسنے کی بہت دھیمی سی آواز تھی۔ میرے چہرے پر ڈھانٹا تھا۔ میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور محتاط قدموں سے آواز کی طرف بڑھا۔ آواز ایک جھاڑی کے عقب سے ابھری تھی۔ بلکہ یہ جھاڑی بھی نہیں تھی، بس جھاڑ جھنکاڑ ہی تھا۔ یہاں کوئی چھپ تو نہیں سکتا تھا مگر جب ذرا دھیان سے دیکھا تو پتا چلا کہ کچے ٹیلے کے اندر یہ ایک کھوہ سی ہے۔ ویران ٹیلوں میں ایسے قدرتی خلا اکثر موجود ہوتے ہیں۔ یہ آواز بھی اسی خلا کے اندر سے ابھری تھی۔ میں جھاڑ جھنکاڑ میں سے گزر کر اس چھوٹی سی کھوہ کے دہانے پر پہنچا۔

”کون ہے؟“ میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ”تم جو کوئی بھی ہو، باہر آ جاؤ۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے، کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تمہارا نقصان ہو جائے گا۔“

جواب میں پھر خاموشی طاری رہی۔ بس جھینگروں کی آوازیں تھیں۔

میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے پنسل ٹارچ روشن کی اور پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھ کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے کے لیے مجھے گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلنا پڑا۔ یکا یک پنسل ٹارچ کی روشنی کسی عورت کے ننگے پاؤں پر پڑی۔ میں نے ٹارچ کو حرکت دی اور ایک سکڑی سمٹی

اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور گھکیائی۔ ”مجھے کچھ نہ کہنا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔“

میں اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ وہی ماڈل گرل جاناں تھی جسے میں نے چند روز پہلے سامنے والے کھنڈر گھر میں رقص کرتے دیکھا تھا۔ اس بے پہلے جاناں سے میری ملاقات لاہور میں پیلے جسم والے پاشا کی عالی شان کوٹھی میں ہوئی تھی۔ وہاں بھی یہ بے چاری بہ حالت مجبوری پاشا کا بیڈروم آباد کر رہی تھی۔

میرا چہرہ ڈھانٹے میں چھپا ہوا تھا۔ کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان سکتی، میری آواز کے ساتھ بھی اس کی جان پہچان معمولی سی تھی۔

میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کی خوب صورت آنکھوں کی دہشت میں اضافہ ہوا۔ وہ یقیناً مجھے سجاوٹ سیالکوٹی کا کوئی ساتھی ہی سمجھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ اب تک جوڑ رکھے تھے۔ لمبی لہجے میں بولی۔ ”مم... میرا کوئی قصور نہیں۔ جو کچھ ہوا، اس کی وجہ سے ہوا... وہ... اپنے ہوش میں ہی نہیں تھا۔“

مجھ سے ڈر کر وہ پہلو کے بل گر گئی تھی اور گھٹری کی طرح بالکل ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی۔ ”سیدھی ہو کر بیٹھو۔“ میں نے ذرا جھکم سے کہا۔ وہ لرز کر سیدھی ہو گئی۔ ”تت... تم جو کہو گے، میں مانوں گی... اس کو پیچھے ہٹالو۔“ اس کا اشارہ میرے پستول کی طرف تھا۔

میں نے پستول کی ٹال نیچے جھکانے سے پہلے احتیاط سے دیکھا، اس کے پاس کوئی ہتھیار یا آلہ نہیں تھا۔ کھوہ میں کسی دوسرے شخص کے آثار بھی نہیں تھے۔ میں نے ٹریگر پر سے انگلی ہٹالی اور بیرل نیچے جھکا لیا۔

”تم نے کیا سمجھا تھا، اس طرح ہنسی رہو گی۔“ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

”مم... میں کیا کرتی۔ وہ بالکل ہوش میں نہیں تھا۔ مم... مجھے لگ رہا تھا میرا دل رک جائے گا۔ وہ مجھے مار بھی رہا تھا۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے اس کے سر پر بوتل ماری...“

جاناں کی باتوں سے میرے اندازے کی تصدیق ہوئی۔ یہ سب کچھ اسی رات ہوا تھا جب یہاں رقص و سرور اور شباب و کباب کی محفل جلی تھی۔ یہاں کل تین لڑکیاں تھیں اور یہ محفل اہم شرکاء کی رات کو رجمین کرنے کے لیے

لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں بہت تھک گئی ہوں... بہت تھک گئی ہوں۔ میں اب اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میری مدد کرو... پلیز میری مدد کرو۔" وہ سسکیاں لینے لگی۔

مجھے اس پر بے تحاشا ترس آیا۔ وہ اپنی شال کو بار بار مضبوطی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹتی تھی۔ جیسے میرے اور اپنے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنا چاہ رہی ہو لیکن ایسی "دیواریں" بے بس عورتوں کا ساتھ کب دیتی ہیں۔ جلد ہی مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اس بے چاری کے بالائی جسم پر اس شال کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کپڑے کا ایک تار بھی نہیں اور وہ سخت سرد راتوں میں اسی ایک شال کے ساتھ... اور پانی میں نان بھگو بھگو کر زندہ رہنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ میرا دل چاہا، اس اجڑی پجڑی لڑکی کو پکڑوں اور لاہور جا کر اسے سیدھا کسی ٹی وی چینل پر لے جاؤں۔ اپنے ملک کی ہزار ہا نوجوان لڑکیوں کو اس "جاناں" کی کہانی سناؤں۔ انہیں بتاؤں کہ "شوہر" میں نام کمانے کے شوق میں جو لڑکیاں گھروں سے نکلتی ہیں اور بے مہار ہوتی ہیں، وہ بھی کبھی کبھی کس انجام کو پہنچتی ہیں۔

جاناں مجھے کافی کچھ بتا رہی تھی لیکن کافی کچھ چھپا بھی رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے ابھی تک ڈکیت سجاد کا ساتھ ہی سمجھ رہی تھی۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنا پستول لاک کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی جیکٹ اتاری اور قمیص بھی اتارنے لگا۔ جانناں کی آنکھوں میں خوف کچھ اور بڑھ گیا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "گلتا ہے کہ تم نے شال کے سوا اور کچھ نہیں پہنا ہوا۔ کم از کم یہ قمیص اور بنیان پہن لو۔ میں دو منٹ کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ یقیناً یہاں لانے والے کسی بھی شخص نے اسے کچھ پہننے کے لیے نہیں کہا ہوگا۔ ہر ایک نے اس کے برعکس ہی بات کی ہوگی۔

قمیص اور بنیان اسے دیے کر میں باہر نکل گیا۔ ٹارچ بھی میں نے اندر ہی چھوڑ دی تھی۔ دو تین منٹ بعد واپس آیا تو وہ میری ہدایت پر عمل کر چکی تھی۔

میں نے کہا۔ "تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے جانناں! میرا تعلق سجاد و غیرہ سے نہیں، مجھ کو کہ میں ایک قریبی آبادی سے آیا ہوں۔"

پہلے تو اسے بھروسہ نہیں ہوا لیکن جب میں نے اپنی بات اصرار کے ساتھ کہی تو وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی بولی۔

تھیں۔ ان شرکاء میں سے کوئی ایک شخص زیادہ ہی مدہوش تھا۔ پہلے سے ٹھکی ماندی جاناں کی برداشت جواب دے گئی اور اس نے اس مدہوش شخص کو دھسکی کی بڑی بوتل مار کر زخمی کر دیا۔ اس کے بعد وہ بھاگ نکلی اور یہاں چھپ گئی۔

میں نے ٹارچ کی روشنی میں جاناں کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ بے بس و بد حالی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس نے ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ بالائی جسم ایک شال سے چھپا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر اس وحشت کے نشان تھے جو اس منحوس رات میں ان بد معاشوں نے اس لڑکی کے ساتھ روا رکھی تھی۔

میں نے جاناں سے کہا۔ "بڑی کڑک لڑکی ہو تم، آٹھ دن ہو گئے ہیں، اور تم نے خود کو یہاں چھپا رکھا ہے، کھاتی پیتی کیا رہی ہو؟"

"میں وہاں کمروں میں گئی تھی۔ کچھ سوکھے ہوئے نان ملے تھے اور تھوڑا سا پانی۔ نانوں کے ٹکڑے پانی میں بھگو بھگو کر کھاتی رہی ہوں۔"

میں نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دی۔ ایک گوشے میں اسٹیل کا ایک جگ پڑا تھا۔ پاس ہی ایک شاپر میں سوکھے ہوئے نان کے ٹکڑے تھے۔

"پولیس والے بھی تو پھرتے رہے ہیں یہاں، انہوں نے بھی تمہیں نہیں دیکھا؟"

وہ پہلو بدل کر بولی۔ "شروع کے دو تین دنوں میں، میں نے گاڑیوں کی آدازیں سنی تھیں۔ ایک دو بار پولیس کی گاڑی والا سائرن بھی سنائی دیا تھا مگر اس طرف تو کوئی نہیں آیا۔"

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ باہر نکل کر پولیس کی مدد مانگو؟"

"مجھے ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ یہ پولیس والے ہی ہیں یا کوئی اور ہے۔ پھر پولیس والوں میں بھی تو اچھے برے ہیں... وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اسے لاہور کے واقعات یاد آ گئے ہوں۔ جب وہ اپنے ایک "گا ہک" کے ساتھ تھی اور پکڑی گئی تھی پھر قیصر چودھری جیسے بے لگام انسپکٹر نے اسے ایسا پھنسا یا تھا کہ وہ بلا معاوضہ پاشا جیسے بندے کی رکھیل بننے پر مجبور ہو گئی تھی اور اب یقیناً پاشا کے ذریعے ہی در بدر ہوتی پھر رہی تھی۔

"تو کیا، اب تمہارا ارادہ مستقل طور پر یہیں رہنے کا تھا؟" میں نے ذرا چستے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"نن... نہیں... میں اب یہاں سے نکلنا چاہتی تھی

تھی اور مجھے تو لگتا تھا کہ اس کا نمبر بھی وہی ہے، یہ ایک معما سا لگتا تھا۔ ایسی تباہ حال گاڑیوں کو تو اسکرپ وائلے ہی قبول کرتے ہیں پھر وہ گاڑی یہاں صبح سالم حالت میں کیسے موجود تھی؟

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولی۔ ”میں نے تمہیں اپنے بارے میں اتنا کچھ بتایا ہے لیکن تم نے ابھی نام تک نہیں بتایا۔“

میں نے کہا۔ ”نام میں کچھ نہیں رکھا ہوتا۔ اصل چیز تو کام ہوتا ہے اور مجھے امید ہے کہ میرا کام تمہیں پسند آئے گا۔ میں تمہیں حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکالوں گا اور محفوظ ٹھکانے تک پہنچاؤں گا۔“

”پھر بھی... مجھے... نام کا تو پتا ہونا چاہیے۔“

پتا نہیں کہ میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے کہا۔ ”تم مجھے یا سر کہہ سکتی ہو۔“

”یا سر؟“ اس نے چونکے لہجے میں کہا۔

”ہاں یا سر، لیکن تم حیران کیوں ہوئی ہو؟“

اس کے چہرے پر ہچکل کے آثار تھے۔ وہ مجھے سرتاپا دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔ وہ ہٹلائی۔ ”تم وہی ہو جسے علاقے کے لوگ یا سر بھائی کہتے ہیں... اور... تم نے پچھلے ہفتے یہاں سجاول اور اس کے ساتھیوں کی تصویریں وغیرہ بھی اتاری تھیں؟“

”ہاں میں وہی ہوں۔ لیکن... یہ تصویروں کی بات تم کیوں کر رہی ہو۔ کس نے بتایا ہے تمہیں؟“

”انہی لوگوں سے پتا چلا ہے۔ تم نے ان کی تصویریں کھینچیں، ویڈیو بنائی... اور ان تصویروں اور ویڈیوز کی وجہ سے سجاول سیالکوٹی کے کسی دوست کو بہت نقصان پہنچا۔ وہ ایک جھگڑے میں ملوث ہو کر گرفتار ہو چکا ہے۔ کیا یہ سب صحیح ہے؟“

”پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ سب پتا کیسے چلا؟“

”میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ یہاں چھپنے کے بعد میں نے ڈکیت سجاول کے کسی ساتھی کو نہیں دیکھا۔ کل رات وہ اس کھوہ کے باہر گھوم رہے تھے۔ اتنے قریب تھے کہ میں ان کی رائفلوں کی کھڑکھڑ بھی سن سکتی تھی۔ قدرت نے مجھ پر خاص الخاص مہربانی کی ہے کہ میں کل رات ان کے ہتھے نہیں چڑھی۔ ورنہ پتا نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔ وہ تین یا چار بندے تھے اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے ڈھونڈنا بھی ان کے پروگرام میں شامل تھا۔ ویسے وہ اپنا کچھ اسلحہ لینے آئے تھے جو انہوں نے یہیں کہیں جھاڑیوں میں دبایا ہوا تھا پلاٹک

”تم پڑھے لکھے لگتے ہو۔ تمہاری بول چال سے مجھے کچھ شک تو ہو رہا تھا لیکن... تمہارا حلیہ؟ اور یہ پگڑی جس میں تم نے منہ چھپایا ہوا ہے؟“

”جھکو کہ سجاول اور اس کے ساتھیوں کی طرح میری بھی یہ مجبوری ہے...“

”کیا تم... میری مدد کر سکتے ہو؟“ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

”ہاں، لیکن اس صورت میں جب تم مجھے اپنے اور سجاول وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔“

”کیا بتاؤں؟“ وہ روہانسی آواز میں بولی۔

”تمہیں یہاں لانے والا کون تھا؟“

”اس کا نام پاشا ہے۔ وہ لاہور میں رہتا ہے۔ بڑا بااثر بندہ ہے۔ اس کی پہنچ اور پر تک ہے۔ میں ایک معاملے میں پھنس کر اس کے پاس چلی گئی تھی۔ اب اس کے پاس رہتی ہوں۔ وہ مجھے اپنے دوستوں اور جاننے والوں کے پاس بھی بھیجتا رہتا ہے... اب اس نے دو دوسری لڑکیوں کے ساتھ مجھے یہاں بھیجا تھا۔“

جاناں نے اپنی رام کہانی کے اکثر حصے مجھے صاف صاف سنا دیے۔ بہر حال کئی باتیں وہ چھپا بھی گئی۔ مثلاً پاشا کے اصل پشت پناہ شکیل داراب کا نام وغیرہ۔

میں نے کہا۔ ”جشن کی رات میں نے یہاں درختوں میں ایک مرسیڈیز گاڑی کھڑی دیکھی تھی سفید رنگ کی... وہ کس کی تھی؟“

وہ ذرا جھجک کر بولی۔ ”مجھے ٹھیک سے اس کا نام معلوم نہیں۔ وہ لاہور کا ایک مالدار زمیندار ہے۔ اسے ”لالہ“ بھی کہتے ہیں۔“

”لالہ وریام تو نہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں... شاید یہی ہے۔“

”کیا اس جشن کی رات وہ بھی یہاں تھا؟“

”ہاں وہ آیا تھا لیکن پینے پلانے سے اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ سونے چلا گیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی۔ یہ لالہ وریام وہی تو نہیں جس کا ایک بڑا بھائی لالہ نظام ٹریفک کے ایک حادثے میں مارا گیا تھا۔ ایک بھاری ٹرک نے اس کی مرسیڈیز کا کچھ مر نکال دیا تھا؟“

”ہاں... ہاں... یہ بات میں نے بھی سنی ہے۔“

اس رات یہاں درختوں میں دیکھی ہوئی مرسیڈیز گاڑی پھر میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ یہ ہو بہو وہی گاڑی

وغیرہ لپیٹ کر۔“

”انہوں نے اس کھوہ کے اندر نہیں جھانکا؟“ میں نے جاناں سے پوچھا۔

”اسی لیے تو کہتی ہوں کہ مجھ گناہ گار کی کوئی چھوٹی موٹی نیکی کام آئی ہے۔ وہ کھوہ کے اندر آئے۔ ان میں سے ایک بندے نے مارچ بھی گھمائی۔ پتا نہیں میں کس طرح روکنی میں آنے سے بچ گئی۔ کھوہ کے اندر آنے والا نشے میں جھومتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ لوگ یہاں پاس ہی درختوں کے نیچے آگ جلا کر بیٹھ گئے۔ وہ پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے ہی مجھے تمہارے نام کا پتا چلا اور یہ بھی پتا چلا کہ جشن والی رات تم ان کے دو بندے زخمی کر کے بھاگ گئے تھے۔۔۔“

باتیں کرتے کرتے جاناں ایک دم رک گئی۔ لرز کر بولی۔ ”اگر تم ہی یاسر بھائی ہو تو پھر ذرا سی دیر بھی نہ کرو۔ فوراً اپنے گھر پہنچو۔۔۔ فوراً پہنچو۔“

”یہ کیوں کہہ رہی ہو تم؟“

”کل میں نے جو کچھ سنا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ آج کی رات تمہارے گھر والوں پر بہت بھاری ہے۔ کیا تاخیر ہو رہی ہے تمہارے پاس۔“ وہ بیجانی انداز میں بولی۔

میں نے رسٹ واج دیکھی۔ یہ ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ میں نے اسے وقت بتایا۔ وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ ”تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”زیادہ دور نہیں۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔ مجھے اس گاؤں کا نام تو معلوم تھا جہاں یاسر کے گھر والے رہ رہے تھے لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کتنے فاصلے پر ہے۔ وہ کراہی۔ ”تم مجھے بھلے آدمی لگے ہو۔ وقت ضائع نہ کرو۔ اپنے گھر والوں کی خبر لو۔ اگر پولیس کی مدد حاصل کر سکتے ہو تو وہ کرو۔ رات آخری پہر تمہارے گھر میں کچھ بہت گرا ہونے والا ہے۔“

اگر یاسر نامی اس شخص کے گھر والوں کے ساتھ کچھ برا ہونے والا تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ علاقے کے لوگوں نے خود ہی میری کارروائیوں کو اس یاسر نامی بندے سے منسوب کر دیا تھا۔ اب یہ بات خود ہی ہر خاص و عام تک چلی گئی تھی اور نتیجے میں یاسر کے گھر والوں کے لیے کوئی سنگین مشکل پیدا ہو رہی تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا، یہ میرے لیے کسی طور قابل قبول نہیں تھا۔

اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں فیصلہ ہو گیا۔ میں جاناں کو لے کر اس ویران جگہ سے نکل آیا۔ پستول میں نے ہاتھ میں

لے لیا تھا اور ہر صورت حال کے لیے بالکل تیار تھا۔ چند منٹ بعد ہم موٹر سائیکل تک پہنچ گئے۔ میں نے موٹر سائیکل میں چابی لگائی اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کوئی آس پاس موجود ہے۔

میں نے جاناں کو گردن سے پکڑا اور نہایت تیزی سے نیچے جھکا دیا، خود میں بھی جھک گیا تھا۔ ہمارا یوں جھکنا ہم دونوں کی زندگی کی ضمانت بن گیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک شعلہ سا ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ جاناں کے چلانے کی آواز دور تک گونجی تھی۔ میں نے جوابی فائر کیا۔ گولی مد مقابل کے سینے میں لگی اور وہ سرکٹوں میں گر کر اوجھل ہو گیا۔

تب ایک شخص پہلو سے حملہ آور ہوا۔ میں نے بھانپ لیا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار آلہ ہے۔ میں تڑپ کر پیچھے ہٹا اور جاقو کا وار مجھے چھوتا ہوا لکل گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے پچھلی مرتبہ ہوا تھا اور میری جیکٹ پر کئی انچ لمبا کٹ آ گیا تھا۔ میں نے مد مقابل کے سینے پر لات رسید کی۔ وہ دور تک لڑھک گیا۔ غیر متوقع طور پر دوبارہ میری طرف آنے کے بجائے اس نے سرکٹوں میں گھس کر دوڑ لگا دی۔

میں اپنا ڈھانٹا مضبوطی سے باندھتا تھا اور مزید احتیاط کے طور پر سیٹھی پنیں بھی لگاتا تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیسے ڈھانٹا کا ایک پلوٹنگ گیا اور وہ کھلتے کھلتے بچا۔ میں نے اسے دوبارہ درست کیا اور زخمی تک پہنچا۔ وہ چپٹ لیٹا تھا اور ختم ہو چکا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ دیہاتی لباس کے بجائے پتلون اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس کا حلیہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ سجادول سیالکوٹی کے ساتھیوں میں سے ہے۔ میں نے اس کی جھینیں ٹٹولیں، جیبوں سے ملنے والی سب سے اہم شے کسی گاڑی کی چابی تھی۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی ایک پک اپ نظر آئی۔ یہ چابی اسی سیاہ پک اپ کی تھی۔ یہاں دو فائر ہو چکے تھے، اب یہ جگہ رکنے کے لیے بالکل بھی مناسب نہیں تھی۔ میں نے پک اپ کا عقبی دروازہ کھول کر موٹر سائیکل کو پک اپ پر چڑھایا۔ ہلاک ہونے والے ڈکیت کا مشین پٹل اٹھا کر ڈیش بورڈ میں رکھا۔ جاناں کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور پک اپ کو حتی الامکان رفتار سے چاند گڑھی کی طرف دوڑا دیا۔

یہ بات تو مجھے تاجور سے معلوم ہو گئی تھی کہ یاسر کے مفرور ہونے کے کچھ عرصے بعد یاسر کے گھر والے بھی چاند

انگارے ہی مجھے احساس ہوا کہ یہاں کوئی سنگین گڑبڑ ہو چکی ہے۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اس کے باوجود لوگ ٹولیوں میں یہاں وہاں کھڑے تھے۔ تین چار گھڑسوار افراتفری کے عالم میں گھوڑے بھگاتے میرے سامنے سے گزرے۔ میں نے پک اپ روک کر ایک ہر اس شخص سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ ڈھائی دینے والے انداز میں بولا۔ ”سیالکوٹی کے لوگ اماں برکتے کی بیٹی کو اٹھا کر لے گئے۔ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے، کوئی ان کو پکڑے۔“

میں نے پک اپ کی ہیڈ لائٹس میں دیکھا کچھ فاصلے پر ایک عورت بے حس و حرکت زمین پر پڑی تھی۔ اس کے سر کے بال اور کپڑے خون اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ یاسر کی والدہ ہی تھی۔ اس نے آخر وقت تک بیٹی کو بچانے کی کوشش کی تھی اور اس کے ساتھ گھسٹی ہوئی گاؤں کے چوراہے تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں ڈاکوؤں نے اس کے سر پر بندوقوں کے بٹ مارے تھے اور اسے نیم جان کر کے چھوڑ گئے تھے۔

اتنے میں تین چار مزید افراد پک اپ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہ تذبذب کے عالم میں میری طرف دیکھ رہے

گھڑی سے نکل کر پاس والے گاؤں میں چلے گئے تھے۔ اس گاؤں کا نام اس نے ”ٹیپل والی“ بتایا تھا۔ جاناں جو کچھ بتا رہی تھی اگر وہ درست تھا تو پھر مجھے جلد از جلد اس ”ٹیپل والی“ گاؤں پہنچنا تھا۔

ہم نے ایک جگہ رک کر ٹیپل والی کا راستہ ایک کھیت مزدور سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ہم بمشکل ڈھائی تین کلو میٹر دور ہیں۔ جاناں بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس نے مری مری آواز میں کہا۔ ”یاسر! آپ مجھے یہیں کہیں اتار دیں، مجھ میں اب اور سہنے کی ہمت نہیں ہے۔ میں اب اس جگہ سے نکل جانا چاہتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ٹیپل والی اور وہاں کی صورت حال سے بہت دور رکھوں گا۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ مجھے تمہیں کہاں اتارنا ہے۔“

☆☆☆

قریباً دس منٹ بعد میں پک اپ ڈرائیو کرتا ہوا، طوفانی رفتار سے ”ٹیپل والی“ گاؤں میں داخل ہوا۔ جاناں اب میرے ساتھ نہیں تھی۔ میرے پیچھے تاریک گلیوں میں گرد کا بادل اٹھ رہا تھا اور آوارہ کتوں کی ٹولیاں میرے پیچھے لپک رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں، گاؤں میں داخل ہوتے

قراض
ہماری زندگی پھر ہمارا ہی حق نہیں بلکہ کچھ لوگوں کا قرض بھی ہوتا ہے جسے انکرہی دل کا بوجھ ہکا ہوتا ہے..... آخری صفحات پر **عمر عبداللہ** کی سوغات

خدنگ عثمانی
تاریخ کے گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے صفحات کا دلکش انداز..... **الیاس سیتاپوری** کے قلم کا سحر

شیش محل
دنیا کو فتح کرنے کے زعم میں خود کو ہار جانے والی ایک دو شیرہ کی دلخراش داستان..... **اسما قادری** کے قلم کی روانی

ماروی
محبت کا پیغام دینے والے محبوب کا ایک دلربا انداز..... **محی الدین نواب** کے خیالات کی بلند پرواز

دسمبر 2015ء جاتے سال کا آخری تحفہ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ



مزید

ملکہ شہزادہ کی تفتیش
محفل شعر و سخن
اور آپ کے خط

طاہر جاوید مغل، تنویر ریاض، کاشف ذبیر، علی اختر،
ڈاکٹر شیر شاہ سید اور سلیم انور کی خوبصورت تجاریر

اس کے علاوہ

To Download Sipense Visit
Paksociety.com

www.pdfbooksfree.pk

READING
Section

تھے۔ میں نے کہا۔ ”کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ وہ لوگ کس طرف گئے ہیں؟“

لبی داڑھی اور روشن چہرے والا ایک درمیانی عمر کا شخص تیزی سے پک اپ میں داخل ہو گیا۔ ”مجھے پتا ہے وہ کس طرف گئے ہوں گے۔“ اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

میں نے دیکھا، اس شخص نے کندھے سے ہولسٹرنا رکھا تھا۔ ”تم کون ہو؟“ میں نے اس سے دریافت کیا۔

”امام مسجد کا بھائی ہوں... اور تم؟“

”ایک ہمدرد ہی سمجھو۔ عزت سب کی سامجھی ہوتی ہے۔“ میں نے بھاری آواز میں مختصر جواب دیا۔

”یہاں سے دائیں موڑو۔“ باریش شخص نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

میں نے پک اپ کو نشیب میں ایک سخت نامہوار راستے پر اتار دیا۔ مجھے ارد گرد کھیتوں.... اور درختوں میں جگنو سے چمکتے نظر آرہے تھے۔ یہ گاؤں کے وہ مسلح لوگ تھے جو دو تین ٹولیوں کی صورت میں اغوا کنندگان کے پیچھے گئے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے ہوائی فائر بھی کر رہے تھے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ باریش شخص نے ایک نہایت مشکل راستہ اختیار کیا ہے مگر یہ شارٹ کٹ بھی ہے۔ ایک دو جگہ تو یوں لگا کہ کھلی چھت والی یہ پک اپ الٹ ہی جائے گی۔ بہر حال میں کسی نہ کسی طور اسے سنبھالنے میں کامیاب رہا۔

باریش شخص اغوا کنندگان کے خلاف غصے سے بھرا ہوا تھا اور انہیں بے نقط ستارہا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ”اب یہ علاقہ تو شریف لوگوں کے رہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ چاند گڑھی میں خون خرابے کے بعد اب یہاں بھی یہی کچھ ہونے لگا ہے۔“

وہ بار بار اپنے موبائل فون پر پولیس چوکی کا نمبر ملانے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن وہاں سے وہی جانا پہچانا جواب مل رہا تھا۔ مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔

باریش شخص گلوگیر آواز میں بولا۔ ”یہ سب کچھ سمجھ سے باہر ہے۔ آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد تو لگتا ہے کہ بہت سے لوگ گاؤں چھوڑنا شروع ہو جائیں گے۔“

بات کرتے کرتے اس نے ایک بار پھر مجھے دھیان سے دیکھا۔ میرا منہ سر ڈھانٹے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ ”کہیں تم... کہیں تم... یا سر کے کوئی دوست تو نہیں ہو؟“

”کون یا سر؟“ میں نے انجان لہجے میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا۔ دور نشیب میں دوسرخ روشنیاں دیکھ کر ہم ٹھٹک گئے۔ میں نے پک اپ کی لائٹس آف کر کے رفتار دھیمی کر دی۔ باریش شخص نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ یہ وہی ہیں۔ شاید ان کی جیب کہیں رک گئی ہے یا پھنس گئی ہے۔“

ہم پک اپ کی بجھی ہوئی لائٹس کے ساتھ ہی تقریباً پچاس میٹر آگے گئے اور پھر اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ اس وقت جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی جب دو تین بار کسی لڑکی کے چلانے کی بہت مدھم سی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے پک اپ کا انجن بھی بند کر دیا۔ ڈیش بورڈ سے مشین پستل نکال کر میں باہر نکل آیا۔ میرے اندر وہی آگ بھڑک چکی تھی جو مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کرتی تھی۔ سینے میں دھڑکن کا نقارہ پوری شدت سے گونج رہا تھا۔ وہی میٹھا میٹھا درد جو ہر فائٹر کے جسم میں، میدان میں اترنے سے قبل جاگتا ہے۔ باریش شخص نے بھی پستول اپنے ہولسٹر میں سے نکال لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ابھی تک اپنے موبائل فون کے ذریعے چوکی کا نمبر ملانے کی ناکام کوشش بھی کر رہا تھا۔

اب ہم جیب کے اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ جیب سواروں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں اور انجن کا شور بھی۔ انجن کے شور اور شور کے اتار چڑھاؤ سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ جیب واقعی کہیں پھنسی ہوئی ہے۔

میں جانتا تھا، اب خطرناک ترین مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ میں نے باریش شخص سے کہا۔ ”آپ آگے جانا چاہتے ہو یا یہیں رکنا چاہتے ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ پیچھے جاؤ اور لوگوں کو بلاؤ۔“

اس سے پہلے کہ باریش شخص کوئی جواب دیتا، اس کے سر پر قیامت ٹوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گرا۔ اس کے ساتھ ہی کڑک دار آوازیں آئیں۔ ”خبردار اسلحہ نیچے رکھو... گولی مار دیں گے... نیچے رکھو اسلحہ۔“

وہ لوگ نظر نہیں آرہے تھے اور یہی چیز سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ مارشل آرٹ کی تربیت کی الف ب بھی یہی ہے کہ نادیدہ دشمن کے وار سے بچنا چاہیے...

میرے قیافے کے مطابق ان کی تعداد تین سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک تو وہ تھا جو میرے سامنے کوچوٹ لگا کر واپس درختوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا اور اس کے دو ساتھی مزید ہو سکتے تھے۔ مشین پستل نیچے پھینکنے کے سوا میرے پاس چارہ نہیں تھا۔ میرے باریش ساتھی کا پستول خود بخود

انکار

بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ ”مٹیل والی“ کا باریش شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔

میرے عقب میں کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ وہ لوگ تین طرف سے میرے قریب آ رہے تھے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ فائر کیوں نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ انہیں تلاش کرنے والے آس پاس انہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ بڑی تعداد میں ہیں۔ اگر یہاں فائرنگ ہو جاتی تو وہ فوراً اس طرف متوجہ ہو جاتے۔

وہ اپنی طرف سے احتیاط برت رہے تھے لیکن یہ احتیاط انہیں بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔ اپنی لاعلمی کے سبب انہوں نے دست بدست لڑائی لڑنے کے لیے ایک نہایت غلط شخص کو چن لیا تھا۔ یہ کون لوگ تھے؟ یہ جو بھی تھے لیکن ان کے ڈانڈے لالہ دریا اور لالہ نظام سے مل رہے تھے اور یہی لالے تھے جو میری چچا زاد فائزہ اور چچی آمنہ کے سفاک قتل میں براہ راست ملوث تھے۔ (نوجوان سیاست دان شکیل داراب براہ راست اس دہرے قتل کا ذمہ دار نہیں تھا)

فائزہ اور چچی آمنہ کی موت کے دلدوز مناظر یاد آئے تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے گھری ہوئی اس ویران جگہ پر اگلے تین چار منٹ میں ایک خوفناک لڑائی ہوئی۔ میرے مقابل پانچ افراد تھے اور یہ پانچوں بے رحم اور خونخوار قسم کے لڑاکے تھے۔ وہ مسلح ہونے کی وجہ سے مجھ پر غالب آ سکتے تھے لیکن ان کی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ فائر کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ میں نے انہیں مارا ہی نہیں، حیرت زدہ بھی کر دیا۔ پہلے دو منٹ کے اندر ہی ان میں سے ایک شخص کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور دو۔۔۔ بڑی طرح زخمی ہو گئے۔ ایک شخص کی آنکھوں میں خون اس طرح بھر گیا تھا کہ وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

جب میرے ہاتھ ایک کلبھاری آگئی تو وہ سمجھ گئے کہ اب فائر کیے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن اب ان کے لیے دیر ہو چکی تھی۔ سرغنہ نے مجھے گولی مارنے کے لیے اپنی سیون ایم ایم رائفل سیدھی کی تو کلبھاری کے زوردار وارنے اس کا ہاتھ کلائی پر سے اس طرح کاٹا کہ وہ قریب قریب علیحدہ ہو گیا۔ دوسرے شخص کے فائر کرنے سے پہلے ہی میں جھک گیا تھا۔ پٹھلا ہوا سیبہ موت کی سرگوشی سنا تا میرے سر پر سے گزرا اور گڑھے میں پھنسی ہوئی لینڈ روور جیب کے ٹائر میں لگا۔ ٹائر ایک بلند دھماکے سے برست ہو گیا۔ میں نے فائر کرنے

اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ان لوگوں نے ہمیں گن پوائنٹس پر لیا اور بڑی احتیاط سے چلاتے ہوئے موقع پر لے آئے۔ وہ تین نہیں دو تھے لیکن اپنے کام میں ایک دم ماسٹر تھے۔ ہم موقع پر پہنچے تو نقشہ ہماری توقع کے مطابق تھا۔ بڑے سائز کی لینڈ روور جیب بائیں طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پہتیا بری طرح کیچرز آلود کھڈے میں دھنسا ہوا تھا۔ پہتیا گھومنے سے جو جھینٹے اڑے تھے انہوں نے جیب سواروں کے کپڑے داغ دار کر رکھے تھے۔ یہ کل چھ افراد تھے۔ دو کے پاس کلبھاریاں تھیں باقی آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ تین افراد نے ڈھانٹے باندھ رکھے تھے، باقی کھلے منہ تھے۔ وہ شکلوں سے ہی بدترین قاتل ڈکیت دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے گھنی مونچھوں والا ایک شخص زیادہ لمبا چوڑا تھا اور اس کے بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں آٹومینک رائفل تھی۔ میرے قیافے کے مطابق یہی اس ٹولی کا سرغنہ تھا۔

یہ قیافہ درست ثابت ہوا۔ وہ دھاڑ کر بولا۔ ”اپنا ڈھانٹا کھولو اور شکل دکھاؤ۔“ ساتھ ہی اس نے رائفل کو خطرناک انداز میں حرکت دی۔

میں ساکت کھڑا رہا۔ کہیں پاس سے لڑکی کے رونے کی کھٹی کھٹی آواز آرہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اس کے منہ میں کیڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

”میں تمہارا باپ کیا بکواس کر رہا ہوں تم سے۔ اپنا تھو بڑا دکھاؤ مجھ کو۔“

”اور اگر نہ دکھاؤ تو؟“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تیری تو۔۔۔“ اس نے گالی بکی اور رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر مجھ پر جھپٹا۔ اس سے بڑی غلطی کیا ہو سکتی تھی اور میں کسی ایسی ہی غلطی کا منتظر تھا۔

میں نے جھک کر سرغنہ کا خطرناک وار بچایا اور اس سے بغلیں ہو کر اسے اس طرح دھکیلا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ میں بھی لڑھک کر ایک جھاڑی میں گرا۔

”فائر نہ کرنا۔۔۔ فائر نہ کرنا۔“ سرغنہ چلایا۔

کلبھاری بردار خطرناک انداز میں میری طرف بڑھے۔ میں اٹنے قدموں پیچھے ہٹا چلا گیا۔ دو رائفل برداروں نے بھی اپنی رائفلیں نال کی طرف سے پکڑ لی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ اسی جگہ مار مار کر میری ہڈیوں کا سرمہ

والے پر جوابی وار کیا۔ یہ گردن پر تھا مگر اس کی کٹہنی پر لگا۔ کلبھاڑی کا تیز دھار پھل کٹی انچ تک اس کے کھوپڑے میں گھس گیا۔ میں نے کلبھاڑی باہر کھینچنے کی کوشش نہیں کی، وہ اسی طرح اس کے سر میں انگی رہی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح لمبی گھاس میں جا گرا۔ میں نے اس کی رائفل اٹھائی اور اس طرف لپکا جدھر سے لڑکی کی گھٹی گھٹی آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ وہی شخص تھا جو لڑکی کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ مجھ پر قائر کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ اس کے بھاگتے قدموں میں دہشت زدگی کی جو جھلک تھی اس نے مجھے مزہ دیا۔ یقینی بات تھی کہ اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے میرے اور اپنے پانچ چھ ساتھیوں کی لڑائی کے خونی مناظر دیکھے ہیں۔ وہ جان گیا تھا کہ میرے سامنے آنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔

لڑکی کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔ ”بچاؤ... بچاؤ۔“

میں وہاں پہنچا۔ وہ کانٹے دار جھاڑیوں میں اوندھی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ اسی کے دوپٹے سے پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ پاؤں چپل سے محروم تھے۔ میں نے چنل ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ قبول صورت تھی مگر اس وقت بے چارگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کے منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا جزدی طور پر نکل چکا تھا۔

”بچاؤ... خدا کے لیے بچاؤ۔“ وہ مجھے دیکھ کر بھی زور زور سے پکارتی رہی۔

میرے سیاہ ڈھانٹے کی وجہ سے وہ مجھے بھی اغوا کنندگان کا ساتھی ہی سمجھ رہی تھی۔ ”حوصلہ کرو، ابھی آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پلٹ کر سرغنہ کی طرف آیا۔

اس کا بٹنا ہوا ہاتھ بھیا تک انداز میں لٹک رہا تھا اور اس نے دوسرے ہاتھ سے خون آگتی کلائی دبا رکھی تھی۔ میرے دل میں ان لوگوں کے لیے ذرہ بھر رحم نہیں تھا۔ میں نے صرف چھ انچ کے فاصلے سے اس کے سر میں گولی ماری اور اسے ٹھنڈا ٹھار کر دیا۔ جس شخص کی ٹانگ ٹوٹی تھی، وہ گھسٹا ہوا ایک رائفل کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اس کی پشت پر دو قائر مار کر اسے بھی پار کر دیا۔ ایک سو رہا بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی رائفل اس کے چوڑے چکلے جسم کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ بس اس کے دستے کا ذرا سا حصہ ہی نظر آ رہا تھا۔ میں نے یہ رائفل بھی کھینچ کر اس کے پیچھے سے نکال لی۔ باقی دو افراد شدید چوٹیں کھانے کے بعد راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔

مجھے آوازوں اور روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ متلاشی لوگ ہماری طرف آرہے ہیں۔ پھر مجھے موٹر سائیکل کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ ایک نہیں دو موٹر سائیکل تھیں۔ پچانوے فیصد امکان یہی تھا کہ یہ پتھیل والی کے ہی لوگ ہوں گے۔ میں بندھی ہوئی لڑکی کے قریب رائفل بدست چوکس کھڑا تھا۔ وہ لوگ نزدیک آئے۔ ایک ایک موٹر سائیکل پر تین تین افراد سوار تھے۔ یہ پتھیل والی کے لوگ ہی تھے۔ دو کے ہاتھ میں رائفلیں بھی نظر آرہی تھیں۔ ایک موٹر سائیکل پر وہی باریش شخص بھی نظر آیا جو دلیری کا مظاہرہ کر کے میرے ساتھ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے اچھا ہی کیا تھا کہ ”میدان جنگ“ گرم ہونے سے پہلے مدد لینے کے لیے نکل گیا تھا۔

اس نے آس پاس پڑی ہوئی تین لاشوں کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ وہ لاش سب سے خوفناک منظر پیش کر رہی تھی جس کے سر میں کلبھاڑی انگی ہوئی تھی۔

”تت... تم ٹھیک ہونا بھائی صاحب؟“ باریش شخص ہکلائی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ میں نے مخصوص بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”دو بھاگ گئے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں، یہاں کا معاملہ دیکھو۔“

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، میں پک اپ پر سوار ہو چکا تھا۔ اس کا انجن ابھی تک اشارت تھا۔ میں نے دیکھا گاؤں کے لوگ ٹولیوں کی صورت میں موقع پر پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ گھوڑوں پر اور کچھ بائیکس وغیرہ پر سوار تھے۔ زیادہ تر لاشیوں اور کلبھاڑیوں سے سج تھے۔

میں زیادہ لوگوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے گیزر لگایا اور سیاہ پک اپ کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

☆☆☆

میں نے جاناں کو اسی قریبی گاؤں میں چھوڑا تھا جہاں رام بیاری اپنے بیمار شوہر وکرم کے ساتھ نقل مکانی کر کے آئی تھی۔ رام بیاری اور وکرم میرے مداح ہو چکے تھے۔ مارواڑیوں کی بڑی حماقت تھی کہ انہوں نے اپنے بچے کی موت کا ذمے دار وکرم اور اس کی بیماری کو ٹھہرایا تھا اور بے قصور میاں بیوی پر چڑھ دوڑے تھے۔ ان دونوں کو بچانے کے لیے مرحوم مولوی فدا نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

کئی دیگر لوگوں کی طرح رام بیاری اور وکرم نے بھی ابھی میری شکل نہیں دیکھی تھی مگر مجھے دیکھے بغیر ہی وہ مجھے

اپنے گھر کے فرد کی طرح محسوس کرنے لگے تھے۔ مارواڑی ذات کے لوگوں سے ڈر کر رام پیاری یہاں اپنے ماموں سیوک رام کے پاس آ چکی تھی۔ سیوک رام اور اس کی ادھیڑ عمر پتی کے سوا اس گھر میں اور کوئی نہیں تھا اور وہ دونوں بھی بھلے مانس لوگ تھے۔

پک اپ میں نے راستے میں ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں چھوڑ دی اور موٹر سائیکل اتار لی۔ میں موٹر سائیکل پر سیوک رام کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھولنے والی رام پیاری ہی تھی۔

”ہائے رام، اتنی دی لگا دی آپ نے۔ میرے من میں تو پتا نہیں کیا کیا دوسواں اٹھ رہے تھے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں... لڑکی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اس کو اپنے کپڑے دے دیے ہیں۔ نیا لحاف بھی نکال دیا ہے۔ دو تین بار بھوجن کا پوچھا ہے۔ کھائی جیتی کچھ نہیں ہے۔ بہت ڈری ہوئی ہے۔ ابھی آپ نے دروازے پر دستک دی تو بے چاری کا رنگ ہلدی ہو گیا۔“

”یہ کئی دن سے بھوکی ہے۔ سیالکوٹی کے بندوں کے ڈر سے چھپی ہوئی تھی۔ تم کھانا لاؤ۔ میں کھاتا ہوں اس کو۔“

”آپ خود بھی تو کھائیں گے نا بھائی جی؟“

”دو چار نوالے لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔

ڈھانے کا نقاب بدستور میرے منہ پر تھا۔ میں رام پیاری کے ساتھ اس کمرے میں پہنچا جہاں جاناں سکڑی سٹی لحاف کے اندر بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر اب ڈھنگ کا لباس نظر آ رہا تھا۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ ذرا سی آہٹ پر جیسے بدک اٹھتی تھی۔ رقص و سرور کی رات یقیناً اس کے ساتھ ناروا سلوک ہوا تھا۔ وہ کوئی شریف زادی نہیں تھی، مگر گوشت پوست کی زندہ انسان تو تھی جو تکلیف بھی محسوس کرتی تھی اور توہین بھی۔

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ”سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”سب ٹھیک نہیں تھا۔ مگر تم بروقت اطلاع نہ دیتیں تو کچھ بہت بُرا ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے تمہارا شکریہ۔“

”وہ... لوگ تمہارے گھر پر پہنچ گئے تھے؟“

”ہاں... پہنچ گئے تھے۔“

”مم... مجھے تفصیل بتاؤ یا سر۔“ وہ لرزاں سرگوشی میں بولی۔ (وہ اس بات پر یقین کر چکی تھی کہ میں ہی وہ پاسر ہوں جس کا نام اس نے سیالکوٹی کے ساتھیوں کی زبانی سنا

میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ پھیل والی میں کیا ہوا ہے۔ میں نے پاسر کی سگی بہن کا ذکر بھی کیا جسے وہ لوگ اٹھا کر لے جانے میں تقریباً کامیاب ہو چکے تھے۔ وہ آبدیدہ ہو گئی۔ بولی۔ ”اوپر والے نے تم پر بڑی مہربانی کی ہے یا سر کہ تمہاری بہن ان درندوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئی ہے۔“ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ”میں تمہارے بارے میں نہیں جانتی یا سر، لیکن اتنا دیکھ لیا ہے کہ تم اچھے بندے ہو، تمہاری ہمت اور دلیری میں بھی کوئی شبہ نہیں لیکن ایک... دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے تم کو میرا ایک مشورہ ہے۔“

”کیا؟“

”تم ان لوگوں سے متانہ لگاؤ۔ یہ بہت بڑا گینگ ہے۔ ان کے ٹانگے بہت آگے تک جڑے ہوئے ہیں۔ تم نے داراب فیملی کا نام سنا ہوا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے انجان ہنسنے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، رام پیاری کھانا لے کر آگئی۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ سبزی اور چاول تھے۔ مرغی کا سالن تھا۔ ساتھ میں دودھ تھا۔ رام پیاری ہماری تسلی کے لیے بولی۔ ”جھپکے کا گوشت نہیں ہے۔ ہمسائی کے گھر سے آیا ہے۔ برتن بھی بالکل صاف ستھرے ہیں۔“

ٹرے سامنے پڑی تھی۔ جاناں اور رام پیاری دونوں ہی تجسس سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ درحقیقت میرا ڈھانٹا میرے ارد گرد موجود ہر شخص کو زبردست الجھن میں مبتلا رکھتا تھا۔ شاید اب ان دونوں عورتوں کا خیال بھی یہی تھا کہ میں جب کھانا کھاؤں گا تو مجھے اپنا ڈھانٹا تھوڑا بہت نیچے کھسکانا پڑے گا اور وہ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت میری صورت دیکھنے میں کامیاب ہو جائیں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بس ایک گلاس نیم گرم دودھ پیاء اور وہ بھی اس طرح کہ ڈھانٹا کھسکانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ سب کچھ ان دونوں کے لیے تعجب خیز تھا۔

رام پیاری اپنے کراہتے اور کھانتے ہوئے شوہر کے پاس واپس چلی گئی تھی۔ وہ گھر میں پھیلی ہوئی غربت اور بیماری کے باوجود ذرق برق کپڑوں میں تھی۔ دن کے وقت وہ ہلکا سا میک اپ بھی کیے رہتی تھی۔ یہ سب کچھ وہ اپنے قریب المرگ شوہر کی شدید خواہش پر کرتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی اپنی دھرم پتی کو ہشاش بشاش

اور خوب صورت دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے اصرار کر کے جاناں کو کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ وہ واقعی فاقہ زدگی کی حالت میں تھی۔ میں نے کہا۔
”تم داراب فیملی کی بات کر رہی تھیں؟“

”یہ ایک بہت بااثر سیاسی خاندان ہے۔ ان کا بڑا عطا اللہ داراب ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو بادشاہ نہیں... بادشاہ گر ہوتے ہیں۔ کوئی بے وقوف سے بے وقوف بندہ بھی ان سے ٹکر لینے کا نہیں سوچ سکتا۔ بلکہ یہ تو دور کی بات ہے جن لوگوں کا داراب فیملی سے تعلق ہوتا ہے، کوئی ان سے بھی اونچی نیچی بات نہیں کر سکتا۔“

”کیا تم نے بھی کوئی اونچی نیچی بات کی تھی جس کی وجہ سے تمہارا یہ حال ہو رہا ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔
اس کے شفاف چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ آہ بھر کر بولی۔ ”ہمارے جیسے لوگ تو ان کے لیے کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے ان سے کیا اونچ نیچ کرنی ہوتی ہے۔ بس میری بد قسمتی کہ ایک دوست کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ گئی اور پھنس پھنسا کر یہاں تک پہنچ گئی۔“

”لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی جاناں، جن لوگوں کے پاس تم پھنسی ہوئی ہو، یعنی پاشا اور لالہ وریام وغیرہ... وہ لاہور سے اتنی دور یہاں چاند گڑھی کے آس پاس کیا کر رہے ہیں؟“

وہ بولی۔ ”اس رات میرے کانوں میں تھوڑی سی بات پڑی تھی۔ لالہ وریام نے بہت زیادہ پی ہوئی تھی اس لیے وہ سجاول وغیرہ کے ساتھ اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ بڑی بھاری آواز میں یا نہیں کر رہا تھا۔ کسی سڑک کی بات تھی جو اس علاقے میں آنے والی ہے۔ بہت بڑی سڑک ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ سڑک شروع ہو گئی تو یہاں بہت کچھ بدل جائے گا۔“

”اور کیا کہہ رہے تھے؟“

”وہ ایک دودھیات کی بات بھی کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں کی مٹی سونا بننے والی ہے۔ لالہ وریام کی یہ بات سن کر سجاول سیالکوٹی نے کہا تھا... آپ فکر ہی نہ کرو لالہ جی۔ سونے کا خزانہ آپ کا ہے اور خزانے پر جو سانپ بیٹھا ہوا ہے اسے ہٹانا ہمارا کام ہے پھر سب زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔“

سانپ، خزانہ، سونا... ان باتوں کا کیا مطلب تھا۔ یہ بات تو مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ جو لوگ حکومت میں

ہوتے ہیں یا سیاسی طور پر بہت فعال ہوتے ہیں، انہیں ترقیاتی منصوبوں کا علم پہلے سے ہو جاتا ہے اور پاکستان جیسے ملکوں میں تو بہت ہی پہلے سے ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ ان منصوبوں کے ارد گرد بڑے بڑے رقبے خرید لیتے ہیں اور بے بہا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں حیران رہ گیا... کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ خزانہ ”چاند گڑھی اور ارد گرد کے دیہات“ کی زمین کو کہا جا رہا تھا اور اس پر بیٹھے ہوئے سانپ سے مراد وہ لوگ تھے جو اس زمین کو آباد کر کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

اچانک ایک اور خیال ذہن میں آیا اور میں سنائے میں رہ گیا۔ چاند گڑھی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں رہنے والے لوگوں کو گا ہے بگا ہے سجاول سیالکوٹی کی جارحیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ ڈکیت شمال کی جانب کے ویران علاقے سے نکلتے تھے اور تباہی مچا کر واپس چلے جاتے تھے۔ علاقے کے لوگ بدول اور خوف زدہ ہو رہے تھے۔ شروع میں تو سجاول گینگ کے لوگ صرف لوٹ کھسوٹ تک محدود تھے مگر اب وہ باقاعدہ زندگیاں بھی چھین رہے تھے اور اسی پر بس نہیں، اب وہ لوگوں کو عزت آبرو کے خوف میں بھی مبتلا کر رہے تھے۔ پچھلی واردات میں انہوں نے باقاعدہ ایک لڑکی کو اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے تاجور کو بھی بمشکل ان کی پورش سے بچا پایا تھا۔

”تم کس سوچ میں کھو گئے ہو؟“ جاناں نے کہا۔

”کچھ نہیں۔ یہی سوچ رہا ہوں کہ ان لوگوں کی ہوس کی کوئی حد بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ لوگ کتنی کتنی دور مار کرتے ہیں اور اس کے بعد مزید آگے کی سوچنے لگتے ہیں۔“

”میں ان سے بہت ڈر گئی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے کہیں روپوش ہو جاؤں۔ پلیز مجھے کسی طرح اس علاقے سے کہیں نکال دو۔“

”تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔ اس وقت یہ لوگ بڑے بھڑکے ہوئے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا، ابھی دو گھنٹے پہلے ان کے کچھ بندے قتل بھی ہوئے ہیں۔ ابھی تمہارا یہاں سے ٹکنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ بے شک یہ میاں بیوی ہندو ہیں لیکن مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔“

”کتنے دن یہاں رہنا ہو گا؟“ وہ مری مری آواز میں بولی۔

”یہ حالات پر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تین چار دن میں، میں تمہیں یہاں سے نکال لوں۔“

کسی قرعہ کمرے سے وکرم کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ برآمدے کی طرف سے بکری کے میانے کی آواز بھی آتی تھی۔ یقیناً یہ وہی بکری تھی جسے کچھ دن پہلے مولوی فدا مرحوم نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ رام پیاری کے گھر پہنچایا تھا تاکہ اس کے بیمار بچے کو اچھی خوراک مل سکے۔

میں نے کمرے میں جا کر وکرم کی عیادت کی۔ وہ جوں کا توں تھا۔ اس کے بچنے کی امید کم تھی۔ بہر حال اس کی بیوی اس کے چہون کے آخری ایام کو آرام دہ بنانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

رام پیاری مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ سر پر دو پٹا درست کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے ہم دونوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ بھگوان سے پرار تھا ہے کہ آپ سکھی رہیں۔ آپ پر اور آپ کے پر یوار پر کوئی آنچ نہ آئے۔“

رام پیاری کو معلوم نہیں تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ آنچ آتے آتے رہ گئی ہے۔ یاسر کی نوجوان بہن بدترین حالات سے دوچار ہوتے ہوتے بچی ہے۔

”ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں تو؟“ وہ لجاجت سے بولی۔

”پوچھو۔“

”آپ... یاسر بھائی ہی ہیں نا...“

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“

”میں نے آپ کو بس دور سے دیکھا ہوا ہے۔ ہاں میرا پتی وکرم آپ سے دو چار بار ملا ہے۔“

”وہ کیا کہتا ہے؟“

”وہ کہتا ہے... آپ یاسر بھائی ہی ہیں۔ بس... آپ کی آواز اسے کچھ بدلی ہوئی لگتی ہے۔ آپ کی گردن پر چوٹ بھی آئی تھی نا جب آپ عالمگیر کے بندوں سے لڑے تھے؟“

”تم خود سوال کر رہی ہو اور خود ہی جواب بھی دے رہی ہو۔“

وہ گڑبڑ اسی گئی۔ ہکلا کر بولی۔ ”وکرم کی بڑی اکھٹا (خواہش) ہے کہ ایک بار آپ کی شکل دیکھے...“

”چلو دکھا دوں گا شکل بھی، لیکن اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ جو باتیں میں نے تمہیں بتائی ہیں ان کا

پورا دھیان رکھنا ہے۔ جانناں کے بارے میں بھولے سے کبھی کسی سے ذکر نہیں کرنا۔“

رام پیاری کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد میں یہاں سے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ ایک جگہ درختوں کے ایک سنان تاریک جھنڈ میں گھس کر میں نے اپنا لباس تبدیل کیا۔ شلوار میں پتلون کے نیچے ہی پہنے رکھتا تھا اور کسی وقت پتلون کے اوپر شلوار پہن لیتا تھا۔ اب بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ پتلون نیچے کر دی اور شلوار اوپر۔ جیکٹ کو الٹ کر پہن لیا اور ڈھانٹا اتار لیا۔ اب میں پھر سے گوٹے شاہ زیب کے روپ میں تھا۔ دین محمد کا ٹریکٹر ڈرائیور۔ جو بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

موٹر سائیکل پر سوار میں چاند گڑھی پہنچا تو ڈیرے پر انیق حسب معمول میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ قرعہ گاؤں پھیل والی میں سجادول سیالکوٹی کے لوگوں نے پھر واردات کی ہے اور یاسر کی بہن کو اٹھانے کی ناکام کوشش کے دوران میں کچھ افراد قتل ہو گئے ہیں۔

”آج تو بڑی دھواں دھار رات گزاری ہے آپ نے؟“ اس نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

”آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔“

”آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“

”پہلے سے زیادہ ٹھیک ہوں۔ یہاں گاؤں میں کیا پوزیشن ہے؟“

”لوگ پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عالمگیر اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد سجادول زخمی درندے کی طرح ہو گیا ہے۔ وہ ضرور مزید کارروائیاں کرے گا۔ اب بھی چودھری محمد نیاز کی بیشک میں گاؤں کے بڑے بیٹھے ہوئے ہیں اور بات چیت ہو رہی ہے۔“

اگلی صبح پورے چاند گڑھی میں رات والے واقعے کا چرچا تھا۔ عام لوگوں کے لیے یہ بڑی جوشیلی خبر تھی کہ سجادول کے لوگ یاسر کی بہن کو اٹھانے کے لیے آئے اور یاسر نے بڑے ڈرامائی انداز میں نمودار ہو کر ان کا راستہ روک لیا۔ موقع پر جو دست دست لڑائی ہوئی تھی اس کا بھی خوب چرچا تھا۔ اس لڑائی کی گواہی یقیناً امام مسجد کے باریش بھائی نے بھی دی ہوگی۔

چاند گڑھی کے لوگوں کے لیے یہ سب کچھ حیران کر

انکار

”یعنی آپ کو پتا ہی نہیں کہ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے، اور کل آپ یہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے حضرت عیسیٰ تک کی تاریخ گھول کر لی رکھی ہے۔“

یہ بحث مزید طول کھینچ سکتی تھی مگر اسی دوران میں دین محمد صاحب ڈیرے کی طرف آتے دکھائی دیے۔ سب چار پائی سے اٹھ گئے اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ میں اور انیق بھی ٹریکٹر کی طرف آ گئے۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتے ہوئے انیق نے کہا۔ ”ویسے شاہ زیب بھائی، آپ سے کچھ زیادتی نہیں ہو رہی؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”جگہ جگہ اپنی جان خطرے میں آپ ڈال رہے ہیں اور ڈنکا یا سر کے نام کانج رہا ہے۔“ وہ دیکھی آواز میں بولا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

وہ ذرا چونک کر بولا۔ ”آپ کے لیے ایک تازہ خبر کا کھوج لگایا ہے میں نے۔“

”فرماؤ۔“

”کل رات سیالکوٹی کے لوگوں نے یاسر کے گھر پر جو حملہ کیا، اس میں یاسر کی والدہ اور پھوپھی شدید زخمی ہوئی تھیں۔ آج صبح سویرے اس کی پھوپھی نے دم توڑ دیا ہے۔ ابھی دوپہر سے پہلے اسے سپرد خاک کر دیا جائے گا۔“

”بری خبر ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن ایک اس سے بھی بری خبر ہے۔“

”وہ کیا؟“

”یاسر کو اپنی اس پھوپھی سے بہت پیار تھا۔ پولیس والوں کا خیال ہے کہ یاسر اس کے جنازے میں شریک ہونے کی کوشش کرے گا یا کم از کم کسی وقت اس کی قبر پر ضرور پہنچے گا۔“

”تمہیں کسے پتا چلا؟“

”داؤد بھائی جیسے لیکسٹر کے پاس رہ کر آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تو آتی ہیں جناب۔ چوکی کے پاس جو چائے خانہ ہے، وہاں جا کر چائے شائے پیتا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے، وہاں کیوں جاتا ہوں۔“

”میرا تو خیال ہے کہ وہاں ڈی ڈی پر انڈین اور پاکستانی فلمیں لگتی ہیں اور فلموں کے بغیر تمہیں حاجت میں مشکل ہوتی ہے۔“

”آپ کی بدظنی سر آنکھوں پر... لیکن وہاں اس

دینے والا تھا۔ اکیلے ”یاسر“ نے کم از کم چھ افراد کا مقابلہ کیا تھا اور ان میں سے تین کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ کچھ لوگ اس کو مزید بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ ہر طرف یاسر بھائی کے نام کی گونج تھی۔ درحقیقت یاسر نامی اس نوجوان کو لوگ پہلے ہی ایک ”ہیرو“ کا درجہ دیتے تھے۔ اب اوپر تلے پیش آنے والے واقعات نے ان کے خیالات کو مزید تقویت دی تھی۔ وہ اس کے دیوانے سے ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو یہ کہتے ہوئے بھی بنے گئے کہ یاسر دو چار دن میں کھل کر سامنے آنے والا ہے۔ پولیس کے بڑے افسروں سے اس کا معاملہ طے ہو گیا ہے۔ کچھ پولیس افسر خود یہ چاہتے ہیں کہ یاسر آگے آئے اور سیالکوٹی کا سامنا کرے۔

کئی طرح کی باتیں کہی جا رہی تھیں۔ یاسر چونکہ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا تھا لہذا گاؤں کے سیانوں کا یہ بھی خیال تھا کہ انتظامیہ اس کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد یہ بات غلط ثابت ہو گئی... اور اس کا ثبوت مجھے انیق نے دیا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو سامنے ٹیوب ویل کے پاس درختوں کے نیچے ڈیرے کی جہازی سائز کی چار پائی پر پہلوان حشمت، انیق، حق نواز اور سونگی وغیرہ بیٹھے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک یقیناً رات والے واقعے پر ہی گرم گرم گفتگو ہوتی رہی تھی لیکن اب حسب معمول حشمت اور انیق میں علمی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ انیق کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”حشمت بھائی، آپ ماسٹر جی کو بلا لیں، دو چار اور پڑھے لکھوں کو بلا لیں۔“ گبرو“ کا لفظ طاقتور، صحت مند جوان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔“

حشمت گبرو بولا۔ ”پتا ناہیں کس الو کے پٹھے نے تم کو اردو پڑھائی ہے۔ جی چاہت ہے کہ تم کو کچھ ناہیں کہوں، تمہارے استاد کو ڈھونڈو اور اس کا سر پھوڑو۔ تم ذرا سی بھی عقل استعمال کر سکتے ہو تو بات تمہاری سمجھ دانی میں آ جاتی۔ تم اس لفظ پر ہی غور کر لو۔ گبرو... یعنی گھب رو... یہ گھبرانے سے نکلا ہے۔ ڈرنے والا، خوف زدہ ہونے والا۔“

”یعنی ہم اس طرح کہیں گے کہ محمد شاہ رگھیا بہت بڑا گھبرو تھا۔ کیونکہ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ اس قدر گھبرا یا کہ لڑے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیے۔“

”بالکل اگر اس نے واقعی ہتھیار ڈال دیے تھے تو پھر اس کو گھبرو کہنا چاہیے۔“

شانہ سہلا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر زچگی کے سلسلے میں عورت کی مدد کرنے کے لیے مجھے آگے بھی جانا پڑا تو چلا جاؤں گا۔

اسی دوران میں میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے موبائل نکالا اور بولا۔ ”ہیلو... کون... بشارت بھائی؟... ہاں ہاں ٹھیک ہے... میں جا رہا ہوں... موٹر سائیکل پر... ہاں دین محمد کا گونگا ملازم چلا رہا ہے... بس دعا کرو کہ یا سر بھائی گھر پر ہی ہو...“

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے اقبال خاموشی سے سن رہا تھا۔ ”نہیں... نہیں... سب کچھ بتاؤں گا اس کو۔ میں ابھی خود دیکھ کر آیا ہوں۔ قبرستان کے باہر دو پولیس والے موجود ہیں... ہاں ٹھیک ہے... اللہ حافظ۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ میں اس کے لیے گونگا بہرا تھا۔ اس نے میرے سامنے بڑی آزادی سے ایک اہم گفتگو کی تھی۔ اس گفتگو نے مجھ پر انکشاف کیا کہ یہ اقبال مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ یہ کسی زچگی کے سلسلے میں نہیں جا رہا۔ اس نے جس شخص کا نام لیا تھا اس نے میری رگوں میں خون کی گردش نہایت تیز کر دی تھی۔ اس نے یا سر کا نام لیا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے وہ کہانی یاد آئی جو تاجور نے سنائی تھی۔ ایک سال پہلے یا سر یعنی یا سر بھائی نے گاؤں کے غریب کریمانہ فروش کے لیے عالمگیر سے ٹکری لی تھی اور نتیجے میں وہ ایک بندے کا قاتل بن گیا تھا۔ جو شخص میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور یا سر کو پولیس کی موجودگی سے باخبر کرنے جا رہا تھا وہ بھی ایک کریمانہ فروش ہی تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ بندہ ہے جس کی خاطر یا سر نے سرائی اور مشکلات کا شکار ہوا۔

اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس ابر آلود بخ بستہ رات میں آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر میری ملاقات اس شخص سے ہونے والی تھی جو یا سر بھائی کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور آج کل ہر خاص و عام سے ”خراج تحسین“ وصول کر رہا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل کی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔

**خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیں**

لیے بھی جاتا ہوں کہ کئی پولیس والے بھی وہاں چائے پینے کے لیے آتے ہیں۔ ایسے ہی ایک حوالدار نیامت سے علیک سلیک بنا رکھی ہے میں نے... نیامت سے ہی پتا چلا ہے کہ آج رات سے ہی چٹیل والی کے قبرستان کی نگرانی شروع ہو جائے گی۔“

”مگر کیا وہ اتنا ہی سیدھا سادہ ہے کہ گھوڑا دوڑاتا ہوا قبرستان میں پہنچ جائے گا؟“

”ہو بھی سکتا ہے جی، آج رات نہ سہی چار پانچ دن بعد اس سے یہ غلطی ہو سکتی ہے۔ جذبات میں بندہ بہت کچھ کر جاتا ہے۔ لالہ وریام بھی تو ایسے ہی کھلا گیا تھا۔“ انیق نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے۔ میں اور انیق ساتھ ساتھ چار پائیوں پر لیٹے تھے۔ میں تاجور کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کی پیشانی کے اس حسین بوسے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بدھ کی رات اچانک ہی میرے ہونٹوں پر جھمکایا تھا اور میری روح کو نہال کر گیا تھا۔ یورپ کے خونی کلبوں کا چیمپئن فائٹر جسے بڑے بڑے ٹکڑم نیچا نہیں دکھا سکے تھے ایک دھان پانی سی دیہاتی لڑکی کے ہاتھوں چاروں شانے چت ہو گیا تھا اور اس وقت لائین کی مدھم روشنی میں کھدر کا لحاف اوڑھے ایک کچے کمرے میں پڑا تھا۔

بڑی عجلت میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ انیق نے حق نواز کی آواز پہچان کر دروازہ کھولا۔ باہر بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ حق نواز کے ساتھ چھوٹے قد کا ایک جوان سال شخص کھڑا تھا۔ حق نواز نے کہا۔ ”انیق یہ اقبال ہے، تمہیں پتا ہی ہو گا کریمانے کی دکان کرتا ہے۔ یہ بڑی مشکل میں ہے۔ شادپور میں اس کی بڑی بہن ہے۔ اس کو بچہ ہونے والا ہے۔ بڑی تکلیف میں ہے۔ اس کا گھر والا کراچی گیا ہوا ہے۔ یہ اس کے پاس جانا چاہتا ہے، فوراً۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ انیق نے ہمدردی سے پوچھا۔

”میں تو موٹر سائیکل چلا نہیں سکتا۔ تم شاہ زیب سے کہو یہ اسے شادپور پہنچا دے۔ پانچ چھ میل سے زیادہ کا فاصلہ نہیں ہے۔ بڑی نیکی کا کام ہو گا۔“

ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں اقبال نامی اس دکان دار نوجوان کو کھٹارا موٹر ہائیک پر اپنے پیچھے بٹھائے کچے ناہوار راستے پر جا رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور بار بار ہلکے ادا کرنے والے انداز میں میرا



ناکام فاتح

تنویر ریاض

دل کی دنیا پر راج کرنے والا ہی اصل فاتح کہلانے کا مستحق ہے... وہ دلیر تھا... بہادر تھا... مظلوم ویے بس لوگوں کی زندگی کو دکھوں سے بچانے کے لیے پنا سوچے سمجھے دشمنوں کے کارواں سے ٹکرا جاتا تھا... کیمپوں میں مقیم پناہ گزینوں پر زندگی تنگ کر دینے والے وحشی درندوں کی سفاکیاں... انسانی جان و مال کی ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں تھی...

ظلم و نا انصافی کے نفرت کدہ دہر میں ایثار و وفا کی بھڑکتی چنگاری کا احوال...

یونگ نے شمالی کوریا کے سپاہیوں کی خاکی پروردی پر ایک نظر ڈالی جو کیمپ سے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھیں اور تقریباً تین چوتھائی میل کا فاصلہ طے کر چکی تھیں۔ وہ رات کے چوکیدار ہونگ ڈو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم نے مجھے پہلے فون کیوں نہیں کیا؟“

”میں ڈر گیا تھا۔“ ہونگ ڈو نے جواب دیا۔ وہ اب بھی آدھا لکڑی کے کاؤنٹر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ”وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور انہوں نے مجھے دھمکی بھی دی تھی۔“

”کیا ان کے پاس بندوقیں تھیں؟“

”ان کے پاس چاقو اور ڈنڈے تھے۔“

”جیب نکالو۔ جلدی سے۔“ جیسے ہی خوف زدہ چوکیدار دوڑا، یونگ نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ”اور ڈینگ سان کو بھی جگا دو۔“

یونگ ڈو نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی وردی صبح کی تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ یونگ نے اسے کوسا اور نظریں اس سمت جمادیں جہاں شمالی کورین جارہے تھے۔ پانچ منٹ پہلے ہی اسے فون پر اطلاع ملی تھی۔ یونگ ڈو کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ بے ربط لہجے میں بول رہا تھا۔ ”کیمپ پر حملہ ہو گیا ہے۔ وہ شمالی کوریا کے سپاہی لگتے ہیں۔ انہوں نے نرس کروڈی کو اس کے کوارٹر سے باہر نکالا اور اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے کوارٹر سے ایک ریڈیو، مائیکروویو، کمپیوٹر اور کبھی قیمتی چیزیں اٹھالی ہیں۔“

یہ پیغام ملتے ہی یونگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یہ حملہ شمالی کوریا کے فاقہ کش سرحدی محافظوں نے کیا ہے۔ یہ ویسے ہی موڈی لوگ ہیں جو چین کے دور دراز علاقوں میں گھس کر لوٹ مار کرتے اور وہاں کی آبادی کو نقصان پہنچاتے ہیں لیکن اس سے پہلے کبھی اغوا کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ یونگ نے ریسیور رکھا اور تھوڑی سی دیر میں کیمپ پہنچ گیا۔ اسے لباس بدلنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ ہمیشہ کسی ممکنہ کارروائی کے لیے وردی میں ملبوس رہتا تھا البتہ باہر نکلتے وقت اس نے فوجیوں کا اوور کوٹ اور فرکی بنی ہوئی ٹوپی پہن لی تھی۔ اس نے اپنی کمر کے گرد پٹی کس کر باندھ لی جس میں اعشاریہ پینتالیس کا آٹھویں ریوالور لٹک رہا تھا۔

حملہ آور اب سفیدے کے درختوں میں غائب ہو چکے تھے جنہوں نے ایک اونچی منڈ پر بنا رکھی تھی اور اس کی وجہ سے وہ دو میل طویل نشیبی راستہ نظر نہیں آرہا تھا جو دریائے یالو کی طرف جاتا تھا جو ایک طرح سے کوریا اور چینی علاقے میچس کے درمیان قدرتی سرحد کا کام دیتا تھا لیکن اب کورین اور چینی بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور ان کی جگہ کوریا میں کیونسٹ آمر اور چین میں کیونسٹ پارٹی نے لے لی تھی۔

وہ تقریباً سفیدے کے درختوں کے نزدیک پہنچ چکا تھا کہ اسے اپنے عقب میں جیب کی آواز سنائی دی۔ یونگ ڈو جیب کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا اور اب بھی اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں، ڈرائیونگ

سیٹ پر ڈینگ سان بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کیمپ میں واحد شخص جس پر یونگ کو مکمل بھروسہ تھا۔ اس کے ہاتھ بھاری اور جلد موٹی تھی۔ سر چوڑا اور سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک عجیب و غریب مخلوق نظر آتا تھا جیسے کسی جادوگر نے تخلیق کیا ہو۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ڈینگ سان چلاتے ہوئے بولا۔ اس کا لہجہ دیہاتی چینیوں جیسا تھا۔

یونگ نے جیب میں چھلانگ لگائی اور پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈینگ سان نے لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر جیب آگے بڑھا دی اور وہ سفیدے کے درختوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑی سی چڑھائی کے بعد نشیبی راستہ شروع ہو گیا جو دریا کی طرف جارہا تھا۔ یونگ نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو کوئی نظر نہیں آرہا۔“

”وہ نیچے دریا کی طرف ہی گئے ہیں۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں۔“ ڈینگ سان بولا۔

یونگ اس کی بات سمجھ گیا۔ اسے یہاں آئے ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے اور اس دوران اس نے اچھی خاصی چینی زبان سیکھ لی تھی۔ اس کا واسطہ قریبی گاؤں میں کام کرنے والی بارگرنز اور ان لوگوں سے پڑتا تھا جنہیں کیمپ میں مقیم غیر ملکیوں کے کمرے صاف کرنے، کپڑے دھونے اور کھانا پکانے کے لیے ملازم رکھا جاتا تھا۔ یونگ کے لیے یہ زبان سیکھنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ کیمپ کی سکیورٹی کا انچارج تھا اور اسے منتخب کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ نہ صرف انگریزی اور کوریائی زبان روانی سے بول سکتا تھا بلکہ اس کے پاس بوسنیا میں کام کرنے کا تجربہ بھی تھا گوکہ اس کے کام کی نوعیت خفیہ تھی لیکن واشنگٹن کو ہونے والی چند فون کالز نے اس کے موجودہ مالکان کو قائل کر دیا تھا کہ وہ شمالی کوریا کی سرحد کے قریب پیش ہونے والی صورت حال سے نمٹ سکتا ہے۔

اس کیمپ کا سرکاری نام بہت مشکل تھا جسے ادا کرتے ہوئے اس کے جڑے دیکھنے لگتے لیکن اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ تنخواہ معقول تھی اور کیمپ میں کام کرنے والے لوگ بھی اچھے تھے۔ دکھاوے کے لیے ان کا چینی حکومت سے معاہدہ تھا کہ وہ اس الگ تھلک دیہاتی علاقے کے پس ماندہ لوگوں کو طبی سہولتیں بہم پہنچائیں گے اور وہ یہ کام بخوبی انجام دے رہے تھے لیکن بعض اوقات وہ چینی حکام کی نظر بچا کر فاقہ کش شمالی کوریا کے باشندوں کو بھی خوراک، کپڑے اور خیمے فراہم کرتے جو کسی طرح دریا پار

”انہوں نے سامان ایک بڑی کشتی میں خنل کر دیا ہے۔“ ڈینگ سان نے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ یونگ نے پوچھا۔ ”وہ پہلے ہی آدھا قاصلہ طے کر چکے ہیں۔“

”سنو۔“ ڈینگ سان نے کہا اور وہ تینوں کشتی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بڑی کشتی نے اپنا رخ تبدیل کر لیا تھا اور وہ شمال مشرق کی طرف جارہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز دور ہوتی گئی۔ وہ کشتی منچوریا کی طرف جارہی تھی۔

”یہ مقامی سرحدی محافظ معلوم نہیں ہوتے۔“ یونگ نے کہا۔

”نہیں۔“ ڈینگ سان نے اس سے اتفاق کیا۔

”ان کی رسائی ایک موٹر بوٹ تک نہیں ہو سکتی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ کسی اور کے لیے کام کر رہے ہیں۔“

”ہاں اور ممکن ہے کہ یہ سرے سے سرحدی محافظ ہی نہ ہوں۔“

یونگ مڑا اور یونگ ڈو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”انہوں نے تم سے بات کی تھی۔ وہ کون سی زبان بول رہے تھے، چینی یا کوریائی؟“

”چینی...“ یونگ ڈو اس کی لاطی پر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں کوریائی زبان کیسے سمجھ سکتا ہوں۔“

”کیا تمہیں وہ چینی لگ رہے تھے یا وہ کوریائی تھے۔“

”کیا وہ سب چینی بول رہے تھے یا ان میں سے کوئی ایک؟“

یونگ ڈو نے اپنا سر پکڑ لیا اور بولا۔ ”مجھے یاد نہیں۔ میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔“

یونگ نے اس کی قمیص کا کالر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بولا۔ ”اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہیں پہلی بار ان کے آنے کا پتا کس طرح چلا؟“

یونگ ڈو پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ان کے قدموں کی آواز سنی پھر ایک آدمی تاریکی میں سے برآمد ہوا۔ وہ اتنی جیزی سے میرے سامنے آیا کہ میں فوری طور پر کوئی حرکت نہ کر سکا۔ اس نے میرے کہین کی کھڑکی سے جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی پھر اس نے مجھے حکم دیا کہ اپنی جگہ سے نہ حرکت کروں۔“

کر کے اس طرف آنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

کیمپ کا مرکزی جزو ایک ڈسپنری تھی جسے ایک چھوٹا اسپتال بھی کہا جاسکتا تھا گوکہ غیر ملکی عملہ اور ڈاکٹر اپنی طرف سے ہر ممکن طبی سہولتیں فراہم کرتے لیکن شمالی کوریا کے مہاجرین میں اموات کی شرح بہت زیادہ تھی۔ بعض اوقات وہ سخت محنت کی وجہ سے اتنے لاغر ہو چکے ہوتے کہ کوئی بھی انہیں نہیں بچا سکتا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو پیچیدہ آپریشن اور منجھکے علاج کی ضرورت ہوتی جو اس ڈسپنری میں ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود یہاں کام کرنے والے رضا کاروں نے کئی لوگوں کی جان بچائی لیکن کیمپ کے قریب پہاڑی پر واقع قبرستان کی آبادی روز بروز بڑھتی گئی۔

”وہ دیکھو۔“ ڈینگ سان چلا یا۔

”مچی سڑک کے خاتمے پر دریا کے کنارے سوگز شمال کی جانب شمالی کوریا کی وردی میں ملبوس کچھ لوگ لکڑی کے چبوترے پر کھڑے ہوئے ایک چھوٹی کشتی میں سامان لاد رہے تھے۔“

”وہ لڑ رہے ہیں۔“ یونگ ڈو چلا یا۔

یونگ نے نظریں جما کر دیکھا۔ اسے وہاں جدوجہد کے آثار نظر آئے۔ نرس کروڈی آخری وقت تک کوشش کر رہی تھی کہ کشتی میں سوار نہ ہونے پائے۔ مزید کچھ چننے چلانے کی آوازیں پھر ایک گھونسا فضا میں بلند ہوا اور نرس کی جدوجہد رک گئی۔

جب تک ڈینگ سان دریا کے کنارے پر پہنچا، کشتی وہاں سے روانہ ہو چکی تھی اور اب وہ تیزی سے چھو چلا کر اسے کنارے سے دور لے جا رہے تھے۔ یونگ نے جیب سے چھلانگ لگائی اور چبوترے کے ساتھ دوڑنے لگا پھر اس نے اپنا ریوالور نکالا اور پوری قوت سے چلاتے ہوئے بولا۔ ”رک جاؤ، ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ انگریزی بول رہا ہے۔ اس نے یہی الفاظ چینی زبان میں ادا کیے لیکن کشتی ساحل سے دور ہوتی جارہی تھی۔ یونگ نے جھنجھلا کر ایک ہوائی قائر کیا اور گہری گہری سانس لینے لگا۔

”وہ چلے گئے۔“ یونگ نے کہا۔

ڈینگ سان نے اس کا بازو پکڑا اور بولا۔ ”غور سے سنو۔“

انہوں نے دیکھا کہ کشتی میں فرار ہونے والے دھیمی آواز میں ایک دوسرے کو احکامات دے رہے تھے پھر اچانک ہی ایک دوسری کشتی کے انجن کی آواز آئی۔

”یہ بات اس نے چینی زبان میں کہی تھی؟“
 ”ہاں، اور اس کے بعد مزید لوگ تاریکی سے باہر
 آئے اور مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔“
 ”اس کے علاوہ بھی اس نے کچھ کہا؟“

”اس نے کہا کہ ان کا تعلق شمالی کوریا سے ہے اور وہ
 امیر سرمایہ داروں سے کچھ چیزیں لینے آئے ہیں جن کے
 پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہے اور اگر میں نے
 مزاحمت کی کوشش کی تو وہ کلہاڑی سے میرا سر پھاڑ دیں
 گے۔“

”گویا اس نے شمالی کوریا کے سپاہی کی وردی پہن
 رکھی تھی لیکن وہ چینی تھا۔“
 ”ہاں، اس میں کوئی شبہ نہیں۔“

”اور باقی لوگ۔ ان کے بارے میں کیا کہو گے؟“
 یونگ نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔ میں نے انہیں بولتے ہوئے نہیں
 سنا۔“ یونگ ڈولھ بھر کے لیے رکا۔ ”اس وقت بھی نہیں
 جب وہ واپس جا رہے تھے۔ نرس کروڈی مسلسل جدوجہد
 کر رہی تھی۔ گوکہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے لیکن پاؤں
 آزاد تھے اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ اسے کیاؤنڈ سے
 باہر لے جائیں لیکن وہ چلنے کے بجائے انہیں ٹھوگریں مار
 رہی تھی جس پر وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئے۔“

”اور ان میں سے ایک نے کچھ کہا بھی تھا؟“
 ”ہاں جب نرس نے ایک آدمی کے پیٹ میں لات
 ماری تو اس نے غصے میں آکر اسے ایک گالی دی تھی۔“

یونگ جانتا تھا کہ کوریائی باشندے گالی نہیں دیتے۔
 اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”گویا وہ بھی چینی ہی تھا۔“

”ہاں۔“ یونگ ڈونے اس کی تائید کی۔ ”ہاں، اب
 میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ وہ سب چینی ہی تھے۔“

کیمپ واپس آنے کے بعد یونگ کی ملاقات ایگزیکٹو
 ڈائریکٹر ڈاکٹر ہینس البرڈ سے ہوئی جو نرس کے اغوا ہو
 جانے سے کافی پریشان تھا۔ اس نے اپنے گنجنے سر پر ہاتھ
 پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ وہ نرس کروڈی
 کو لے گئے لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“

یونگ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن
 وہ نرس کے بارے میں خود بھی فکر مند تھا۔ ان دونوں کی پہلی
 ملاقات کیمپ کے ڈائنگ ہال میں ہوئی تھی۔ وہ ایک سادہ
 سی عورت تھی۔ آنکھوں پر مونے شیشوں کا چشمہ لگاتی اور
 اپنے بھورے بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں باندھ کر رکھتی

لیکن وہ بڑی مہربان تھی۔ اس وقت یونگ ایک جھجے کی مدد
 سے پاستا کا ٹکڑا کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے کامیابی
 نہیں ہو رہی تھی۔ نرس نے اس کی مدد کی اور ایک مستطیل ٹکڑا
 کاٹ کر اس کی پلیٹ میں ڈال دیا۔ یونگ نے اس کا شکریہ
 ادا کیا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اس نرس کا ہمیشہ خیال
 رکھے گا۔ وہ اسے کیمپ میں مریضوں کی خدمت اور دیکھ
 بھال کرتے دیکھتا تو بے اختیار اس پر پیار آنے لگتا۔ وہ ہر
 ایک کے ساتھ اخلاق سے پیش آتی۔ خاص طور پر بچوں کے
 وارڈ میں اس کا رویہ مثالی ہوتا۔ وہ جب کمرے میں داخل
 ہوتی تو سب بچے اسے دیکھ کر بستر سے اٹھ جاتے اور ان
 کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ وہ ہر بچے کے پاس بیٹھ
 کر اس سے باتیں کرتی اور محبت و شفقت کے ساتھ اس کی
 حتمی داری کرتی۔ یونگ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کے بارے
 میں کیا سوچتی ہوگی۔ وہ آدھا کورین اور آدھا امریکن تھا۔ گو
 کہ سیکپورٹی انچارج ہونے کی وجہ سے اسے اچھی تنخواہ اور
 بہتر سہولتیں مل رہی تھیں لیکن وہ حیران تھا کہ کیا نرس کروڈی
 جیسی پڑھی لکھی اور ذہین عورت اس کی جانب متوجہ ہو سکتی
 ہے لیکن اسے یہ پختہ یقین تھا کہ اگر اس نے حملہ آوروں کا
 سراغ لگا کر اسے بازیاب نہ کرایا تو وہ یہ حقیقت کبھی نہیں
 جان سکے گا۔

”لیکن تمہارا کہنا ہے کہ وہ لوگ شمالی کوریا کے سرحدی
 محافظ نہیں تھے؟“ ڈاکٹر البرڈ نے کہا۔ ”پھر وہ کون تھے؟“
 ”ان کے نکل جانے کے بعد ہم تینوں یعنی ڈینگ
 سان، یونگ ڈو اور میں نے دریا کے کنارے چینی علاقے
 کی تلاشی لی، وہاں ہم نے صبح کا پورا وقت گزارا۔ ہمیں وہاں
 سے یہ بیگ ملا ہے۔“

یونگ نے کینوس بیگ کھول کر اس میں سے ایک ٹوٹا
 ہوا الارم کلاک نکالا اور بولا۔ ”ہمیں یقین ہے کہ یہ نرس
 کروڈی کا ہے اور یہ حملہ آوروں سے راستے میں گر گیا۔“

ڈاکٹر نے یونگ کے ہاتھ سے کلاک لیا اور اسے
 دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس میں پانچ بجے صبح کا الارم لگا ہوا
 ہے، اس کی شفٹ چھ بجے سے شروع ہوتی ہے۔“

یونگ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں کچھ اور چیزیں
 بھی ملی ہیں جو اتنی اہم نہیں۔ مثلاً یہ ایک شمالی کورین کیمپ
 ہے جو شاید تیز ہوا چلنے سے گر گئی ہوگی۔“

ڈاکٹر نے کیمپ کا بغور معائنہ کیا۔ اسے اندر باہر سے
 دیکھا لیکن اسے وہاں کسی کا نام لکھا ہوا نظر نہیں آیا۔ اس نے
 وہ کیمپ اپنی میز پر رکھ دی اور بولا۔ ”اس کے علاوہ کچھ

چہرے کی طرف دیکھا پھر اپنی میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اس پر کچھ لکھا اور یونگ کو دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ رقم کیٹھر سے لے لو۔ تمہارے اخراجات کے لیے ہے۔“

یونگ نے کاغذ پر نظر ڈالی۔ اس پر ایک ہزار امریکی ڈالر اور اتنی ہی مالیت کی چینی کرنسی لکھی ہوئی تھی۔

ڈینگ سان اچھی طرح جانتا تھا کہ کہاں جاتا ہے۔ ”نجوی“ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”وہ ایک پڑھا لکھا شخص ہے۔ وہی اس تعویذ کے بارے میں کچھ بتا سکے گا۔“

وہ گوڈنگ زی کی تنگ گندی سڑکوں سے گزرتے ہوئے مطلوبہ جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ گاؤں شمال مشرقی چین میں واقع ہے۔ ڈینگ سان نے دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور لکڑی کے بنے ہوئے پرانے سے گیٹ کو ہلکے سے دھکا دیا۔ اس نے بہ آواز بلند اپنا نام لیا تو کسی نے جواب میں کہا۔ ”اندر آ جاؤ۔“

اس کمرے کی دیواروں اور چھت پر ٹائل لگے ہوئے تھے جہاں روایتی چینی لباس پہنے ایک جوان عورت نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے آنے کا مدعا جان لینے کے بعد اس عورت نے چار سوین طلب کیے۔ اپنی میز پر رکھے ہوئے رجسٹر میں اس رقم کا اندراج کیا اور اس کی رسید یونگ کو پکڑا دی۔ پندرہ منٹ بعد وہ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں محفل کے چولہے سے خوشبودار دھواں اٹھ رہا تھا۔ فرش کے وسط میں ایک داڑھی والا شخص گاؤں کے سے فیک لگائے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے ایک قطار میں چند موم بتیاں روشن تھیں۔ اس نے یونگ اور ڈینگ سان کو اپنے سامنے فرش پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یونگ چینی زبان سے واقف تھا جبکہ ڈینگ سان بھی اچھے خاصے لفظ سمجھ لیتا تھا۔ اس لیے ان تینوں کو گفتگو کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ بوڑھے نے ان سے آمد کا مقصد دریافت کیا تو یونگ نے اسے وہ تعویذ پکڑا دیا۔

بوڑھے نے کانپتی انگلیوں سے وہ تعویذ پکڑا اور مدھم مدھم روشنی میں اس کا بغور معائنہ کیا پھر اس نے اپنے تکیے ہونٹ مسخکہ خیز انداز میں سکڑے اور وہ تعویذ فرش پر پھیلتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی اسے میرے پاس لانے کی؟“

یونگ اور ڈینگ سان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر یونگ نے کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے؟“

”یہ تمہیں کہاں سے ملا؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”صرف یہ۔“ یونگ نے کہا اور ایک تعویذ ڈاکٹر کے حوالے کر دیا جو ایک باریک سی ڈوری میں بندھا ہوا تھا۔ محفل کے بنے ہوئے اس تعویذ پر کسی بدروح کی شبیہ کندہ تھی۔

”تمہارا خیال ہے کہ یہ تعویذ حملہ آوروں میں سے کسی ایک کا ہے؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”یہ مجھے لکڑی کے پلیٹ فارم سے ملا تھا۔ یہ کافی قیمتی ہے۔ اس لیے کافی دیر سے وہاں موجود نہیں ہوگا البتہ مجھے یقین ہے کہ جب وہ کشتی میں سامان لا رہے تھے تو اس دوران یہ کسی کی گردن سے نکل گیا ہوگا۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ اس تعویذ پر کس کی شکل بنی ہوئی ہے۔“

”نہیں، البتہ ہونگ ڈو کو معلوم ہے۔“

”اس نے تمہیں کیا بتایا؟“ ڈاکٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ وہ اس مخلوق کو دیکھ کر اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس نے اپنا سامان باندھا اور کسی سے ایک لفظ کہے بغیر ہی یہاں سے چلا گیا۔“

”چلا گیا؟“ ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے؟“

”ہاں، میں نے اس کا بس اسٹیشن تک پیچھا کیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی بھی حیران تھی کہ اس نے یک طرفہ ٹکٹ کیوں لیا جبکہ یہاں وہ بہت اچھی ملازمت کر رہا تھا۔“

”یقیناً وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہوگا۔“ ڈاکٹر البرڈو نے کہا۔ اس نے تعویذ کو ایک بار غور سے دیکھا اور یونگ کو واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”ہونگ ڈو کہاں گیا ہے؟“

”بیجنگ۔“ یونگ نے جواب دیا۔

”وہاں تو اسے ہم کبھی نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔“

”ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے جہاں یہ تعویذ لے جائے۔ نرس کروڈی خطرے میں ہے۔ اسی لیے میں یہاں آیا ہوں تاکہ تم سے ڈینگ سان کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کر سکوں۔“

ڈاکٹر البرڈو نے بھوس چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف ڈینگ سان کو لے جانے کی اجازت مانگ رہے ہو، اپنے لیے نہیں۔“

”مجھے تو ہر حال میں جانا ہے۔“

ڈاکٹر البرڈو نے ایک لمحے کے لیے یونگ کے

یونگ نے اسے نرس کروڈی کے افوا اور حملہ آوروں کے تعاقب میں بتانا شروع کیا لیکن چینی زبان پر عبور نہ ہونے کے سبب وہ اپنی بات وضاحت سے بیان نہ کر سکا چنانچہ بقیہ بات ڈینگ سان نے پوری کی۔ یوڑھے نے بڑے سکون سے اس کا بیان سنا۔ درمیان میں کچھ سوالات بھی کیے۔ جب ڈینگ سان اپنی بات پوری کر چکا تو یوڑھے نے ایک بار پھر تعویذ کی طرف دیکھا لیکن اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

”کیا تم منچورین ہو؟“ یوڑھے نے یونگ سے پوچھا۔

”میں کورین ہوں۔“ یونگ نے جواب دیا۔

”اور اس کے علاوہ؟“ یوڑھے نے کہا۔

”ہاں، میرا باپ امریکن تھا۔“

”کیا وہ مرچکا ہے؟“

”نہیں لیکن وہ میرے لیے مرچکا ہے۔“

یوڑھے نے لمحہ بھر کے لیے یونگ پر نظریں جمائیں پھر ڈینگ سان سے بولا۔ ”تم بے وقوف نہیں لگتے یا پھر بہت بہادر ہو۔“

ڈینگ سان اور یونگ خاموش رہے۔ یوڑھا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تعویذ منچورین نسل کے ایک فرقے سے تعلق رکھتا ہے جس کا سربراہ سفید رچھ کے نام سے مشہور ہے۔ وہ چینیوں سے نفرت کرتا ہے اور وہ یہ کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ کوئی کورین اس کے علاقے میں قدم رکھے۔ اس کوشش میں بہت سے لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، اگر وہ یا اس کے آدمی اس نرس کو لے گئے ہیں تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ وہ واپس نہیں آئے گی۔ پولیس، فوج کوئی بھی اس کے علاقے میں نہیں جاسکتے۔“

”اس کا علاقہ کہاں پر ہے؟“ یونگ نے پوچھا۔

یوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔“

”میں جانا چاہتا ہوں۔“ یونگ نے اصرار کیا۔

”اگر تم وہاں گئے تو واپس نہیں آسکو گے۔“

”کچھ بھی ہو۔ میں جانا چاہتا ہوں۔“ یونگ اپنی بات پر قائم رہا۔

یوڑھے نے ایک گہری سانس لی اور علاقے کا پتا بتا دیا پھر اس نے بلند آواز سے اپنی پوتی کو بلایا۔ وہی لڑکی اندر آئی جس نے یونگ سے فیس لی تھی، یوڑھے نے کہا۔ ”ان لوگوں کو فیس واپس کر دو۔ ممکن ہے کہ بہت جلد

پسماندگان کو ان کی جھنڈ و گھنٹن کے لیے پیسوں کی ضرورت پیش آجائے۔“ ☆☆☆

ٹرین شمال کی جانب سفر کر رہی تھی۔ وہ ہر چھوٹے اسٹیشن پر رکتی اور مسافر چڑھتے اترتے رہتے۔ وہ سینکڑوں اسٹیشن پر اترے جس کے اطراف میں دو اور تین منزلہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں جس سے لگتا تھا کہ یہاں زراعت پیشہ لوگ رہتے ہیں لیکن شہر کے باہر خاصی غیر آباد زمین تھی اور شمالی حصہ پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ یونگ نے ایک گہری سانس لی اور اسے لگا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ اسے ابھی طرح یاد تھا کہ بچپن میں اس کی ماں نے ہمیشہ یہی بات اس کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی کہ وہ امریکن نہیں بلکہ کورین ہے اور اسے یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے۔

”اب ہم کیا کریں؟“ ڈینگ سان نے اس اجنبی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

اسٹیشن کے باہر تین چھکڑے ٹھوسیت کھڑے ہوئے تھے اور ان کے چلانے والے حیرت سے ان اجنبیوں کو دیکھ رہے تھے۔

”ہمیں ان میں سے کوئی گاڑی کرائے پر لینی چاہیے۔“ یونگ نے کہا پھر اس نے آگے بڑھ کر چینی زبان میں ایک گاڑی بان سے کچھ کہا لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بقیہ دونوں نے بھی اس کی تھلید کی اور ایک ایک کر کے اپنی گاڑیوں سمیت وہاں سے کھسکتے لگے۔ اس سے پہلے کہ آخری گاڑی بان بھی نکل جاتا، ڈینگ سان نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور بولا۔ ”تمہیں اس گاڑی اور گھوڑے کے کتنے پیسے چاہئیں؟“

اس شخص نے خوف زدہ انداز میں ڈینگ سان کے چہرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں جیسے موت اس کے سر پر آن کھڑی ہو۔ شاید وہ پوری طرح ڈینگ سان کی بات سمجھ نہیں پایا تھا۔ یونگ نے چینی زبان میں یہی بات دہرائی اور اشاروں سے کچھ کہا تب گاڑی بان کچھ سمجھ پایا۔ یونگ نے اپنی جیب سے چینی کرنسی نکالی اور گاڑی بان کے حوالے کر دی۔ اس نے نوٹ گنتے کے بعد انکار کر دیا۔ یونگ نے اس میں مزید کچھ رقم کا اضافہ کیا تو وہ گاڑی سے نیچے اتر آیا اور اس نے چابک ڈینگ سان کے حوالے کر دیا۔ پھر اس نے وہ رقم جیب میں رکھی اور ریل کی پٹری پار کر کے پہاڑیوں کی جانب چلا گیا۔

وہ دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ڈینگ سان نے لگام سنبھالی اور ہلکے سے ٹھوکی پیٹھ تھپتھپائی۔ گاڑی کے

ناکام فاتح

دوسری صبح یونگ اور ڈینگ سان کو یہ بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ ان کے لائے ہوئے راشن نے کام دکھایا اور شکر گزار پناہ گزینوں نے انہیں منزل مقصود کا پتا بتا دیا۔ جھیل کے شمال میں سفید رینچ کی پناہ گاہ تھی۔ یہ پناہ گزین اس سے ڈرتے اور نفرت بھی کرتے تھے۔

”اگر تم اسے مار دو۔“ ڈیاؤ منگ نے کہا۔ ”خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اگر تم اسے نہیں مارتے تو مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔“

ابھی انہوں نے پہاڑی کی طرف جاتے ہوئے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ گاڑی ایک چٹان سے ٹکرائی اور ایک آواز کے ساتھ بائیں طرف کا پہیہ نکل گیا۔ ڈینگ سان نے گاڑی سے اتر کر نقصان کا معائنہ کیا اور گاڑی کو کوئٹے لگا۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ واپس جا کر پیسے کی مرمت کرواتے۔ انہیں جلد از جلد نرس کروڑی تک پہنچنا تھا۔ اس کے بجائے انہوں نے ضروری سامان ٹوکے پیٹھ پر لادنا اور اسے کھینچتے ہوئے پہاڑی کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک جگہ رک کر انہوں نے کھانا کھایا اور کچھ دیر سنانے کے بعد دوبارہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ آدھا میل ہی گئے ہوں گے کہ زمین سے بھاپ نکلتا شروع ہو گئی۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم بڑھاتے آگے چلے۔ کچھ دیر بعد فضا صاف ہو گئی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے وہ جھیل تک پہنچ چکے تھے جس کے آخری سرے پر ایک ٹیمپ نظر آ رہا تھا جس میں صرف خیمے ہی نہیں بلکہ لکڑی سے بنا ہوا ایک گودام بھی تھا اور خیموں کے درمیان کچھ لوگ حرکت کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

گزشتہ شب کھانے کے دوران ڈیاؤ منگ اور دوسرے مزدوروں نے یونگ اور ڈینگ سان کو سفید رینچ کی کارروائیوں کے بارے میں بتایا تھا۔ ”وہ شمالی کوریا سے فرار ہو کر آنے والوں پر حملے کرتے ہیں۔“

”جیسے بھیڑیے ہرنوں پر جھپٹتے ہیں۔“ کسی اور نے لقمہ دیا۔

ڈیاؤ منگ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”بوڑھوں کو سردی سے ٹھہر کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جوان مردوں اور عورتوں کو الگ الگ بیچتے ہیں۔ یہ عورتیں چینی زمینداروں کی بیویاں بن جاتی ہیں اور اگر اچھی قیمت مل جائے تو انہیں جسم فروشی پر لگا دیا جاتا ہے جبکہ مرد کھیتی باڑی یا کان کنی میں لگ جاتے ہیں۔“

پہیوں نے ایک چرچہ اہٹ کے ساتھ حرکت کی اور وہ قصبے کے وسط سے گزرنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے انہیں نظر انداز کر دیا اور اپنے کام میں لگے رہے البتہ چند ایک رک گئے اور انہیں گھورنے لگے۔ شاید وہ اجنبیوں کو دیکھنے کے عادی نہ تھے۔ قصبے کے باہر کھلی چمنیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہاں سڑک کے دونوں جانب دو تین ایکڑ تک خیموں کا شہر پھیلا ہوا تھا جس میں مرد، عورتیں اور بچے مقیم تھے۔

”یہ کون لوگ ہیں؟“ یونگ نے پوچھا۔

”ہجرت کر کے آنے والے کارکن۔“ ڈینگ سان نے جواب دیا۔ ”یہ یہاں فصل کی کٹائی کے لیے آئے ہیں۔“

”ہمیں ان سے بات کرنا چاہیے۔ شاید یہ کچھ جانتے ہوں۔“

ڈینگ سان نے تائید میں سر ہلایا اور گاڑی کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا۔ وہ دونوں اس جانب بڑھے جہاں کچھ لوگ آگ کے پاس سٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ ڈینگ سان نے قریب جا کر انہیں ہیلو کہا لیکن سامنے بیٹھا ہوا شخص اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ اس نے ایک دوسرے شخص کو بلایا۔ وہ ایک گول چہرے والا منحنی سا آدمی تھا جس کے سامنے کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس نے رواں چینی میں بولنا شروع کیا اور ڈینگ سان نے بھی اسی تیزی کے ساتھ جواب دیا۔ پھر یونگ سے کہنے لگا۔

”یہ میرے آبائی صوبے کا ہے۔ اس کا نام ڈیاؤ منگ ہے۔“

یونگ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور دیکھا کہ عورتیں کھانے کے برتنوں میں سے بچا کھچا کھانا پلیٹوں اور پیالوں میں ڈال رہی تھیں جبکہ بچے کھانے کی کمی کی شکایت کر رہے تھے۔

”ان لوگوں کو پیسے کب ملتے ہیں؟“ یونگ نے پوچھا۔

”جب کٹائی مکمل ہو جاتی ہے۔“ ڈینگ سان نے جواب دیا۔ ”اس سے پہلے نہیں۔“

”ممکن ہے کہ ہم ان کی زبان کھلوا سکیں۔“ یونگ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں گاڑی لے کر واپس قصبہ چلے گئے اور جب واپس آئے تو ان کی گاڑی میں آٹے اور چاول کی بوریاں لدی ہوئی تھیں اور گاڑی کے ساتھ رسی سے بندھی ہوئی بارہ بھیڑیں چل رہی تھیں۔

”اور بچوں کے بارے میں کیا کہو گے؟“ ڈینگ سان نے پوچھا۔

”یہ سب سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ چینیوں کو وارث کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ بڑھاپے میں ان کی دیکھ بھال کر سکے اگر ان کے اپنے بچے نہیں ہوتے تو وہ منگے داسوں کوئی لاوارث بچہ خرید لیتے ہیں۔“

”خاص طور پر لڑکے۔“ کوئی بیچ میں بولا۔

”اور لڑکیوں کا کیا ہوتا ہے؟“ یونگ نے پوچھا۔

”ثیادو منگ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”بعض اوقات وہ بھی فروخت ہو جاتی ہیں اور کبھی نہیں۔“

یونگ پوچھتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ جو لڑکیاں فروخت نہیں ہوتیں، ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں ایک نظریہ قائم ہو رہا تھا کہ نرس کروڈی کو کیوں اغوا کیا گیا۔ اگر لڑکے اتنے ہی قیمتی ہیں تو یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بچوں کے وارڈ میں کام کرنے والی نرس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ جب سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا، یونگ کو پہلی بار امید کی کرن نظر آئی۔ اگر یہ سچ تھا تو سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں کے پاس نرس کروڈی کے ہونے اور اسے زندہ رکھنے کی معقول وجہ موجود تھی۔

”وہ خیمہ دیکھو۔“ ڈینگ سان نے کہا۔ ”یہ خیمہ سب سے بڑا ہے اور کیمپ کے وسط میں ہے۔“

”اس کے علاوہ گودام سے بھی قریب ہے۔“ یونگ نے کہا۔

انہوں نے اپنی نظریں اس طرف جمادیں۔ کئی لوگ اس خیمے کے اندر باہر جا رہے تھے۔

”یہ یقیناً ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔“ ڈینگ سان نے کہا۔

کیمپ کے باہر مسلح افراد پہرہ دے رہے تھے اور ان کے کندھوں پر ایم آئی رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ یہ ہتھیار کوریا کی جنگ میں استعمال کیے گئے تھے۔

سورج غروب ہونے تک وہ دونوں ڈھلوان سطح پر بیٹھے اپنے پروگرام کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے رات میں کیمپ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کسی مدد کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ مقامی چینی پولیس یقیناً سفید ریچھ کے لیے کام کرتی ہوگی اور اگر معجزاتی طور پر ایسا نہیں تھا تب بھی انہیں شمالی کوریا سے ملحقہ علاقے میں کوئی کارروائی کرنے کے لیے بیجنگ سے

اجازت لینا پڑتی اور اس میں کئی روز لگ سکتے تھے۔

”ہمیں صرف ایک ہی فائدہ حاصل ہے۔“ یونگ نے کہا۔ ”اور وہ یہ کہ ہم ان پر اچانک حملہ کر کے انہیں حیرت زدہ کر دیں۔“

”اور ان کے ساتھ بے رحمی سے پیش آئیں۔“ ڈینگ سان نے اپنے تھیلے میں سے ایک قدیم چینی تلوار نکالتے ہوئے کہا۔

”تم تو بہت نرم مزاج ہو۔“ یونگ نے کہا۔ ”پھر سفید

ریچھ سے اتنی نفرت کیوں؟“

”تم وہ سب کچھ نہیں سمجھ سکے جو پناہ گزین مزدور کہہ رہے تھے۔“

”نہیں۔“ یونگ نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

ڈینگ سان نے پیار سے تلوار کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تو اس کا اصل نشانہ شمالی کوریا سے آئے ہوئے پناہ گزین ہیں لیکن بعض اوقات سرحد پر سختی ہونے کی وجہ سے ان کی آمد میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں کی کارروائیاں جاری رہتی ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”ایسی صورت میں وہ ان عارضی مزدوروں کو نشانہ بناتے ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں یہاں موجود ہیں کیونکہ حکومت ان کے تحفظ کا کوئی بندوبست نہیں کر سکتی۔ اس لیے ان مزدوروں کے کیمپ بہت بڑے ہوتے ہیں اور وہ حفاظت کی خاطر اکٹھے رہنا پسند کرتے ہیں۔“

”اور ثیادو منگ پر کیا گزری؟“

”ایک دن اس کی بہن کو اٹھالیا گیا جب وہ دریا کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر اسے ہمارے ساتھ آنا چاہیے تھا۔“ یونگ نے کہا۔

”وہ خوف زدہ تھا۔“ ڈینگ سان نے جواب دیا۔

یونگ نے سفید ریچھ کے کیمپ کے گرد دو درجن مشعلیں دیکھیں تو وہ بھی اپنے آپ کو خوف زدہ محسوس کرنے لگا۔ اس خوف پر قابو پانے کے لیے نرس کروڈی، اس کے مسکراتے چہرے اور خوش اخلاقی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا، اگر وہ اسے سفید ریچھ کے چنگل سے آزاد نہ کروا سکا تو اس کی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک خلا پیدا ہو جائے گا۔

اب انہیں سب سے پہلے ایک رائفل چھیننا تھی۔ اس

ناکام فاتح

میں لگے ہوئے زنگ آلود کنڈے کا معائنہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔

”اس میں تالا لگا ہوا ہے۔“
”پھر کیا ہوا۔ ہم اسے توڑ سکتے ہیں۔“ ڈینگ سان نے کہا۔

”نہیں، اس طرح آواز ہوگی۔“
”اس کی چابی یقیناً ہیڈ کوارٹر میں ہوگی۔“ ڈینگ سان نے خیال ظاہر کیا۔

”وہاں روشنی ہو رہی ہے۔“
”وہاں موجود شخص کو اگر ہم باہر نکال سکیں تو چابیوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔“

یونگ نے اس بارے میں سوچا۔ اس میں خطرہ ضرور تھا لیکن ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا، وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم خیمے کی طرف چلتے ہیں۔“

وہ ٹھنوں کے بل بیٹھ کر اپنا منصوبہ بنانے لگے۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد وہ اٹھے اور رات کی تاریکی میں کم ہو گئے۔ انہیں ایک محافظ کا نام معلوم ہو گیا تھا چنانچہ اسی کو استعمال کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ڈینگ سان خیمے کی طرف بڑھا اور چینی زبان میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”کومنگ بالکل ہی ناکارہ شخص ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ ڈیوٹی کے دوران سونا منع ہے، ایسے آدمی کو تو گولی مار دینی چاہیے۔“

یہ کہہ کر اس نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہاں ایک باوردی افسر میز کے پیچھے بیٹھا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ اپنے پستول تک پہنچتا، ڈینگ سان اس کے سر پر سوار ہو چکا تھا۔ اب اس کی پوری کوشش تھی کہ اپنی بھاری ہتھیلی سے اس کا منہ بند کر دے۔ یونگ بھی اندر آ گیا تھا۔ اس نے باوردی افسر کا بازو پکڑا اور اسے زمین پر گرادیا۔ تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر میز کے پیچھے ڈال دیا۔ یونگ نے اس کا چینی ساختہ ریوالور بھی قبضے میں کر لیا۔

دونوں نے دفتر کی تلاشی لی اور جلد ہی مطلوبہ شے انہیں مل گئی۔ وہ اسٹینڈ پر رکھا ہوا لکڑی کا ایک بڑا باکس تھا جس میں تالا لگا ہوا تھا۔ ڈینگ سان نے آفیسر کی جیبوں کی تلاشی لی تو انہیں چابیوں کا گچھا مل گیا۔ چند سیکنڈ میں یونگ نے بکس کھولا اور اس میں سے ویرہاؤس کی چابی نکال لی۔ اس پر فیک لگا ہوا تھا۔ انہوں نے چابی قبضے میں کی اور خیمے

مقصد کے لیے جس محافظ کا انتخاب کیا گیا، وہ آدھ گھنٹے سے اپنی جگہ سے نہیں ہلکا تھا۔ یونگ اور ڈینگ سان کو یقین تھا کہ وہ سوچکا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔ وہ بڑی احتیاط سے اس کی جانب بڑھے۔ ڈینگ سان اس کے بائیں اور یونگ دائیں جانب ریٹک رہا تھا۔ ڈینگ سان پہلے اس تک پہنچ گیا۔ اس نے سوئے ہوئے محافظ کی جیبوں کی تلاشی لی پھر رائفل اور بڑی مقدار میں گولیاں یونگ کے حوالے کر دیں جبکہ رائفل میں پہلے ہی آٹھ راؤنڈ موجود تھے۔

کیمپ کی جانب ریٹک کے بجائے وہ بائیں جانب موجود دوسرے گارڈ کی جانب بڑھے۔ انہیں ایک اور رائفل کی ضرورت تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ فرار کے لیے ایک محفوظ راستہ بھی چاہ رہے تھے۔ دوسرا محافظ بیدار لیکن تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک پتھر سے دوسرے پتھر تک جاتا اور پھر ایک جگہ رک کر اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرتا۔ وہ خاصا چوکس تھا اور براہ راست اس کی جانب بڑھنا خطرے سے خالی نہ ہوتا چنانچہ یونگ نے ایک اور طریقہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو وہ بوسنیا میں بھی آزما چکا تھا اور اسے امید تھی کہ یہاں بھی وہی طریقہ کام آئے گا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا حالانکہ وہ خود سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن بعض اوقات کسی کو سگریٹ پیش کر کے اسے اپنا کام نکلوانے میں آسانی ہوتی تھی۔ اس لیے اس کی جیب میں سگریٹ کا پیکٹ ہمیشہ موجود ہوتا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا پھر اس نے دیا سلائی سے سگریٹ سلگایا اور آہستگی سے محافظ کی جانب بڑھا۔

”کومنگ! یہ تم ہو؟“ گارڈ نے اپنی آواز دہمی رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ ڈیوٹی کے دوران سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔“

یونگ نے کوئی جواب دینے کے بجائے زوردار کش لگایا تاکہ سگریٹ کی آگ تیز ہو جائے۔

محافظ نے حیرت سے اسے دیکھا اور دوبارہ بولا۔ ”کومنگ!“

اچانک ہی اس کے عقب سے ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، ڈینگ سان نے اس کا ماتھا پکڑا اور نکو اس کی گردن پر پھیر دی۔ محافظ ڈمگایا اور خاموشی سے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ڈینگ سان نے جھک کر دیکھا۔ وہ مر چکا تھا۔ انہوں نے دوسری رائفل بھی قبضے میں کی اور کیمپ کے وسط میں موجود گودام کی طرف بڑھے۔ یونگ نے گیٹ

سے باہر آ گئے۔

”بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“ یونگ نے ان سے کورین میں کہا۔ ”تم ہمارے ساتھ ہی یہاں سے جاؤ گے۔“

ڈینگ سان نے کچھ میں سے جابیاں ٹولیں اور ایک ایک کر کے تمام لوہے کے بنجرے کھول دیے۔ وہ سب گودام کے بیرونی دروازے پر جمع ہو گئے۔ یونگ نے ان کی گنتی کی تو معلوم ہوا کہ قیدی بنائے جانے والے ان افراد میں چھ مرد اور آٹھ عورتیں تھیں۔ وہ سب زمین پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ یونگ نے انہیں بتا دیا تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد زبان کے بجائے ہاتھ کے اشاروں سے کام لیا جائے گا۔ وہ سب کیمپ سے نکلنے کے بعد ڈینگ سان کے پیچھے چلیں گے لیکن اس سے پہلے اسے امریکن نرس کو بھی ساتھ لینا ہے۔ ان قیدیوں نے سرگوشی میں اسے بتایا کہ نرس کو علیحدہ خیمے میں رکھا گیا ہے۔ جہاں بیماروں کا علاج ہوتا ہے۔ یونگ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اس وقت اس خیمے میں ایک ہی بیمار بچہ موجود ہے جسے لوگ چھوٹے رپچھ کے نام سے جانتے ہیں اور وہ سفید رپچھ کا اکلوتا پوتا ہے۔

”گویا وہ اس کی تیمارداری کے لیے یہاں لائی گئی ہے؟“ یونگ نے کہا۔

”ہاں۔“ ایک قیدی نے اسے بتایا۔ ”وہ سفید رپچھ کا اکلوتا وارث ہے۔ اس کا باپ ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا اور اب اس کی بیماری نے سفید رپچھ کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ لڑکا ہر وقت کھانسیا رہتا ہے اور اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ مرنہ جائے لیکن امریکن نرس کے آنے کے بعد اس کی حالت میں بہتری آئی ہے۔“

یہ نرس کروڈی کا کردار اور پیٹھے سے اس کی لگن تھی کہ وہ ایک ایسے شخص کے پوتے کی تیمارداری کر رہی تھی جس نے اسے قید میں رکھا ہوا تھا۔

”اس لڑکے کے صحت یاب ہو جانے کے بعد وہ نرس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟“ یونگ نے پوچھا۔

قیدی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”شاید وہ اسے بیچ دیں جس طرح انہوں نے ہمیں بیچنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔“

یونگ گودام سے نکل کر اس خیمے کی جانب چل دیا جہاں نرس کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ وہ خیمہ میڈ کوارٹر کے پیچھے کیمپ کے عقبی حصے میں تھا۔ اس وقت وہاں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی لیکن کسی وقت بھی محافطوں کی ڈیوٹی تبدیل ہو سکتی تھی۔ یونگ کے علم میں تھا کہ زیادہ تر محافطوں

گودام کا دروازہ ہلکی سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ کھل گیا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے لائٹ آن کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ چند لمحوں کے اندر صبرے میں ہی دیکھتے رہے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا تھا لیکن اسے مقفل نہیں کیا۔ ڈینگ سان کو وہاں لکڑی کا روشن دان نظر آیا تو اس نے وہ کھول دیا اور اس کے ذریعے چاند کی روشنی گودام میں داخل ہو گئی۔ یونگ نے اپنی دانست میں جوا کھینچا تھا کہ نرس کروڈی، گودام میں ہوگی کیونکہ پورے کیمپ میں یہی ایک مستقل عمارت تھی لیکن یہ یقینی نہیں تھا۔ وہ کسی خیمے میں بھی ہو سکتی ہے اور یہ امکان بھی تھا کہ اسے رسی یا زنجیروں سے باندھ دیا گیا ہوتا کہ وہ بھاگ نہ سکے۔ اس کے باوجود گودام کسی قیدی کو رکھنے کے لیے بہترین جگہ ہو سکتی تھی۔

وہ تختوں کے پاس سے گزرے جن پر لکڑی اور گتے کے باکس رکھے ہوئے تھے اور ہر ایک پر چھنی یا جاپانی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ چند ایک پر انگریزی عبارت بھی نظر آئی۔ ان میں زیادہ تر ڈبوں میں بند اشیا مثلاً پھل، سبزیاں، گوشت اور کھانے پینے کا دوسرا سامان تھا۔ ایک لکڑی کی سیڑھی کے ذریعے وہ محتاط انداز میں دوسری منزل پر پہنچے۔ یونگ رک گیا اور نتھنے سکڑتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ انسانی غلامت کی بوجھ شدید تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لکڑی کے شہتیروں سے ستاروں کی روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ یونگ آگے بڑھ کر جھکا اور اس نے دیکھا کہ وہاں چار فٹ اونچی لوہے کی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔ یہ بنجرے تھے اور ان میں گھاس پر کچھ لوگ سٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے حرکت نہیں کی۔ یونگ دوسرے بنجرے کی جانب گیا، وہاں بھی سب لوگ بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔

یونگ نے ڈینگ سان کو اشارہ کیا۔ اس نے جیب سے ایک نارنج نکالی اور یونگ کو پکڑا دی۔ اس نے یہ نارنج خیمے سے اٹھائی تھی۔ یونگ نے نارنج روشن کی اور اس کی روشنی بنجرے میں بیٹھے ہوئے شخص پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“

اس شخص کی آنکھ میں آنسو آ گئے اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ یونگ نے نارنج کی روشنی اطراف میں ڈالی تو اسے مزید کئی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے لرزاتے نظر آئے۔

قرض

ایک آدمی تالاب میں ڈوب رہا تھا، اس کے دوست نے چلائنگ لگا کر اسے بچالیا۔ لوگوں نے پوچھا: ”تم تو اتنے ڈرپوک ہو، اسے بچانے کے لیے پانی میں چلائنگ کیسے لگا دی؟“

وہ بولا۔ ”مجھے اس آدمی سے اپنے پانچ سو روپے وصول کرنے تھے۔ اگر یہ ڈوب جاتا تو میرے پانچ سو روپے بھی ڈوب جاتے۔“

☆☆☆

تکرار

ایک بس میں کنڈیکٹر اور ایک نوجوان عورت کے درمیان بچے کی عمر کے بارے میں تکرار ہو رہی تھی۔ ”میرا لڑکا چار سال کا کس طرح ہو سکتا ہے، تم ہی بتاؤ میری شادی کو ابھی تین سال پورے نہیں ہوئے۔“

کنڈیکٹر زچ آکر بولا۔ ”میڈم! میں صرف بچے کا ٹکٹ لینے کا کہہ رہا ہوں، کیونکہ وہ چار سال کا لگتا ہے لیکن آپ خواہ مخواہ اپنی شادی اور بچے کی پیدائش کے بارے میں ایسی صفائی پیش کر کے شبہات پیدا کر رہی ہیں۔“

سید خواجہ ممتاز علی، راولپنڈی

کردیکھ رہی تھی۔ ”یہ لڑکا اس کا پوتا ہے اور اسے کالی کھانسی ہو گئی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس کے لیے کچھ کر سکتی ہوں لیکن یہ ٹھیک نہیں ہو رہا کیونکہ یہاں علاج معالجہ کی کوئی سہولت نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ اسے آرام پہنچا سکتی ہوں۔ یہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا یا نہیں۔“

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”تم بولنے میں احتیاط سے کام لو۔ یہ تھوڑی بہت انگریزی سمجھ لیتا ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ یونگ نے جواب دیا۔ ”امید ہے کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اگر اس نے ہمیں مشکل میں ڈالا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“

نرس کی زنجیر کا تالا کھل گیا اور وہ اپنے ٹخنے کو سہلانے لگی۔ یونگ نے کہا۔ ”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

”ایک منٹ۔“ نرس نے کہا پھر وہ آگے بڑھی۔ اس نے چھوٹے ریچھ کے گرم گالوں کو چھوا پھر جبک کر ان کا بوسہ لے لیا۔

کی ڈیوٹی ہر دو گھنٹے بعد بدل جاتی ہے۔ اس کے بعد اچھے سے اچھا سپاہی بھی چوکس نہیں رہ سکتا۔ یونگ کو اندازہ تھا کہ اسے کیپ میں آئے ہوئے دو گھنٹے ہونے ہی والے تھے اور اب اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

خیمے میں موسم بتی روشن تھی۔ یونگ نے پردہ ہٹا کر جھانکا تو اس کی نظر ایک طویل قامت شخص پر گئی۔ ناکافی روشنی میں اس کا ہیولا واضح نہیں تھا لیکن اس کے لمبے قد سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ نرس کروڈی نہیں ہے، پھر رات کے اس پہر کون یہاں آسکتا ہے پھر فوراً ہی اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ایک ہی شخص ہے جو اپنے قانونی وارث کے لیے فکر مند ہو سکتا ہے۔ اس نے رائفل کا سیفٹی کچھ ہٹایا اور آندھی طوفان کے مانند خیمے میں داخل ہو گیا۔ آہٹ سنتے ہی سفید داڑھی والا شخص اس کی جانب گھوم گیا۔

”ایک بھی آواز نکالی۔“ یونگ غراتے ہوئے بولا۔ ”تو یہیں تمہیں کھڑے کھڑے مار دوں گا۔“

اس شخص نے براؤن رنگ کی ادنی پتلون اور اسی رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ یونگ کی دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ دہنگ لہجے میں بولا۔ ”تم یہاں سے زندہ نہیں جاسکتے۔“

”اگر میں مرا تو تمہیں بھی ساتھ لے کر مروں گا۔“ یونگ نے کہا۔

اس شخص کے پیچھے ایک سفید چادر سی پر لٹک رہی تھی۔ یونگ نے اس کی طرف رائفل کا رخ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے احتیاط سے چادر ہٹا کی اور خیمے کے عقبی حصے میں داخل ہو گیا۔ وہاں بستر پر ایک

آٹھ نو سال کا لڑکا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں ایک فولڈنگ چیئر پر نرس کروڈی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بہت نڈھال اور ہلکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔

اس کے ٹخنے میں ایک زنجیر بندھی ہوئی تھی۔

یونگ، تم! وہ بے یقینی کے عالم میں بولی۔

یونگ کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے چابیوں کا کچھا نکالا اور اسے نرس کی طرف اچھالا جسے اس نے بڑی پھرتی سے اچک لیا پھر وہ کسی چٹکچٹا ہٹ کے بغیر جھکی اور مطلوبہ چابی تلاش کرنے لگی۔

یونگ نے بوڑھے آدمی پر سے نظریں ہٹائے بغیر نرس سے انگریزی میں پوچھا۔ ”یہ شخص کون ہے؟“

”سفید ریچھ۔“ نرس کروڈی نے کہا۔ وہ باری باری ہر چابی کو اپنے ٹخنے کی زنجیر میں پڑے ہوئے تالے میں لگا

یونگ نے کہا۔ ”اسی زنجیر سے اس بوڑھے کے ہاتھ پشت کی جانب باندھ دو اور زنجیر کا دوسرا سرا اس بانس کے گرد لپیٹ کر اسے مقفل کر دو۔“

نرس احتیاط سے آگے بڑھی اور یونگ کی ہدایت کے مطابق سفید ریچھ کو خیمے کے وسط میں گڑے ہوئے بانس کے ساتھ باندھ دیا۔

”اب اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دو تاکہ یہ شور نہ مچا سکے۔“

نرس نے دراز کی تلاشی لی تو اسے وہاں کپڑے کی پٹی اور ٹیپ مل گیا۔ اس نے کپڑا اس کے منہ میں ٹھونس کر اس پر ٹیپ لگا دیا۔ جب وہ اپنا کام ختم کر چکی تو یونگ سفید ریچھ کی جانب بڑھا اور رائفل کی نال سے اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان نشانہ لینے لگا۔

”نہیں، ایسا مت کرو۔“ نرس نے کہا۔

”کیوں؟ یہ ایک چور، زانی اور بردہ فروش ہے۔“

اسے مرجانا چاہیے۔“

”نہیں، ایسا نہیں کرو۔“ نرس نے دوبارہ کہا تو یونگ نے رائفل کا رخ چھوٹے ریچھ کی طرف کر لیا۔ سفید ریچھ نے یہ دیکھ کر اپنے آپ کو زنجیر سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ یونگ نے نال کا رخ آسمان کی طرف کیا اور بولا۔ ”اگر تم نے ہمارا پیچھا کیا تو میں واپس آ کر تم دونوں کو جان سے مار دوں گا۔“

سفید ریچھ نے اسے گھورا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت ٹپک رہی تھی۔ یونگ اسے بے بسی کے عالم میں چھوڑ کر نرس کے ہمراہ گودام میں آیا جہاں سب لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ چند لمحوں بعد یہ قافلہ واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ لوگ جھیل تک پہنچ پائے تھے کہ کیمپ سے الارم بجنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ قیدیوں کو دوڑنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ ان کی ٹانگیں گھنٹوں ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے اکڑ گئی تھیں تاہم نرس اور دوسرے صحت مند قیدیوں نے ان کی مدد کی اور وہ چلنے کے قابل ہو گئے۔

کچھ دور آگے چلنے کے بعد ڈینگ سان ایک جگہ رک گیا تاکہ ان مسلح لوگوں کا راستہ روک سکے جو سفید ریچھ کے کیمپ میں جمع ہو رہے تھے۔ یونگ نے کہا کہ اسے زیادہ دیر رکنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر ڈینگ سان نے اسے یقین دلایا کہ وہ صرف چند فائر کرے گا تاکہ ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکا جاسکے۔ ڈینگ سان کو وہیں چھوڑ کر یہ قافلہ ڈھلان کی جانب بڑھ گیا۔ ابھی ان لوگوں نے آدھے میل کا

فاصلہ طے کیا تھا کہ فائر کی آوازیں آنے لگیں۔ یونگ کو امید تھی کہ ڈینگ سان اتنا احمق نہیں کہ اس سلسلے کو دیر تک جاری رکھے۔

یونگ نے جس جگہ اپنی گاڑی اور ٹوکو چھوڑا تھا، وہاں پہنچ کر اس نے قافلے کے لوگوں کو کچھ دیر آرام کرنے کے لیے کہا۔ اب وہ لوگ خطرے کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور فائر کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ یونگ نے نرس کروڑی اور کورین پناہ گزینوں کو ہدایات دیں اور سمجھایا کہ وہ کس طرح پناہ گزینوں کے کیمپ تک پہنچ سکتے ہیں۔

”کیا تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے؟“ نرس نے پوچھا۔ ”میں یہاں رک کر ڈینگ سان کا انتظار کروں گا۔ اس کے آنے کے بعد ہم دونوں کوشش کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہو سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں کی پیش قدمی روک سکیں۔“ نرس کروڑی اپنا سرد ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”اپنا خیال رکھتا۔“

اس نے سر ہلایا اور ٹیلے کے عقب میں پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ڈینگ سان بھی آ گیا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”سفید ریچھ غصے سے پاگل ہو گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں سو گز دور سے سنی تھیں۔“

”اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“ یونگ نے پوچھا۔

”بیس کے قریب تو ہوں گے۔“

”کیا وہ سینکڑوں میں داخل ہو سکتے ہیں؟“

”ممکن ہے۔ ایسے موقع پر پولیس اپنا منہ چھپا لیتی

ہے کیونکہ سفید ریچھ نے انہیں خرید رکھا ہے اور وہ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔“

یونگ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں کو اتنی دیر روک سکے کہ نرس کروڑی اور دوسرے لوگ سینکڑوں اور وہاں سے مہاجر کیمپ تک پہنچ سکیں۔ ایسی صورت میں وہ وقتی طور پر محفوظ رہیں گے۔“

جب سفید ریچھ اور اس کے ساتھی وہاں پہنچے تو شفق کی لالی آسمان پر نمودار ہو رہی تھی۔ اب ڈینگ سان اور یونگ کو بڑی احتیاط سے اپنا اسلحہ استعمال کرنا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے اپنا شکار منتخب کر رہے تھے۔ کچھ دیر تو سفید ریچھ کے ساتھیوں نے بے دریغ گولیاں چلائیں پھر انہیں اپنے نقصان کا اندازہ ہوا تو وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ سورج اب پوری طرح نکل آیا تھا اور یونگ سوچ رہا تھا کہ وہ اس

ایک نوجوان شاعر جب پہلی بار میک لگا کر
شاعرے میں نظم پڑھنے گیا تو بوڑھے میزبان شاعر
نے کہا۔ ”میک لگا کر تم بالکل بجو لگتے ہو۔“
نوجوان شاعر بولا۔ ”میک اتار دو تو پھر آپ مجھ
کو بجو لگیں گے۔“

ٹریجڈی

مادہ کیٹنگروم میں داخل ہوئی تو زکینگرو نے
پوچھا۔

”منا کہاں ہے؟“

مادہ کیٹنگرو نے جھک کر نیچے دیکھا اور چلا اٹھی۔
”اوہ میرے خدا...! کسی نے میری جیب
کاٹ لی...!“

بات کا بہت کم امکان تھا کہ چینی حکام ان کے کاغذات
چیک کریں گے۔

یونگ اور ڈینگ سان پہلے ہی محافظوں سے چھنی ہوئی
رائفلوں سے چھٹکارا حاصل کر چکے تھے کیونکہ وہ غیر قانونی
اسلحہ رکھنے کے الزام میں گرفتار ہونا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی
وہ انہیں بچ سکتے تھے کیونکہ یہ اس سے بڑا جرم تھا۔ لہذا انہوں
نے اس اسلحہ کو مزدوروں کے کیمپ کے باہر گڑھا کھود کر دفن
کر دیا۔ سفید ریچھ اور اس کے ساتھی ٹھگ بھی مسلح نہیں تھے۔
یونگ کا خیال تھا کہ وہ لوگ ڈیاؤ منگ کے ساتھیوں کی آڑ میں
ٹرین تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اچانک سفید ریچھ کے ساتھیوں میں سے ایک نے
اس کورین عورت کی جانب اشارہ کیا جسے مزدور عورتوں نے
اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس شخص نے سفید ریچھ کے
کان میں سرگوشی کی اور وہ بھڑک اٹھا جیسے کوئی اس کی قیمتی
شے لے جا رہا ہو۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو احکامات دینا
شروع کیے اور اس کے نصف درجن ساتھی مجمع میں گھس
گئے۔ یہ دیکھ کر ڈیاؤ منگ بھی خاموش نہ رہ سکا اور اس نے
چلا کر اپنے ساتھیوں کو چوکس کرنا چاہا۔ اس پر ایک عورت
نے ٹھگوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن سب سے آگے والے
ٹھگ نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس پر شمالی کوریا کے پناہ
گزینوں نے بلند آواز میں آہ و زاری شروع کر دی۔

یہ منظر چینی مزدوروں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔
ان کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے اور انہیں یاد آ گیا کہ

موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ جائے یا یہیں رک کر ان کا
مقابلہ کرے بھی دیوتاؤں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اچانک زمین ہلنے لگی اور جس ٹیلے کے پیچھے انہوں
نے آڑ لے رکھی تھی، وہ بھی ڈگمگانے لگا۔ ڈینگ سان تیزی
سے پیچھے ہٹا جبکہ یونگ اپنی جگہ بیٹھا سفید ریچھ اور اس کے
ساتھیوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا پھر جو کچھ اس نے دیکھا،
وہ اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ سفید ریچھ اور اس
کے ساتھی اپنی پناہ گاہ سے باہر آئے۔ ان کی پشت یونگ کی
جانب تھی اور وہ پہاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر سفید
ریچھ نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے اور کوئی دعائیہ
گیت گانا شروع کر دیا۔ دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔

ایک بار پھر زمین میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اس مرتبہ
ایک شعلہ بلند ہوا پھر دھوکے کے بادل چھا گئے۔ یوں لگتا تھا
کہ آتش بازی ہو رہی ہے۔ پھر وہ شعلہ غائب ہو گیا لیکن
سفید ریچھ اور اس کے ساتھی اور زیادہ بلند آواز میں دعائیہ
گیت گاتے رہے پھر سفید ریچھ گھٹنوں کے بل جھکا اور اس
نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا۔ عین اسی وقت فضا میں ایک
سرسراہٹ سی سنائی دی۔ اس نے فوراً سر جھکا دیا۔ دیکھتے ہی
دیکھتے وہ ٹیلا کنکروں اور راکھ سے بھر گیا۔ یونگ اپنے سر کو
بچاتے ہوئے نیچے کی جانب جھکا اور لڑھکتا ہوا ڈینگ سان
کے قریب پہنچ گیا۔

”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ یونگ نے کہا اور وہ دونوں
ڈھلان پر چلنے لگے۔ کبھی کبھی وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے کہ سفید
ریچھ کے ساتھی ان کا تعاقب تو نہیں کر رہے۔

انہیں لے جانے والی ٹرین دوسری صبح آئی۔ اسی
مگاڑی سے ڈیاؤ منگ اور دوسرے عارضی مزدوروں کو
زرعی کیون میں جانا تھا جہاں انہیں آئندہ کٹائی کے لیے
کام مل سکتا تھا۔ وہ سینکڑوں کھیتوں میں اپنا کام ختم کر
چکے تھے۔ پلیٹ فارم لوگوں سے کچا مچ بھرا ہوا تھا۔ ان
میں عارضی مزدوروں کے علاوہ مقامی شہری بھی تھے جو
دوبارہ لاوا پھوٹنے کے ڈر سے عارضی نقل مکانی کر رہے
تھے۔

یونگ ٹکٹ خرید کر آیا تو ڈینگ سان نے اسے کہنی
سے ٹھوکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سفید ریچھ اپنی جیکٹ
میں ملبوس نصف درجن لوگوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا جو شکل
سے ہی ٹھگ لگ رہے تھے۔ ڈیاؤ منگ وعدہ کر چکا تھا
کہ وہ شمالی کوریا کے پناہ گزینوں کو اپنے قافلے میں شامل
کرے گا اور انہیں کام پر بھی لگوا دے گا۔ اس لیے اس

ماضی میں سفید ریچھ اور اس کا گروہ ان کے ساتھ کیا سلوک کر چکا ہے لیکن اس بار حالات مختلف تھے۔ شاید یہ بے بس کورین عورتوں کی موجودگی تھی یا پھر ان کے اندر نرس کروڈی جیسی تعلیم یافتہ عورت کو دیکھ کر ہمت پیدا ہو گئی تھی لہذا وہ خونخوار بھیڑیوں کی طرح سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔

ٹرین نے سیٹی دی تو سب لوگ چیختے چلاتے اس کی طرف بھاگے۔ سفید ریچھ اور اس کے ساتھی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چینی مزدور انہیں لاتیں گھونے مار رہے تھے۔ سفید ریچھ نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجمع کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ تھوڑی دیر میں وہ زمین پر گر چکا تھا اور اس کی حفاظت کرنے والے ٹھگ بھی ایک ایک کر کے پسپا ہو رہے تھے۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد تمام چینی مزدور اور کورین پناہ گزین ٹرین پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یونگ، ڈینگ سان اور نرس کروڈی کو آخری یوگی میں جگہ ملی۔ ٹرین کے جانے کے بعد تین پولیس والے زمین پر چت پڑے ہوئے ٹھگوں کے سر پر پھینچ گئے۔ ان میں سے ایک نے سفید ریچھ کے منہ پر تھوکا اور دوسرا اپنے جوتے سے اس کے جسم پر ضربیں لگانے لگا۔ سفید ریچھ کے منہ سے خون بہنے لگا اور اس کی آنکھیں خلا میں جم کر رہ گئیں۔ اس کی دہشت اور طاقت ختم ہو چکی تھی اور اب وہ ایک بے وقعت انسان کی طرح چینی سپاہیوں کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

کیمپ واپس پہنچنے پر ڈاکٹر البرڈو نے نرس کروڈی کا پری تپاک خیر مقدم کیا پھر اس نے اسے امیر جنسی روم میں بھیج دیا تاکہ اس کا طبی معائنہ کیا جاسکے۔ اس کے جانے کے بعد وہ یونگ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب ہمیں یہاں کی سیکورٹی بڑھانی ہوگی۔ میں نہیں چاہتا کہ دوبارہ اس طرح کا واقعہ ہو۔“

یونگ نے ڈینگ سان کی پیٹھ تھپتھپائی اور بولا۔ ”اب یہ تمہارا نیا سکیورٹی انچارج ہوگا۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ ڈاکٹر نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”میرا استعفیٰ کل صبح تمہاری میز پر پہنچ جائے گا۔“

”لیکن کیوں؟ اتنا اچھا کام کرنے کے بعد تم یہاں سے جا رہے ہو؟“

”ہاں، میرے جانے کا وقت آ گیا ہے۔“ یونگ نے کہا۔ ”اگر زیادہ عرصہ کوئی کام کر لوں تو بے چینی ہونے لگتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تعریفی خط دوں گا اور

تمہارے جانے کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔“

بیجنگ جانے والی بس میں سوار ہوتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی اگلی منزل کون سی ہو سکتی ہے لیکن جلد ہی اس کے خیالات کا رخ نرس کروڈی کی طرف ہو گیا اور اسے ٹرین کے سفر میں ہونے والی گفتگو یاد آنے لگی۔ نرس نے اس سے پوچھا تھا۔ ”کیا وہ محفوظ رہیں گے؟“ اس کا اشارہ شمالی کوریائی پناہ گزینوں کی جانب تھا۔

”ہاں۔“ یونگ نے جواب دیا۔ ”ڈیڈ منگ نے انہیں کام دلوانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ محنتی لوگ ہیں اور ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ چینی مزدوروں کے درمیان رہ کر کام کریں۔“

”چھوٹے ریچھ کا کیا ہوگا؟“ وہ فکر مندی سے بولی۔

”اس کا باپ اور دادا، دونوں ہی دنیا سے چلے گئے۔“

”اس کی فکر نہ کرو۔ وہ اپنے لوگوں کے درمیان ہے۔“ یونگ نے کہا۔

”مجھے اُمید ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یونگ نے وہ بات کہہ دی جو وہ عرصے سے کہنا چاہ رہا تھا۔ یہ الفاظ منہ سے نکالنا آسان نہ تھا اور نہ ہی وہ ایسی گفتگو کا عادی تھا مگر اس نے ہمت کر ڈالی۔ نرس نے پیار سے اس کی جانب دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی توجہ کا مرکز وہ نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ نرس کروڈی کو اپنے کام سے محبت تھی۔ وہ بچوں پر جان چھڑکتی تھی اور وہ کسی ایسے مرد کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی تھی جو اسی کی طرح مہربان، حساس اور جذباتی ہو۔ نرس کروڈی نے جو کچھ کہا، اس کا مفہوم اب اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ وہ اسے پسند کرتی تھی لیکن اس کے لیے جذباتی نہیں تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ ایک روز اپنے لیے کوئی مناسب لڑکی تلاش کر لے گا۔

بس بیجنگ کے اسٹیشن پر رکی تو اس نے اپنا سامان سنبھالا اور نیچے اتر آیا۔ اس کے دائیں بائیں لاتعداد عورتیں چل رہی تھیں۔ ان میں سے کئی بہت خوب صورت اور اسارٹ تھیں لیکن کوئی بھی نرس کروڈی جیسی نہیں تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اتنے بڑے جھوم میں اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کیا۔ اسے یوں لگا کہ وہ جیت کر بھی ہار گیا تھا پھر اس کی نظر ایک بار پرگنی اور وہ اس جانب بڑھ گیا۔



چھٹکارا

سلیم نثار روتی

شطرنج کا کھیل سکون... سوچوں اور ذہنی قلابازیوں کا نام ہے... ایک مہرہ آگے بڑھانے کے لیے دور تک سوچنا پڑتا ہے... ورنہ ایک غلط چال پوری بازی کو پلٹ دیتی ہے... ہار سے بچنے کے لیے مہرے کو پٹوانا بھی پڑتا ہے... زندگی کی بساط پر بکھرے کچھ ایسے ہی مہروں کا شاطرانہ کھیل... جو پرانے اور بیکار مہروں سے نجات کے لیے آخری حد تک جا پہنچے تھے...

ازدواجی زندگی کی نازک ڈوریں... جو سخت اور غلط سستوں میں بندھ چکی تھیں...

جمشید نے اسے ایک پارٹی میں دیکھا تھا۔ وہ لڑکی اتنی ہی حسین تھی کہ جمشید کی آنکھیں گویا چندھیا گئی تھیں۔ اگر رضوانہ ساتھ نہ ہوتی تو وہ ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر حسینہ سے ملاقات کر لیتا۔

وہ اس وقت تنہا تھی اور ایک طرف بیٹھی مہمانوں کو گھور رہی تھی۔ شاید اسے کسی دوست کی آمد کا انتظار تھا۔ اچانک رضوانہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔ ”جمشید، میں ذرا واش روم کی طرف جا رہی ہوں۔“

جمشید نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس مسکرا کر رہ گیا۔

رضوانہ کے جاتے ہی وہ حسینہ اپنی جگہ سے اٹھی اور خراماں خراماں چلتی ہوئی جمشید کے پاس آئی اور بہت ادا سے بولی۔ ”اگر میں غلطی نہیں کر رہی ہوں تو آپ آرٹس کرافٹس ایڈورٹائزنگ کے اوز مسٹر جمشید ہیں؟“

جمشید چونک اٹھا۔ وہ شہر کی جانی پہچانی شخصیت تھی۔ اکثر اخبارات اور ٹی وی پر اس کے انٹرویوز آتے رہتے تھے۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ بالکل غلطی نہیں کر رہی ہیں۔ میں ہی جمشید ہوں۔“

”میں شائلہ ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ”آپ نے شاید مجھے ایک ٹالک شو پاؤڈر کے اشتہار میں دیکھا ہو؟“

”ہاں، چہرہ کچھ جانا پہچانا تو لگ رہا ہے۔ گویا آپ ماڈل ہیں؟“

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”آپ نے درست فرمایا۔“ ”آپ ایسا کریں۔“ جمشید نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا کارڈ رکھ لیں اور کل کسی وقت ٹیلی فون کر کے میرے آفس آجائیے گا۔“

شائلہ نے کارڈ لیا اور مسکرا کر بولی۔ ”میں ضرور حاضر ہو جاؤں گی۔“ وہ لہراتی ہوئی واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد رضوانہ واپس آگئی۔

وہ لوگ ڈنر کے بعد واپس آئے تو جمشید کے حواس پر شائلہ سوار تھی۔ اس کی عمر ایسی نہیں تھی کہ کسی بھی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جائے۔ وہ چالیس سال کی عمر سے تجاوز کر چکا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس کے لیے خوب صورت چہروں کی کوئی کمی ہو۔ وہ ملک کی ایک بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی کا مالک تھا۔ شہر کے پوش علاقے میں اس کا بہترین آفس تھا۔ روزانہ اس کا واسطہ ماڈل لڑکیوں سے پڑتا رہتا تھا۔ اس کے دفتر میں بھی کئی خوب صورت اور طرح دار لڑکیاں ملازمت کرتی تھیں لیکن شائلہ میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ پہلی ہی نظر میں اس کے حسن کا اسیر ہو گیا تھا۔

جمشید کی بیوی رضوانہ بھی بہت خوب صورت تھی اور جمشید نے اس سے پسند کی شادی کی تھی۔ اس سلسلے میں رضوانہ زیادہ جنونی تھی۔ وہ جمشید پر صرف اپنا حق سمجھتی تھی۔ جمشید اس سے دبتا بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس پورے کاروبار کی مالک رضوانہ تھی۔ پندرہ برس پہلے جمشید اس

ایڈورٹائزنگ فرم میں کلائنٹ ایگزیکٹو کے طور پر کام کرتا تھا، وہ بہت محنتی تھا۔ کمپنی کے مالک غزالی صاحب اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی رضوانہ بھی اکثر آفس آتی رہتی تھی۔ جمشید کی پہلی ملاقات رضوانہ سے غزالی صاحب کے دفتر ہی میں ہوئی تھی۔ رضوانہ نے جمشید کو دیکھا تو اس کی مردانہ وجاہت پر مرئی۔ جمشید کو بھی رضوانہ پسند آئی تھی۔

پھر دونوں کی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور یہ ملاقاتیں بالآخر شادی پر ختم ہوئیں۔ غزالی صاحب بھی جمشید کو پسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جمشید ان کی فرم کو زیادہ بہتر طریقے سے سنبھال سکتا ہے۔ جمشید نے اپنی محنت سے ثابت کر دیا کہ ان کا خیال غلط نہیں تھا۔

دو سال پہلے غزالی صاحب کا انتقال ہو چکا تھا لیکن انہوں نے شادی کے فوراً بعد ہی کمپنی کے تمام اختیارات جمشید کو سونپ دیے تھے۔ اب کمپنی کی مالک تو رضوانہ تھی لیکن عملی طور پر کمپنی کی تمام ذمے داریاں جمشید پر تھیں۔

جمشید کے لیے زیادہ تکلیف دہ رضوانہ کی شکی فطرت تھی۔ وہ بات بات پر جمشید پر شک کرتی تھی۔ وقفے وقفے سے دفتر ٹیلی فون کر کے یہ معلوم کرتی رہتی تھی کہ جمشید دفتر ہی میں موجود ہے یا نہیں۔ وہ اچانک دفتر بھی آجاتی تھی۔ وہ اتنی شکی مزاج تھی کہ محض شک کی بنا پر جمشید کی تین پرسل سیکریٹریز کو ملازمت سے فارغ کر چکی تھی۔

جمشید اگر کسی وقت رضوانہ سے محبت کرتا بھی تھا تو اب اس کا جذبہ مر چکا تھا۔ اب تو وہ رضوانہ کو محض اس کی دولت اور جائیداد کی خاطر برداشت کر رہا تھا۔ اگر رضوانہ اس فرم کی مالک نہ ہوتی تو جمشید اب تک اس سے علیحدگی اختیار کر چکا ہوتا۔

”تم ابھی تک سوئے نہیں؟“ رضوانہ کی آواز پر جمشید چونک اٹھا۔

وہ نہ جانے کب سے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر اسے شائلہ کا خیال آ رہا تھا۔

”آج پتا نہیں کیوں مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔“ جمشید نے بیزارگی سے کہا۔

”بیڈ کی سائڈ دراز میں میری سلپنگ پلنز ہیں۔“ رضوانہ نے کہا۔ ”اس میں سے ایک ٹیمپلیٹ لے لو۔“ رضوانہ نے اسے مشورہ دیا اور کروٹ بدل لی۔

”میرے سونے اور جاگنے کا اسے بہت خیال ہے؟“

آج مجھے سیمائی تھی۔“

”کون سیمائی؟“ جمشید نے پوچھا۔

”ارے تم سیمائی کو بھول گئے۔ وہ بیوٹی کوئین جو...“

”اچھا اچھا، وہ سیمائی۔“ جمشید کو یاد آ گیا۔ ”وہ جو

تمہاری بیسٹ فرینڈ تھی اور جس نے ہماری شادی میں بہترین ڈانس کیا تھا۔“

”ہاں وہی سیمائی۔“ رضوانہ نے کہا۔ ”پھر عجیب سے

لہجے میں بولی۔“ اس کی شادی ہماری شادی کے ایک سال

بعد ہوئی تھی۔ اب اس کا نو سال کا بیٹا ہے۔ سیمائی خود بھی ابھی

تک پہلے ہی کی طرح اسمارٹ اور پُرکشش ہے۔ کتنا اچھا

لگ رہا تھا جب اس کا بیٹا اسے ماما کہہ کر پکار رہا تھا۔“

”تمہیں اچھا لگ رہا تھا؟“ جمشید نے تلخ لہجے میں

کہا۔ ”تم تو بچوں کو پسند ہی نہیں کرتی ہو۔“

”فارگا ڈسک جمشید۔“ رضوانہ نے کہا۔ ”آج مجھے

احساس ہوا کہ میں غلطی پر تھی۔ سیمائی تو ماں بننے کے بعد پہلے

سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی ہے۔“

”شکر ہے تمہیں احساس تو ہوا۔“ جمشید کے لہجے میں

گہرا طنز تھا۔ ”یہی میں تم سے کہتا تھا تو تم مجھے ساس ہونے کا

طعنہ دیتی تھیں۔“

”طعنے تو تم اب بھی دے رہے ہو۔“ رضوانہ نے کہا۔

”سوری۔۔۔ میں سوچتی ہوں کہ اب مجھے بھی ماں بن جانا

چاہیے۔“

پھر رضوانہ واقعی اٹھتے بیٹھتے بچے کی آرزو کرنے لگی۔

جمشید اس کی بے نیازی دیکھتا تھا اور مسکراتا تھا۔ رضوانہ کو ہر

چیز کی جلدی ہوتی تھی۔ صبر تو اسے چھو کر بھی نہیں گزرتا تھا۔

”آخر وہ ایک دن شہر کی معروف ڈاکٹر شمسہ کے پاس

جا پہنچی۔ اس کی خواہش پر ڈاکٹر نے اس کے کئی لیبارٹری

ٹیسٹ کیے اور یہ بھیانک انکشاف کیا کہ رضوانہ بھی ماں نہیں

بن سکتی۔

”کیوں ڈاکٹر؟“ رضوانہ چیخ کر بولی۔

”اس کی ذمہ دار آپ خود ہیں مسز جمشید۔“ ڈاکٹر

نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آپ نے ابتدا میں فطرت کو اپنے

ڈھب پر چلانا چاہا، مختلف طریقوں سے اولاد کا راستہ روکا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے آپ کو اس بوجھ سے ہمیشہ کے

لیے آزاد کر دیا۔“

”اس کا علاج دنیا میں کہیں تو ہو گا؟“ رضوانہ نے

کہا۔ ”میں علاج کے لیے یورپ اور امریکا جاؤں گی۔“

”میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی خواہش پوری

جمشید نے چڑ کر سوچا۔ ”ہر جگہ آسیب بن کر میرے ذہن پر سوار رہتی ہے۔ اب میرے سونے اور جاگنے پر بھی اس کا حکم چلے گا۔ کم بخت کو اندھیرے میں بھی نظر آتا ہے ملی کی طرح۔“

پھر کروٹیں بدل بدل کر رات کے نہ جانے کس پہر جمشید سو گیا۔

صبح اس کی طبیعت کافی بوجھل تھی۔ وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو رضوانہ پہلے سے وہاں موجود تھی اور اخبار پر نظر دوڑا رہی تھی۔

جمشید نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح پُرکشش اور متناسب جسم کی مالک تھی۔ اس کی فکر اب بھی وہی تھی جو شادی کے وقت تھی لیکن اسے اپنی اس خوب صورتی کا بہت بھاری معاوضہ دینا پڑا تھا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ ماں بننے کو تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ جمشید اس سے کہتا تو وہ ترش لہجے میں کہتی۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی گنوار عورتوں کی طرح بچے پیدا کرتی رہوں اور اپنے اس متناسب جسم سے ہاتھ دھو لوں۔ نہیں جمشید، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو عمر پڑی ہے۔ ابھی ہماری شادی کو صرف ایک ہی سال تو ہوا ہے۔“

”رضوانہ! ماں بننے سے تمہاری خوب صورتی میں کوئی کمی نہیں آ جائے گی بلکہ...“

”جمشید پلیز۔“ رضوانہ اس کی بات کاٹ دیتی۔ ”میں تمہارا لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میری ساس بننے کی کوشش مت کرو۔“

”عورت تو اولاد کے بغیر ادھوری ہوتی ہے، پھر تم کیسی عورت ہو؟“ جمشید نے تلخ لہجے میں کہا۔

”میں ابھی لڑکی ہوں۔“ رضوانہ نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ”عورت کہہ کر مجھے ڈی گریڈ مت کرو۔“

غزالی صاحب نے بھی کئی مرتبہ دبے لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ”بیٹا! اب تو گھر کا سونا پن کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میرے کان کب سے کسی ننھے بچے کی قلقلاریاں سننے کو ترس رہے ہیں۔“

رضوانہ ان کی بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔ وہ بے چارے نواسے، نواسی کی آرزو لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ان کی شادی کو دس برس سے زیادہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

ایک رات وہ سونے لیٹے تو رضوانہ نے کہا۔ ”جمشید!

کرے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

وہاں سے واپسی پر رضوانہ بہت اُداس تھی۔ وہ دیر تک روتی رہی۔

جشید نے اسے سمجھایا۔ ”رضوانہ! یہ کوئی بیماری نہیں ہے کہ جس کا علاج نہ ہو۔ تم میں خدا نخواستہ کوئی کمی بھی نہیں ہے۔ تم نے تو خود کئی بار اس بوجھ سے نجات حاصل کی ہے۔ یہاں نہ سہی، دنیا میں کہیں تو اس کا علاج ہوگا۔ سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ تم دل چھوٹا مت کرو۔ ہم امریکا جائیں گے۔“

پھر وہ دونوں چھ مہینے تک امریکا، برطانیہ اور یورپ کے کئی شہروں کے ماہر ڈاکٹروں کے پاس گئے لیکن رضوانہ کا علاج کوئی بھی نہ کر سکا۔

امریکا سے واپس آئی تو رضوانہ پہلے سے زیادہ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ وہ اب جشید پر پہلے سے زیادہ شک کرنے لگی تھی۔

ان کے گھر میں خالہ زینت برسوں سے کام کرتی تھیں۔ کام کیا کرتی تھیں، وہ گھر کے ایک فرد کی طرح تھیں۔ ان کی صرف ایک ہی بیٹی تھی، شکیلہ۔

اس دن خالہ زینت کے بدلے شکیلہ چائے لے کر آئی تھی، رضوانہ اسے دیکھ کر چونک اٹھی۔ چند برسوں میں اس نے خوب رنگ روپ نکال لیا تھا۔ تروتازہ چہرہ، متناسب جسم۔

رضوانہ نے کن انکھیوں سے جشید کی طرف دیکھا جو۔ ٹی دی پر کرکٹ میچ دیکھنے میں مصروف تھا۔

”اماں کہاں ہے تمہاری؟“ رضوانہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”امی کورات سے بخار آرہا ہے۔ بخار میں بھی ناشتا دی بنا کر گئی تھیں۔ مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ میں کوارٹر میں جا رہی ہوں۔ تم صاحب اور بیگم صاحبہ کو چائے دے آنا۔“

”اچھا اچھا۔“ رضوانہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب تم جاؤ، ضرورت ہوگی تو تمہیں بلا لوں گی۔“

”جی اچھا بیگم صاحبہ۔“ شکیلہ نے کہا اور واپس چلی گئی۔

جشید بظاہر ٹی وی دیکھ رہا تھا لیکن رضوانہ کی باتیں سن کر چونک اٹھا تھا۔ اسے محسوس ہو گیا تھا کہ اب خالہ زینت یہاں زیادہ دن نہیں رہیں گی۔

جشید کے اندازے کے برعکس رضوانہ نے دوسرا کام کیا، شکیلہ کی شادی اپنے دفتر کے ایک سلیز آفیسر سے کرا

دی۔ اس نے اپنے خیال میں یہ نیکی کا کام کیا تھا لیکن جشید جانتا تھا کہ اس نیکی کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔

”آج تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ رضوانہ نے جشید سے پوچھا۔

”آفس جانے کا پروگرام ہے۔“ جشید نے ہنس کر کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ آفس میں کوئی میٹنگ تو نہیں ہے یا تمہیں کسی کلائنٹ کے پاس تو نہیں جانا؟“

جشید چونک اٹھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے رضوانہ کو شاملہ کے بارے میں علم ہو گیا ہو۔ اس نے کہا۔ ”ایسا کوئی خاص پروگرام تو نہیں ہے، کوئی کلائنٹ آ بھی سکتا ہے۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”مجھے آج جیولرز کی طرف جانا تھا۔ میں نے نیکلس کے کچھ ڈیزائن پسند تو کیے تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک نظر تم بھی دیکھ لو، آخر آل تمہاری چوائس تو زبردست ہے۔“

”کس وقت جاؤ گی؟“ جشید نے پوچھا۔

”میں لنچ کے بعد آؤں گی۔“ رضوانہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ جشید نے اٹھتے ہوئے کہا اور بریف کیس اٹھا کر روانہ ہو گیا۔

راستے میں وہ ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاملہ کو آج کے بجائے کل بلا لے۔ پھر اس نے سوچا، لیکن میرے پاس تو شاملہ کا سل نمبر بھی نہیں ہے۔ اس نے بھی کسی ماڈل یا کسی اور لڑکی سے اس کا سل نمبر نہیں لیا تھا۔ ماڈلز تو خود ہی اس سے رابطہ کرنے کو بے چین رہتی تھیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔ اس نے سر جھٹک کر سوچا۔

وہ آفس پہنچ کر معمول کی مصروفیات میں لگ گیا۔

اچانک انٹرکام کی گھنٹی بجی تو وہ چونکا۔

”ہیس۔“ اس نے ریسپورڈ اٹھا کر کہا۔

”سر، یہ کوئی مس شاملہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ آپریٹر نے کہا۔

”اچھا نہیں اندر بھیج دو۔“ اس نے انٹرکام کا ریسپورڈ رکھ کر دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ کام کی وجہ سے اسے لنچ کرنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

پریشانی یہ تھی کہ لنچ کے بعد رضوانہ نے بھی آفس آنے کو کہا تھا۔

”اب کیا کروں؟“ جشید ہاتھ مل کر بولا۔ ”پھر اس نے خود ہی کہا۔“ کرنا کیا ہے۔ رضوانہ آتی ہے تو آئے۔“

شاملہ ایک ماڈل ہے اور ماڈلز تو میرے پاس آتی ہی رہتی

روکے۔ "جشید نے کہا پھر شاملہ سے بولا۔ "مس شاملہ، یہ میری وائف رضوانہ ہیں اور رضوانہ! یہ شاملہ ہیں، نئی ماڈل ہیں اور..."

"ہاں میں نے انہیں ایڈز میں دیکھا ہے۔"
"ہیلو مسز جشید۔" شاملہ نے کہا۔ "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"رہی بات کر رہی ہو یا تمہیں واقعی خوشی ہوئی ہے؟"
رضوانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر وہ جشید سے بولی۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ بیچ کے بعد آؤں گی۔"

"ہاں تو چلو، مجھے کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔"
پھر وہ شاملہ سے بولا۔ "مس شاملہ! آپ اپنی کچھ تصویریں مجھے بھجوا دیجیے گا۔ اگر کلاسٹ نے آپ کو اپروڈ کر دیا تو ہم آپ کو چانس ضرور دیں گے۔"

"تھینک یو سر۔" شاملہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو اپنی پروفائل بھجوادوں گی۔"

جشید اسے چائے کے لیے بھی نہ روک سکا۔ وہ رضوانہ کی فطرت سے واقف تھا۔

اس کے جانے کے بعد ہیون چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا۔

رضوانہ ہنس کر بولی۔ "یہ فوزیہ تو بہت ایکٹو ہو گئی۔ فوراً چائے بھی بھجوا دی لیکن میرا موڈ بالکل نہیں ہے چائے پینے کا۔"

"اگر تمہارا موڈ نہیں ہے تو پھر چلو، میں تو اس وقت یوں بھی چائے نہیں پیتا ہوں۔" جشید نے جلدی سے کہا۔
رضوانہ نے اپنے پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور اپنا میک اپ درست کرتے ہوئے بولی۔ "اس لڑکی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

"کس لڑکی کی بات کر رہی ہو؟" جشید نے تجاہل سے کام لیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رضوانہ، شاملہ کی بات کر رہی ہے۔

"میں اس لڑکی شاملہ کی بات کر رہی ہوں۔" رضوانہ نے کہا۔

"تم نے خود ہی تو اس سے کہا تھا کہ تم نے اسے کسی اشتہار میں دیکھا ہے۔" جشید نے بیزارگی کا مظاہرہ کیا۔

"میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔" رضوانہ نے کہا۔ "میں نے اسے حال ہی میں کہیں دیکھا ہے۔"

"اچھا دیکھا ہوگا۔" جشید نے کہا۔ "اب چلو، مجھے واپس آ کر کام بھی نمٹانا ہے۔"

ہیں۔ بس یہ کروں گا کہ شاملہ کا بھی نمبر لے لوں گا۔"
دروازے پر دستک ہوئی، دوسرے ہی لمحے شاملہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی گئی۔ اس نے بہت مسکور کن پر فیوم لگا رکھا تھا۔

"آئیے مس شاملہ۔" جشید نے خوش دلی سے کہا۔
شاملہ خراماں خراماں چلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آفس کے کمرے میں نہیں بلکہ ریسیپ پر چل رہی ہو۔ وہ جشید کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھیے نا، آپ کھڑی کیوں ہیں؟" جشید نے کہا۔
"تھینک یو۔" شاملہ نے کہا اور بہت ادا سے اس کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

جشید نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا اور کہا۔ "میرے لیے کافی بھجوائیں اور اب مجھے کوئی کال مت دیجیے گا۔" پھر وہ شاملہ سے مخاطب ہوا۔ "مس شاملہ! آپ کتنے عرصے سے ماڈلنگ کر رہی ہیں؟"

"مجھے ماڈلنگ کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے سر۔" شاملہ کھکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "صرف تین مہینے ہی ہوئے ہیں۔"

"اور آپ نے کتنے ایڈز کیے ہیں؟" جشید نے پوچھا۔

"میں نے چار... سوری پانچ ایڈز کیے ہیں سر۔"
"ویری گڈ!" جشید نے کہا۔

"میں ٹاپ کی ماڈل بننا چاہتی ہوں سر۔" شاملہ نے کہا۔ "اگر آپ مجھے موقع دیں تو میرا یہ خواب پورا ہو سکتا ہے۔"

"دیکھیں شاملہ..."
انٹرکام کی گھنٹی سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

جشید نے جھنجھلا کر ریسیور اٹھایا اور ناگواری سے بولا۔ "فوزیہ! میں نے منع..."

"فوزیہ نہیں، میں بول رہی ہوں رضوانہ۔" دوسری طرف سے رضوانہ کی آواز سنائی دی۔

"اچھا، تم ہو... تو باہر کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ نا۔"

فوراً ہی دروازہ کھلا اور رضوانہ بہت طمطراق سے اندر داخل ہوئی۔ وہ خاصی باوقار اور دلکش عورت تھی۔ شاملہ بھی اس سے مرعوب نظر آرہی تھی۔

"میں نے... تمہاری آپریٹر کا حراج درست کر دیا ہے۔ وہ مجھے بھی اندر آنے سے روک رہی تھی۔"

"اس کی اتنی جرأت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ تمہیں

”اتنے چڑچڑے کیوں ہو رہے ہو؟“ رضوانہ ہنس کر بولی۔
 ”آج کام کچھ زیادہ ہی ہے۔ احمر برادرز کی نئی کمپین بنانا ہے۔ انہیں یہ کمپین ارجنٹ چاہیے۔“
 ”چلو بھی، تم تو کام کی فینشن لے لیتے ہو۔“ رضوانہ مسکرا کر بولی۔

جشید اسے کیسے بتاتا کہ فینشن کام کی نہیں بلکہ تمہارے نازل ہونے کی ہے۔
 وہ دو گھنٹے بعد آفس پہنچا تو ذہنی طور پر بہت تھک گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر رضوانہ پر غصہ آرہا تھا۔ وہ وقت بے وقت نازل ہو کر اس کا دماغ خراب کر دیتی تھی۔ اس نے بے دلی سے کچھ کام کیا، پھر آفس سے باہر نکل آیا۔ گھر جانے کے بجائے اس نے جم خانہ کا رخ کیا۔
 وہ ابھی ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ سکا تھا کہ اس کے کانوں میں رضوانہ کی آواز آئی۔ ”تم تو آفس میں کام کرنے والے تھے؟“

جشید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دل چاہا کہ رضوانہ کے چہرے پر اتنی زور سے جھانپڑ مارے کہ اس کی ساری خوب صورتی دھری کی دھری رہ جائے۔ اس نے دل پر جبر کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یار، وہ احمر برادرز کے ذکی صاحب اپنے نئے پراجیکٹ پر مجھ سے ڈسکس کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں آفس کے بجائے یہاں بلا لیا۔“

وہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کسی خاتون کی آواز آئی۔ ”ہائے رضوانہ!“
 ”ہائے!“ رضوانہ نے جواب میں کہا اور اس خاتون کی طرف بڑھ گئی۔

اسی وقت جشید کو ذکی صاحب نظر آئے۔ جشید جانتا تھا کہ ذکی صاحب اکثر وہاں آتے ہیں لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ذکی صاحب آج ہی وہاں آجائیں گے۔ وہ جلدی سے ان کی طرف بڑھ گیا۔ یہ جھوٹ ایک طرح سے جشید کے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا تھا۔ ذکی صاحب واقعی اس سے اپنے نئے پراجیکٹ پر بات کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے کوئی وقت طے نہیں ہوا تھا۔

رضوانہ جم خانہ کا ایک چکر لگا کر لوٹی تو ذکی صاحب اور جشید کو بات کرتے دیکھ کر کچھ مطمئن ہو گئی۔ ایسے موقعوں پر وہ دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جشید اس وقت بھی آفس ہی کا کام کر رہا ہے۔

رہی بات چیت کے بعد ذکی صاحب نے جشید سے اپنے نئے پراجیکٹ کے بارے میں بھی سرسری سی بات چیت کی، پھر وہ اٹھ کر اکبر موتی والا کی طرف چلے گئے۔
 جشید تو یہاں کچھ تفریح کے لیے آیا تھا لیکن رضوانہ نے یہاں بھی نازل ہو کر اس کا موڈ خراب کر دیا تھا۔ وہ اب یہاں آ کر پچھتا رہا تھا۔

اسی وقت اس کے دل میں پہلی مرتبہ یہ خیال آیا کہ اگر رضوانہ نہ ہو تو پھر زندگی کتنی خوش گوار ہو جائے مگر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ اگر رضوانہ نہیں ہوگی تو پھر یہ عیش و آرام بھی نہیں ہوگا۔ وہ اس وقت جم خانہ میں بیٹھا تھا۔ یہاں کی ممبر شپ بھی لاکھوں روپے کی تھی اور سات ہندسے ماہانہ سے کم آمدنی والا شخص یہاں کا ممبر ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ہاں، ایک صورت ہے۔ رضوانہ اگر اس دنیا میں ہی نہ ہو تو... فوراً ہی اسے خیال آیا کہ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

اسی وقت رضوانہ اس کے پاس آگئی اور بولی۔ ”جی! تم نے ڈنر نہیں کیا ہوگا ابھی؟“
 ”میں تمہارے بغیر کیسے ڈنر کر سکتا ہوں۔“ جشید نے منافقت سے کام لیا۔

”چلو، پھر ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

جم خانہ سے واپسی پر رضوانہ چپک رہی تھی۔ جشید اس کی ہنسی سے اتنا ہی بیزار ہو رہا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی اور اب جشید کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔

رات کو جب وہ سونے لیٹا تو رضوانہ سوچنے لگی۔ جشید کا دل چاہا کہ اس کی نازک سی گردن مردود دے یا تکیہ اس کے منہ پر رکھ کر دبا دے اور اس وقت تک دبائے رہے جب تک رضوانہ کی سانس بند نہیں ہو جاتی۔

اس نے سر جھٹک کر سوچا، یہ میں کس انداز میں سوچ رہا ہوں۔ تم ٹھیک سوچ رہے ہو، اس کے اندر سے آواز آئی۔ اس عورت نے تمہاری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس نے تمہیں ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ اس کا مرجانا ہی بہتر ہے۔

اچانک رضوانہ نے کروٹ بدلی اور جشید کے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ ”جی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، کچھ بد ہضمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹیبلٹ لے لی ہے۔“

”تو پھر سو جاؤ اور فارماگازیک سونے سے پہلے لائٹ

آف کر دیا کرو۔ پتا نہیں تمہارا دماغ کہاں ہوتا ہے؟“ وہ بڑبڑاتی ہوئی پھر سو گئی۔
اگلے دن جمشید لنچ کے لیے اٹھنے ہی والا تھا کہ شائلہ آگئی۔
”مس شائلہ! لنچ تو آپ نے ابھی یقیناً نہیں کیا ہو گا؟“

”جی ہاں، لنچ تو میں نے نہیں کیا ہے۔“
”تو پھر آئیے، لنچ میرے ساتھ کریں۔ میں لنچ کے لیے اٹھنے ہی والا تھا۔“

شائلہ بھلا کیوں انکار کرتی۔ شہر کی ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا سی ای او اسے لنچ پر لے جا رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی جمشید کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”آپ کی گاڑی بہت شاندار ہے۔“ شائلہ نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”میری گاڑی اب شاندار ہو گئی ہے۔“ جمشید نے کہا۔ وہ عموماً ماڈلز سے اس لیے بات نہیں کرتا تھا لیکن شائلہ تو اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ اس لیے تو وہ اسے دوسری ہی ملاقات میں لنچ پر لے جا رہا تھا۔

وہ شائلہ کو ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔

لنچ کرتے ہوئے شائلہ نے کہا۔ ”سر! ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانتے گے؟“

جمشید نے مسکرا کر کہا۔ ”میں خوب صورت لڑکیوں کی باتوں کا برا نہیں مانتا۔“

”آپ کی مسز کا رویہ کچھ عجیب سا ہے آپ کے ساتھ۔“

جمشید کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”عجیب سا نہیں بلکہ انتہائی تکلیف دہ۔“ جمشید نے کہا۔ ”دولت نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔“

”آپ نے انہیں اتنا موقع ہی کیوں دیا؟“ شائلہ نے کہا۔ ”سوری، مجھے آپ کے گھریلو معاملات کو ڈسکس نہیں کرنا چاہیے لیکن...“

”ارے اس عورت نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔“ جمشید گویا پھٹ پڑا۔ ”میں اس سے چھٹکارا بھی نہیں پاسکتا۔“

”کیوں سر؟“ شائلہ نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔
”اس لیے کہ اس تمام دولت اور کاروبار کی مالک رضوانہ ہے۔“ جمشید کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”لیکن اب میں نے

چھٹکارا بھی سوچ لیا ہے کہ میں بھی اپنی من مانی کروں گا۔ رضوانہ کہاں تک میری نگرانی کرے گی۔“
”سر، میں آپ کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہی ہوں۔“ شائلہ نے ہمدردی جتائی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ اتنی بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک یوں اس سے اپنے گھریلو معاملات پر بات کر رہا تھا۔

”چھوڑوان باتوں کو، تم بتاؤ تمہاری ہو بیڑ کیا ہیں؟“
”میری ہو بیڑ۔“ شائلہ ہنس کر بولی۔ ”مجھے رائیڈنگ کا بہت شوق ہے لیکن اس کا موقع نہیں ملتا ہے۔ سوئمنگ کا شوق بھی ہے۔ میرا یہ شوق پورا ہوتا رہتا ہے۔“
”رائیڈنگ تم نے کہاں سیکھی؟“ جمشید نے پوچھا۔

”نواب شاہ میں۔“ شائلہ نے جواب دیا۔ ”میرا ایک کزن نواب شاہ میں رہتا ہے۔ وہ لوگ چھوٹے موٹے زمیندار ہیں لیکن اس نے دو تین اچھی نسل کے گھوڑے پال رکھے ہیں۔ میں اکثر نواب شاہ جاتی رہتی ہوں۔“
”ویری گڈ!“ جمشید نے کہا۔ ”رائیڈنگ کا شوق تو مجھے بھی ہے۔“

وہ یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اٹھنے سے پہلے جمشید نے کہا۔ ”میں نے ہا کس بے پر ایک ہٹ بھی لے رکھا ہے۔ اس کا علم رضوانہ کو نہیں ہے۔ جب بھی تھک جاتا ہوں تو وہیں جا کر چند گھنٹے آرام کر لیتا ہوں۔“

”میں وہ ہٹ ضرور دیکھوں گی۔“ شائلہ نے کہا۔
شائلہ کو رخصت کر کے جمشید دوبارہ آفس چلا گیا۔ آپریٹر نے بتایا کہ آپ کی مسز آئی تھیں اور آپ کا انتظار کر کے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے گئی ہیں۔

جمشید نے اس خبر پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ تو اس وقت شائلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے چند ماہ پہلے طبر کے علاقے میں ایک بہت بڑا فارم ہاؤس خریدا تھا۔ فارم ہاؤس میں آم اور امرود کے بہت سے درخت تھے۔ وسیع و عریض لان تھا اور ایک سوئمنگ پول بھی تھا۔ اس کا علم بھی رضوانہ کو نہیں تھا۔ جمشید نے فارم ہاؤس کی دیکھ بھال کے لیے ایک چوکیدار اور مالی بھی رکھ لیا تھا۔ وہ کبھی کبھار اس فارم ہاؤس پر بھی چلا جاتا تھا۔

اس وقت اسے یہ فکر تھی کہ شائلہ کو کس کلاسٹ کے اشتہار میں ماڈل کے طور پر لیا جائے۔ اگر شائلہ بلا جواز آفس آتی رہتی تو نہ صرف رضوانہ بلکہ آفس کا دوسرا اسٹاف بھی جمشید کی طرف سے مشکوک ہو جاتا۔

جشید کوئی ایسا پارسانہ نہیں تھا لیکن وہ ہر کام بہت احتیاط سے کرتا تھا۔ اکثر ماڈل گرلز کو وہ ہا کس بے والے ہٹ پر لے جاتا تھا اور وہیں سے رخصت کر دیتا تھا۔

شائلہ کے لیے اچانک اسے جنید فیبرکس والوں کا خیال آیا۔ وہ لوگ بھی اس سے کسی اچھی ماڈل کی فرمائش کر رہے تھے۔ شائلہ کی پروفائل اس کے پاس تھی۔ اس نے کلاسٹس منیجر کے ہاتھ وہ فائل انہیں بھجوا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جنید فیبرکس کے مالک فرید صاحب صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور انہیں شائلہ کے بارے میں بتایا۔

شام تک کلاسٹ ایگزیکٹو فرید صاحب کا اپروول لے کر آگیا۔ یوں شائلہ آزادی سے آفس آنے لگی۔

جشید کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آفس کی ایک لڑکی نسرین اور کمپیوٹر آپریٹر بلال، رضوانہ کے مخبر تھے۔ وہ رضوانہ کو پہلے ہی کی رپورٹ پہنچا کر رہے تھے۔

اس دن بھی شائلہ آفس میں موجود تھی۔ لنچ کے وقت جشید اٹھا تو شائلہ کو بھی لنچ کے لیے لے گیا۔ اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے ٹیلی فون پر ایک کلاسٹ سے بات کرتے ہوئے بتا دیا کہ میں لنچ کے لیے شیرٹن جا رہا ہوں۔ اگر آپ میرے ساتھ لنچ کرنا چاہیں تو وہیں آ جائیں۔ وہ کلاسٹ بھی کسی اچھی ماڈل کی تلاش میں تھا۔ جشید نے سوچا کہ وہیں وہ شائلہ کو اس سے ملوا کر اپروول لے لے گا۔

اس کے نکلنے ہی نسرین نے رضوانہ کو اطلاع دے دی۔

جشید نے لنچ کا آرڈر دیا ہی تھا کہ رضوانہ شیرٹن کے ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر جشید لمحے بھر کو تو شٹا گیا پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔

رضوانہ سیدھی اس کے پاس پہنچی اور تلخ لہجے میں بولی۔ ”تم لنچ کرنے کے لیے روز آفس سے اتنی دور آتے ہو؟“

”روز تو نہیں۔“ جشید نے کہا۔ ”کبھی کبھی۔“

”جب یہ ڈریم گرل تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔“

رضوانہ کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو رضوانہ؟“ جشید نے کہا۔

”میں اس قسم کی لڑکیوں کو خوب جانتی ہوں۔“

رضوانہ نے بلند آواز میں کہا پھر وہ شائلہ سے مخاطب ہوئی۔

”تم ماڈلنگ کرتی ہو تو ماڈلنگ ہی کرو، اپنی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔“

”منز جشید!“ شائلہ نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ

میری انسلٹ کر رہی ہیں۔“

”تمہاری انسلٹ!“ رضوانہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

”تمہاری انسلٹ ابھی میں نے کی ہی کہاں ہے؟ اور انسلٹ تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کی کوئی عزت ہوتی ہے۔“

”رضوانہ!“ جشید نے کہا۔ ”آہستہ بولو۔ ہم لوگ اس وقت اپنے ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھے ہیں۔“

رضوانہ نے گھور کر جشید کی طرف دیکھا اور ہونٹ چبا کر بولی۔ ”تم سے تو میں گھر جا کے نمٹوں گی۔“ پھر وہ شائلہ سے مخاطب ہوئی۔ ”چلو اٹھو اور چلتی پھرتی نظر آؤ۔ ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

شائلہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی اور بغیر کچھ کہے اپنا پرس اٹھا کر تیز قدموں سے چلی گئی۔

اسی وقت ویٹر لنچ لے کر آگیا۔ جشید نے اس سے کہا کہ لنچ پیک کر دو، مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔

ویٹر سر ہلا کر چلا گیا۔

جشید، رضوانہ کو لے کر سیدھا گھر پہنچا اور غصے سے بولا۔ ”تمہیں آخر کیا ضرورت تھی اس کی بے عزتی کرنے کی؟“

”میں ایسی لڑکیوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، وہ تمہیں بے وقوف بنا کر اپنا کام نکال رہی ہے۔“

”رضوانہ!“ جشید بلند آواز میں بولا۔ ”تم ہوش میں تو ہو، کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”میں بکواس نہیں کر رہی ہوں بلکہ ہوش و حواس میں کہہ رہی ہوں، میں بھی اب تمہیں برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ آج تم اس حرافہ کو پہلی دفعہ لنچ پر لے کر نہیں گئے تھے بلکہ اکثر اسے لے کر جاتے رہتے ہو۔“

جشید سناٹے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ رضوانہ اس کی ٹوہ میں رہتی ہے اور اس کی نگرانی کراتی ہے۔

”میں نے کب کہا ہے کہ میں اسے پہلی دفعہ لنچ پر لے گیا تھا۔ وہ اس وقت بہترین ماڈل ہے اور ایڈورٹائزنگ ایجنسی والوں کو ماڈلز کے نعرے تو اٹھانا پڑتے ہیں۔“

”میں اس لڑکی کو ایک سیکنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔“ رضوانہ نے کہا۔ ”اگر اب وہ لڑکی آفس میں نظر آئی تو میں اس کی وہ بے عزتی کروں گی کہ ساری ماڈلنگ بھول جائے گی۔“

”تم نے اس بات کو ایسا کیوں بنا رکھا ہے؟“ جشید

بیماری

ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا۔
 ”یہ کوئی پرانی بیماری ہے جو آپ کی صحت اور ذہنی سکون کو تباہ و برباد کر رہی ہے۔“
 مریض نے جلدی سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے آہستہ بولے۔ وہ بیماری باہر ہی بیٹھی ہے۔“

کترینین

ایک ہوائی جہاز میں کچھ پاگلوں کو علاج کے لیے بیرون ملک لے جایا جا رہا تھا۔ وہ سفر میں تھے اور پاگل شور کرنے لگے۔ تو پائلٹ نے اپنے ساتھی سے کہا تم جاؤ دیکھ کر آؤ کیا ہو رہا ہے۔ وہ گیا اور دیکھا تو وہاں پاگل فٹ بال کھیل رہے تھے۔ وہ پریشان ہو گیا کہ ان کو کیسے سمجھائے۔ اس نے دیکھا کہ ایک پاگل کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ وہ ساتھی اس کے پاس گیا اور کہا۔

”تم مجھے کچھ ٹھیک لگتے ہو ان سے کہو کہ ہم بہت اونچائی پر پرواز کر رہے ہیں۔ کھیلتا بند کرو خطرہ ہو سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر ساتھی چلا گیا۔ کچھ لمحوں بعد وہاں سکون ہو گیا۔ تو پائلٹ نے ساتھی کو کہا کہ دیکھ کر آؤ یہ چپ کیسے ہو گئے۔ وہ وہاں گیا اور دیکھا کہ اس ایک پاگل کے سوا۔۔۔ کوئی نہیں ہے۔ اس نے اس پاگل سے پوچھا کہ باقی کہاں گئے تو اس نے جواب دیا۔

”میں نے ان سے کہا کہ تم باہر جا کر کھیلو، مجھے پڑھنے میں دقت ہو رہی ہے تو وہ باہر چلے گئے۔“

☆☆☆

ایک سردار کو ایک نوجوان فون پر بڑا تنگ کیا کرتا تھا تو سردار نے اپنی سم بدل دی اور بڑے جذبے سے اس نوجوان کو فون کر کے کہا۔ ”اس نمبر پر فون کر کے دکھاؤ تو مانوں۔“

خیام بیزادہ، پاک پتن

نے کہا۔ ”اگر تم کہتی ہو تو میں اس کا کنٹریکٹ کینسل کر دوں گا۔ میرے لیے کوئی عام ماڈل نہیں بلکہ تم زیادہ اہم ہو۔“
 ”تمہاری نظروں میں تو میری اب کوئی وقعت ہی نہیں رہی ہے۔“ رضوانہ نے شکوہ کیا۔

”وہم ہے تمہارا۔“ جمشید نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارا ہاتھ یہ سوچ کر تھامنا تھا کہ اب یہ مر کے ہی میرے ہاتھ سے چھوٹے گا۔“

”ایسی باتیں مت کرو جی۔“ رضوانہ نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔ جمشید نے سکون کا سانس لیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ آج رضوانہ اور اس کی اربوں روپے کی دولت اور کاروبار اس کے ہاتھ سے گیا۔

وہ شام اس نے رضوانہ کے ساتھ گزاری اور وہ اسے ڈنر کے لیے باہر لے گیا۔

اس نے سل فون پر شائلہ سے بھی بات کی اور اس سے معذرت کی کہ میری بیوی کی وجہ سے تمہیں صدمہ پہنچا ہے۔ میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ اب تم آفس مت آنا بلکہ کل اسی ہٹ پر پہنچ جانا۔ میں وقت تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

شائلہ ہٹ پر آئی تو جمشید نے اسے بھی اپنی چکنی چڑی باتوں سے منالیا ورنہ وہ تو جمشید سے مزید ملنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

شائلہ کے آفس آنے پر پابندی لگی تو جمشید کو احساس ہوا کہ وہ تو شائلہ سے محبت کرنے لگا ہے اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

اس نے شائلہ سے مل کر پروگرام بنایا کہ ہم لوگ ایک ہفتہ فارم ہاؤس پر گزاریں گے۔

”ایک ہفتہ؟“ شائلہ حیرت سے بولی۔ ”ایک ہفتے تک آپ گھر سے غائب رہیں گے تو رضوانہ کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو سارے شہر میں آپ کو ڈھونڈتی پھرے گی۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ جمشید مسکرا کر بولا۔ ”میں بزنس ٹرپ کے لیے نکلوں گا۔“

”ویری گڈ آئیڈیا سر۔“ شائلہ خوش ہو کر بولی۔
 ”بس تم تیاری کر لو۔ ہم پرسوں فارم ہاؤس پر چلیں گے۔“

جمشید نے رضوانہ کے سامنے سل فون پر کوریائی کی ایک پارٹی سے بات کی اور یوں ظاہر کیا جیسے اس کا کوریایا جانا بہت ضروری ہو، اس نے یہ بھی کہا کہ میں اپنے منبر کو بھیج دیتا ہوں لیکن پارٹی شاید اس پر راضی نہیں ہوگی۔

اس نے کوریا تو کال ہی نہیں کی تھی۔ وہ تو اپنے ایک دوست سے باتیں کر رہا تھا۔
”اگر بہت ضروری ہے تو چلے جاؤ۔“ رضوانہ نے کہا۔

”تمہارے بغیر تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ جمشید نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ رضوانہ کو کوریا بالکل پسند نہیں ہے۔ وہ صرف ایک مرتبہ کوریا گئی تھی اور آئندہ کبھی نہ جانے کا عہد کر چکی تھی۔

”میں... تمہارے ساتھ کوریا چلوں؟“ رضوانہ نے منہ بنا کر کہا۔ ”امپاسیبل! ہاں یورپ کے بزنس ٹور میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”کتنے دن کا ٹرپ ہے؟“ رضوانہ نے پوچھا۔
”میں سوچ رہا ہوں کہ لگے ہاتھوں جاپان اور ملائیشیا کا وزٹ بھی کر لوں۔ تقریباً دس بارہ دن تو لگ جائیں گے۔“

پھر اس نے پیکنگ شروع کر دی۔ رضوانہ کو ستانے کے لیے جمشید نے پھر ایک فرضی کال کی اور کہا کہ کل تک مجھے ٹکٹ چاہئیں۔

اگلے روز وہ دن کے دس بجے کے قریب گھر سے روانہ ہوا تو رضوانہ نے کہا کہ میں اتر پورٹ تک تو تمہارے ساتھ جا ہی سکتی ہوں۔“

”یار، اگر تم اتر پورٹ گئیں تو شاید میں نہ جاسکوں۔“ جمشید نے کہا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ تم بس ہنستے ہنستے مجھے گھر ہی سے رخصت کر دو۔“

”اچھا بابا، میں اتر پورٹ نہیں جا رہی ہوں۔“ جمشید نے سکون کا سانس لیا۔ رضوانہ اگر اتر پورٹ جاتی تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔ جمشید نے دوسرے سے ٹکٹ ہی نہیں بنوایا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ اتر پورٹ روانہ ہوا۔ ڈرائیور نے اسے ڈپارچر لائن میں چھوڑا اور واپس آ گیا۔ جمشید نے ایک دن پہلے ہی اتر پورٹ کی پارکنگ میں اپنی پراڈوپارک کر دی تھی۔ ڈرائیور کے جانے کے بعد وہ ٹھہلتا ہوا پارکنگ لاٹ میں پہنچا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پارکنگ سے باہر نکل آیا۔

اس نے باہر نکلتے ہی شاملہ کو ٹیلی فون کر دیا کہ تم فوری طور پر شاہراہ فیصل پر آ جاؤ۔ میں کارساز پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

دس منٹ کے اندر شاملہ بھی وہاں پہنچ گئی اور دونوں

فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔
فارم ہاؤس کا مالی چھٹیوں پر تھا۔ چوکیدار کو کھانا پکانا نہیں آتا تھا اس لیے جمشید نے کھانے پینے کا سامان اور اتر پورٹ خوراک کے ڈبے فارم ہاؤس پر پہنچا دیے تھے۔ پہلے دن ان لوگوں نے خوب انجوائے کیا۔ سردی کا موسم تھا اس کے باوجود شاملہ نے خوب سوئمنگ کی۔ جمشید کو سوئمنگ کا شوق نہیں تھا لیکن شاملہ کو دیکھ کر وہ بھی پانی میں اتر گیا۔ رات کو وہ دونوں دیر تک جاگتے رہے اور میوزک سنتے رہے، پھر تھک ہار کے بیڈروم میں چلے گئے۔

صبح ناشتے کے بعد شاملہ امرود کے درختوں کی طرف جانگلی اور خوب امرود کھائے۔

رات کو وہ دونوں لٹچ کی تیاری کر رہے تھے کہ جمشید کے کانوں میں کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی، گاڑیاں تو وہاں سے گزرتی ہی رہتی تھیں۔

اس وقت جمشید نے شاملہ کو کوئی لطیفہ سنایا تھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ جمشید بھی ہنس رہا تھا۔

اچانک اس کی ہنسی رک گئی۔ اس کی نظریں سامنے جی ہوئی تھیں۔ شاملہ نے اسے اس حال میں دیکھا تو الجھ گئی اور بولی۔ ”کیا ہوا جی؟“

جمشید کی نظروں کے زاویے میں کوئی فرق نہیں آیا تو اس نے مڑ کر دیکھا اور بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

دروازے کے عین درمیان... رضوانہ کھڑی تھی اور غضب ناک نظروں سے شاملہ کو گھور رہی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر اچانک شاملہ کے چہرے پر زنائے دار تھپڑ رسید کر دیا اور بولی۔ ”آوارہ، بد چلن لڑکی! تجھے اور کوئی نہیں ملا تھا؟ اب نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ میرا شو ہر تیرے لیے جمشید سے جی ہو گیا۔“ اس نے دوسرا تھپڑ مارا، پھر وہ اسے مارتی ہی چلی گئی۔

اچانک شاملہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چیخ کر بولی۔ ”اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو ورنہ دو ہاتھ میرے بھی ہیں۔“ رضوانہ اس بات سے اور مشتعل ہو گئی اور شاملہ کے چہرے پر ایک زبردست تھپڑ مار دیا۔ جوابی طور پر شاملہ نے بھی اس کے چہرے کو نشانہ بنایا اور دونوں ایک دوسرے سے سکتھم گتھا ہو گئیں۔

جمشید کی سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اچانک شاملہ نے رضوانہ کو زوردار دھکا دیا۔ رضوانہ الٹ کر گری۔ گرتے ہوئے ٹیبل کا کوننا رضوانہ کے سر پر لگا۔ وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگی۔

جشید گھبرا گیا۔ وہ رضوانہ کو اٹھانے کے لیے اس کی طرف بڑھا لیکن اٹھانہ پایا۔ رضوانہ نے زور سے ہچکی لی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ جشید نے رضوانہ وار رضوانہ کو آوازیں دیں، اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا لیکن اس کے جسم میں حرکت نہ ہوئی۔ جشید نے اس کی نبض دیکھی، اس کی سانس کی آمد و رفت محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود، رضوانہ مر چکی تھی۔

”کک... کیا... یہ مر گئی؟“ شائلہ نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

”ہاں، یہ مر چکی ہے۔“ جشید نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

شائلہ جبری طرح بوکھلا گئی اور بولی۔ ”اب... اب کیا ہو گا جی؟“

”گھبراؤ مت۔“ جشید نے اسے تسلی دی۔ ”مجھے سوچنے دو۔“

”یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے جی۔“ شائلہ نے کہا۔ ”اگر پولیس آگئی تو ہم دونوں پکڑے جائیں گے۔“

”شائلہ، پلیز خاموش رہو۔“ جشید نے کہا۔ ”پولیس یہاں کیوں آئے گی؟ سکون سے بیٹھو اور مجھے کچھ سوچنے دو۔“

پھر وہ چند لمحوں بعد بولا۔ ”اب ایک ہی طریقہ ہے۔ رضوانہ کی لاش کو یہیں فارم ہاؤس میں دبا دیا جائے۔“

”کون دبائے گا؟“ شائلہ نے کہا۔ ”میں خود دباؤں گا۔ اس کی قبر چوکیدار کھودے گا۔“

”چوکیدار؟“ شائلہ چونک کر بولی۔ ”یوں تو چوکیدار قتل کا گواہ بن جائے گا۔“

”فکر مت کرو، میں چوکیدار کو اتنی رقم دوں گا کہ وہ منہ کھول ہی نہیں سکے گا۔“

”جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو جی۔ مجھے یہاں وحشت ہو رہی ہے۔“

☆☆☆

سلمان اور جاوید بہت دیر سے ایک جگہ بیٹھے تھے۔ چند دن پہلے تک دونوں بے روزگار تھے لیکن کچھ دن پہلے جاوید کو جاب مل گئی تھی۔

جاوید کا اپنا گھر تھا۔ ملازمت بھی تھی اس لیے وہ سلمان کے مقابلے میں خوش حال تھا۔ سلمان گلستان جوہر کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔

رات گئے وہ دونوں وہاں سے اٹھے۔ جاوید کے پاس پرانی سی ایک موٹر سائیکل بھی تھی۔

سلمان نے اسے کہا۔ ”جوہر موٹر تک تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، وہاں سے پندرہ بیس منٹ کا تو پیدل کا راستہ ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔“

اصل میں جاوید کی موٹر سائیکل میں اتنا بیٹرول ہی نہیں تھا کہ وہ اندر تک جا کر سلمان کو چھوڑے۔

جاوید نے اسے جوہر موٹر پر چھوڑ دیا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ سلمان پیدل ہی اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ فلیٹ میں بالکل تنہا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی سکھر میں تھے۔ دو مہینے پہلے تک وہ ایک معقول ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی فرم اچانک ہی مالی بحران کی زد میں آگئی تھی اور اس کی ملازمت ختم ہو گئی تھی۔

جاوید بھی اسی کمپنی میں تھا یوں دونوں ایک ساتھ بے روزگار ہو گئے تھے۔ جاوید کو گزشتہ دنوں ملازمت مل گئی تھی۔

سلمان یہ سوچتا ہوا فلیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ فلیٹ میں چائے کا تو انتظام ہے۔ دودھ چینی اور چائے کی ہتی موجود تھی۔ وہ صبح ناشتے میں چائے تو پی ہی سکتا تھا۔

اچانک اس کے نزدیک سے شاندار سی ایک گاڑی گزری، پھر گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور وہ رپورس ہو کر اس کی طرف آنے لگی۔ گاڑی سلمان کے نزدیک آ کر رک گئی۔

سلمان نے حیرت سے دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بہت خوب صورت سی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ حیران تھا کہ رات کے اس پہر یہ لڑکی کہاں سے آگئی اور آئی گئی تھی تو اس کے نزدیک گاڑی کیوں روک دی؟

لڑکی نے گاڑی کا شیشہ اتارا اور کھٹک دار آواز میں بولی۔ ”آپ اتنی رات کو پیدل کہاں جا رہے ہیں؟“

”آدمی اتنی رات کو تو اپنے گھر ہی جا سکتا ہے۔“ سلمان نے کہا۔

”آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“ لڑکی نے ہنس کر کہا۔

”آ... آپ... مجھے ڈراپ کریں گی... آپ؟“ سلمان ہکلا یا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی لڑکی اسے لفٹ کی پیشکش بھی کر سکتی ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”رہنے دیں، آپ کو خواہ مخواہ زحمت ہوگی۔“

”زحمت کیسی؟“ لڑکی پھر مسکرائی۔ ”میں بھی اسی طرف جا رہی ہوں۔ اگر آپ بھی میری گاڑی میں بیٹھ جائیں گے تو مجھے کون سی زحمت ہوگی؟ آئیے۔“

لڑکی کے اصرار پر سلمان جھجکتا ہوا گاڑی میں بیٹھ

چھٹکارا

اس نے سلمان سے کہا۔ ”جوہر موٹر تک تو میں تمہیں

چھوڑ دوں گا۔“

ٹھیک ہے، وہاں سے پندرہ بیس منٹ کا تو پیدل کا

راستہ ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔“

اصل میں جاوید کی موٹر سائیکل میں اتنا بیٹرول ہی

نہیں تھا کہ وہ اندر تک جا کر سلمان کو چھوڑے۔

جاوید نے اسے جوہر موٹر پر چھوڑ دیا۔ اس وقت رات کے

دو بج رہے تھے۔ سلمان پیدل ہی اپنے فلیٹ کی طرف

روانہ ہو گیا۔ وہ فلیٹ میں بالکل تنہا رہتا تھا۔ اس کے

ماں باپ اور بہن بھائی سکھر میں تھے۔ دو مہینے پہلے

تک وہ ایک معقول ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی فرم اچانک

ہی مالی بحران کی زد میں آگئی تھی اور اس کی ملازمت

ختم ہو گئی تھی۔

جاوید بھی اسی کمپنی میں تھا یوں دونوں ایک ساتھ

بے روزگار ہو گئے تھے۔ جاوید کو گزشتہ دنوں

ملازمت مل گئی تھی۔

سلمان یہ سوچتا ہوا فلیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ

فلیٹ میں چائے کا تو انتظام ہے۔ دودھ چینی اور چائے

کی ہتی موجود تھی۔ وہ صبح ناشتے میں چائے تو پی

ہی سکتا تھا۔

اچانک اس کے نزدیک سے شاندار سی ایک گاڑی

گزری، پھر گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور وہ رپورس

ہو کر اس کی طرف آنے لگی۔ گاڑی سلمان کے نزدیک

آ کر رک گئی۔

سلمان نے حیرت سے دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بہت

خوب صورت سی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ حیران تھا کہ

رات کے اس پہر یہ لڑکی کہاں سے آگئی اور آئی گئی

تھی تو اس کے نزدیک گاڑی کیوں روک دی؟

لڑکی نے گاڑی کا شیشہ اتارا اور کھٹک دار آواز

میں بولی۔ ”آپ اتنی رات کو پیدل کہاں جا رہے ہیں؟“

”آدمی اتنی رات کو تو اپنے گھر ہی جا سکتا ہے۔“

سلمان نے کہا۔

”آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“ لڑکی نے ہنس

کر کہا۔

”آ... آپ... مجھے ڈراپ کریں گی... آپ؟“ سلمان

ہکلا یا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی لڑکی اسے

لفٹ کی پیشکش بھی کر سکتی ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے

کہا۔

”رہنے دیں، آپ کو خواہ مخواہ زحمت ہوگی۔“

”زحمت کیسی؟“ لڑکی پھر مسکرائی۔ ”میں بھی اسی

طرف جا رہی ہوں۔ اگر آپ بھی میری گاڑی میں بیٹھ

جائیں گے تو مجھے کون سی زحمت ہوگی؟ آئیے۔“

لڑکی کے اصرار پر سلمان جھجکتا ہوا گاڑی میں

بیٹھ

گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھلنے پر روشنی ہوئی تو لڑکی کا حسن دیکھ کر سلمان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

”آپ پڑھتے ہیں؟“ لڑکی نے پوچھا۔
”جی نہیں، میں ماسٹر تو کر چکا ہوں۔ ایک کمپنی میں ملازمت کرتا تھا لیکن آج کل بے روزگار ہوں۔“
”نو پرابلم؟“ لڑکی مسکرا کر بولی۔ ”میرے کچھ کونٹیکٹ ہیں آپ کو جابل مل جائے گی۔“

”میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔“ سلمان نے ممنونیت سے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکی کسی انتہائی دولت مند شخص کی بیٹی ہے لیکن اس کے دل میں انسانیت کا درد ہے۔
”آپ کے والدین اور بہن بھائی بھی آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں؟“ لڑکی نے یوں پوچھا جیسے اپنی بات کی تصدیق کرنا چاہتی ہو۔

”جی نہیں۔“ سلمان نے جواب دیا۔ ”میری فیملی سکھر میں ہے، میں اس فلیٹ میں تنہا رہتا ہوں۔“
”آپ جابل کیا کرتے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔
”میں سٹریٹ فبیر تھا۔“

”ویری گڈ۔“ لڑکی ہنس کر بولی۔ ”سٹریٹ جابل تو بہت آسانی سے مل جاتی ہے۔“
”بس یہیں روک لیں۔“ سلمان نے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ جو سامنے پمپس ہے، میرا فلیٹ اسی میں ہے۔“

”میں آپ کو ڈراپ کرنے اتنی دور آئی ہوں، کیا آپ مجھے ایک کپ چائے بھی نہیں پلائیں گے؟“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سلمان بُری طرح چونکا۔ اس نے سوچا یہ لڑکی یقیناً کال گرل ہے اور راتوں کو اسی طرح اپنا شکار ڈھونڈتی ہے ورنہ کوئی شریف لڑکی تو رات کے اس پہر کسی اجنبی کو لفٹ دینے سے رہی۔ رات تو رات کوئی تنہا لڑکی کسی اجنبی کو دن میں لفٹ نہ دے۔ آج کل کراچی کے حالات بھی تو نامساعد ہیں۔

”کیا سوچتے گئے؟“ لڑکی نے ہنس کر کہا۔
”دیکھیے محترمہ!“ سلمان نے سرد لہجے میں۔ ”اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں کوئی پیسے والی آسامی ہوں تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں آج کل بے روزگار ہوں۔“

”کیا آپ مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہے ہیں؟“ لڑکی کو ہنسہ آگیا۔ ”اگر آپ ایسا سمجھ رہے ہیں تو مجھے آپ کی

سوچ پر افسوس ہے۔ میں نے تو آپ کو شریف انسان سمجھ کر لفٹ دی اور آپ...“ لڑکی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔“ سلمان نے جلدی سے کہا۔ ”اگر آپ کو میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔“
”نو۔“ لڑکی نے سر ہلا کر کہا۔ ”پہلے آپ مجھے چائے پلائیں۔“

سلمان نے طویل سانس لی اور بولا۔ ”آئیے میرے ساتھ۔“

لڑکی نے گاڑی لاک کی اور اس کے ساتھ چلتے چلتے وہ بولی۔ ”کتنی عجیب بات ہے کہ ہم دونوں اتنی دیر سے ساتھ ہیں اور آپ نے اب تک اپنا نام بھی نہیں بتایا۔“

”تو آپ نے کون سا بتا دیا ہے۔“ سلمان ہنس کر بولا۔ ”میرا نام سلمان احمد ہے۔“
”میں شائلہ ہوں، شائلہ سرفراز، سرفراز صاحب کو تو آپ یقیناً جانتے ہوں گے؟“

”وہ سرفراز صاحب جو بہت بڑے صنعت کار اور سیاست داں ہیں؟“ سلمان کے لہجے میں حیرت تھی۔
”جی ہاں، وہی سرفراز صاحب۔“ شائلہ نے جواب دیا۔ وہ میسرے شوہر ہیں۔“
”لیکن... وہ تو...“

”بوڑھے ہیں۔“ شائلہ نے ہنس کر اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ ”یہ میری بد قسمتی ہے کہ میری شادی ایک بوڑھے سے کر دی گئی۔“

”زینے یہ اندھیرا ہے۔“ سلمان نے چلتے چلتے کہا۔ ”ڈرا سنبھل کر چلیے گا۔ ہمیں صرف سیکنڈ فلور تک جانا ہے۔“
”کوئی بات نہیں۔“ شائلہ نے کہا۔ پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”جس کے دل میں اندھیرا ہو، باہر کا اندھیرا اس کا کیا بگاڑے گا۔“

سلمان اس کے جواب پر خاموش رہا۔ دونوں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر سیکنڈ فلور پر پہنچے۔ کریڈور میں مدھم لائٹ فلر کا ایک انرجی سیور روشن تھا۔

سلمان نے چابی جیب سے نکال کر فلیٹ کا دروازہ کھولا اور بولا۔ ”آجائے۔“

شائلہ اندر داخل ہو گئی۔ ڈرائنگ روم بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ فرنیچر بھی بہت اچھا تھا اور کھڑکیوں پر پردے بھی قیمتی تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ سلمان واقعی کوئی

”آپ بیٹھیں۔ میں چائے لے کر آتا ہوں۔“

شائلہ اس دوران میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتی رہی۔ سلمان ٹرے میں دو کپ رکھ کر لے آیا۔ شائلہ چائے پیتے ہوئے مسلسل سلمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اچھا خاصا خوب رو اور وجیہ مرد تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی لڑکی اپنا دل ہار سکتی تھی لیکن شائلہ تو شادی شدہ تھی۔

”میں آپ سے ایک بات کہوں؟“ شائلہ نے

اچانک کہا۔

”جی کیسے۔“ سلمان چونک کر بولا۔

”وہ اصل میں جب میں یونیورسٹی میں پڑھتی تھی تو میرا ایک کلاس فیلو جمال تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔“

سلمان نے سوچا کہ یہ لڑکی مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہے؟

شائلہ نے جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا اور بولی۔ ”آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ عجیب پاگل لڑکی ہے۔ مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہے؟ تو بات یہ ہے سلمان صاحب کہ جمال بالکل آپ کا ہم شکل تھا۔ وہی دراز قد، گھنے سیاہ بال، کسرتی جسم، سیاہ آنکھیں، آپ تو بالکل جمال کی تصویر نکلتے ہیں۔ جب میں نے آپ کو سڑک پر پیدل چلتے دیکھا تو بڑی طرح چونک اٹھی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جمال یہاں کیسے آگیا؟ میں نے بے اختیار ہو کر آپ کو لفٹ کی آفر کر دی کہ مزید کچھ دیر آپ کو دیکھ سکوں۔ میرے والدین نے جمال سے میری شادی نہیں ہونے دی اور اس بڑھے کے حوالے کر دیا۔“

”وہ... میرا مطلب ہے کہ جمال اب کہاں ہے؟“

”جمال...“ لڑکی نے سسکی سی لے کر کہا۔ ”وہ اب

اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس سے میری جدائی برداشت نہ ہو سکی اور اس نے خودکشی کر لی۔“ شائلہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”آپ... پلیز مت روئیں...“ سلمان گھبرا کر

بولا۔ وہ کسی لڑکی کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”میری ایک خواہش پوری کر دیں گے؟“ شائلہ نے

کہا۔

”جی کیسے، اگر میرے بس میں ہو تو ضرور پوری

کروں گا۔“

”دیکھیے پھر آپ مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھیں گے۔“

شائلہ نے جھپکتے ہوئے کہا۔

”نہیں سمجھوں گا۔“ سلمان جواب دیا۔ اسے اب

اس محسوس جذباتی لڑکی پر ترس آ رہا تھا۔

”دیکھیے کچھ اور مت سمجھیے گا۔“ شائلہ نے کہا۔ ”شاید

آپ جانتے ہیں کہ سرفراز آج کل ملک سے باہر ہیں۔“

”جی ہاں، میں جانتا ہوں۔ میں نے کسی اخبار میں

بھی پڑھا تھا ان کے بارے میں۔“

”میں چاہتی ہوں کہ آپ... کچھ دن کے لیے...

جمال بن جائیں۔“ شائلہ نے کہا۔

”جی...!“ سلمان نے غیر یقینی انداز میں اس کی

طرف دیکھا۔

”مجھے غلط مت سمجھیے۔“ شائلہ جلدی سے بولی۔ ”میں

بس آپ کو جی بھر کے دیکھنا چاہتی ہوں، پلیز... میری یہ

خواہش پوری کر دیں۔“

”لیکن آپ... اس فلیٹ میں تو نہیں رہ سکتیں۔“

سلمان نے کہا۔

”میں اس فلیٹ میں رہنا بھی نہیں چاہتی۔ طیر کی

طرف سرفراز کا بہت بڑا قارم ہاؤس ہے۔ ہم وہاں جا کر

رہیں گے۔“

”آپ اتنے بڑے آدمی کی بیوی ہیں اگر سرفراز

صاحب کو معلوم ہو گیا تو آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، میں

فضول میں مارا جاؤں گا۔“

”انہیں معلوم کیسے ہوگا۔ قارم ہاؤس پر میرے اور آپ

کے سوا کوئی بھی نہیں ہوگا۔“ شائلہ نے کہا۔ ”آئیے نا پلیز۔“

اس کے لہجے میں ایسی خوشامد تھی کہ سلمان مزید انکار

نہ کر سکا اور اس کے ساتھ چلتے پر راضی ہو گیا۔

”آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ عجیب پاگل لڑکی

ہے۔“ شائلہ نے کہا۔ ”یوں سینہ زوری سے ایک نوجوان کو

لے جا رہی ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے جمال پر پورا

بھروسہ تھا۔ اس نے بھی مجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ مجھے امید

ہے کہ جمال کا ہم شکل بھی مجھے میلی نظر سے نہیں دیکھے گا۔“

”صرف اس یقین کی بنیاد پر آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر

لیا؟“ سلمان نے کہا۔

”جی ہاں۔“ شائلہ نے کہا۔ ”مجھے جمال پر پورا

بھروسہ ہے۔“

وہ دونوں ایک مرتبہ پھر گاڑی میں آ بیٹھے۔ شائلہ نے

گاڑی آگے بڑھا دی اور بولی۔ ”اب تو آپ کو یقین آ جانا

چاہیے کہ آپ کی جاب میرے لیے کوئی پرالیم نہیں ہے۔“

سرفراز صاحب کے آتے ہی آپ کی جاب پکی۔“

”میں ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“ سلمان نے کہا۔

”مجھے جمال سے اس غیریت کی توقع نہیں ہے۔“

سلمان خاموش ہو گیا۔ وہ فطری طور پر عیاش نہیں

تھا۔ نہ اسے لڑکیوں سے کوئی دلچسپی تھی۔ اسے صرف ایک

لڑکی سے دلچسپی تھی۔ وہ اس کی مگیتر تھی اور سکھر میں رہتی تھی۔

سلمان سوچ رہا تھا کہ اب جاب ملتے ہی میں فوری طور پر

فرح سے شادی کر لوں گا۔

”دیکھیے مجھے کہتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔“

شمالہ نے کہا۔ ”آپ کو فوری طور پر پیسوں کی ضرورت بھی

ہوگی۔“ اس نے ڈائیں بورڈ پر رکھا ہوا پرس اٹھایا اور اسے

اپنی گود میں رکھ کر بائیں ہاتھ سے اسے کھول لیا اور نوٹوں کی

ایک گڈی نکال کر سلمان کی طرف بڑھائی۔ ”دیکھیے انکار

مت کیجیے گا۔ جمال بھی میری بات کو ٹالتا نہیں تھا۔“

سلمان کا دل چاہا کہ لڑکی کو ایک زوردار جھانپڑ رسید

کرے اور کہے کہ بھاڑ میں گیا تمہارا جمال، تم خود تو پاگل

ہو، مجھے بھی پاگل کر کے دم لوگی لیکن وہ اس سے ایسا کہہ نہیں

سکتا تھا۔ لڑکی سے اسے صرف ایک لالچ تھا۔ وہ اسے بے

روزگاری سے نجات دلا سکتی تھی۔ اس وقت جاب سلمان کی

سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اس نے خاموشی سے لڑکی کے

ہاتھ سے نوٹوں کی گڈی لے لی۔ وہ اس قسم کے پیسے کو اپنے

لیے ناجائز سمجھتا تھا لیکن اس وقت مجبوری یہ تھی کہ وہ جمال بنا

ہوا تھا اور جمال اس پاگل لڑکی کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔

باتوں ہی باتوں میں وہ لوگ فارم ہاؤس تک پہنچ

گئے۔ لڑکی نے اتر کے گیٹ کھولا اور گاڑی اندر لے جانے

کے بعد ایک مرتبہ پھر اتر کر گیٹ بند کر دیا۔

”فارم ہاؤس تو بہت شاندار ہے۔“ سلمان نے

توصیفی انداز میں کہا۔

”میں تمہیں یہاں مزیدار کھانے بھی کھلاؤں گی۔“

شمالہ نے کہا۔

”ہم کتنے دن یہاں رہیں گے۔“ سلمان نے

پوچھا۔ وہ لڑکی کی جذبات بھری باتوں میں آکر یہاں آتو

گیا تھا لیکن اب پچھتا رہا تھا۔

”صرف تین دن۔“ شمالہ ہنس کر بولی۔ ”کیونکہ

چوتھے دن سرفراز صاحب واپس آ رہے ہیں۔“

”تین دن۔“ سلمان کراہا۔ لڑکی نے غصے سے اس

کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”صرف تین دن؟

میں تو سمجھ رہا تھا کہ ہم ہفتے بھر یہاں قیام کریں گے۔“

”اگر تم چاہو تو زندگی بھر یہاں قیام کر سکتے ہو۔“

شمالہ ہنس کر بولی۔

”کیا مطلب؟“ سلمان نے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں؟“

”مطلب یہ کہ تم تو میرے دل میں رہتے ہو۔ میں

جب بھی یہاں آؤں گی تم میرے ساتھ آؤ گے۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے فارم ہاؤس کے ایک

شاندار بیڈروم میں داخل ہوئے۔

”تم ایک کام کرو۔“ شمالہ نے کہا۔ ”اس الماری

میں سرفراز صاحب کے کئی سلپنگ سوٹ بھی ہیں۔ تم ان

میں سے ایک نکال کر پہن لو تا کہ تم ایزی ہو جاؤ۔ چاہو تو

غسل بھی کر لو۔“

سرفراز اس الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے

جونہی الماری کھولی کوئی اس کے اوپر آگرا۔ سرفراز بڑی

طرح چونک کر پیچھے ہٹا۔ وہ کوئی عورت تھی۔ انتہائی دلکش

اور باوقار عورت۔ لیکن اس میں ایک خرابی تھی کہ وہ زندہ

نہیں تھی۔ اس نے آہستگی سے عورت کی لاش کو فرش پر رکھ

دیا اور گھوم کر دیکھا تو کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ جھپٹ کر

دروازے تک پہنچا اور اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن کمر

باہر سے لاک کر دیا گیا تھا۔

سلمان نے عورت کی لاش کو دیکھا، اس کے جسم سے

اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

سلمان سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور پولیس کا ایک سب

انسپکٹر اور سپاہی اندر آ گیا۔ ان کے ساتھ جمشید بھی تھا۔

جمشید نے چیخ کر انسپٹر سے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! یہ

آدمی کافی عرصے سے میری بیوی کو پریشان کر رہا تھا۔ شاید

اسے بلیک میل کر رہا تھا۔ آج بھی یہ رقم لینے آیا تھا۔ رضوانہ

نے اسے پیسے دے دیے ہوں گے پھر اس نے رضوانہ کو قتل

کیوں کیا؟“

انسپکٹر نے آگے بڑھ کر سلمان کے ہاتھوں میں

جھکڑیاں ڈال دیں اور سلمان کو کھینٹتے ہوئے جمشید سے

بولا۔ ”سر! آپ کو پولیس اسٹیشن تک آنا پڑے گا۔ آپ کا

بیان بہت ضروری ہے۔“

”میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ جمشید نے کہا۔

پولیس انسپکٹر کے جانے کے بعد ایک کمرے سے

شمالہ بھی نکل آئی اور وہ جمشید کے ساتھ دیوانہ وار رقص

کرنے لگی۔

خام گواہی

خوشی کے لمحات حاصل کرنے کے لیے کتنی جدوجہد کرنی پڑتی ہے... اس کی کسمپرسی کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے... جو اس کرب سے گزرا ہو... سختیوں کے بعد اب اسے زندگی کی آسانیاں میسر ہونے والی تھیں... وہ بے حد سرشار و مخمور تھا... مگر حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے...

کرنیں بکھیرتے سورج کی کارکردگی جس نے یکدم پائنا پلٹ دیا...

جب تک میں اپنے گھر کے داخلی دروازے تک نہیں پہنچ گیا۔ ابھی میں نے گھر میں قدم رکھنے کے بعد دروازہ بند ہی کیا تھا کہ میز پر بیوی ڈورس نے دھڑلے کے ساتھ حسب معمول اپنے دکھڑوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

تب میں نے اسی لمحے یہ عزم کر لیا کہ میں اپنی بقیہ زندگی یہاں بیٹھ کر اس کی طویل اکتا دینے والی شکایتیں سننے میں نہیں گزاروں گا۔

بے شک ڈورس کو دل کا عارضہ تھا لیکن مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ میں اپنی بقیہ زندگی اس کے مستقل مطالبات اور شکوے شکایات سننے میں برباد کر دوں۔ اگر میں اسے اس بات کی اجازت دوں گا تو مجھ پر لعنت ہو۔

اب جبکہ میرے پاس وقت اور پیسا دونوں تھا تو میں حقیقت میں زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں ہر اس دیس اور ملک کی سیر کرنا چاہتا تھا جن کا میں نے زندگی بھر خواب دیکھا تھا۔ چاہے اس کے لیے مجھے ڈورس کو تنہا ہی کیوں نہ چھوڑ کر جانا پڑے۔

لیکن میں بے وقوف تھا جو یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے شکوے سے نکلنے کی اجازت دے دے گی۔

ایک رات قبل میرے اس اچانک انکشاف کے بعد کہ میں جزیرہ ہوائی کی سیر کا ارادہ رکھتا ہوں، ہمارے درمیان خاصی بحث ہوئی۔ ڈورس نے کہا کہ میں اسے تنہا گھر پر چھوڑ کر امیر بیواؤں کے گروپ کے ہمراہ گل

مجھے بالکل واضح طور پر وہ صحیح لمحہ اچھی طرح یاد ہے جب میں نے پہلی مرتبہ اس حقیقت کو سمجھا کہ مجھے اپنی بیوی کو لازمی قتل کرنا ہوتا ہے۔ میرے ریٹائرمنٹ سے ٹھیک تین ہفتے پہلے کی بات ہے۔

میں نے اپنی زندگی کے پینتیس طویل اکتا دینے والے سال اس کہانی کی نذر کر دیے تھے اور یہ احمقانہ یقین رکھتا تھا کہ میری کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔ لیکن بعد میں پتا چلا کہ اس بارے میں، میں نمایاں طور پر خوش فہمی کا شکار تھا۔ میرے اعزاز میں ایک لنچ کا اہتمام کیا گیا اور تحفے میں مجھے ایک سنہری گھڑی پیش کر دی گئی۔

میں نے اپنی ذاتی اشیاء جوتے کے ایک ڈبے میں بھر لی تھیں۔ جب میں نے دفتر کی عمارت سے باہر قدم رکھا تو برسوں بعد مجھے اپنے آزاد ہونے کا احساس ہوا۔ میری ذاتی اشیاء کا ڈبا میرے ہاتھ میں تھا اور میرے ذہن پر کسی قسم کا کوئی بوجھ نہیں تھا۔

میری یہ خوش فہمی صرف اس وقت تک برقرار رہی



چہرے اڑانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جب میں نے یہ کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے تو اس نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اسے مار ڈالتا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ وہ جانتی ہے کہ وہ کبھی بھی زندہ گھر واپس نہیں لوٹے گی۔

مجھے اس کی ان باتوں پر طیش آرہا تھا۔ اپنی صحت کے بارے میں اس کی شکایات ایک عرصے تک سنتے سنتے میں عاجز آچکا تھا اور یہ نوبت آچکی تھی کہ مجھے اب اس کی صحت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ دل کی مریض تھی لیکن اگر اس کا خیال یہ تھا کہ میں اپنی بقیہ زندگی اس کی دیکھ بھال کے لیے گھر ہی میں محصور رہ کر گزار دوں گا تو یہ اس کی سراسر غلط فہمی تھی۔

اگلے روز صبح جب میں باتھ روم میں آئینے کے سامنے کھڑا اپنی داڑھی تراش رہا تھا تو اچانک مجھ پر منکشف ہوا کہ ڈورس کو لازمی مرنا ہوگا۔

اس لیے کہ میں نے زندگی بھر سخت محنت مشقت اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ مجھ سے وہ خوشیاں چرا لے جن کی خاطر میں نے اتنی محنت زندگی گزاری تھی۔

درحقیقت اس سارے معاملے کا مشکل ترین مرحلہ اس پر عمل کرنے کے فیصلے تک پہنچنے کا تھا۔ اس کے بعد کے تمام مرحلے حیرت انگیز طور پر نہایت آسان لگ رہے تھے۔ ڈورس کو یہ یقین دلانا مشکل نہیں تھا کہ میں نے اس کے مطالعے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اب میرا جزیرہ ہوائی یا کسی اور تفریحی مقام پر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

اب میں نے روزانہ مقامی لائبریری میں جانا شروع کر دیا۔ ڈورس رومانی ناول پڑھنے کی رسیا تھی۔ وہ تقریباً روزانہ ہی دوڑتی ہوئی لائبریری جایا کرتی تھی اور پڑھنے کے لیے ایک نیا ناول لے آتی تھی۔ اس کے اس مشغلے کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے موقع غنیمت جانا اور اسے پیشکش کی کہ میں خود لائبریری جا کر اس کے لیے روزانہ ایک نیا ناول لاسکتا ہوں۔

ڈورس نے میری یہ پیشکش بہ خوشی قبول کر لی۔ میں نے لائبریری پیدل آنا جانا شروع کر دیا۔ میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ میری روزانہ کی آمد و رفت کے اوقات بھرپور طریقے سے لوگوں کی نگاہ میں رہیں۔

میں روزانہ صبح نصف النہار کے وقت مقامی سوئمنگ پول کے پاس پہنچ جاتا تھا جہاں نو عمر لڑکے پانی میں اگلیاں کر رہے ہوتے تھے۔ میں نے ان سے ایک آدمہ

جملہ کہنا اپنا معمول بنالیا تھا۔ میں ہمیشہ ان کو متوجہ کرتے ہوئے اپنی گھڑی کو دیکھتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ یہ عین دوپہر کا وقت ہے اور سورج نصف النہار پر ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ پیٹھ پیچھے میرا مذاق اڑاتے تھے اور مجھے ایک خبیثی اور احمق بوڑھا کہتے تھے لیکن میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ اس لیے کہ اس حوالے سے وہ مجھے یاد رکھتے تھے اور یہ بات میرے مقصد کے لحاظ سے نہایت موزوں تھی۔

پھر میں وہاں سے آگے بڑھ جاتا تھا اور گھڑی پر نگاہ رکھتے ہوئے صبح ساڑھے بارہ بجے لائبریری میں ہوتا تھا۔ میں اپنی گھڑی کو دیکھتے ہوئے لائبریرین سے کہتا تھا کہ وہ میری پابندی کو دیکھتے ہوئے اپنی گھڑی سیٹ کر سکتا ہے۔ چند ہفتوں کے بعد میرا یہ معمول ہر ایک کے ذہن میں نقش ہو چکا تھا۔ اگست کے آخر میں، میں نے محسوس کیا کہ اب اپنے منصوبے کے اگلے حصے پر عمل کرنا میرے لیے محفوظ رہے گا۔

اس روز میں اپنے معمول سے ایک گھنٹا قبل گھر سے روانہ ہوا تو ڈورس اپنے ناول کے مطالعے میں اتنی منہمک تھی کہ اس نے نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

سوئمنگ پول تک پہنچ کر میں اپنی مخصوص جگہ پر رک گیا، میں نے اپنی دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور پانی میں موجود لڑکوں سے کہا کہ یہ نصف النہار کا وقت ہے جبکہ حقیقت میں اس وقت صرف گیارہ بجے تھے۔ پھر ان سے چند جملوں کا تبادلہ کرنے کے بعد میں لائبریری کی جانب چل دیا۔

جب میں سوئمنگ پول میں موجود تیراکوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو جلدی سے درختوں کے جھنڈ میں چلا گیا اور گھوم کر واپس اپنے گھر کی جانب تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

گھر پہنچ کر ڈورس کو قتل کرنا میری توقع سے کہیں زیادہ آسان رہا۔ میں نے صوفے پر سے ایک ٹکیہ اٹھایا اور اسے مضبوطی کے ساتھ ڈورس کے چہرے پر رکھ کر اس پر اپنا پورا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ڈورس نے اتنی جدوجہد نہیں کی جتنی کہ میں اس سے توقع کر رہا تھا۔ میں نے سچے پر اس وقت تکسپوری احتیاط کے ساتھ اپنا دباؤ برقرار رکھا جب تک مجھے یقین نہیں آگیا کہ وہ جان کی بازی ہار چکی ہے۔

ڈورس کی پسندیدہ کرسی کے برابر والی میز پر ایک

قدیم نادر گھڑی رکھی رہتی تھی۔ مجھے اچانک خیال سوچا تو میں نے اس گھڑی کا وقت آگے بڑھا دیا اور اسے بارہ بج کر پینتیس منٹ پر سیٹ کر دیا۔ ساتھ ہی اسے نیچے فرش پر لڑھکا دیا۔

پھر احتیاط کے ساتھ ڈورس کی لاش فرش پر رکھ دی اور اس کا ہاتھ نیکی فون کی جانب بڑھتے ہوئے کر دیا۔ واپسی میں، میں نے احتیاط برقی اور سوئمنگ پول کی جانب سے لائبریری جانے سے گریز کیا اور راستہ تبدیل کرتے ہوئے اپنے معمول کے وقت پر لائبریری پہنچ گیا۔ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ لائبریرین میری وقت کی پابندی کو خاص طور پر نوٹ کر لے۔

پھر جونہی میں گھر واپس پہنچا تو میں نے فوراً ہی ہمارے نیکی ڈاکٹر کو فون کیا اور ڈورس کے ہارٹ اٹیک کی خبر دی۔ وہ چند منٹوں میں ہی پہنچ گیا۔

ڈورس کے دل کی کیفیت کو تو نظر رکھتے ہوئے مجھے توقع تھی کہ وہ ہارٹ فیل ہونے کی بنا پر موت کے سرٹیفکیٹ پر فوراً ہی دستخط کر دے گا۔ لیکن اس وقت مجھے ایک جھٹکا سا لگا جب اس نے میرا فون استعمال کرنے کی اجازت چاہی اور شریف کے دفتر کا فون نمبر ڈائل کیا۔

شیرف ایڈمز تقریباً بیس منٹ میں آ گیا۔ اسے دیر اس وجہ سے ہوئی کہ وہ راستے میں سوئمنگ پول سے اپنے بیٹے بوبی کو لینے چلا گیا تھا۔

جونہی ان دونوں باپ بیٹے نے ہمارے گھر میں قدم رکھا، ڈاکٹر جونسن، شیرف ایڈمز کو ایک جانب لے گیا اور دبے دبے لہجے میں اس سے بات چیت کرنے لگا۔ مجھے جو کچھ سنائی دیا، وہ یہ تھا کہ ڈاکٹر ڈورس کی موت کے بارے میں کچھ شبہ کا اظہار کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں سے معاملہ کچھ گڑبڑ سا لگ رہا ہے۔

”جب تم گھر پہنچے اور اپنی بیوی کو فرش پر پڑے ہوئے پایا تو تم نے کیا کیا؟“ شیرف نے مجھ سے پوچھا۔

”جب میں گھر پہنچا اور میں نے اسی طرح اسے فرش پر پڑا ہوا پایا تو سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس کی نبض ٹولی۔ جب مجھے اس کی نبض نہیں ملی تو میں نے فوری طور پر ڈاکٹر جونسن کو فون کیا۔“ یہ جواب دیتے ہوئے میں نے بھرپور کوشش کی کہ میری آواز سے یہ ظاہر ہو جیسے میں اپنے آنسوؤں کو روکنے کی جدوجہد کر رہا ہوں۔

”کیا تم نے کوئی ایسی بات نوٹ کی جس کی بنا پر تمہیں یہ خیال آیا ہو کہ کوئی چوری چھپے زبردستی گھر میں گھس

آیا ہو؟“ شیرف ایڈمز نے پوچھا۔

”اب جبکہ تم نے تذکرہ کیا ہے تو مجھے یاد آیا کہ حقیقی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مائی گاڈ، لگتا ہے کہ میری اچانک آمد نے میری بیوی کے قاتل کو لازمی حقیقی دروازے سے بھاگ کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا ہوگا۔“

”اس بات کی زیادہ امید نہیں ہے۔ جیسا کہ تم اپنی اس ٹوٹی ہوئی گھڑی کو دیکھ رہے ہو، اس کے مطابق تمہاری بیوی کی موت بارہ بج کر پینتیس منٹ پر واقع ہوئی تھی اور یہاں موجود ڈاکٹر جونسن کا کہنا ہے کہ تم نے اسے دو بجے کے بعد فون کیا تھا۔ یہ وہ وقت ہے جب تم عام طور پر لائبریری سے واپس گھر آتے ہو، درست؟“

”بالکل ٹھیک کہا، شیرف ایڈمز، بالکل ٹھیک! میں گھر سے گیارہ بج کر چالیس منٹ پر نکلا تھا۔ سوئمنگ پول پر ٹھیک بارہ بجے پہنچا تھا اور لائبریری ٹھیک ساڑھے بارہ بجے پہنچ گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمہارا بیٹا بھی میری پابندی وقت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ میں نے آج بھی اس سے بات کی تھی جیسا کہ میں اکثر کیا کرتا ہوں اور وہ ٹھیک بارہ بجے دوپہر نصف النہار کا وقت تھا۔

آپ لوگ میرے خوف و دہشت کا تصور کر سکتے ہیں جب شیرف کے بیٹے نے اپنی ان بڑی بڑی محسوس ٹکا ہوں سے میری طرف دیکھا اور جائے واردات سے میری عدم موجودی کو مکمل طور پر برباد کر دیا۔

”آئی ایم سوری سر۔ لیکن اس وقت بارہ نہیں بجے تھے۔ یوازہ اسکاؤٹ میں ہمیں وقت سورج کی پوزیشن کو دیکھ کر بتلانا سکھایا جاتا ہے۔ لہذا میں نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ جب آپ نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا تھا اور یہ کہا کہ یہ نصف النہار کا وقت ہے تو اس وقت سورج اپنے درست مقام پر موجود نہیں تھا۔ آپ جب بھی ہمارے پاس سوئمنگ پول پر آتے ہیں تو میں ہمیشہ سورج کو چیک کرتا ہوں۔ وہ اس وقت عین دریا کے اوپر ہوتا ہے۔ لیکن آج وہ وہاں پر نہیں تھا۔ آج وہ مشرق کی جانب تھا اور دریا کے عین اوپر نہیں پہنچا تھا۔ مجھے اس وقت حیرانی ہوئی تھی جب آپ نے یہ کہا تھا کہ یہ عین دوپہر کا وقت ہے اور سورج نصف النہار پر ہے۔ آپ نے ہمیں ایسا کیوں کہا تھا جبکہ نصف النہار ہونے میں کم از کم ایک گھنٹا باقی تھا؟“

اور یہی وہ لمحہ تھا جب شیرف ایڈمز نے مجھے میرے حقوق پڑھ کر سنا شروع کر دیے۔





آوارہ گرد

ڈاکٹر عبد اللہ ربیع

قسط نمبر: 20

مندن کلیسا، سینی گاک، دھرم شمالی اور اناٹہ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بائیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام پر رابیوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ پورا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گہات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سننی اور ایشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...



ماں جی کی بات نے جیسے وقت کی نبض تھام لی تھی۔ ایسی نبض کہ جس کی حرکت دل کی ہموار ”ردم“ کا پتا دیتی ہے کہ زندگی ابھی رواں دواں ہے، لیکن صرف دھڑکتے دل کا نام ہی تو زندگی نہیں... بعض زندہ لوگ تو مردوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں یا کر دیے جاتے ہیں۔ ماں جی کی بات بھی شاید میرے لیے کچھ ایسا ہی پیغام لائی تھی۔ جس نے مجھے گرد و پیش سے تو کیا اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیا تھا۔

کمرے... کی فضا اچانک ہی دم بہ خودی ہو گئی تھی۔ ہر سو ایک سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ہاں! شور... زدہ سناٹا۔ بھلا سناٹا بھی شور زدہ ہوتا ہے؟ لیکن بعض سناٹے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو بہ ظاہر خاموش ہوں مگر اندر اپنے ایک طوفان چھپائے ہوتے ہیں۔

میں یاں کے دائیں جانب اور زہرہ بانو اُن کے بائیں طرف بیٹھی تھی۔

میں ابھی تک جیسے ایک شاک کی سی کیفیات سے دوچار تھا۔ میرا ہاتھ ابھی تک زہرہ بانو کے نرم و نازک ہاتھ پر تھا، ان کے ہاتھ میں واضح طور پر لرزش محسوس کی جاسکتی تھی۔

چند نہیں بلکہ کئی ٹائپ اسی طرح کم صم سی گھڑیوں کی نذر ہو گئے، اور جب حواسوں کو عقل و خرد کا یارا ہوا تو میں نے ماں جی کے دائیں جانب بیٹھی زہرہ بانو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی کشادہ آنکھیں... مزید پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نگاہیں میرے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ لگتا تو یہی تھا کہ میری طرح وہ بھی ایک شاک سے گزر رہی ہو۔

آخر کیا سوچ کے ماں جی نے اتنی بڑی بات اور اتنی آسانی سے کہہ دی تھی؟ کیا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ میرا اور عابدہ کا تعلق، احساسات و جذبات کی غیر مرئی ڈور میں بندھ چکا ہے؟ عابدہ کی وجہ سے میں کس قدر پریشان اور تشویش زدہ تھا، کیا ماں جی کو پھر بھی اس بات کا احساس نہ ہو سکا تھا کہ عابدہ میرے لیے میری سانسوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

ماں جی کو زہرہ بانو اور میری عمر کے تفاوت کی بھی پروا نہ تھی؟ یا۔۔۔ ان کا دل صرف اپنے بڑے بیٹے لیتھی شاہ کے لیے دھڑکتا تھا؟ اور جو بیٹا، یعنی میں۔۔۔ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ماں جی کو اس کے جذبات و احساسات کی کوئی فکر نہ تھی؟ آخر کیا سوچ کر ماں جی نے اتنی بڑی بات کہہ

ڈالی تھی؟ مجھے اپنے اس خیال پر فوراً شرمندگی کا احساس بھی ہوا تھا کہ میں...۔۔۔ ماں کے متا بھرے اور بے لوث ہمارے پر ”شبہ“ کر رہا تھا۔ ماں باپ کے لیے تو سب اولاد سناجھی ہوتی ہے۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے ”لاڈلا“ کوئی کوئی ہوتا ہے۔

ماں جی کی متا بھری محبت کو میں نے آج دوسری بار شک کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اور خود ہی مجھے اپنی اس غلط فہمی پر ندامت اور شرمساری بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔

ایک خیال اور بھی اچانک ہی کسی برچھی کی طرح میرے سینے میں کھب کے رہ گیا۔

”کہیں اس سارے چکر میں زہرہ بانو کا تو ہاتھ نہیں تھا؟ ماں جی کو اپنے ساتھ بہ صد اصرار بیگم ولا لے جانا، ان کی تندہی کے ساتھ خدمت کرنا۔ اور ماں جی کو اپنا بتا لینا کہ ماں جی کا دل ہی بیگم ولا میں زہرہ بانو کے ساتھ لگ کر رہ گیا تھا۔ کک... کہیں غیر محسوس طور پر زہرہ بانو نے ہی تو نہیں میری اور عابدہ کی محبت پر شبخوں مارا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے بڑی تیز اور آتش فشاں۔۔۔ نظروں سے زہرہ بانو کے سکتہ زدہ چہرے کو دیکھا اور یہ اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کرنے لگا کہ کہیں یہ ساری ”شرارت“ اور ”شرانگیزی“ اسی کی تو نہیں پھیلائی ہوگی۔ مگر خود اس کے چہرے پر بھی تو ایسے ہی تاثرات، ڈوبتی ناؤ کی طرح ہلکورے لے رہے تھے کہ جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

میری آنکھوں سے یلکھت پھونٹے شراروں کی تپش کو شاید زہرہ بانو نے بھی پل کے پل بھانپ لیا تھا اور یہی سبب تھا کہ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں خوف، آنسوؤں کی طرح بہہ کر اس کے پورے چہرے پر پھیل گیا۔

”تت... تم دونوں خاموش کیوں ہو گئے؟ جواب نہیں دیا میری بات کا۔“

دفعۃً ہی ماں جی کی آواز نے جیسے پُرسکوت گھڑیوں کو تھپک کر رکھا لیا۔ تب ہی میں نے زہرہ بانو کے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ فوراً ہٹا لیا، یوں، جیسے میں نے کسی ناگن کے پھن پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ماں جی نے میری اس حرکت کو خاص طور پر نوٹ کرتے ہوئے مجھے شاکی... نظروں سے گھور کے دیکھا۔

”مم... ماں جی! یی... یہ آ... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

میری آواز میں ایسی لڑکھڑاہٹ تھی گو یا میرا پورا جسم

دونوں کا ایک لکھا دیکھ رہی ہوں۔ کاش! میرا یہ سوہنا خواب پورا ہو جائے۔“

ماں جی کی بات سن کر میں دل کر رہ گیا۔ ”کیا واقعی کاتب تقدیر نے ایسا کچھ میرے نصیب میں لکھ ڈالا تھا کہ...“ اس سے آگے کا تصور میرے لیے محال تھا۔

میں نے ایک سلگتی ہوئی نظر زہرہ بانو کے چہرے پر بھی ڈالی تھی۔ اس بار اس نے اپنا چہرہ جھکایا ہوا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز سراسر فردیاندہ لگا۔ جیسے اسے ماں جی کی بات پر کوئی اعتراض ہی نہ ہو۔ اس میں بھی مجھے اس کی چلتی کاری کا شبہ ہوا تھا کہ وہ خاموش کیوں تھی؟ اسے بھی انکار میں بولنا چاہیے تھا ماں جی سے، تاکہ ماں جی اپنے اس خیال پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

میں نے اپنی رستہ داغ پر ایک نگاہ ڈالی اور بالآخر ایک گہری سانس کھینچ کر ماں جی سے کہا۔

”ماں جی! مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں آج شام اول خیر کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہونا ہے۔ ابھی تیاری بھی کرنی ہے۔ آپ کو اور کوئی بات تو نہیں کرنا تھی؟“ میری بات پر ماں جی نے ایک سوچتی ہوئی سی نظر میرے چہرے پہ ڈال کر ہولے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی، پھر بولیں۔

”شہزی پتر! اپنا خیال رکھنا۔ کب تک لوٹے گا خیر سے؟“

”ارادہ تو جلد لوٹنے کا ہے، اگر کام بڑھ گیا تو مزید کتنے دن رکنا پڑے اس کا نہیں معلوم مجھے۔“

”چنگا۔ پر میری بات پر تو غور تو کرے گا ناں شہزی پتر؟“

ماں جی نے مجھے جس بات پر غور کرنے کے لیے کہا تھا، وہ میرے لیے لیے قابل غور تو کیا، اس کا تصور کرنا بھی میرے لیے ناممکنات میں سے تھا لیکن ماں جی کو میں کیا جواب دیتا؟

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ کر بہت ہولے سے فقط اپنے سر کو اثبات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا تھا۔ جبکہ ماں جی نے وقت رخصت میری خیریت اور سلامتی کی اتنی بہت سی دعا کیں دیں کہ بے اختیار میرا دل بھر آیا۔ ماں کی انہی دعاؤں کا تو میں پیاسا تھا، جو وہ مجھے ہر وقت دیتی رہتی تھیں۔ میں ان کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور پھر جب ماں جی کو سلام کر کے اور دانستہ زہرہ بانو کو نظر انداز کرتے ہوئے، کمرے سے نکلنے لگا تو وہ ایک دم ماں جی

ہی ڈگمگا رہا ہو۔ یکدم ہی میں ماں جی کے پاس سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”شہزی پتر!“

ماں جی نے مجھے پکارا۔ ان کی ٹھہری ہوئی اور سپاٹ آواز محسوس کر کے میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہی ان کی طرف گھوما تو ایک منظر دیکھ کر میں زہرہ بانو کی شراکتیازی اور چالاکی کی جھلک محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ اس کا ہاتھ ابھی تک ماں جی کے ہاتھ میں تھا اور وہ ان کے پاس سے اٹھی بھی نہیں تھی۔

یہی وہ وقت تھا، جب پہلی بار میرے پورے وجود میں اس کے لیے نفرت کی ایک لہری دوڑ گئی۔ جبکہ ماں جی مجھے آواز دینے کے بعد اب میرا چہرہ نکلے جا رہی تھیں۔ اپنی آواز پر متوجہ پا کر وہ دوبارہ بولیں۔

”مجھے پسند نہیں آئی میری بات شہزی پتر؟“

میں ابھی ماں جی کو ایسا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا جس سے ان کا دل دکھتا۔ لہذا میں نے ہل کے ہل اس کبیر اور لا-نخل سی صورت حال کو ماں کی بغیر کسی تاراشکی کے بندل کرنے کا سوچ کر، مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے، ماں جی کے قریب آ کر کہا۔

”ماں جی! میرے لیے آپ کا یہ فیصلہ بہت اچانک اور بالکل ہی غیر متوقع ہے۔ جس کا ابھی میں اتنی جلدی بھلا کیا جواب دے سکوں گا؟“

یہ کہہ کر میں تھا اور پھر جیسے ان عذاب ناک گھڑیوں کا کچھ بوجھ زہرہ بانو کی گود میں ڈالنے کی غرض سے دوبارہ ماں جی سے بولا۔

”بلکہ یہ سب کچھ تو زہرہ بھابی کے لیے بھی غیر متوقع اور اچانک ہی ہوگا۔ اب بھلا وہ یا میں اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟“

دفعۃً ہی مجھے احساس ہوا کہ میرے منہ سے کچھ غلط نکل گیا۔ یہ احساس مجھے ماں جی کے چہرے پر خوش امید کے ابھرتے تاثر کو بھانپ کر ہوا۔ وہ میری اس بات سے شاید مجھے نیم رضا مستند سمجھ رہی تھیں، یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے متا بھری رسائیت سے بولیں۔

”ہاں، ہاں... شہزی پتر! تم دونوں سوچ لو پھر فیصلہ کر لینا۔ ایک دوسرے سے تو تم پہلے سے واقف ہو ہی۔ ویسے ایک بات میں تم دونوں سے ہی کہوں گی کہ یہ سارے تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ کس کا کہاں اور کس کے ساتھ لکھا ہے، یہ کاتب تقدیر پہلے ہی لکھ چکا ہوتا ہے اور میں تم

کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ سے بڑی نرم آواز میں بولی۔

”شہزادی کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا، اگر ہم ماں جی کے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔“

مجھے صاف لگا تھا کہ اس نے ”ہم“ کا صیغہ جان بوجھ کر لگایا تھا اور ”ماں جی“ کا لفظ الگ سے استعمال کیا تھا بلکہ اس نے اس حساس موضوع کے چھڑنے پر، دانستہ ہی تھوڑی دیر مزید روکنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اس کی طرف ایک بار پھر برہم سی نگاہ ڈالی اور خاصی رکھائی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ذرا جلدی ہے، ویسے بھی ابھی مجھے بھوک نہیں پھر سکی۔“ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا اور اچانک کچھ سوچ کر میں مڑا، زہرہ بانو کی نگاہیں ابھی تک میرے تعاقب میں جمی ہوئی تھیں، مجھے اس طرح یکدم اپنی جانب پلٹنا دیکھ کر وہ بھی تھوڑا چوکی۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آپ ذرا..... میرے ساتھ آئیں گی؟“ میرا لہجہ یکسر اجنبی تھا۔

”ابھی آتی ہوں۔“ میں دروازے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔

یہ کمرہ، ماں جی کے کمرے سے ذرا الگ اور فاصلے پر تھا..... اور خالی بھی۔

یہاں آکر میں بیٹھا نہیں، کھڑا رہا اور اپنے اندر کے ابال پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ ابھی میرے پاس کچھ وقت تھا۔ اتنے میں وہ بھی آگئی۔

میں اس کی طرف پلٹا۔ ہم دونوں آمنے سامنے تھے اور نگاہیں چار تھیں۔

”کیا آپ ماں جی کے ساتھ اسی لیے اتنی محبت جتا رہی تھیں کہ وہ ایک دن آپ کی خدمت گزاری کے نتیجے میں آج میرے ساتھ اتنی بڑی بات کہہ ڈالیں جو میری سوچ میں تو کیا تصور میں بھی کبھی نہیں ہو سکتی۔ جواب دیں مجھے؟“

میں نے ایک ایک لفظ چبا کر سخت لہجے میں کہا تو اس کے شادابی چہرے پہ بیک وقت کئی رنگ چھلک گئے۔ ان میں برہمی کا رنگ بھی تھا اور ایک نامعلوم اداسی کا شائبہ بھی، کہیں ناگواری کی کروٹ تھی تو کسی رخ پر کم گشتہ دکھ بھی اٹھا ہوا تھا، کشادہ آنکھوں کی گہرائیوں میں حسرت و یاس کی تاثراتی چمک بھی ابھری تھی، لیکن سب سے آخر میں اس کے چہرے پہ جو کیفیت گویا ٹھہر کے رہ گئی تھی، اسے محسوس کر کے ایک لمحے کو تو میں بھی قدرے چوکنے پر مجبور ہو گیا۔

زہرہ بانو کے چہرے کی اس آخری اور مجسم ٹھہر جانے والی کیفیت میں ایسا ایسی ایک سرکشی نمودار ہونے لگی۔ وہ جواباً آتش فشاں لہجے میں گویا ہوئی۔

”شہزاد احمد صاحب! تم نے کس برتے پر اتنا بڑا الزام مجھ پر تھوپ دیا؟ ماں جی سے میری محبت، میرا خلوص تمہیں ڈھونگ لگا؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟“

”ہاں!“ میں اندر سے بھڑکا ہوا تھا اس لیے دو ٹوک انداز میں کہہ ڈالا۔

”کیوں؟“

”کیوں؟“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”کمال ہے۔ آپ جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بن رہی ہیں؟ آخر ماں جی نے اتنی بڑی بات کیسے اور کیا سوچ کر کہہ ڈالی ہم دونوں سے؟ ضرور اس میں آپ کے ڈھونگی رویے کا بھی دخل ہو گا کہ ماں جی مجھ سے ایسا کہنے پر بالآخر مجبور ہو جائیں۔ صحیح کہانا میں نے زہرہ بیگم!“

زہرہ بانو کے چہرے پر اب شدید اتار چڑھاؤ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ کچھ ایسا بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ضبط اور تحمل سے کام لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی شہزادی! کہ تم میرے بارے میں ایسی گری ہوئی اور گھٹیا سوچ رکھو گے۔ مجھے ماں جی سے واقعی کتنی محبت ہے۔ ان سے میری محبت کا صرف یہی حوالہ کافی ہے کہ وہ میرے مرحوم شوہر لائق شاہ کی ماں ہیں اور میں ان کی بہو۔“

”تو پھر یہ سب آپ کیوں خاموشی اور فرماں برداری سے سنتی رہیں، جو ماں جی نے ہم دونوں سے کہا تھا۔“ میں نے کتنی سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

”آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اسی وقت ان کے پاس سے اٹھ جائیں اور ایک دم انکار کر ڈالیں مگر آپ تو ایسے فدویانہ انداز میں ان سے لگی بیٹھی رہیں جیسے آپ کو ماں جی کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض ہی نہ ہو۔ میں بھی تو تھا ناں۔ ماں جی کی بات سنتے ہی ایک دم ان کے پاس سے اٹھ گیا۔ مقصد اشارتا ان پر یہی ظاہر کرنا تھا کہ میرے لیے ان کا یہ فیصلہ قابل قبول نہیں۔“

”تو پھر کہہ ڈالتے یہ بات ماں جی سے... کیوں خاموش رہے تھے؟“ وہ بھی تنک کر بولی۔ ”اس طرح تو تم نے بھی دو غلے پن سے کام لیا۔ اور اس بات پر ہی ماں جی کو احساس ہوا تھا کہ ان کی بات تمہارے لیے قابل قبول ہے۔“

اوارہ گرد

”او خیر، کا کا! ماں جی سے ملنے کے بعد تو تیرے چہرے پہ بارہ بج گئے ہیں، خیریت ہے؟“
میری سوچتی نظریں کار کی ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اسی انداز میں بولا۔ ”پتا نہیں کیوں یا راول خیر! آج میرا دل بڑا خراب سا ہو رہا ہے۔“

”او خیر! کیا بات ہو گئی ایسی کا کے؟ ماں جی نے تجھے کوئی ضروری بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ کہیں تیری خرابی دل کا تعلق اسی بات سے تو نہیں؟“

کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑتا، مگر اس وقت میں اندر سے سچ ہو رہا تھا۔ ایک کڑواہٹ سی تھی جو کسی زہر کی طرح میرے پورے وجود میں گھل رہی تھی۔ چند ثانیوں کے بعد میں نے اول خیر کو ساری بات بتادی، یہ بھی کہ آخر میں آتے ہوئے میری زہرہ بانو سے بھی تلخی ہو گئی تھی۔

اول خیر یہ سن کر سنجیدہ رہا۔ مگر پھر فوراً ہی اس نے ایک عجیب بات کہہ کر مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

”شہزی کا سکہ! پتا نہیں تو کیا سمجھے، لیکن بات سچ ہے۔ چاہتا تو میں یہی تھا کہ تجھے پہلے ہی سے بتا دیتا، لیکن یہ موضوع ہی حساس نوعیت کا تھا کہ میں چپ رہا۔ درحقیقت مجھے انہی دنوں یہ شبہ ہونے لگا تھا، جب ماں جی کا بیگم ولا میں دل لگ گیا تھا۔ اور پھر جب ماں جی کی زبانی ہی یہ پتا چلا کہ ان کا وہاں دل لگنے لگا ہے تو میں کچھ کچھ کھٹک گیا تھا لیکن...“ وہ کہتے کہتے تھما تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔
”لیکن کیا؟“

”میرا خیال ہے تجھے بیگم صاحبہ سے ابھی اتنی بڑی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ میں ان کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ اپنی شخصیت پر کوئی الزام بھی برداشت نہیں کرتی ہیں۔ اگر ایسا کچھ ہو بھی جائے تو وہ اس کی تردید کرنے کے بجائے، ضد میں آکر الٹا ہی کرتی ہیں، جیسا انہیں سمجھا جا رہا ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا میں نے ان پر غلط الزام لگایا تھا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”غلط تو نہیں کہا تھا کا کے! پھر تجھے یہ بات ابھی نہیں کہنی چاہیے تھی۔ جبکہ ماں جی کو تو نے سچ جواب دیا تھا۔ یعنی، نا انکارنا اقرار۔“ وہ بولا۔

”مگر مجھے اب بھی یقین ہے کہ زہرہ بانو نے میرے اور عابدہ کے بیچ سیندھ لگانے کی کوشش کی ہے۔ وہ پہلے ہی

زہرہ بانو کی اس بات نے مجھے لا جواب سا کر دیا۔ کیونکہ اپنی اس غلطی کا مجھے بھی احساس ان کے چہرے پر ایک طرح کی خوش امید کی تاثیر ابھرتے وقت ہوا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

”میں ابھی صاف بات کہہ کر ماں جی کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا لیکن اب یہ ذمے داری صرف آپ کی بنتی ہے زہرہ صاحبہ کہ آپ ماں جی کو اشاروں کنایوں سے سمجھانے کی کوشش کریں، انہیں میرے اور عابدہ سے متعلق اصل حقیقت بتادیں میں اس کے لیے کیا ہوں اور وہ میرے لیے کیا ہے۔“

”لیکن تم نے جو مجھ پر اتنا بڑا الزام لگایا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا۔

”اس کی وہی حیثیت ہے جو میں آپ سے کہہ چکا ہوں اور جو آپ اچھی طرح سن چکی ہیں۔“

”تمہیں اپنے یہ الفاظ واپس لینا ہوں گے شہزی!“ اچانک وہ بدلے لہجے میں بولی تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے سامنے کسی محاذ پر خیم ٹھونک کر آگئی ہو۔

”تم نے مجھ پر ایک غلط اور گھٹیا الزام لگایا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ تم اس پر ڈٹے ہوئے بھی ہو۔“

”تو پھر آپ کو اپنے الزام کی خود ہی نفی کرنا ہوگی۔“ میں نے بھی اٹل لہجے میں کہا۔ ”جس طرح آپ نے اپنے سلوک سے ماں جی کو یہ باور کروانا چاہا کہ آپ ان کو ابھی تک اپنی ساس سمجھتی ہیں، بالکل اسی طرح انہیں آپ نے یہ احساس دلانا ہے کہ ان کی بات، ان کا خیال، میرے لیے

ہی نہیں بلکہ آپ کے لیے بھی ناقابل عمل ہے۔“

”پہلے تمہیں اپنے الفاظ واپس لینا ہوں گے شہزی!“

”میں نے جو دیکھا، جو محسوس کیا وہ کہہ دیا۔ اس کی نفی آپ کو خود کرنا ہوگی، اپنے عمل سے۔“

یہ کہہ کر میں انہیں سوچتا ہوا چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ اول خیر دوسرے کمرے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے بلوالیا اور پھر ہم بیگم ولا سے اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس بار بھی کاراول خیر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ اول خیر نے ایک دو بار میری طرف گردن موڑ کر دیکھا بھی تھا، شاید وہ خستہ تھا کہ میں خود بات کروں گا، مگر میری خاموشی کو طویل پکڑتے دیکھ کر اسی نے بات کی ابتدا کی اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

اس بار بھی کاراول خیر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ اول خیر نے ایک دو بار میری طرف گردن موڑ کر دیکھا بھی تھا، شاید وہ خستہ تھا کہ میں خود بات کروں گا، مگر میری خاموشی کو طویل پکڑتے دیکھ کر اسی نے بات کی ابتدا کی اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

اس بار بھی کاراول خیر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ اول خیر نے ایک دو بار میری طرف گردن موڑ کر دیکھا بھی تھا، شاید وہ خستہ تھا کہ میں خود بات کروں گا، مگر میری خاموشی کو طویل پکڑتے دیکھ کر اسی نے بات کی ابتدا کی اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

اس بار بھی کاراول خیر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ اول خیر نے ایک دو بار میری طرف گردن موڑ کر دیکھا بھی تھا، شاید وہ خستہ تھا کہ میں خود بات کروں گا، مگر میری خاموشی کو طویل پکڑتے دیکھ کر اسی نے بات کی ابتدا کی اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

بس! اب آگے اللہ خیر ہی کرے۔ لیکن تو تسلی رکھ۔۔۔
 لکے! ایسا کچھ ہو گا نہیں۔ بیگم صاحبہ کبھی بھی تیرے اور عابدہ
 کے حق میں ڈاکا نہیں ڈالیں گی۔ پر تو نے ان کا دل توڑ کر

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ وطن عزیز میں موجود کالی بھیڑوں کا خفیہ طور پر قلع قمع کرنے کے لیے، جو مختلف آبادوں میں وطن عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور لوٹ مار کرپشن کے ذریعے اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف تھے، رہنجز کے ہی ایک ایسے ونگ کو عمل میں لایا گیا تھا جو کلی طور پر خود کو وطن کا گناہ مگر سچا سپاہی سمجھتے ہوئے اس میں رضا کارانہ طور پر بھرتی کیے گئے تھے۔ جو خود بھی اپنی ذاتی زندگی میں ایسے لوگوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے، مگر خاطر خواہ سوز سزنہ ہونے کی بنا پر وہ بے بس تھے یا پھر مقدور بھر اپنی سی کوشش جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان میں



تلاش



سردار دلیپ سنگھ لندن گئے۔ ایک روز ہائیڈ پارک کی دھڑکیوں کو ناچتے ناچتے تھک گئے تو ایک شیخ پر لیٹ کر سنانے لگے۔ چند منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر خاتون ادھر سے گزری۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”آر یو ریلک سنگ (ARE YOU RELAXING)
 انہوں نے جھٹ کہا۔ ”لو... آئی ایم دلیپ سنگھ!“

پھر ایک چلی دوشیزہ نے جاتے ہوئے وہی کہا۔ سردار جی نے پرانا جواب دہرا دیا۔ جب چار پانچ لوگوں کے ساتھ یہی قصہ ہوا تو سردار جی شیخ سے اٹھ گئے۔ انہوں نے طے کر لیا کہ اتنے لوگ ریلک سنگھ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں تو یہ ہم ان کو سر کر لینی چاہیے۔ وہ ایک طرف چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے کئی لوگوں سے سوال کیا۔ ہر ایک ہنس کر عجیب نظروں سے ان کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایک دور افتادہ گوشے میں ایک عمر رسیدہ شخص شیخ پر لیٹا ہوا تھا۔ سردار جی نے اپنا سوال ہرایا۔ ”آر یو ریلک سنگھ؟“ اس نے غنودہ آواز میں کہا۔ ”نہیں۔“

سردار جی حیرت سے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولے۔ ”تم یہاں پڑے موج کر رہے ہو... ادھر سارے لوگ تم کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

اسے سردار خوشونت سنگھ کا تجربہ

میں پڑتے تو دشمن ہم پر وار کر سکتا تھا۔ بشرطیکہ کہ انہوں نے ہی یہ جال بچھایا ہوتا، یہی سبب تھا کہ ہم غیر معمولی طور پر احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ البتہ گا ہے بہ گا ہے... موجودہ پھونپھون پر تبادلا خیال ضرور کر رہے تھے۔

”اگر تو واقعی یہ سچ ثابت ہوا تو ہمیں ٹریا کی روح کو سلام پیش کرنا چاہیے کہ وہ... اپنی جان کی پروا کئے بغیر ان درندوں کے بیچ میں رہتے ہوئے، اپنے چند گھنٹے بھر ساتھیوں کا ایک ایسا ٹولہ بنانے میں کامیاب رہی جو اس کی موت کے بعد بھی اپنے اس خطرناک مشن میں مصروف کار ہیں جو بھیڑیوں کی کچھار میں رہتے ہوئے ان کی تلخ کئی کرنے کو کوئی موقع... جانے نہیں دیتے تھے۔“

میرا خیال تھا کہ یہی گنتی کے چند بھیدی اسپیکٹرم کی لنکا

سے ایک میں بھی تھا۔ میری چوہدری ممتاز اور وزیر جان کے ساتھ ہونے والی چوکھی جنگ میں ان دونوں دشمنوں کے خلاف چونکا دینے والے انکشافات کے بعد سے میجر ریاض باجوہ میرا انتخاب ایک ”پاور ایجنٹ“ کے طور پر کر چکے تھے۔

بہر حال اول خیر اور شکلیہ اس اہم مہم میں خاصے پڑا تھا نظر آرہے تھے۔ ماں جی گھر پر نہیں تھیں، ورنہ شکلیہ کو میں ساتھ نہیں لے جاتا۔

البتہ آنسہ خالدہ سے ہر وقت رابطے میں رہنے کے لیے میرے پاس اسمارٹ فون تھا اور اس میں تیز رفتار نیٹ کی سہولت موجود تھی۔

ہم لاہور کے لیے ملتان سے اپنی کار میں تقریباً تین بجے سہ پہر نکل پڑے۔ باکی روڈ سفر تھا اور کار بھی اچھی کنڈیشن کی تھی۔ درمیانی رفتار سے ملتان سے لاہور لگ بھگ چار سے ساڑھے چار گھنٹوں کا سفر تھا، میں نے اول خیر کو اسی رفتار سے کار چلانے کا کہا تھا۔

چونکہ یہ ایک اہم مشن تھا اور ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا اسی لیے ہم نے ”اسلحہ خیز“ تیاری پوری کر رکھی تھی۔ کار اول خیر چلا رہا تھا اور اس کے برابر میں شکلیہ بیٹھی تھی، جبکہ میں دانستہ عقبی سیٹ پر براجمان تھا اور میری گود میں ایک ہلکی ساخت کی مشین گن تیار حالت میں تھی۔

اوکاڑہ پہنچ کر ہم... ایک روڈ سائڈ ہوٹل میں بہ مشکل بیس منٹ ر کے اور کار کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور چائے کا ایک ایک کپ اپنے معدے میں اتارنے کے بعد دوبارہ روانہ ہو گئے۔ اب کار میں چلا رہا تھا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر شکلیہ تھی جبکہ اول خیر عقبی سیٹ پر محتاط بیٹھا تھا۔

موسم گرم اور خشک تھا۔ کار کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اے سی آن تھا۔ پنجاب کی گرمیاں یوں بھی بڑی خشک ہوتی ہیں۔ ٹھنڈے پانی کی بوتلیں ہمارے پاس موجود تھیں، تاکہ بلاوجہ راستے میں رکنا نہ پڑے اور سفر جاری رہے۔

لاہور کے لیے روانہ ہوتے وقت... شبہ تھا کہ ممکن ہے ہمارا تعاقب کیا جائے۔ مگر ابھی تک ایسی کوئی بات ظہور پذیر ہونے کے امکانات دور نزدیک نظر نہیں آرہے تھے۔ خلاف توقع اول خیر اور شکلیہ کی ابھی تک راستے میں کوئی جھڑپ نہیں ہوئی تھی۔ وجہ مجھے یہی سمجھ میں آئی تھی کہ اس وقت ہم ٹوٹی رکی حالات سے دوچار تھے، کسی بحث

ڈھا سکتے تھے۔ مگر تنہا یہ لوگ بہر حال کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، جب تک کہ انہیں کوئی بیرونی سپورٹ نہیں مل جاتی۔ ثریا جب زندہ تھی تو وہ بھی انہی بنیادوں پہ اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھی اور اسی سلسلے میں اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔

ہم ساڑھے سات بجے تک بہ خیریت لاہور پہنچ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم نصف گھنٹا لیٹ ہوئے تھے۔

ہم نے سب سے پہلے ائرپورٹ کے قریب واقع مذکورہ ہوٹل کا رخ کیا۔ ملکی حالات کے پیش نظر راستے میں چند جگہوں پر ہونے والی چیکنگ کی وجہ سے ہم ریڈی میڈ میک اپ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ کیونکہ چیکنگ کے دوران شناختی کارڈ دکھانے کا سب سے پہلے تقاضا کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے اس میں ہمارے اصل فوٹو چسپاں تھے، چہرہ بدلنے کی صورت میں مشکل پڑ جاتی۔ جبکہ اسلحہ بھی ہم نے کار کے خفیہ خانوں میں چھپا رکھا تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں آخری ہتھیار میرا ”پاور ایجنٹ“ کا وہ کارڈ رہ جاتا تھا جس کے سلسلے میں، میں احتیاط ہی کرتا تھا کہ اسے بار بار شونہ کرنا پڑے تو بہتر ہے۔

جیسے ہی ہم شہر میں داخل ہوئے تو مذکورہ ہوٹل کا رخ کرنے کے بجائے ہم نے کسی الگ تھلگ مقام پر کار کے اندر ہی یہ ”کام“ نمٹا دیا۔ اس میں مزید بیس سے پچیس منٹ صرف ہو گئے۔

ہمارے پاس اب ثریا کے ساتھی کی ”ریکی“ کرنے کے لیے کم وبیش ایک گھنٹا ہی بچا تھا۔ معاملہ حساس تھا اسی لیے میں اپنے منصوبے کو بے داغ رکھنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے ہم نے ایک نسبتاً عام سے قریبی ہوٹل میں ایک کمر لیا۔ وہاں کچھ مزید ضروری تیاریاں کیں، جس میں ریڈی میڈ میک اپ بھی شامل تھا اور اسلحے کی ترتیب بھی۔

اس کے بعد ہم تینوں اس ہوٹل سے روانہ ہوئے اور ائرپورٹ والے ہوٹل کا رخ کیا۔

میں نے اب اپنی کار کو استعمال کرنے سے اجتناب برتا، اور وہی پرانا طریقہ اختیار کیا جو ایسے مواقع میں اکثر کرتا تھا۔ یعنی کار کسی گیراج میں روک کر اس کی ٹیونگ اور آئل چینج کرنے کے لیے چھوڑ دی اور وہاں سے ہم تینوں ایک ٹیکسی میں روانہ ہو گئے۔

کسی اہم اور حساس نوعیت کے مشن کا مارگٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے لائحہ عمل کو زگ زیک انداز میں ترتیب دے کر آگے بڑھنا میری تربیت کا حصہ تھا۔

مذکورہ ہوٹل پہنچ کر جانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ حالانکہ ہم تینوں میک اپ میں تھے اور ہمارے پہچان لیے جانے کا احتمال کم ہی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اسپیکٹرم کے گھاگ اور انتہائی تربیت یافتہ ایجنٹ بھی غضب کی نظر رکھتے تھے۔ ایک تجربہ اس کا مجھے ہو چکا تھا۔ وہ ”متوقع“ صورت حال میں بدلے ہوئے چہروں کے پیچھے اصل چہرہ تاڑنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔

ہوٹل ائرپورٹ کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے یہاں اندر باہر سخت سیکیورٹی کا انتظام تھا۔ اس کے لیے میں نے اول خیر اور شکلیہ کو باہر ہی کہیں محتاط ہو کے کھڑے رہنے اور انہیں کانوں کی ”لو“ پہ اسپائی ارفون چپکائے رکھنے کی ہدایت کر دی تھی۔ تاکہ میرا ان سے رابطہ بحال رہے۔

میری ہدایت کے مطابق یہ دونوں کسی عام سے فرد کو بھی شک میں مبتلا کیے بغیر اپنا کام بہ خوبی سرانجام دینا جانتے تھے۔ یعنی انہیں ایک ہی جگہ مسلسل کھڑے نہیں رہنا تھا۔

میں اب نہتا تھا اور ہوٹل کے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

گیٹ پر ہی مجھے روک لیا گیا۔ ایک وردی پوش سیکیورٹی گارڈ نے ”میٹل فائینڈر“ میرے پورے جسم پر پھر پھیرا، اس کے بعد مجھے ایک فل ہاڈی اسکیننگ (میٹل ڈیٹیکٹر) ڈور کے اندر سے گزارا گیا اور پھر وہاں سے میں نے فرش پر بچھے دبیز کارپٹ پر قدم رکھتا، پُر اعتماد چال چلتا ہوا دانستہ استقبالیہ پر جانے کے بجائے لابی کا رخ کیا۔ جہاں کہیں کہیں ہوٹل کے عملے کے افراد ڈبل پیس سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے، ان میں گوری چٹی اسمارٹ لڑکیاں بھی تھیں۔

اس طرح کے اشارز ہوٹلز میں عام سے لباس والے کسٹمر کو یہ لوگ خواجخواہ ہی چھتی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شاید یہ ان کی پیشہ ورانہ تربیت کا حصہ تھا۔ ان کے خیال کے مطابق ایسا ہلکا کسٹمر ان کے مالی فائدے کے لائق نہیں ہوتا تھا۔ تاہم میں نے اپنی ڈریسنگ کا خاص خیال رکھا تھا تاکہ کسی معمولی آدمی کو بھی مجھ پر کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہو۔ میں نے بیش قیمت گرے کلر کا بہترین تراش کا سکلپر کلاس ڈبل مشن سوٹ زیب تن کر رکھا تھا، جو میرے دراز قد

”یہ کمرانمبر انیس میں میرے ایک عزیز کو بھی آتا تھا۔ کیا نام تھا اس کا... ہاں، یاد آیا، زبیر، بتا سکتے ہو، وہ آگیا ہے؟“

وہ جواباً مودبانہ بولا۔ ”نہیں سر! وہ تو ابھی دو تین گھنٹے قبل ہی آئے تھے مگر میرا خیال ہے سرکہ وہ آپ کے مطلوبہ عزیز نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ دو افراد ہیں، اور ایک ان میں مس سوزی نامی خاتون ہیں اور مرد کا نام شاید عبید تھا۔“

”اوکے! مجھے شاید مغالطہ ہوا ہوگا۔ تم جاسکتے ہو، ضرورت پڑی تو میں کال کر لوں گا تمہیں۔“ میں نے اس سے کہا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اسپاکی ٹرانسمیٹر پر اول خیر سے رابطہ کر کے اپنا کمرانمبر بتا دیا۔

دو افراد میں ہمارا مطلوبہ آدمی عبید ہی ہو سکتا تھا، کیونکہ میرے سیل پر رابطہ کرنے والا مرد ہی تھا۔ جبکہ سوزی نامی عورت پر مجھے کچھ الجھن سی ہوئی تھی۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ آیا یہ دونوں دشمن تھے یا خیر خواہ۔ یعنی آنجہانی ثریا کے ساتھی۔

عبید نے (اگر تو یہ وہی تھا) مجھے فون کرنے سے منع... کر رکھا تھا۔ البتہ خود وہ کسی وقت بھی مجھ سے رابطہ کر سکتا تھا۔ اگلے دس منٹوں بعد میں روم سے نکلا، گرد و پیش پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور میری نظریں کمرانمبر انیس پر ٹھہر گئیں۔ پھر میں اسی طرف بڑھ گیا۔

عملے کی ایک سوٹ پوش حسینہ مسکراتی ہوئی میرے قریب سے گزرتی چلی گئی، جواباً میں بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ آگے بڑھ گئی تو میں مطلوبہ دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

میں نے دروازہ تھوڑا دھکیلا، وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، مجھے ایک ایسی آڑ کی تلاش تھی جہاں رک کر میں اس کمرے پر نگاہ رکھ سکوں۔ جلد ہی مجھے اوپر جاتے زینے کا ایک خلا دکھائی دے گیا، وہاں سے میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر دروازے پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔

اس طرف ایک نصف قد آدم کھڑکی بھی تھی جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔ میں ادھر ہی جا کھڑا ہوا اور یونہی باہر کا نظارہ کرنے لگا۔

ہوٹل چونکہ سینٹرلی انٹرنیشنل تھا اس لیے کھڑکیاں انٹرائٹ تھیں۔

کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر میں نے رسٹ وایج

اور کسرتی جسم پر بہت عمدہ نظر آتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ لابی کی طرف جاتے ہوئے قریب کھڑے عملے کے ایک سوئڈ بوئڈ شخص نے میری پُرجیہہ شخصیت سے مرعوب ہوتے ہوئے مجھ سے کچھ استفسار کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔ اس کے برعکس اس نے نہایت ادب سے قدرے جھک کر ہاتھ کے اشارے سے لاؤنج کی طرف میری راہنمائی کر ڈالی۔

اپنے چہرے پہ بردبارانہ تاثرات لیے میں نے اس پر ایک اچھٹی سی نگاہ ڈالی اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالنے کے بعد میں نے اسی مذکورہ شخص کی طرف دیکھا وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا، مگر پھر مجھ پر نظر پڑی تو میں نے ہلکے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی، اشارہ بھانپتے ہی وہ تیر کی طرح میری جانب بڑھا۔

”سر؟“ میرے صوفے کے قریب آکر وہ نہایت احترام سے بولا۔

”میری کراچی کی فلائٹ کینسل ہو گئی ہے، دوسری فلائٹ میں ابھی چند گھنٹے باقی ہیں، کوئی روم مل سکتا ہے؟“ مجھے معلوم تھا کہ اس کا جواب کیا ہوگا اسی لیے میں نے ساتھ ہی..... معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے یہ بھی کہہ

ڈالا ”میں بہت تھکا ہوا ہوں، استقبالیہ پہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں ہے۔ بس! جلدی سے میرے لیے ایک کمرے کا بندوبست کر دو جو گراؤنڈ پر ہی ہو۔ پندرہ اور بیس کی رومیں ہوتو زیادہ بہتر رہے گا۔ اس طرف ذرا میں ماحولیاتی سکون محسوس کرتا ہوں۔“

مجھے موٹی اسامی سمجھ کر اس نے چند سیکنڈوں میں میرا کام نمٹا دیا۔

میں نے دانستہ اسی کمرے کا انتخاب کیا تھا جو کمرانمبر انیس کے قریب ہی ہو، تاہم ساتھ ہی میں نے اپنی قریب ترین چوائس بھی بتا ڈالی تھی۔

مجھے کمرانمبر اکیس ملا تھا۔ میں نے ٹگڑی ٹپ کے ساتھ پے منٹ کی اور اسی آدمی کے ہمراہ مذکورہ کمرے میں آگیا۔ ثریا کے ساتھی نے چونکہ پہلے ہی سے مجھے کمرانمبر انیس کا کہہ رکھا تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ یا تو وہ وہاں موجود تھا یا آنے والا تھا، گویا کمرانمبر ایک تھا۔

یہاں آتے ہی میں نے اپنے لیے کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو منگوایا اور کھانا سرو ہونے کے بعد میں نے اسی شخص سے

میں وقت دیکھا۔ اسی وقت مجھے اپنے سل کی تھر تھراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے دانستہ سل کو ”خاموش“ حالت میں رکھا ہوا تھا۔

ڈپلے پر اسی کا نمبر آ رہا تھا۔ میرا دل یکبارگی ایک جوش کے احساس تلے دھڑکا اور کال اٹینڈ کر ڈالی۔

”ہیلو، کہاں ہو تم؟“ دوسری جانب سے عجلت آمیز آواز ابھری۔

”راستے میں ہوں لیکن فکر نہ کرو میں ٹھیک نو بجے...“
”اوکے، رائٹ۔“ اس نے میری بات کائی۔
”میں نے یہی تسلی کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ سنو، میں اس وقت اپنی جان داؤ پہ لگائے ہوئے ہوں، ممکن ہے تھوڑی دیر ہو جائے۔“ وہ آگے بولا۔

”میرے ساتھ ایک ساتھی لڑکی بھی ہے۔ وہ تنظیم کی وفادار ہے۔ میں اسے چالاکی سے ڈاج دے کر روم نمبر انیس میں آ کر تم سے ملاقات کروں گا اور ایک اہم بات سیر کر کے آئندہ کا کوئی لائحہ عمل بھی طے کریں گے۔“

”کیا تمہاری ساتھی لڑکی کو کمرانمبر انیس کا علم ہے؟“ میں نے اس کا ایک جھوٹ پکڑنے کی غرض سے پوچھا۔

”ہاں! اوکے پائے۔“ اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میری تسلی تو ہو گئی تھی لیکن ایک بات پر الجھ گیا تھا میں۔ اگر وہ کمرانمبر انیس میں مجھ سے کوئی خفیہ بات کرنا چاہتا تھا تو پھر اس نے اپنی ساتھی لڑکی یعنی تنظیم کی وفادار کو اس کمرے کے بارے میں کیوں بتایا تھا؟ یا پھر ہو سکتا ہے اس کی کوئی مجبوری ہو؟ وہ خود بھی کسی تنظیمی اہم مشن پر وہاں پہنچنے والے ہوں یا پھر پہنچ چکے ہوں؟

اس ضمن میں بہت سی باتیں ذہن میں آرہی تھیں جس کے چند اہم نکات پر میں غور کر چکا تھا۔

میں نے ہونٹ بھیج کر مچر غور انداز میں اپنی رسٹ وایج میں وقت دیکھا، ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ پہلے میرے دل میں خیال آیا کہ دروازے پر نوک کر کے اندر گھن پوائنٹ پر گھسنے کی کوشش کروں لیکن اس طرح معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ اگر وہ سچا تھا تو اس کا بھی سارا منصوبہ غارت ہو جاتا اور زندگی اس کی الگ اپنے لوگوں کے ہاتھوں داؤ پہ لگ جاتی۔ اسی لیے اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

میرا اب وہاں کھڑے رہنا بے کار ہی تھا۔ لہذا میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور ایک بار پھر اول خیر سے رابطہ کیا۔ اسے مزید چند ضروری ہدایات دیں۔

پورے نو بجے تو نہیں، البتہ نو بج کر بیس منٹ پر اس

نے مجھے کال کی اور پوچھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کتنی دیر میں پہنچ سکتا ہوں؟“

”مجھے پندرہ بیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔“
”ٹھیک ہے، لیکن اس سے زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

”میں استقبالیہ پر کیا کہوں کہ کس سے ملنا ہے مجھے۔ ایسے ہوٹلوں میں سیکورٹی سخت ہوتی ہے۔ تم کس نام سے مقیم ہو؟“

”عبید۔“ اس نے جواب دیا اور میرا اثباتی جواب سننے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے مزید پندرہ منٹ اپنے کمرے میں گزارے، پھر اول خیر سے رابطہ کر کے اسے موجودہ پجوشن کے بارے میں آگاہ کیا اور پھر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے کمرانمبر انیس کے دروازے پر آ کر دستک دی اور ایک ہاتھ اپنا کوٹ کی جیب کے اندر ڈال لیا۔

”کون؟“ اندر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔
”میں شہزی، جسے تم نے فون کیا تھا۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ سامنے ایک درمیانی عمر اور مناسب قد و قامت کا حامل شخص کھڑا نظر آیا۔ اس نے مجھے فوراً اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے راستہ دیا۔

میں محتاط روی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اور ایک ہی نگاہ ڈال کے سمجھ گیا کہ وہ کمرے میں تنہا تھا۔

اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ جب تک وہ پلٹتا میں ہاتھ روم اور واش روم چیک کر چکا تھا کہ وہاں اس کا کوئی ساتھی تو نہیں چھپا ہوا۔

”میں تو سمجھتا تھا کہ ثریا کا حوالہ دینے کے بعد تمہارے لیے شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی؟“ وہ ہولے سے مسکرا کر بولا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور دروازے کی چٹخی چڑھا دی۔ تاکہ ہنسی قفل کی دوسری چابی سے اس کا کوئی ساتھی اندر نہ در آئے۔

”اگر تمہاری تسلی ہو گئی ہو تو ہم آرام سے بیٹھ کر گفتگو کر لیں؟“

وہ کچھ کچھ بیزار سا نظر آنے لگا۔

”لو، یہ بھی میں میز پر ڈالے دیتا ہوں۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک پستول نکال کر قریب دھری میز کی سطح پر رکھ دیا۔

”تم شاید میک اپ میں ہو؟“ میں اس کی بات پر چونکا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ثریا کے کتنے ساگھی میری صورت سے آشنا تھے؟

”تمہیں کیسے شک ہوا؟ کیا تم نے میری صورت دیکھی ہے؟“

”بھکانا سوال۔“ وہ بولا۔ ”تم اسپیکٹرم کے انتہائی مطلوب دستوں میں سے ایک ہو۔ تمہاری تصاویر تک پوری دنیا میں، جہاں جہاں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، پہنچا دی گئی ہیں۔ اب ذرا کام کی بات ہو جائے؟“

”شیور۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ میں اب اس کی طرف سے کافی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔

اب ہم دو کرسیوں پر آنے سے بٹھ گئے۔ میں نے ایک بار پھر اپنے کان کی لو پر ہاتھ رکھ کر اول خیر سے مختصراً بات کی اور اس سے بولا۔

”ہاں! اب کہو۔ کیا بات ہے؟“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”آرک لو جن کی تمہارے ہاتھوں ہلاکت کے بعد سے اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو زبردست دھچکا لگا ہے۔ کیونکہ وہ تنظیم کا ایک مقامی ونڈلرایجنٹ تھا۔ جس کے زیر اثر اسٹیشن چیف اور کیٹس ایجنٹ ہوتے ہیں۔“ اس نے تھوڑا توقف کیا، اس کے بعد دوبارہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے آگے کہنا شروع کیا۔

”شاید تمہارے علم میں ہو کہ اسپیکٹرم بڑے بڑے عالمی گروہوں اور ممالک سمیت بھاری معاوضے پر ان کے مفادات کے لیے پوری رازداری کے ساتھ کام کرتی ہے بلکہ بسا اوقات تو انہیں بھی ساتھ ملا لیتی ہے جہاں ان کے مشترکہ مفادات ہوں ان میں ”بلیوٹلسی“ کا نام قابل ذکر ہے۔ بلیوٹلسی کے بارے میں تمہیں کچھ بریفنگ ہے؟“ وہ رکا۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔

”کیا؟“

”یہی کہ یہ بھارتی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی ”را“ کی ایک ذیلی شکل ہے جسے خصوصی طور پر بھارت نے پاکستان کے خلاف اپنے مذموم اور ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے جدید بنیادوں پر تشکیل دیا ہے۔“ میں نے میجر ریاض باجوہ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق کہا تو عبید مسکرا کے عجیب سے لہجے میں بولا۔

”بس؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے الجھن آمیز سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

”بھارت شروع ہی سے پاکستان کے خلاف دوغلی پالیسی چلتا رہا ہے۔ یہ ظاہر وہ وطن عزیز کے خلاف جو ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، اس کے درپردہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ را کے وطن عزیز میں ملک دشمن سرگرمیوں کے ٹھوس شواہد ملنے اور یو این او میں پاکستان کے خاطر خواہ احتجاج کے بعد سے معاملہ یہ ظاہر ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے اور لگتا یوں ہے کہ اب سب ٹھیک ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد را کا اصل ونگ ”بلیوٹلسی“ اپنی کارستانیاں آگے بڑھاتا رہتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ را کا ایک ونگ بہت پہلے سے ہی کام کر رہا ہوتا ہے۔“

وہ اتنا بتا کر تھا اور ایک نگاہ اپنی رسٹ وایج پر ڈالنے کے بعد آگے بولا۔ ”اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ آج بارہ بجے کی فلائٹ سے ایک عام مسافر کے بھیس میں بلیوٹلسی کا ایک انجیل پیر ایجنٹ جس کا اصل نام سندرداس ہے، نیمل کے نام سے یہاں پہنچنے والا ہے، جو درحقیقت اسپیکٹرم کے ساتھ کیے گئے ایک معاہدے کے تحت اس کی۔۔۔ لوکل کمانڈ کو سنبھالا دے گا، اور اسے اسپیکٹرم کا ونڈلرایجنٹ کا عہدہ تفویض کیا جائے گا۔ یوں سمجھ لو اسپیکٹرم نے یہاں اپنے ذوق ونگ کو سپورٹ دینے کے لیے بلیوٹلسی سے ایک مدد لی ہے۔ اور اب وہ دونوں مشترکہ طور پر اپنے مذموم مقاصد کو یہاں پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔“ وہ رکا۔

اس کی بات شاید اب بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ تاہم میں خاموش اور مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ آگے بولا۔

”پہلے میں خود سندرداس کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں غور کرنے پر میں نے سوچا کہ اس سے بھلا کیا فرق پڑتا؟ بلیوٹلسی اپنا ایک اور ایجنٹ بھیج دیتی۔ یہ مسئلے کا خاطر خواہ حل نہ ہوتا۔ لہذا بعد میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد میں.... اس نتیجے پر پہنچا کہ تم سے مدد لینی چاہیے، جو پلان میں نے سوچ رکھا ہے، اس کے مطابق ہمیں اسپیکٹرم کے خلاف دوسرے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔“

”کیا پلان ہے تمہارا؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

وہ میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

”تمہیں سندرداس کی جگہ لینا ہوگی۔“

”واٹ؟“ میں بری طرح چونکا۔ ”یہ.... یہ.... کیسے ممکن ہے، بھلا؟ اسپیکٹرم کی پوری عالمی قیادت کی نظروں

”بات اگر تمہاری سمجھ میں آگئی ہے تو میں آخری بات کہہ ڈالوں، کیونکہ اب وقت کم بچا ہے، اور ہمیں بلکہ تمہیں بہت سا کام نمٹانا ہے۔ اگر دل نہیں مان رہا تمہارا تو تم واپس جاسکتے ہو۔“

”آخری بات بھی کہہ ڈالو، میں سب سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں آگے بڑھنے کے لیے ہی قدم اٹھاتا ہوں، پیچھے نہیں۔“

”گڈ“ وہ توصیفی لہجے میں بولا۔ ”دیکھو، سندرداس کو اترپورٹ ریسیو کرنے کے لیے میں اور سوزی جائیں گے، یہاں اسی ہوٹل میں کمرانمبر کیا ون میں اسے کچھ دیر رکنا ہے، اس کے بعد ایک گاڑی ہمیں لینے کے لیے آئے گی۔“

”اس میں ہمارے ساتھی یعنی جیسی وفادار ہوں گے، وہ ہمیں سندرداس سمیت ساہیوال لے جائیں گے۔ یہ سارے معاملات چک نواں میں واقع اسپیکٹرم کے فلاحی آفس اسٹیشن فور میں طے پائیں گے۔“

”معاہدے کی اس بلیک کو برا فائل پر سندرداس سمیت، وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان کے دستخط ہوں گے۔ اس کے بعد وزیر جان سندرداس کو اپنی ذاتی گاڑی میں اپنی رہائش گاہ ”کینال لاج“ لے جائے گا، سندرداس وہیں رہے گا، جب تک وزیر جان اسے کھلاں والی میں زیر تعمیر ایک نئے ”زیر وہاؤس“ میں منتقل نہیں کر دیتا۔“

”کھلاں والی۔“ میں اس نام پر بری طرح چونکا تو عبید کو بھی میرے اس طرح بدکنے پر حیرت ہوئی، وہ اسی لہجے میں بولا۔

”کیا ہوا؟ تم کھلاں والی کے ذکر پر اتنا چونک کیوں گئے ایک دم؟“

میں اگر اسے زیر خان عرف خان جی کے بارے میں بتاتا تو بات لمبی ہو جاتی اسی لیے اس سے سر دست پہلو تہی کرتے ہوئے بولا۔

”کوئی خاص بات نہیں، یہ نام ذرا سنا ہوا لگا تھا، تم آگے کہو۔“

”معاہدے کی اس فائل کو ”بلیک کو برا“ کا نام دیا گیا ہے۔ جس میں اسپیکٹرم سمیت بلیوٹکسی کا گٹھ جوڑ، اور وزیر جان اور ممتاز خان کا سارا کچا چٹھا درج ہے۔ اگر ہمارا یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا ہے تو یوں سمجھو ان دونوں نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کیے ہیں، یہ صورت دیگر یہ بلیک کو برا معاہدہ۔ اسپیکٹرم اور بلیوٹکسی کو ایک نئی زندگی دے

میں، میں اب اجنبی نہیں رہا، وہ میرے سامنے آئے بغیر میری ایک ایک ہسری اور تصویر تک سے واقف ہے۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں میک اپ۔ کرلوں تو بھی یہ ناممکن ہے، باوجود اس کے بہت سی قباحتیں ہیں۔ سندرداس کا بھی پورا ریکارڈ، مع کوڈز وغیرہ کے سب ان کے پاس محفوظ ہوگا۔“

”تم کیا سمجھتے ہو شہزی۔! ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ ہم نے ان ساری باتوں پر غور نہیں کیا ہوگا؟“ عبید میری طرف دیکھ کر اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔

میں اس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ اس بار وضاحت آمیز اور صراحت سے اپنے پلان کی تفصیل بتانے لگا۔

”سنو شہزی! جب ہم نے ان ساری باتوں پر غور کیا تو ہمیں بھی یہ ناممکن سا لگا تھا، لیکن اس میں سارا کھیل چونکہ ٹائٹنگ کا ہے اس لیے یہ منصوبہ ہمارے لیے قابل غور ہے۔“

”ٹائٹنگ سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں کہا تو وہ بولا۔

”ہمارا پلان اس پر زیادہ دیر متحرک نہیں رہ سکتا۔ یعنی یہ دنوں یا مہینوں پر محیط نہیں ہو سکتا، یہ صرف چند منٹوں کا کھیل ہوگا۔“

”چند منٹوں کا کھیل؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ”ایک مقررہ اور مختصر وقت تک اس منصوبے پر عمل پیرا رہتے ہوئے دشمن پر ایسی کاری ضرب پڑے گی کہ وہ ایک طویل عرصہ تک اپنے زخم چاٹتا رہے گا۔“

”تو پھر یہ کارنامہ تم یا تمہارا کوئی ساتھی بھی بہ خوبی انجام دے سکتا ہے۔ اس کے لیے تم لوگوں نے میرا ہی کیوں انتخاب کیا؟“ میرے اس روائتی سوال پر وہ بولا۔

”مجھے پتا تھا تم یہ سوال ضرور کرو گے، شاید ثریا نے تمہیں اس سلسلے میں زیادہ معلومات نہیں دی کہ اسپیکٹرم کی اصلیت سے واقف ہونے کے بعد اپنی جان پر کھیل کر اس نے خود سمیت، اسپیکٹرم کے حال میں پھنسنے کے بعد کتنے لوگوں کے ضمیر کو جگایا تھا، یہ محض گنتی کے تھے، یوں سمجھ لو

آٹھ، دس، ان میں ثریا سمیت تو بہت سے مارے گئے، اب صرف میں اور میرے دو ساتھی کریم اور سجاد نامی ساتھی بچے ہیں، وہ دونوں وزیر جان کی اسپیشل کمانڈ کے زیر اثر ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتے ہیں، رہا میں تو، مجھے تم

دیکھ ہی رہے ہو، میں خود اس وقت تنظیم کی ایک وفادار سوزی کے ساتھ، سندرداس کو پردٹو کول دینے کے لیے آیا

ڈالے گا۔ جو ظاہر ہے ہمارے ملک کے لیے خیر کا باعث نہیں بن سکتا۔ لہذا تمہیں سندرداس کی جگہ لینا ہوگی اور فائل پر دستخط ہوتے ہی تمہیں، سجاد اور کریم فرار کروادیں گے۔ تم وہ فائل لے کر نکل جانا اور اسے پاور والوں کے سپرد کر دینا۔ یہ منصوبہ اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ ڈن۔“

”ڈن! میں نے بھی مستحکم لہجے میں کہا پھر سوچتے ہوئے بولا۔“ مگر سندرداس کو یہاں سوزی کے ہوتے ہوئے ٹھکانے لگانا اور اس کی جگہ لینا، کیا اتنا ہی آسان ہوگا؟“

”تم نے ہامی بھری، شہزاد صاحب! بس یہی کافی ہے۔ باقی کا کام میں سرانجام دے ڈالوں گا۔“

”لیکن سندرداس کی شکل و صورت جیسا میک اپ اور یقینی طور پر اس کے بائیوڈیٹا کا مفصل ریکارڈ، یہ سب اس قلیل مدت میں کرنا کیسے ممکن ہوگا؟“

”فون پر تم سے بات اور ہامی بھرتے ہی میں اور سجاد اس کا پہلے ہی سے بندوبست کر چکے ہیں۔ اس طرح ہماری جانیں بھی داؤ پہ لگی ہوئی ہیں۔ اب ہماری زندگی کا دارومدار اس منصوبے کی کامیابی پر منحصر ہے۔ سندرداس کا بائیوڈیٹا کریم اور سجاد نے گول کر کے دوسرا بنا ڈالا ہے، حتیٰ کہ سندرداس کی تصویر بھی تبدیل کر دی گئی ہے، اور اس کی جو تصویر سجاد اور کریم نے وزیر جان اور ممتاز خان کو دکھائی ہے وہ اصل سندرداس کی نہیں ہوگی بلکہ یہ وہ ہوگی جو میں تمہارا ریڈی میڈ میک اپ کرنے کے بعد ظاہر کروں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے وہ تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔ میں نے بھویں سیکنڈز اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ تو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ جس شخص کی تصویر تھی وہ عام سی اور میک اپ کی رُو سے بہت آسان سی تصویر تھی، یعنی اس شخص کا میک اپ بہ آسانی میرے چہرے پہ کیا جاسکتا تھا۔ یہی تصویر وزیر جان اور ممتاز خان کو دکھائی گئی تھی۔ جبکہ بائیوڈیٹا تبدیل کرنے کی یوں بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اس کے علاوہ عبید نے احتیاط کے پیش نظر سندرداس کے اصل چہرے کی بھی تصویر مجھے دکھا دی، جو کہ ظاہر ہے اسے اسی کے ساتھی کریم یا سجاد نے اسے دی ہوگی، جو انہیں راکی طرف سے برقی رابطے کے ذریعے ہی موصول ہوئی ہو گی، تاکہ یہ لوگ (اسپیکٹرم) ان کے ساتھی کو پہچان لیں، جبکہ منصوبے کے مطابق اصل تصویر کو وزیر جان وغیرہ سے چھپایا ہی گیا ہوگا۔ بہر حال میں نے اصل سندرداس کی تصویر بھی دیکھ کر اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

مگر پھر یکا یک میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں نے اس سے پوچھا۔

”تم نے جو نقلی سندرداس کی تصویر انہیں دکھائی ہے، اسے سوزی نے بھی تو دیکھا ہوگا، جبکہ وہ تمہارے ساتھ ائرپورٹ پر اصل سندرداس کو ریسو کرنے جا رہی ہے، وہ اس بدلی ہوئی صورت والے اصل سندرداس کو دیکھ کر...“

”میں سرے سے ایسا ہونے ہی نہیں دوں گا۔“ وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر درمیان میں بولا۔ ”اول تو میری یہی کوشش ہوگی کہ صرف میں ہی سندرداس کو لے کر ہوٹل پہنچوں اور سوزی کو روم نمبر اکیاون میں ہی ٹکے رہنے کا مشورہ دوں گا، اس کے بعد اپنے شکار کو میں روم نمبر ایش میں لا کر انٹا غفلت کرنے کے بعد تمہیں بلا لوں گا اور پھر تم سندرداس بن کر ہمارے ساتھ اسٹیشن فور کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔“

”سوچ لو دوست! اگر سوزی نے بھی تمہارے ساتھ لاؤنج تک جانے کا ارادہ کر لیا تو پھر کیا کرو گے؟ کیونکہ وہ آخر کار اپنے ”بڑوں“ کی ہی ہدایت پر عمل کرے گی، تم پر ہرگز نہیں۔“ میں نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا۔

”اس کا حل بھی میں نے سوچ رکھا ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے کہ سوزی انکار کر سکتی ہے، جبکہ میرے ساتھ جانے میں وہ اصل سندرداس کو دیکھ کر چونک جائے گی۔ تب میں اسے ائرپورٹ پر ہی کسی طرح ڈاج یا جمل دینے کی کوشش کروں گا، بلکہ ممکن ہو تو میں اسے بہانے سے وہیں کہیں پبلک ٹوائلٹ میں ٹھکانے لگا دوں گا۔“

”پھر اپنے بڑوں کو کیا جواب دو گے سوزی کے بارے میں۔“

”آسان سی بات ہے، کہہ دوں گا میں کہ نامعلوم دشمنوں نے ہم پر حملہ کر ڈالا تھا اور میں بڑی مشکل سے تمہیں، یعنی سندرداس کو لے کر پہنچا ہوں۔“ وہ بولا۔

یہاں مجھے اس کے منصوبے میں کئی سقم محسوس ہوئے تھے، جو بہ ظاہر تیر بہ ہدف بھی نظر آتے تھے، لیکن ذرا غور کرنے پر ہی مجھے اس امر کا بھی اندازہ ہو چلا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ منصوبہ جہاں سو فیصدی کامیابی کا ضامن نظر آتا تھا وہیں، خطرناک بھی محسوس ہوتا تھا۔

لہذا اب مجھے ادراک ہونے لگا کہ یہ منصوبہ کس وجہ سے اتنا قلیل اور مختصر مدت میں انجام دینے کا متقاضی تھا؟ ظاہر ہے اسے طول نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اس میں بھانڈا پھوٹنے

لولووش، سی آئی اے کے باسکل ہولارڈ کا چیتا داماد تھا۔ جس کی ٹائیکریک فورس کے ایجنٹ پاکستان میں میری گرفتاری کے لیے عنقریب ایک خفیہ آپریشن کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ تو کیا میں عابدہ کی خاطر اپنے وطن کو ملک دشمن عناصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا؟ کیا میرا قومی آدرش اور ملی حیثیت اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ میں اپنے وطن پر اپنی محبت کو ترجیح دیتا؟ جبکہ مجھ پر تو سرحد کے ایک گنام اور بہادر سپاہی کا بیٹا ہونے کی حیثیت کا بھی اطلاق ہوتا تھا۔

”کاتب تقدیر نے آخر یہ سارے امتحان میرے اور عابدہ کے نصیب میں ہی کیوں لکھے تھے؟“ میں نے کڑھتے دل کے ساتھ سوچا۔

پہلے عابدہ مجھ سے دور ہوئی اور اتنی دور ہوئی کہ سات سمندر پار چلی گئی۔ پھر جدائی کی اس طول پڑتی عذاب ناک گھڑیوں میں وہاں اس کے ساتھ کیا ہوا؟ ایک نیک مقصد اور کار خیر ادا کرنے کی اسے اتنی بڑی اور بھیانک سزا سے دوچار ہونا پڑا کہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کو ”عالمی دہشت گردوں“ اور امریکی دشمنوں کا آلہ کار قرار دے دیا گیا۔ اب اسے امریکا کی خطرناک جیلوں میں سے ایک میں بھیجنے کا ناپاک ارادہ کیے ہوئے تھے۔ کاش! میں عابدہ کو امریکا بھیجتا ہی نہیں تو آج اس کے ساتھ یہ سب نہ ہوا ہوتا۔

اچانک ہی میرے دل و دماغ پر مایوسی اور بددلی کا غلبہ سا طاری ہونے لگا۔ ایسے وقت میں مجھے اپنے غم خوار اور بے جگر... یار اول خیر کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ ایسے مایوسی کے لمحات میں ایک وہ ہی میری ہمت بڑھاتا تھا۔ مگر نہیں، وہ جب میرے قریب نہ بھی ہوتا تھا تو اس کی بے لوث باتیں اور نصیحتیں تو میرے ساتھ رہتی ہی تھیں۔ ایسے موقع پر وہ اپنی پوری زندگی کے تجربے کا پتھر، میری سوچ اور میرے حوصلے کے خشک پڑتے سوتوں پر نچھاور کر دیتا تھا۔ ایسے میں اسی کی ایک کہی ہوئی بات مجھے بے اختیار یاد آگئی۔

”آخر، کا کے! تو بہت جلدی اپنا دل چھوٹا کر لیتا ہے، پردیکھ، انسان فطری طور پر کمزور واقع ہوا ہے۔ زیادہ خوشی ملتی ہے تو وہ اسے ”خوشی کے آنسو“ کہہ کر اپنی اس فطری... کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ دکھ کی گھڑی میں وہ اپنے آنسوؤں کے ذریعے اسے ”تقدیر کا لکھا“ کے الزام میں دھونے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ایسا تب ہی ہوتا ہے جب وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے جو کچھ بھی

... کا سو فیصد خطرہ تھا۔ اس کی بات پر مجھے بالآخر بتانا پڑا۔“ اگر منصوبے کو جلد اور زیادہ آسانی سے نمٹانا چاہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں بلکہ میرے دو ساتھی بھی ہوٹل کے باہر موجود ہیں۔“

میری بات پر وہ چونکا اور جانے کیوں اس کی پیشانی پر شکنیں سی نمودار ہو گئیں پھر وہ اسی انداز میں بولا۔

”ہرگز نہیں۔ ہمارے منصوبے میں مزید کسی اور کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہے، رہے تم تو تم ہمارے ساتھ ہو ہی۔ لیکن فی الحال تم بھی نہیں۔ میں سیل پر تم سے رابطے میں رہوں گا۔ یہ بتاؤ تم نے یہاں کمرالے رکھا ہے؟“

”ظاہر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر میرے زیادہ دیر یہاں رہنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا۔“

”گڈ! اب تم ذرا تیار ہو جاؤ میں تمہارا سندر داس جیسا میک اپ کیے دیتا ہوں، باقی کپڑوں کا بندوبست تو اسے ٹھکانے لگانے کے بعد ہو ہی جائے گا۔“

اس نے آخر میں کہا اور میں نے دھیرے سے اپنے سر کو اٹھاتی جنبش دے ڈالی۔

وہ اپنے کام میں خاصا مہارت ثابت ہوا بلکہ مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے محسوس ہوا تھا، میں اگر ایسا میک اپ کرتا تو مجھے کم از کم آدھے سے پونا گھنٹا تو لگ ہی جاتا۔ حالانکہ سندر داس جیسی صورت اختیار کر کے میک اپ کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

اس نے یہ کام بہ مشکل پندرہ، بیس منٹ میں نمٹا دیا۔ اس کے بعد میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

اس منصوبے کا کلی طور پر انحصار مجھ پر تھا اسی لیے میں اس میں ترمیم کرنے کا حق رکھتا تھا۔ میں اسی پر ہی غور کر رہا تھا لیکن سب سے پہلے مجھے اول خیر سے رابطہ کرنا تھا، ورنہ رابطے میں دیر ہونے کی صورت میں وہ مجھے کسی خطرے میں پھنسا سمجھ کر اندر گھسا چلا آتا۔

اول خیر کو میں نے ابھی صرف عبید کے ساتھ ہونے والی ”تسلی بخش“ ملاقات کے بارے میں ہی بتایا تھا، اور اپنی تسلی کروا کے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ منصوبے کی کامیابی کی صورت میں وزیر جان اور ممتاز خان پاور والوں کی گرفت میں آجائے اور پھر قید خانہ ہمیشہ کا ان دونوں کا مقدر ہوتا۔ جبکہ اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کا بھی قلع قمع ہو جاتا۔ پھر کیا ہوتا؟ کیا لولووش اس زخم کو بھلایا؟ جبکہ اس صورت میں عابدہ کی زندگی الگ۔ داؤہ لگی ہوئی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ

کر رہا ہے، وہ صرف اور صرف اپنے بل بوتے اور اپنے زور بازو پر کر رہا ہے۔ درحقیقت وہ اس طرح اللہ کی اس مدد کو بھولنے لگتا ہے جو حق کی جنگ میں ایک کمزور سے کمزور تر انسان کے ساتھ بھی درپردہ شامل رہتی ہے۔ ”پس! مایوس نہ ہونا“ یہ اس مولائے کریم کی شرط ہے۔

اول خیر کے کہے ہوئے یہ جملے یاد آتے ہی ایک ایک کی جگہ اپنے اندر ایک حیرت انگیزی تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔ شاید یہ سچ تھا کہ میں ایسا سوچنے لگا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ ہمت مردان، مددِ خدا، یہ خیال آتے ہی میں اپنے اندر ایک نئی طاقت اور نیا جوش اور ولولہ سرایت کرتا محسوس کرنے لگا۔ اور صدقِ دل کے ساتھ اللہ سے معافی بھی مانگی کہ میں کیوں بھول گیا تھا یہ کہ میں جس جنگ میں مصروف ہوں، وہ صرف میری ہی جنگ نہیں ہے، یہ ایک حق کی باطل کے خلاف جنگ ہے اور اللہ کی مدد تو اس میں لازماً شامل ہے ہی، تو پھر کیوں اس زعم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ میں اپنے زور بازو کے بل بوتے پر کر رہا ہوں۔

میں نے سر جھٹک کر خیالات کی بڑھتی ہوئی کثافت کو ذہنِ دل سے نکال پھینکا اور عبید کا انتظار کرنے لگا۔

سندرد اس جیسے تربیت یافتہ بلیوٹسی ایجنٹ کو قابو کرنا اور پھر اس سلسلے میں آپسیکٹرم ایجنٹ سوزی کو ڈانچ دینا، یہ دونوں ایسے مختلف اور ”رسک فل“ کام تھے، جسے عبید تنہا انجام دینے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ مجھے وہ ”ادور کانفیڈنس“ کا شکار محسوس ہوتا دکھائی دے رہا تھا، اسی لیے میں نے بھی اسے اپنے ساتھیوں اور اپنی مدد کی پیش کش بھی کر ڈالی تھی۔ اگرچہ سچویشن کچھ ایسی ہی تھی جو سوزی اور سندرد اس کے لیے طمانیت کا باعث بنتی تھی کہ عبیدان کا ہی ”ساتھی“ تھا اور عبید کے لیے ظاہر ہے کہ ”ساتھی“ بن کر یہ کام نمٹانا سب سے زیادہ آسان ہوتا، لیکن پھر بھی اسے اکیلے یہ کام سرانجام نہیں دینا چاہیے تھا۔

میں نے وقت گزاری کے لیے سوچا کہ کیوں نہ اب اول خیر سے بھی ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ کر کے ساری بات بتا دی جائے، یہ سوچ کر ابھی میں اس سے رابطہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے سل پر عبید کی کال آگئی۔ اور پھر جب میں نے اس کی دوسری طرف سے ذرا بوکھلائی ہوئی آواز سنی تو میں خود بھی پریشان ہو گیا۔

”ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔“
”کیسی گڑبڑ؟“

”یہ کم بخت سوزی ڈانچ میں نہیں آسکی ہے، زیادہ

کوشش کی تو وہ میری طرف سے فوراً شک میں پڑ جائے گی اور کوئی بعید نہیں وہ مجھ پر بھی قابو پالے، کیونکہ وہ میرے مقابلے میں زیادہ تربیت یافتہ ہے، اور اس وقت مجھے خود بھی اسی کی کمانڈ میں دیا گیا ہے۔“ وہ بولا۔ میں نے فکر مند انداز میں اپنے ہونٹ بچھنے لگے پھر ذرا ایک لمحہ کے توقف سے مستفسر ہوا۔

”ویسے سوزی کا تم کرنا کیا چاہتے ہو؟“
”میں اسے تھوڑی دیر کے لیے خود سے دور کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اپنے منصوبے کو رازداری سے عملی جامہ پہنا سکوں، تم کوئی مدد کر سکتو...“
”مجھے سوچنے دو۔“ میں نے کہا۔

”ذرا جلدی۔ وقت کم ہے۔ ورنہ یہ سارا زرخیز منصوبہ پل بھر میں مٹی ہو جائے گا۔“ وہ بولا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پھر اس سے پوچھا۔
”تم ہو کہاں اس وقت؟“

”ارپورٹ سے ہوٹل کی طرف آرہا ہوں، کمر نمبر اکیاون میں آنا ہے ہمیں۔“
”ٹھیک ہے۔“

”تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ مگر دیکھو... تم اس کے سامنے مت آنا، ہو سکتا ہے وہ تمہیں پہچان لے۔ میں خود اس وقت تمہیں ارپورٹ کے لاؤنج کے پبلک ٹوائلٹ سے فون...“
اچانک دوسری طرف سے عبید کی کراہ آمیز گھٹی گھٹی آواز ابھری، اور اگلے ہی لمحے رابطہ منقطع ہو گیا۔ میرے پورے وجود میں جیسے سرد لہری دوڑ گئی بلکہ پل کے پل میں نے اپنی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی ٹھنی بوندیں بھی محسوس کی تھیں۔

صاف لگتا تھا کہ عبید پر بات کرتے ہوئے کسی نے حملہ کر دیا تھا۔ شاید اس کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ بنا بنا یا زرخیز منصوبہ ناکام ہو چلا تھا، کیونکہ عین ممکن تھا کہ سوزی کو اس پر کسی بات کا شبہ ہو گیا ہو۔ اور وہ اس کی ریکی کرتے ہوئے اس تک پہنچ کر گفتگو کا کافی حصہ سن چکی ہو۔ ابھی یہ میرا صرف قیاس تھا۔

میں حیر کی طرح اپنے کمرے سے نکلا اور چکنے فرش والے کوریڈور پر اندھا دھند دوڑتا چلا گیا، ساتھ ہی اول خیر سے رابطہ کر کے ہانپتی آواز میں بولا۔

”اول خیر! تم دونوں جلدی سے ارپورٹ کے لاؤنج تک پہنچو میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔ جلدی۔“ میں نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا اور دوڑتا ہوا ہوٹل کی لابی سے سیدھا گیٹ

پر پہنچا، عملے کے اور دیگر لوگ مجھے اس طرح بے تحاشا دوڑتا پا کر چونکے مگر مجھے اب ان کی پروا نہیں تھی۔
ہوٹل کے گیٹ سے نکلتے ہی میں نے اتر پورٹ کا رخ کیا۔ اور اس طرف جانے والی سڑک پر آ کر اپنی رفتار بڑھا دی۔ ڈبل پس سوٹ کے ساتھ میں دوڑتا ہوا کسی گھاگ جاسوس کی طرح ہی نظر آتا تھا۔ جو فرار ہوتے ہوئے کسی خطرناک مجرم کا تعاقب کرتا ہے۔

چند منٹوں میں ہی اتر پورٹ کے گیٹ پر میں پہنچ چکا تھا، یہاں چیکنگ ہو رہی تھی۔ میرے پاس وقت ضائع کرنے کا کوئی چانس نہ تھا اسی لیے میں نے فوراً سے پیشتر ہی اپنی جیب سے اپنا اسٹیشل سروس والا کارڈ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور سیکورٹی اہلکاروں کو وہ دکھا کر میں اندر داخل ہو گیا۔ اول خیر اور شکیلہ مجھے ایک طرف کھڑے، منتظر دکھائی دیے تھے، میں نے انہیں ادھر ہی رکنے کا اشارہ کیا۔ اگرچہ میں انہیں بھی اپنے ”ریفرنس“ سے اندر لے جاسکتا تھا، مگر کچھ سوچ کر میں نے ایسا نہیں کیا۔

مجھے عبید کی جان بچانا تھی اور سوزی پر بروقت قابو پانا تھا۔ یہ صورت دیگر وہ اپنے لوگوں کو عبید کی ”غذاری“ کے علاوہ کسی منصوبے کی بھٹک کی اطلاع بھی کر سکتی تھی بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ عبید پر قابو پا کر یہ اطلاع دے بھی چکی ہو، اس صورت میں سارا منصوبہ ہی فیل ہو جاتا۔

اندر اراپول لاؤنچ میں آتے ہی میں نے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے، عقابی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اور آنے والے ایک ایک مسافر کا چہرہ دیکھنے لگا۔

مجھے زیادہ تر.... سندر داس اور اس کے ساتھ موجود سوزی نامی لڑکی... کی ایک ساتھ نظر آنے کی امید تھی، اگر عبید، سوزی کے ہتھے چڑھ گیا تھا تو سوزی نے بھلا اس بے چارے کو کہاں زندہ چھوڑا ہوگا۔ جلد ہی مجھے ایک نہیں بلکہ دو مطلوبہ چہرے دکھائی دے گئے اور میں بری طرح ٹھٹک گیا، خوشی اور طمانیت کی ایک لہری میرے وجود میں دوڑ گئی، ان میں ایک تو سندر داس تھا (جس کی اصل تصویر عبید مجھے کسی احتیاط کے پیش نظر ہوٹل میں ہی دکھا چکا تھا) جبکہ دوسرا چہرہ عبید کا تھا۔

عبید کو دیکھ کر بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ میں تو یہ توقع کیے بیٹھا تھا کہ سوزی نے اس پر قابو پالیا ہوگا، یا بے بس کر دیا ہوگا، لیکن ہو سکتا ہے کہ خوش قسمتی سے وہ سوزی کے قابو

میں آنے کے بجائے، وہ اس کے زرخے میں آگئی ہو۔ اگر ایسا تھا تو بلاشبہ عبید نے بڑی ہمت اور جواں مردی سے کام لیا تھا، یہی تو وہ حوصلہ ہوتا ہے جو خود سے زیادہ طاقت ور دشمن پر حاوی کرتا ہے، لیکن مجھے تو فون کر کے عبید کو آگاہ کرنا چاہیے تھا، کیونکہ جب متوقع طور پر مجھ سے بات کرتے ہوئے سوزی نے ہی اس پر حملہ کیا تھا تو عبید کی فون پر مجھ سے بات ادھوری رہ گئی تھی۔

لیکن میں اب عبید کو زندہ دیکھ کر خوش تھا کہ منصوبہ اپنی جگہ جوں کا توں تھا لیکن پھر بھی عبید ہی مجھے کچھ بتا سکتا تھا۔ میں ان کے پیچھے ہولیا اور ہوٹل تک جا پہنچا۔ راستے میں اول خیر کو بھی.... دوبارہ اسی پوزیشن میں کھڑے رہنے کی ہدایت کر دی تھی، وہ بھی اس گھن چکر پر کچھ الجھ سا گیا تھا۔

ہوٹل آتے ہی میں نے سیدھا اپنے روم کا رخ کیا اور عبید کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اس کو سندر داس کو ٹھکانے لگا کر ہی آنا تھا۔ لہذا میں یہ دعا مانگنے لگا کہ سندر داس کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور تیزی سے میں نے دروازے کا رخ کیا۔

”کون؟“ میں نے دروازے سے لگ کر ہولے سے پوچھا۔

”میں ہوں عبید، جلدی کھولو دروازہ۔“ دوسری جانب سے عبید کی آواز ابھری اور میں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ وہ اکیلا تھا۔ وہ تھکا تھکا ہانپتا سا ایک قریب رکھی کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور بڑبڑایا۔

”اف! آج تو میں بھی جان سے گیا تھا اور منصوبہ بھی سارا خاک میں ملنے والا تھا شکر ہے۔ سب ٹھیک رہا۔“

میں تب تک دروازہ بند کر کے اس کی جانب پلٹا تو وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تھکا تھکا سا تھا مگر وہاں کامیابی کا جوش بھی ایک دبی دبی سرخی کی صورت میں نظر آتا تھا۔

”جب تم سے فون پر میری بات ادھوری رہ گئی تھی تو میں یہی سمجھا تھا کہ تم سوزی کے زرخے میں آ چکے ہو، کیونکہ فون پر بات کرتے ہوئے میں نے تمہاری کراہ کی آواز سنی تھی۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”ہاں! اس کم بخت کو مجھ پر شبہ ہو گیا تھا“ وہ بولا۔ ”یہ اسپیکٹرم کے ایجنٹ بہت زیرک اور گھاگ ہوتے ہیں، ذرا

اوارہ گرد

بوللا۔۔۔ نہیں، ہم نے ویسے بھی اپنے منصوبے میں شہرے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ رہی بات موجودہ گڑ بڑ کی تو یہ وہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ خفیہ فورسز کے ادارے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، ممکن ہے یہ انہی کی حرکت ہو۔“

باقی کے کام ہم نے ترنت نمٹائے، بے ہوش سندر داس کو انتہائی رازداری کے ساتھ کمرے کی کھڑکی سے اول خیر اور شکلیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کو رن بستہ کر دیا گیا تھا، تاکہ ہوش میں آنے کے بعد کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو۔

بے ہوش اور رن بستہ سندر داس کو اول خیر اور شکلیہ کے حوالے کرتے وقت میں نے انہیں مختصر ترین الفاظ میں ایک ”ڈکٹیشن“ بھی دے ڈالی تھی۔ میں چونکہ اس منصوبے کی مدد سے اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کے تابوت میں آخری ٹھونکنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا، اسی لیے میں چاہتا تھا کہ کسی بھی صورت میں ہونے والی متوقع گڑ بڑ میں ”پاور“ والوں کی مدد بھی میرے ساتھ شامل ہو۔

اگرچہ اس سے پہلے انہیں اس مشن میں شامل نہ کرنے کا میرا ایک مقصد تھا، جس کی تکمیل کے لیے۔۔۔ میں اب تک درحقیقت میجر باجوہ صاحب کے مشوروں پر ہی عمل کر رہا تھا، کیونکہ یہ قول ان کے پاور والوں کا ابھی براہ راست اسپیکٹرم پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا، اس کے لیے پہلے کسی گوریلا کارروائی کے ذریعے ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کر لیا جاتا۔ اس کے بعد پاور سیکریٹ سروس اپنا ایکشن پلان ترتیب دیتے۔ پاور سیکریٹ سروس جیسا ادارہ ہو خواہ انٹرسروسز یا آئی ایس آئی، ان کا ایک اپنا طریقہ کار ہوتا ہے، وہ خاموشی سے پہلے اپنے ”گوریلوں“ کے ذریعے ٹھوس ثبوت و شواہد اکٹھے کرتے ہیں اس کے بعد ہی ایکشن لیتے ہیں، یہ صورت دیگر ایسے اداروں کو بعض شریک عناصر بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

”اسپیکٹرم“ کے سلسلے میں بھی یہی قباحیں تھیں، اس نے خود کو ایک بین الاقوامی فلاحی ادارے کی حیثیت سے ظاہر کر رکھا تھا۔ اور ملکی سطح پر کچھ کارنامے بھی انجام دیے تھے، جس کی بنا پر انہیں (اسپیکٹرم کو) بعض سیاسی اور عوامی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی بھی ملی تھی۔

لیکن اب صورت حال اور تھی۔ عبید کے منصوبے کے مطابق اس بار کی کارروائی اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیتی، بلکہ عالمی سطح پر بھی اسے ایک بدنام زمانہ مجرم تنظیم کے طور پر۔۔۔ ڈیپیکٹر کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا جب ان کے خلاف ٹھوس ثبوت ہاتھ

ذرا سی بات پر کھٹک جاتے ہیں، خیر، میں نے سوزی کو وہیں پبلک ٹوائلٹ میں ہی ٹھکانے لگا دیا ہے۔ تھوڑی گڑ بڑ تو ہو گئی ہے، اس کے لیے مجھے چیف (وزیر جان) کو مطمئن کرنا پڑے گا، وہ میں کر لوں گا۔ اب سندر داس کو بھی اسی کمرے میں۔۔۔“

”کیا تم نے اسے بھی ہلاک کر دیا ہے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت جلدی سے پوچھا۔

”نہیں، فی الحال تو میں نے دھوکے سے اسے بے ہوش کر دیا ہے، اب اسے بہ آسانی جہنم واصل کیا جاسکتا ہے۔“

”نہیں، اسے ابھی زندہ رہنے دو۔“

”کیا؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟“ وہ جیسے یکدم مجھے گھور کے بولا۔ وہ میری حیثیت نہیں جانتا تھا اسی لیے بے اختیار اس کے منہ سے یہ نکلا تھا۔ جبکہ میں سندر داس کو پاور والوں (میجر ریاض باجوہ) کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

”میں اسے خفیہ فورسز والوں کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہر حال دشمن ملک کا جاسوس ہے اور وطن دشمن کارروائیوں کے لیے یہاں آیا تھا، اس کے منہ سے بہت کچھ اگلویا جاسکتا ہے۔“

”ہمارے پاس اس سارے کھراگ میں پڑنے کا وقت نہیں ہے۔ وہ لوگ ہمیں لینے کے لیے یہاں ہول پہنچنے والے ہیں۔“ وہ بولا۔

”کسی کھراگ کی ضرورت نہیں ہوگی۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”باہر موجود میرے ساتھی یہ کام بہ خوبی سر انجام دے سکتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں اس سے پوچھا۔

”تم نے اب تک کی کیا رپورٹ دی انہیں؟“

”یہی کہ نامعلوم دشمنوں نے حملہ کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں سوزی ہلاک ہو گئی اور میں سندر داس کو بچا کے ہوٹل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں، لیکن یہاں بھی مجھے خطرہ ہے۔ اسی لیے میں نے دانستہ ان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں اور سندر داس خود ہی آجائیں، لیکن انہوں نے منع کرتے ہوئے یہ حکم صادر کر دیا ہے کہ وہ خود ہمیں لینے کے لیے یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ اس گڑ بڑ کے بعد ان لوگوں کو تم پر کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہو گیا؟“

میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تو وہ اعتماد سے۔۔۔

آ جاتے، اور اب اس کے حصول کا یہ سنہری موقع تھا۔ اسی لیے میں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی صرف اپنے بل بوتے پر اس اہم مشن کو پورا کرنے کا رسک لے سکتا تھا۔ چنانچہ اس بارے میں، میں نے اول خیر اور شکیلیہ کو اچھی طرح بریف کر دیا تھا کہ وہ دونوں بلیوٹکسی کے ایجنٹ سندرداس کو میجر ریاض باجوہ صاحب کے حوالے کرتے وقت انہیں ساری صورت و حالات بتا دیں۔ تاکہ وہ کسی بھی وقت گڑ بڑ کی صورت میں اسٹیشن فور پر اپنی خفیہ فورس ”پاور“ سمیت کامیاب چڑھائی کر سکیں۔ عبید کو میں نے اعتماد میں لے لیا تھا۔ اور اس نے میری اس حکمت عملی پر اطمینان کا بھی اظہار کیا تھا۔

اس کے بعد ہم موجودہ منصوبے کی لائن آف ایکشن ترتیب دینے میں مصروف ہو گئے۔

بہ قول عبید کے، میرے لیے صرف سندرداس کا بھیس بھرتا ہی کافی نہ تھا، اس سے متعلق دیگر اہم نوعیت کی باتوں اور معاملات سے میرا ”آپ ڈیٹ“ ہونا لازمی تھا، جو اس کی جامہ تلاشی لینے کے بعد ہمیں سوچنا تھا۔

سندرداس کے پاس ایک بریف کیس تھا۔ اس کے اندر کچھ ضروری کاغذات تھے، انہی میں ایک فائل ہمیں نظر آئی تھی جس کا رنگ سیاہ تھا، جس پر بلیوٹکسی کے ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے سندرداس اور اس کے متعلقہ عہدے دار کے دستخط پہلے سے موجود تھے، یہ آرڈری دستخط تھے، تاہم ثبوت کے لیے یہی کافی تھا جو اسپیکٹرم کے، را کے ایک ذیلی ونگ ”بلیوٹکسی“ سے گٹھ جوڑ ظاہر کرتے تھے۔ مگر عبید نے فائل کا جائزہ لینے کے بعد مجھے بتایا کہ اسی طرح کی ایک فائل وزیر جان کے پاس بھی تھی۔ اور یہ دونوں فائلیں ”کمپائل“ ہونے کے بعد ہی ایک مکمل ”بلیک کوبرا“ فائل کہلائی، اور اس میں جو حصہ ان کے پاس تھا، وزیر جان اور ممتاز خان دستخط ہونا تھے۔ تاہم عبید نے حفظ ماتقدم کے تحت مجھے سندرداس کے دستخط دکھا دیے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ مجھے بھی وہاں دوبارہ دستخط کرنا پڑ جاتے۔ اتنا وقت تو نہیں تھا کہ میں وہاں سندرداس کے دستخط کی پریکٹس کرتا، تاہم ایک سادے سے کاغذ پر میں نے دو تین بار سندرداس کے دستخط کر کے کچھ ہاتھ ”صاف“ کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ فرق ہو سکتا تھا مگر دیگر شواہد اس قدر مضبوط تھے کہ وزیر جان کا اس طرف دھیان کم ہی جاتا۔ یوں بھی فائل میں اصل دستخطوں کی اہمیت وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان کی تھی۔ سندرداس کی جامہ تلاشی کے دوران میں اس کا سل،

والٹ اور دیگر ضروری اشیاء ہم نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر شے برآمد نہ ہوئی تھی۔ تاہم اس کے پاس جو کچھ بھی تھا، اس سے جس قدر آپ ڈیٹ ہونا لازمی تھا میرا، وہ میں ہو چکا تھا۔ لیکن ایک خطرہ تھا کہ اگر سندرداس سے اس کے اپنے کسی باس یا ساتھی کا رابطہ ہوتا تو میں اسے کیا جواب دیتا؟ اور کیسے دیتا؟ میں نے جب اسی خطرے کا اظہار عبید سے کیا تو وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

”شہزی! اس لیے ہماری یہی کوشش ہونی چاہیے کہ یہ معاملہ جلد از جلد منٹ جائے کیونکہ۔۔۔۔۔ لیٹ ہونے کی صورت میں سارا منصوبہ ہی خاک میں مل جائے گا اور ہماری جان کو بھی خطرہ لاحق ہوگا۔

چنانچہ ہماری کوشش یہ تھی کہ یہ معاملہ یا معاہدہ راتوں رات ہی منٹ جائے۔

یہ سارے امور نمٹانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اسپیکٹرم کے چار ایجنٹ ہمیں لینے کے لیے وہاں آن پہنچے۔

اب اصل خطرناک کام کی ابتدا ہونے لگی تھی۔ پیش آئندہ حالات غیر یقینی تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ آگے ہمارے ساتھ یا میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ تخت یا تختہ۔

بہت سے خطرات اندیشناک خیالات، دوسوہ بن کر دل و دماغ میں کلبلا رہے تھے۔

میں نے بغور اسپیکٹرم کے ان چاروں ایجنٹوں کی حرکت و سکنات سے جائزہ لینے کی سعی چاہی تھی، مجھے بہ ظاہر ان کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی تھی جس سے پتا چلتا ہو کہ انہیں ہم پر کسی قسم کا کوئی شبہ ہوا ہو۔

روم اکیادون میں آکر انہوں نے مجھ سے مسکرا کر خیر مقدمی انداز میں ہاتھ ملایا۔ میں نے عبید کی ہدایت کے مطابق اپنے چہرے کو سنجیدہ اور رعب دار بنا رکھا تھا، تاہم اس میں ہلکی سی پریشانی اور تشویش کا ”ترکا“ بھی لگا دیا تھا، تاکہ وہ سب حقیقی محسوس ہو، جو تھوڑی دیر قبل ارپورٹ کے پبلک لاؤنج میں ہمارے ساتھ ہو چکا تھا، جس کے نتیجے میں سوزی کو جہنم واصل کرنا پڑا۔

ان چار ایجنٹوں میں دو تو مناسب قد و قامت کے تھے اور وہ مقامی ہی نظر آتے تھے، جبکہ ایک متناسب الاعضاء جسامت کی خاتون تھی، ہادی النظر میں وہ مقامی ہی لگتی تھی لیکن میری عقابانی نگاہوں نے اس کی آنکھوں کی پتلیوں اور جلد کی رنگت میں غیر مقامی پن کو تاڑ لیا تھا۔ جبکہ چوتھا دراز

ہو چکے ہیں۔

اول خیر کو میری (عبید کے) اس منصوبے میں۔۔۔۔۔ شمولیت پر تشویش لاحق تھی بلکہ اسے تو یہ سارا منصوبہ ہی ایک مل صراط پر چلنے کے مترادف لگ رہا تھا۔ یہ خونی بھیڑیوں کی کچھار میں گھس کر ان کے خوفناک جبروں سے شکار بچ کر لانے والی بات تھی۔

لیکن میں سمجھتا تھا، جس قدر اس میں خطرات تھے، اس کی کامیابی کی صورت میں اتنے ہی اس کے دورس نتائج برآمد ہونے کے قوی امکانات بھی موجود تھے۔

ہمارا سفر خاموشی سے جاری تھا۔ وہ دراز قامت ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھا، میں اس خاتون کے ساتھ درمیانی سیٹ پر تھا، جبکہ ان کا چوتھا ساتھی عبید کے ہمراہ پچھلی سیٹ پر موجود تھا۔

انٹرکولر ایک طاقتور انجن کی لگژری گاڑی تھی، یہی سبب تھا کہ خاصی تیز رفتاری کے باوصف، جھکوں کا بالکل بھی پتا نہیں چلتا تھا۔

ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران میں یہ نان اسٹاپ سفر لگ بھگ تین گھنٹوں پر محیط رہا اور پھر منزل پر پہنچ کر ہم سب نیچے اتر آئے۔

فضا میں جس کی کیفیت تھی۔ ہوا کی ہوئی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر سو سنائے کا راج تھا۔ میرے سامنے اسٹیشن نور کی وہی عمارت تھی جہاں میں اس سے پہلے بھی دو تین بار آچکا تھا اور بڑی معرکہ آرائیاں ہوئی تھیں۔ اب مجھے کچھ ایسا ہی لگتا تھا جیسے اس بار میں اس کے تابوت میں آخری کل لٹو نکلنے والا ہوں۔

ہم سب اندر داخل ہوئے۔ یہ ظاہر میرا چہرہ پرسکون اور مچرا ہوا تھا۔ اگرچہ اندر میرے دل میں ایک دھکڑ پکڑ کی سی کیفیات طاری تھیں، لیکن میں نے اپنی چال ڈھال اور شخصیت کو مستحکم بنائے رکھا۔

ایک ہال نما کمرے میں، جہاں خاصا قیمتی اور آرام دہ فرنیچر بچھا ہوا تھا۔ وہاں مجھے بٹھا دیا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کسی نے آکر مجھے مطلع کیا کہ ابھی کچھ دیر میں ”چیفس“ (اسٹیشن چیف اور کیٹسا ایجنٹ) تشریف لانے والے تھے۔

میں محتاط ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو معمول پر لانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اپنی کنپٹیوں پہ سنسناہٹ محسوس ہوئی، وجہ میرے ان دونوں ازلی دشمنوں کی اس ہال

قامت تھا، اس نے اپنی اصلیت چھپانے کی ذرا بھی سعی نہیں کی تھی، وہ غیر ملکی ہی نظر آتا تھا۔ اسی نے ہی سب سے پہلے مجھ سے مخاطب ہو کر چند مخصوص کوڈورڈز کا تبادلہ کیا۔ جو ظاہر ہے عبید مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ اس کا لہجہ بھی غیر مقامی ہونے کی چغلی کھاتا تھا۔ وہ انگریزی میں ہی مخاطب تھا۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ خاصا بارعب اور محکم مزاج نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ مجھے اس خطرناک ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق اس سے گفتگو کر کے یہ جانا تھا کہ میں ان کا محکوم نہیں، بلکہ مستقبل میں ان کا چیف کی سطح کا ”ہینڈلر ایجنٹ“ ہوں۔ جسے اسپیکٹرم کی سپریم اتھارٹی کی حمایت حاصل ہونے والی تھی۔ لہذا میں بھی اپنے لہجے کو پورا اعتماد اور بارعب بناتے ہوئے اس سے انگلیش میں ہی بولا۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ میرے سلسلے میں بڑی رازداری برتی گئی ہوگی، لیکن یہاں آکر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ کتنی رازداری سے کام لیا گیا ہے۔“

اس سے مخاطب ہوتے وقت میں نے اپنے لب و لہجے کا بھی خیال رکھا تھا کہ کہیں وہ میری اصلیت سے واقف نہ ہو جائے۔

بہر حال میری بات اور شکایت میں وزن تھا، اس پر مستزاد میرے بارعب لہجے اور طنز کا اس دراز قامت پر خاطر خواہ اثر بھی ہوا، لہذا اسے اس حقیقت کا بھی فوراً اندازہ ہو چلا تھا کہ میں خود بھی اپنی آئندہ کی (معاہدے کے بعد کی) حیثیت کا بہ خوبی ادراک رکھتا ہوں۔ یہی سبب تھا کہ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پہ خیالت کے آثار نمودار ہو گئے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

”ہم نے پوری رازداری ہی برتی تھی لیکن بد قسمتی سے یہاں ہمارے کچھ مخالف گروپس بھی ہماری ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ یقیناً یہ انہی میں سے ہی کسی کی حرکت ہو سکتی ہے۔ مگر ہمیشہ انہیں منہ کی ہی کھانی پڑتی ہے، جس کا ثبوت آپ کا ہمارے سامنے صحیح سلامت موجود ہونا ہے۔“

میں نے اب اس کی بات پر حوصلہ افزا انداز میں مسکراتا ضروری سمجھا۔

وہ ایک بڑی سی انٹرکولر گاڑی میں آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم سب ساہیوال کی طرف گاڑن ہو چکے تھے۔ وہ خاتون، جس پر مجھے غیر مقامی ہونے کا شبہ تھا، اپنے چیف (اسٹیشن چیف) وزیر جان کو مودبانہ انداز میں مطلع کر رہی تھی کہ ہم سب لاہور سے بخیریت ساہیوال کی جانب روانہ

کمرے میں آدھی تھی۔
 ”ویکم! ویکم!“ سب سے پہلے وزیر جان مجھے دیکھتے ہی اپنے دونوں بازو... پھیلاتا ہوا، میری طرف بڑھا، اور میں بھی اپنے ہونٹوں پہ دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سموئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد چوہدری ممتاز میرے ساتھ پرتپاک انداز میں بغل گیر ہوا۔ اس مردود کو طوعاً و کرہاً ہی سہی، اپنے سینے سے لگاتے ہوئے، مجھے اپنے بڑے بھائی لیتھ شاہ کے خون کی بو آتی محسوس ہوئی، یہ خونی میرے بھائی کا قاتل تھا اور اسے اپنے سینے سے لگاتے وقت میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پائے رکھا تھا، ورنہ جی تو میرا یہی چاہا تھا کہ اس خونی کا گلا دبوچ لوں۔
 ان دونوں کے علاوہ ان کے چار ساتھی بھی تھے جو بہ ظاہر تو غیر مسلح ہی نظر آ رہے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ انہوں نے اپنے چست لباس کے پیچھے جدید طرز کے ہتھیار چھپا رکھے ہوں گے۔ ان میں عبید بھی شامل تھا۔

اس کے بعد ہم آمنے سامنے دونوں صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ کچھ کھانے پینے کا دور چلا، پینے کے لیے جو کچھ وہاں میرے سامنے سرو کیا گیا تھا اس میں دہسکی بھی تھی اور مشروب بھی۔ میٹھا چیوڑا، شمس اور بھنے ہوئے تیتروں کے سالم پٹھور بھی دھرے تھے۔

شراب کو تو میں نے آج تک چھوا بھی نہیں تھا اور یہاں یہی مشکل آن پڑی تھی کہ اگر میں پینے سے انکار کرتا تو وہ دونوں گھاگ ”چیفس“ میرے بارے میں کھٹک سکتے تھے۔

بہت جبر و کراہ کے بعد میں نے بالآخر دہسکی کا پیگ تمام ہی لیا اور ان دونوں سے ”چیرز“ کرنے کے بعد دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگتے ہوئے پیگ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا، ایک ہلکی چسکی لی تو شراب کی تلخی نے میرے دماغ کی نسون تک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور جب اس کا آبِ ارغواں کا وہ گھونٹ میرے حلق سے اترنے لگا تو مجھے یوں لگا جیسے گلے سے لے کر سینے تک یہ تلخ گھونٹ مجھے چیرے ڈال رہا ہو۔ ایک جلن کا احساس ہوا تھا۔ مگر جلد ہی میں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا۔

”ہم کرنل سی جی بھجوانی کے دل سے مشکور ہیں کہ انہوں نے ہمیں اس قابل سمجھا کہ ہماری لوکل کمانڈ کی سپورٹ کے لیے اپنا ایک اہم آدمی ہمیں سونپ دیا۔“
 وزیر جان نے آبِ تلخ کا گھونٹ بھرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

چونکہ عبید نے موقع کی مناسبت سے اس بارے میں مجھے اچھا خاصا بریف کر دیا تھا کہ مجھے کیسی اور کس نوعیت کی گفتگو کرنی ہے۔ نیز وزیر جان کے منہ سے کسی کرنل سی جی بھجوانی کا نام سن کر میں نے اندازہ قائم کیا کہ یہ سندر داس کا ہی کوئی چیف ٹائپ کا شخص ہوگا۔ اب مجھے یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں وہ اسی وقت سی جی نامی اس شخص سے رابطہ نہ کر بیٹھے، یا خود اس کی کوئی کال نہ آجائے، اگرچہ عبید نے اس سلسلے میں پہلے ہی میری تشفی کر دی تھی کہ اسٹیشن فور کے کنٹرول اینڈ پاور روم میں اس کے دونوں ساتھیوں سجاد اور کریم کا ہی کنٹرول ہے، لہذا وہ ایسا کچھ ہونے نہیں دیں گے، یا اس طرح کی کوئی کال ہی ڈراپ کر دیں گے، یا انہیں کسی طرح مطمئن کر دیں گے وغیرہ، لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ باتیں مختصر کرتے ہوئے، میں ان دونوں پر یہی زور دوں کہ معاہدہ بلیک کو برا کو جلد از جلد فائل کر دیا جائے۔

لہذا وزیر جان کے بعد اس کے تقریباً ہم رتبہ چوہدری ممتاز خان نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”اس کے ساتھ ہم یہ امید بھی کرتے ہیں کہ ہمارا اور آپ کا یہ ساتھ بلیک کو برا معاہدے کی صورت میں کافی عرصے تک رہے گا اور مددگار بھی ثابت ہوگا۔“
 ”کیوں نہیں بلکہ مجھے پورا وشواس ہے کہ اس معاہدے کے بعد تو بلیو تلسی اور اسپیکٹرم کا یہ مثالی اتحاد ثابت ہوگا۔ سی جی صاحب خود اس کا ایک شاندار جشن منانے کے لیے یہاں ہوں گے۔“ میں نے بھی ان کا من پسند جواب دیا۔

”زبردست، پھر تو بگ باس لولوش کو بھی ہم یہاں مدعو کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ یقیناً اس جشن میں شرکت کے موقع کو نظر انداز نہیں کریں گے۔“ وزیر جان بولا۔
 لولوش کے ذکر پر میرا حلق بغیر پیسے کڑوا ہونے لگا۔ یہی بد بخت اور ملعون تو میرا اصل شکار تھا۔ تاہم میں اس کے ذکر پہ کچھ چونکا ضرور تھا۔

جی تو میرا کر رہا تھا کہ میں باتوں باتوں میں ان سے اور بھی کچھ اگلاؤں، لیکن اب اس کا موقع تھا نہ کوئی فائدہ، کیونکہ اس منصوبے کی کامیابی کے بعد یہ دونوں پاور والوں کی گرفت میں ہوں گے۔

وہ دو پیگ چڑھا چکے تھے، جبکہ میرا پہلا ہی نہیں ختم ہوا تھا۔ البتہ نصف ہو چکا تھا، اور اسی نے ہی میرا دماغ گھما کر

رکھ دیا تھا۔ کیونکہ پتا تو ایک طرف میں نے اس اُم خبیثہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے یہ ہال کمر اٹھو مٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر معاملہ یہاں بہت حساس اور اہم تھا اسی لیے میں نے اپنے محل پر پڑتے اعصاب پر قابو رکھا تھا۔

اسی دوران میں باتوں باتوں میں چالاکی سے میں ان دونوں جفاکاریوں کو اصل مقصد کی طرف لے آیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ معاہدے کی فائل پر دستخط کرنے والے معاہدے کو طویل نہ دے ڈالیں اور میں اس وقت ذرا سی دیر کا بھی محمل نہیں ہو سکتا تھا۔ عبید کی بھی مجھے سختی کے ساتھ یہی ہدایت تھی۔

بہانہ کسی وقت بھی پھوٹ سکتا تھا۔ لہذا معاملے کی بات چھیڑتے ہی ان دونوں نے فوراً اس کی پامی بھری۔ میں نے اسی وقت اپنا (سندر داس کا) پریف کیس کھول کر سامنے رکھ دیا اور بلیک کوبرا کی فائل سے متعلق کاغذات کے صفحات ان کے سامنے پھیلا دیے، تب تک وزیر جان وہاں موجود اپنے ایک ساتھی کو مخصوص اشارہ کر چکا تھا، جو ذرا سی دیر میں ایک سیاہ رنگ کی فائل ہاتھ میں اٹھا کر اس کے روبرو پیش ہو چکا تھا۔

یہی اصل کوبرا فائل تھی۔ سامنے دیکھی جیسے کی ٹاپ پر فائل کے دونوں حصوں کا کچلا کر دیا گیا۔ پہلے وزیر جان نے اس پر اپنے دستخط کیے اس کے بعد چوہدری ممتاز خان اپنے دستخط کرنے کے لیے فائل پر جھکا۔

دونوں مہاشیطانوں کو اس فائل پر دستخط کرنا دیکھ کر میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات ہو رہی تھیں۔ جی کر رہا تھا کہ اسی وقت میرے پر نکل آئیں اور میں یہاں سے اڑ کر اپنے ٹھکانے جا پہنچوں اور پھر ان دونوں شیطانوں کے عبرت ناک انجام کا تماشا دیکھوں۔

مجھے یہ دونوں خبیث گویا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرتے محسوس ہو رہے تھے اور ظاہر ہے حقیقت بھی یہی تھی۔

اس فائل اور اس وقت کے لیے میں نے اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ اس منصوبے کے پایہ تکمیل تک پہنچنے پر میرے آئندہ کے کئی کامیاب منصوبوں کا انحصار تھا۔ میں اب تک بہت غور و فکر کے ساتھ بہت کچھ سوچ چکا تھا۔

ممتاز خان بھی بلیک کوبرا فائل پر دستخط کر کے سیدھا ہو گیا تو میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور بہ ظاہر ہے پروا سا نظر آنے لگا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ فائل میرے ہی حوالے کی جائے گی، جبکہ ایک کاپی اس کی ان کے پاس

موجود تھی۔ اس پر میرے دستخط ہونا تھے۔ وہ فائل میری جانب سرکادی گئی تو میرے دل کی دھڑکنیں تیزی سے ہونے لگیں۔ وجہ یہی تھی سندر داس کے دستخط کی مجھے کچھ زیادہ پریکٹس نہیں تھی، تاہم اپنی غیر معمولی زود فہمی اور سمجھداری کے بل بوتے پر میں نے اللہ کا نام لے کر پورے اعتماد کے ساتھ فائل اپنی جانب کھسکائی اور قلم سنبھالے فائل پر جھک گیا۔ ساتھ ہی لمبے بھر کو ان دونوں خبیثوں کی طرف بھی دیکھا۔ وزیر جان اپنے لیے ایک اور پیگ بنانے میں مصروف تھا جبکہ چوہدری ممتاز خان ٹرے میں رکھے بھنے ہوئے تیتروں میں سے ایک سالم پھور کو اٹھا کے بھجھوڑنے میں مصروف تھا۔

میں نے فائل پر سندر داس سے ملتے جلتے دستخط کر دیے اور پھر فائل دانستہ بند کر کے تھوڑا آگے کھسکا دی اور اپنی فائل خود سنبھالتے ہی میں نے ان کا دھیان بٹاتے ہوئے فوراً تہنیتی لہجے میں کہا۔

”بدھائی ہو آپ سب کو۔ آج سے ہم سب ایک ہو گئے، شہادت ہو گئے۔“

”بدھائی، بدھائی۔“ وہ دونوں بھی بھونڈے انداز میں اپنے پیگ والے ہاتھ بلند کرتے ہوئے غرور کے نشے تلے گورن میں پورے لیکن دوسرے ہی لمبے جیسے وزیر جان نے ایک دھماکا کر دیا۔ وہ اپنا سیل فون نکال کر بولا۔

”میں ابھی اس خوشی کے موقع کی اطلاع چیف باس لودوش کو دیتا ہوں، وہ یہاں کی لیگل کمانڈ کے مستقبل کے لیے بہت مہم تھیں، آپ اسے بہت تسلی ہو جائے گی۔“

میں اپنی جگہ سے ہلکا سا اٹھ گیا اور غیر ارادی طور پر فائل پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اسی وقت یہاں سے بھاگ کھڑا ہوں، لیکن یہ بچوں کا مکمل نہ تھا کہ گیند چھین کر بھاگ نکلتا۔ میں اس وقت اسٹیشن فوری نکارت کے اندر دنی گوشے میں اوجھ پکھڑم کے کھاگ کاغذوں کے زبغے میں تھا۔

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملا کر ضروری سمجھا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”شیور، شیور۔“ دائے ناٹ۔ لودوش کو بتا دو کہ بیوتکسی انہیں بھی مایوس نہیں کرے گی۔ ہاں اہمارے ہی جی صاحب کا بھی انہیں دھننے داؤد سے دینا۔“

وہ دونوں میری بات پر ہنستے ہوئے اپنا سرو چھٹے لگے۔ میرا پیگ نصف سے کم ہو گیا تھا، جو میں میز پر ہی رکھ چکا تھا اور دانستہ میں نے پلیٹ میں سے تھوڑا میٹھا چوڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔

”اونہہ، رابطہ نہیں ہو پارہا۔ لگتا ہے چیف باس کہیں بڑی ہیں۔ خیر بعد میں بات کر لیں گے۔“

معاون وزیر جان کی اس آواز نے میرے اندر دور تک خوشی کی لہریں دوڑا دیں، اچھا ہی ہوا تھا کہ لولووش سے اس کا رابطہ نہیں ہو پایا، ورنہ بات لمبی بھی ہو سکتی تھی اور خطرناک بھی۔

”مسٹر سندر داس! کیا تم اس طے معاہدے کی خوش خبری اپنے سی جی صاحب کو نہیں دو گے؟“

اچانک چوہدری ممتاز خان نے مجھ سے کہا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ لولووش سے رابطہ کرنے یا بات کرنے سے زیادہ برا کرل سی جی بھجوانی سے میرا رابطہ کرنا تھا، کیونکہ اس سے براہ راست مجھے ہی بات کرنا تھی۔

میں نے پل کے پل کچھ سوچا اور پھر ایک متانت آمیز سی ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔

”میں کرل صاحب کے اوقات کار سے واقف ہوں، وہ اس وقت آرام...“

یہی وہ وقت تھا جب اچانک وزیر جان کے سیل فون کی بیل گنگنائی اور میری بات ادھوری رہ گئی۔

”اوہ، چیف باس کی کال ہے، جسٹ اے منٹ۔“

وزیر جان نے اپنے سیل فون کی بڑی سی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے سیل اپنے کان سے لگا کر انتہائی مودبانہ لہجے میں پہلے اسے ہیلو کہا اور پھر بولا۔

”یس چیف! میں نے اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ کو بلیک کوبرا معاہدہ طے پانے کی خوش خبری سنا دوں۔“

یہ کہہ کر وہ رکا اور شاید دوسری طرف سے لولووش کی بات خاموشی سے سننے لگا۔ ادھر میرے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں سی ریگ رہی تھیں، میں جانتا تھا کہ عبید اور اس کے دونوں ساکھی سجاد اور کریم کی جان بھی میری طرح گویا حلق میں انگی ہوئی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اگر لولووش امریکا میں تھا تو وہاں اس وقت شام کے چار یا پانچ بجے ہوں گے، کیونکہ امریکا اور پاکستان کے اسٹینڈرڈ ٹائمنگ میں کم از کم چوبیس گھنٹے کا فرق تھا۔

”یس چیف! شیور۔ وہ اس وقت ہمارے سامنے ہی موجود ہے۔ سوری... اوہ... سمجھ گیا۔ آواز ذرا ہلکی تھی، اسی لیے آپ کی بات نہیں سمجھ پایا، ہاں تو آپ اس وقت رنگون میں ہیں؟ سونائس، یہ تو اور بھی اچھا ہو جائے گا کہ اس اہم

معاہدے کے بعد آپ دونوں کی ملاقاتیں بھی ہو جائیں۔ بھارت سے براہ کون سا دور ہے۔ اس عظیم معاہدے کے بعد اگر آپ کی اور کرل سی جی بھجوانی کی ملاقات بھی ہو جاتی ہے تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ یس، یس چیف! ہٹ، ہم چاہ رہے تھے کہ آپ پاکستان کا بھی ایک چکر...“ وہ رکا۔ سیل فون اپنے کان سے لگائے میری طرف دیکھتے ہوئے فون پر بولا۔

”یس چیف! مسٹر سندر داس اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لیجیے بات کریں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے فون میری طرف بڑھا دیا اور ایک پرجوش سی مسکراہٹ سے بولا۔ ”یہ لومسٹر سندر داس! چیف باس لولووش آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نے اپنے سوکھے حلق کو تر کرنے کے لیے کچھ نگلنے کی سعی چاہی اور چہرے پہ مسکراہٹ لیے، دھڑکتے دل کے ساتھ وزیر جان سے سیل فون تھام لیا۔

میں اس وقت عالمی حیثیت کے حامل ایک انٹرنیشنل ڈان ”اسپیکنگ“ جیسی ہشت پا اور بین الاقوامی گینگ کا چیف باس، برمودس کے کسی گمنام دور افتادہ، پراسرار جزیرے میں پیدا ہونے والا، اور وہیں کا رہائشی اور بودوباش اختیار کرنے والے، خوف و دہشت کی علامت، سفاکی اور بربریت میں تاتاری فطرت کے مالک برازیلیین نژاد لولووش سے مخاطب ہونے والا تھا۔

لولووش سے متعلق اب تک مجھے مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوتی رہی تھیں، اس کی تعریف میں، میں نے اب تک یہی کچھ سنا تھا، اور اس وقت اس سے بات کرنے والا تھا میں، جو میری زندگی کا پہلا موقع تھا۔

”ہیلو... چیف... مسٹر لولووش! میں سندر داس آپ سے شرفِ کلامی حاصل کرنے پر آپ کا اور کے دونوں ساتھیوں، مسٹر وزیر جان اور ممتاز خان کا مشکور ہوں۔“

میں نے اس کے رتبے اور گٹھ جوڑ کے حوالے سے نہایت مودبانہ اندازِ مخاطب اپناتے ہوئے اس سے کہا تو دوسری جانب چند ثانیوں کے لیے خاموشی سی طاری رہی۔ جانے کیوں اس کی یہ خاموشی مجھے بری طرح کھل رہی تھی کہ جانے کیا بات تھی کہ وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ پھر جب بدستور اسی خاموشی کا دورانیہ کچھ طویل ہوا تو میں سمجھا شاید کال ڈراپ ہو گئی ہے۔ میں نے دوبارہ ہیلو کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دفعتاً ہی دوسری جانب سے ایک

میری بھانپتی ہوئی نظریں پہلے ہی ان دونوں کے چہروں کا طواف کر رہی تھیں تب ہی میں نے دیکھا کہ چوہدری ممتاز خان کا چہرہ بھی یک دم بھونچکا سا رہ گیا۔
 ٹھیک اسی وقت میرے اندر کوئی زور سے چیخا۔۔۔
 ”شہزی! تمہارا پول کھل چکا ہے۔ ہوشیار باشد!“

ظاہر ہے میری موجودگی میں بھلا وزیر جان کو ممتاز خان سے کوڑورڈز میں کیوں گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ دال میں یعنی طور پر کالا تھا۔

لیکن میں بہ ظاہر اپنے چہرے پہ طمانیت کے آثار طاری کیے اسی طرح بیٹھا رہا۔ بے شک اگر لولووش کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہوا بھی تھا تو وہ یقینی پھر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے ہزاروں میل دور تھا اور محض فون پر وہ بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اصل میں، میں کون تھا؟ جبکہ کوڑورڈز کی گفتگو سے مجھے تھوڑا بہت اس امر کا بھی اندازہ ہوا تھا کہ ابھی یہ دونوں میرے سلسلے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ لیکن مجھے اس سلسلے میں کچھ زیادہ خوش فہمی بھی نہیں تھی۔ ہاں البتہ لولووش کا میرا یعنی سندرداس کا پورا نام لینا مجھے چونکا ضرور گیا تھا، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یا تو سندرداس سے راپٹلے میں رہ چکا تھا یا اس کے بارے میں اسے پوری جان کاری تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں ان کے بارے میں اندازے قائم کرتا رہ گیا اور انہوں جو کرنا تھا، وہ کر ڈالا۔ وزیر جان کے ایک ذرا مخصوص اشارے پر ان چاروں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ حرکت کی اور اپنے لباس سے پستولیں نکال کر مجھ پر تان لیں، ان میں عبید کو بھی ان کا ساتھ دینا پڑا، وہ ابھی مجبور تھا، اور ان کا محکم بھی۔ میں چونکہ ذہنی طور پر چند سیکنڈ قبل ہی خود کو اس ناخوش گوار واقعے کے لیے تیار کر چکا تھا اس لیے بہ ظاہر آرام سے اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔

اس دوران میں ان دونوں نے بھی اپنی پستولیں نکال کر اس کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر قدرے درستی سے کہا تو وزیر جان نے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں آپ کی اصلیت سے متعلق کچھ شبہ ہوا ہے کہ آپ ہمارے مطلوبہ آدمی نہیں ہو۔“

اس کا محتاط لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ ابھی وہ

کھر کھراتی، بھاری اور کھردری سی آواز ابھری۔

”ہائے۔ ہمیں بھی بہت خوشی ہوئی تم سے بات کر کے اور اس سے زیادہ مسرت ہمیں اس معاہدے کے طے پا جانے پر ہوئی ہے۔ مسٹر سندرداس سکینہ!“

اس نے میرا، یعنی سندرداس کا پورا نام لیا تھا۔ اس کے لہجے میں جانے کیوں مجھے ایک خوفناک سی سرسراہٹ کا احساس ہوا تھا، جسے محسوس کر کے میرے پورے ٹھٹکے ہوئے وجود میں ان گنت چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اس کا کھردرا اور سپاٹ لہجہ اس کی دوستانہ گفتگو کی نفی کرتا لگا تھا یا پھر یہ میرا وہم تھا۔ میرا منہ خشک سا ہونے لگا تھا۔ پتا نہیں اس کم بخت کی آواز اور لہجے میں ایسا کیا تھا کہ مجھے اپنا اعتماد متزلزل سا ہوتا محسوس ہوا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے مزید کچھ کہتا، اس نے فوراً پتلی پتلی آواز میں کہا۔
 ”فون وزیر جان کو دو۔“

میں نے ایسا ہی کیا اور فون وزیر جان کی طرف بڑھا دیا۔ جو اس نے فوراً اپنے کان سے لگا کر مودبانہ انداز میں ہیلو بھی کہہ دیا۔

میری دھڑکتی نظریں وزیر جان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے اطراف میں گردش کر رہی تھیں، تب ہی اچانک کیا ہوا کہ اس کا بھلا بھلا چہرہ، دھواں دھواں سا ہونے لگا، یوں، جیسے بالکل ست کے رہ گیا ہو۔ اور اس کی ادھر ادھر گردش کرتی نظریں یک بیک میرے چہرے پر مرکوز ہو کے رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں سے میرے لیے جو تھوڑی دیر قبل دوستانہ جذبات مترشح ہو رہے تھے، وہ ایک انکی ایک عجیب سے سناٹوں میں بدل گئے۔ میرا دل یکبارگی۔۔۔ زور سے دھڑکا۔ اور پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

”او کے چیف! آئی گیٹ اٹ۔“

یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میرے چہرے سے یک دم نظریں ہٹا کر اپنے قریب بیٹھے ممتاز خان سے کچھ کہا۔

میں ٹھٹک گیا۔ یہ مخصوص کوڑورڈز تھے۔ جس میں ”ڈی“ اور ”ایس“ کا استعمال بار بار آتا تھا۔ اپنی ٹریننگ کے دوران مجھے ”ڈی کوڈنگ“ کی جو تربیت دی گئی تھی، اس کے مطابق کوڑورڈز کی گفتگو میں بار بار ڈی اور ایس کا صاف مطلب (suspicious+dummy) کا لیا جاتا تھا۔ یعنی ”مشتبہ۔“

خود بھی اس سلسلے میں ابہام کا شکار تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر ان کا شک غلط نکلا تو کہیں میں ان سے ناراض ہی نہ ہو جاؤں، یہی وہ نقطہ تھا، جسے میں نے فوراً بھانپتے ہوئے وزیر جان سے تلخ لہجے میں کہا۔

”حیرت ہے، آپ کو اپنے لوگوں پہ بھی بھروسہ نہیں رہا یا پھر یہ سب اس قدر غلطی ہیں کہ تمہارے کسی بھی دشمن کی چال میں آرام سے پھنس سکتے ہیں۔“

”ابھی پتا چل جاتا ہے۔“ اس بار ممتاز خان نے کہا اور اپنے ایک پستول بہ دست ساٹھی کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا جبکہ دوسرا ساٹھی میری جانب بڑھا۔ ”یہ فائل ہمارے حوالے کر دو۔“ ممتاز خان نے اپنے پستول کا رخ میری جانب کر دیا۔ عین لب و لہجہ پر میں اندر ہی اندر بری طرح تھملا کر رہ گیا اور اس گھڑی کو کوٹنے لگا جب اس مرد دلولووش سے میری فون پر گفتگو ہوئی تھی، جو مختصر اسی مگر اس گرج باران دیدہ شخص کو نبھانے کیسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے کارپرداز کو اس کی بھینک دے تھی۔

وہ اہم فائل میری گود میں پڑی تھی، ناچار وہ میں نے اس کے ساٹھی کی طرف بڑھا دی، جو اپنا پستول تانے میرے سامنے آچکا تھا، اس کا انداز خاصا محتاط تھا اور اس نے بالکل میرے آگے آنے کی کوشش نہیں کی تھی، بلکہ ایک سائڈ سے میری جانب بڑھا تھا۔ اور تب ہی اچانک میری سماعتوں نے ایک چلائی ہوئی آواز سنی تھی، جس نے مجھے ہی نہیں وہاں موجود سبھی کو بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”خبردار! کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ ورنہ چیف کے سر میں روشن دان بنادوں گا۔“

یکنف سب کو سانپ سونگھ گیا۔ یہ عبید تھا۔ اپنے منصوبے کی اب تک کامیاب آبیاری کرتے ہوئے عین آخری لمحات میں اس کی ناکامی اسے بھی راس نہ آسکی تھی اور وہ جوش جنوں میں مجھ سمیت اپنی جان بھی داؤ پہ لگا گیا تھا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور اس نے صوفے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے، عقب سے اپنے اسٹیشن چیف وزیر جان کی کنپٹی پر اپنے پستول کی نال رکھ دی تھی۔

”سب اپنے ہتھیار پھینک دو، وزیر جان تم بھی ورنہ گولی چلا دوں گا میں۔“ وہ پھر جنونی انداز میں چیخا۔

وزیر جان اور ممتاز خان کے چہرے مسخ ہو گئے۔ ان کے باقی ساٹھی بہ ظاہر سپاٹ انداز میں کھڑے رہ گئے، جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ عبید کے لہجے اور درانہ وار انداز

نے جلد ہی وزیر جان کو یہ باور کرا دیا تھا کہ جب اپنا کوئی ساٹھی باغی ہوتا ہے تو اس نے سر سے اپنے کفن ہی باندھے ہوتا ہے، وہ صرف مرنے اور مارنے کے لیے ہی اپنے کسی پر ہتھیار اٹھاتا ہے۔

اس نے نہ صرف فوراً اپنا پستول پھینک دیا بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی ہتھیار پھینک دینے کا کہا۔

”شہزی! فائل لے کر بھاگ جاؤ۔ میں زیادہ دیر...“ عبید نے چلا کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ عبید کو میں نے بغیر آواز نکالے گرتے دیکھا۔

نامعلوم سمت سے آنے والی جو گولی اسے چاٹ گئی تھی، وہ یقیناً انہی کے کسی ساٹھی نے داغی ہوگی، یہ کوئی کھلی کچہری نہیں تھی، مجرموں کا اپنا ٹھکانا تھا، کہاں کب کون سا ان کا ساٹھی یہاں دھیان لگائے بیٹھا تھا، کون جانتا تھا؟

یقیناً عبید کو بھی اس خطرے کا اندازہ تھا لیکن باوجود اس کے اس نے مجھے ایک قلیل ساموق دینے کے کی خاطر اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی، ساتھ ہی ”بھری محفل“ میں میرا نام بھی پکار چکا تھا، جو یقیناً وزیر جان اور ممتاز خان پر بم ہی بن کر گرا ہوگا۔

گولی کا دھماکا اور عبید کی چیخ کے فوراً ہی بعد میرے حرکت کرنے کی باری آگئی تھی، وہ ایک پل ایسا تھا کہ جس نے میرے پورے ٹھٹکے ہوئے وجود میں گویا پارادوڑا دیا۔

میں نے فائل دیوچ لی۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے سب سے پہلے اس آدمی کو ایک لات رسید کی جو گولی کی آواز اور اپنے ”غدار“ ساٹھی کی چیخ پر اپنا پستول اٹھانے کی فوری کوشش میں آگے کو جھکا تھا۔ لات اسے میں نے اس زاویے سے

ماری تھی کہ وہ ”قائمہ“ بن گیا تھا، یعنی لڑکھڑا کر اور ذرا ترچھا ہو کے تیزی سے وہ اپنے دونوں گرو گھنٹال، وزیر جان اور ممتاز خان پر جا گرا تھا۔ باقی دونوں ساٹھی ایجنٹ اپنے پستول اٹھا چکے تھے، جبکہ مجھے پہلے ہی ان کی اس متوقع حرکت کا ادراک تھا جس کے تدارک میں... پہلے والے کو

لات رسید کرتے ہی اس کے پستول پر قبضہ جما چکا تھا، لیکن میرے پاس دوبارہ سنبھل کے اٹھنے کی مہلت نہیں تھی، لہذا میں نے ایک ہاتھ میں بلیک کوبرا فائل سنبھالی اور دوسرے میں پستول تولتے ہوئے، تلے اوپر دو فائر ٹھونک دیے،

میرے پستول کی ایک گولی کارگر ثابت ہوئی، دشمن کر یہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا تھا جبکہ دوسرا... اسے دائیں شانے پر گولی کا داغ سہتے ہوئے لڑکھڑایا ضرور تھا مگر خود کو

حقی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ دسمبر 2015ء

کی جھلکیاں

جہد برق

ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیق، اردو کے
نامور قلم کار کا زندگی نامہ

نانگا پریت کا عقاب

ندیم اقبال کے شرر بار قلم کا شہکار، سیر پاکستان

بگ تھری

مریم کے خاں کا کرکٹ کے دیوانوں کی
خاطر چوڑا دینے والی تحریر

اپنے حصے کی شمع

نسلی اعوان کی وہ تحریر جسے عرصہ تک
آپ بھلا نہ پائیں گے

درست غلط فیصلہ

رومانہ شعیب کی بستر مرگ سے ارسال کردہ سچ بیانی

اس کی جلاوہ

اور بھی بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، تاریخی
واقعات، سچے قصے، یاد رہ جانے والی تحریریں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

ڈھن سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے، مجھ پر ایک فائر
جھونک دیا۔ عین اسی وقت میں نے بجلی کی سی پھرتی کے
ساتھ اسی طرف جست لگا دی تھی، جدھر دروازہ تھا، چھلانگ
کار آمد تو ثابت ہوئی تھی مگر ہال کمرے کے چکنے فرش پر میں
گھسٹا ہوا اس کی چوکھٹ سے اپنے سر کو ٹکرائے سے نہ بچا
سکا۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک کراہ آمیز چیخ سی خارج
ہو گئی تھی، اور مجھے اپنا پورا دماغ جھنجھٹا محسوس ہوا۔ آنکھوں
کے گرد تاریکی سی سمٹ آئی۔ فائل پر میری گرفت ڈھیلی پڑی
اور وہ چھوٹ کر دروازے کی چوکھٹ سے باہر، کوریڈور کی
طرف سرکتی چلی گئی۔

بلیک کوبرا فائل سے محرومی کے احساس نے مجھے جیسے
ایک دم ہوش دلادیا، اور بکھرے حواسوں کو پل کے بل سمیٹتے
ہی میری متلاشی نظریں اس پر جم گئیں، عقب میں گولی کا
دھماکا گونجا، مگر جب تک میں یہ سرعت رینگ کر چوکھٹ چھوڑ
چکا تھا۔ گولی کسی چوبی حصے سے ٹکرائی تھی اور لکڑی کے پھلٹر،
مع برادوں کے میرے چہرے پر لگے۔ مجھے کچھ خراشوں کا
احساس ہوا۔ اس کی پروا کیے بغیر میں نے نظر آ جانے والی
کوبرا فائل پر جھپٹا مارا اور اٹھ کر دوڑ لگا دی۔ اپنے عقب میں
مجھے وزیر جان اور ممتاز خان کے تحکمانہ انداز میں پاگلوں کی
طرح چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ دوڑتے
قدموں کی گونج عمارت میں ہڑ بونگ کا پتا دیتی تھی۔

میری کوشش یہاں سے باہر نکلنے کی تھی، جبکہ اس کے
بہت سے گوشوں سے میں اتنا واقف بھی نہ تھا۔ اچانک
میرے سامنے تین چست لباس میں ملبوس افراد کسی کمرے
سے ظلوغ ہو کر ملک الموت کی طرح میرے سامنے آن
کھڑے ہوئے، ان کے ہاتھوں میں طاقت ور گنز تھیں۔

”ہالٹ۔“ ان میں سے ایک حلق کے بل چیخا۔ میں
ایک گہری سانس خارج کر کے وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔ میرا
اور ان کا فاصلہ بہ مشکل چند قدموں کا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ
میرا کھیل ختم ہو گیا تھا مگر ایسے ہی وقت میں ایک چوڑا دینے
والا واقعہ رونما ہوا، انہی میں سے ان کے ایک ساتھی نے

عجیب حرکت کی، اس نے مجھ پر تانی ہوئی گن کو حرکت دی
اور اس کا کندا، اس کے ساتھ کھڑے ساتھی کے جڑے پر
لگا۔ ظاہر ہے یہ حملہ اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ وہ
اپنے حلق سے ”اوغ“ کی آواز خارج کرتا ہوا اپنے
تیسرے ساتھی سے جا ٹکرایا، دونوں ہی لڑکھرائے تو اس
نے پوزیشن بنا کر ان پر برسٹ فائر کر دیا۔

میں ابھی حیرت زدہ نظروں سے یہ ”معجزانہ“ منظر دیکھ

ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں بھاری قدموں کے دوڑنے کی آوازیں قریب آتی محسوس ہوئیں۔ جبکہ میرے اس دشمن نما ہمدرد نے اپنے ہی دونوں ساتھیوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد یکدم مجھ پر بھی گن تان لی۔ میرا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ حلق کے بل چلا کر مجھ سے بولا۔

”نیچے گر جاؤ۔“ اس نے ہاتھ کا اشارہ بھی کیا تھا۔ میں فوراً نیچے گر گیا۔ اس نے برسٹ کھول دیا، گولیوں کی بھینک تڑتڑاہٹ مجھے اپنے عین سر پہ سنائی دیتی محسوس ہوئی تھی اور عقب میں متعدد انسانی چیخیں، لیکن چند ہی سیکنڈوں بعد میں نے اپنے اس ہمدرد کو بھی گولیوں سے چھلنی ہو کے گرتے دیکھا۔ جس کے بارے میں اب تک میں یہ اندازہ قائم کر چکا تھا کہ وہ عبید کے انہی آخری دو ساتھیوں، سجاد اور کریم میں سے ہی کوئی ہو سکتا تھا۔

میں نے لیٹے لیٹے پیچھے اپنی گردن گھما کر دیکھا تو میں اس کی قربانی کو دل ہی دل میں سلام پیش کیے بتا نہ رہ سکا، میرے تعاقب میں آنے والے مسلح دشمنوں کو وہ مرتے مرتے بھی جہنم واصل کر چکا تھا۔ جو کم و بیش تین چار کی تعداد میں تو تھے ہی۔ ایک دو گرا رہے تھے۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ میں نے اس کی گن اٹھالی اور پستول بیلٹ میں اس لیا، جبکہ قائل کو میں اپنی شرٹ کے اوپری بٹن کھول کر اس میں رکھ چکا تھا۔

میں جانتا تھا کہ نکاسی کے سارے راستے بند کیے جا چکے ہوں گے یا انہیں پہلے ہی سے ٹریپ کر دیا ہوگا۔ اس لیے میں نے کسی جلد بازی کا مظاہر نہیں کیا۔ مجھے بس چند لمحوں کے لیے ٹھہرنے کی مہلت درکار تھی کہ میں میجر باجوہ صاحب کو ”گرین سگنل“ دے دوں۔

جس طرف سے میرے ہمدرد سمیت وہ تین مسلح دشمن اچانک طلوع ہوئے تھے، میں نے اسی طرف کا ہی رخ کیا تھا، میں سمجھا تھا کہ شاید وہ کوئی کمرہ ہوگا لیکن موڑ کاٹنے پر معلوم ہوا وہ ایک زینہ تھا جو اوپر جاتا تھا، پہلے میں نے زینے چڑھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر میں فوراً اس کے خلا میں جا چھپا۔ اور وہاں سے میں نے ذرا ٹھہر کر اپنا سل فون نکالا اور باجوہ صاحب سے رابطہ کرنے لگا۔

میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا جس میں ایک جوش کی سی کیفیت تھی۔ ایک اہم مشن کامیابی کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس بار آپسیکٹرم کو آخری چوٹ لگنے والی تھی، اس کا شیرازہ بکھرنے کو تھا۔ بلیک کوبرا قائل کی صورت میں اس

کی تباہی میری شرٹ کے اندر سینے میں ایک ”بٹن“ کی طرح چسپاں تھی، جسے دبانے کی دیر تھی۔ یہ آپسیکٹرم کے لیے ایک ایسا ٹائم بم تھا جس کی ”کاؤنٹ ڈاؤن“ شروع ہو چکی تھی، اور یہ پھٹنے کو تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس اہم قائل کے حصول کے لیے عبید سمیت اس کے ساتھیوں (سجاد یا کریم) نے بھی اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ ان کا ایک ساتھی ابھی زندہ تھا، اور آپسیکٹرم میں ابھی وہی بچا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان کی قربانی زائل جانے کیسے دے سکتا تھا؟

باجوہ صاحب سے رابطہ ہوا تو میرے ہمدرد گہری طمانیت سی پھیل گئی۔ وہ اپنی پاور سیکریٹ سروس سمیت پہلے ہی سے اسٹیشن فور کی عمارت کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے، اور میری طرف سے گرین سگنل کے منتظر تھے۔

جیسے ہی انہیں اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ بلیک کوبرا قائل میرے پاس محفوظ تھی، انہوں نے ایکشن لے لیا۔

لیکن میرا کام اب چھپ کر تماشا دیکھنا ہی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے اسٹیشن فور کے اندر اچھی خاصی کھلبلی مچا دی تھی۔ میری سماعتوں میں ابھی تک وزیر جان اور ممتاز خان کی بوکھلائی ہوئی ہسٹریائی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

آج کا دن آپسیکٹرم کا آخری دن ثابت ہونے والا تھا۔ میرے گرین سگنل دینے کے بعد ”پاور“ والے اب تک حرکت میں آگئے ہوں گے۔ کچھ لمحات مزید بیت گئے، کوئی ہلچل محسوس نہ کر کے مجھے ذرا حیرت سی ہوئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ موجودہ آپریشن میں انہوں نے کیا طریقہ اختیار کیا تھا، تاہم میرے اندر بے چینی نے دستک دی تو مجھ سے وہاں دبکا بیٹھا نہیں گیا اور گن سنبھالے زینے سے نکلنے کے ارادے سے تھوڑا سر کاہی تھا کہ اچانک مجھے پہلے سے زیادہ کھلبلی کا شور سنائی دیا۔ اسی وقت مجھے عمارت کے اندر متعدد انسانوں کے در آنے کا احساس ہوا۔ میں اپنی جگہ ایک بار پھر جم گیا، اسی وقت پہلے وقفے وقفے سے برسٹ فائر ہوئے، اس کے فوراً بعد ہی تواتر کے ساتھ گولیاں چلنے کی سمع خراش آوازیں ابھریں۔ لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم گیا مگر بھگدڑ بہ دستور مچی ہوئی تھی۔ اس میں انسانی آوازوں کے زور زور سے بولنے کا شور بھی تھا۔ انہی آوازوں میں مجھے ایک شاسا آواز سنائی دی۔

”اس طرف اوپر... اوپر۔“

یہ میجر ریاض باجوہ کی آواز تھی۔ میں فوراً اوٹ سے نکل آیا۔ ان کے ہمراہ پاور سیکریٹ سروس کے چار ایجنٹ تھے۔ سب جدید اسلحے سے مسلح تھے۔ باقی پھیلے ہوئے

تھے۔ بارے تکلیف سے میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی۔

”شہزی! آریو او کے؟“ دفعتاً میں نے دھوکے کے کثیف بادلوں میں میجر ریاض کی ٹھکر بھری آواز سنی، اور مجھے احساس ہوا کہ دوسرے ہینڈ گرینیڈ سے صرف مجھے ہی خراشیں آئی تھیں۔

”یس سرا! آرم او کے۔ آریو؟“

”فرار... دشمن فرار ہونے کے لیے یہ آخری ہتھکنڈا آزما رہا ہے۔“

میجر ریاض باجوه کی اس بات نے مجھے فکر مند سا کر دیا۔ اچانک ان کے وائرلیس ڈیوائس میں سے مخصوص بپ کی آواز ابھری۔

”یس۔“ انہوں نے فوراً کال ریسیو کی۔ کچھ سیکنڈ دوسری جانب سے اپنے کسی ماتحت وغیرہ کی بات سنتے رہے پھر بارعب اور تحکمانہ لہجے میں بولے۔

”نکاسی کے ہر راستے پر چار چار جوانوں کی ٹولی مقرر کر دو۔ اور تمام گاڑیاں ٹاپ آف رکھو۔ کوئی دشمن بھاگنے نہ پائے۔ کلیئر۔“

اس کے بعد انہوں نے کیپٹن جنجوعہ سے رابطہ کیا۔

”دشمن ہلکی ساخت کے بم استعمال کر رہا ہے۔ مقصد فرار ہونا ہے۔ بی کیئر فل۔ اپنے اصل ٹارگٹ پر خود کو فوکس رکھو۔ وہ دونوں بچ کے جانے نہ پائیں اور نہ ہی ان کی ہلاکت ہو۔ کلیئر۔“

وہ بات سے فارغ ہوئے تو اسی وقت اوپر سے فائرنگ کی آواز ابھری اور ساتھ ہی کوئی چلا یا۔ ”ہتھیار پھینک دو ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔“

یہ ہمارے سامنے تھے، انہوں نے شاید اوپر موجود دشمنوں پر غلبہ پالیا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے تلے اوپر دو برسٹ فائر ہوئے، انسانی چیخ کی آواز بھی ابھری۔ میجر ریاض متشکر سے ہو گئے۔ وہ تیزی سے زینے کی طرف دوڑے، میں اور ان کا ساتھی گن لے کر ان کے پیچھے لپکے۔ اوپر فائرنگ جاری تھی۔ پتا چلا پاور اور اسپیکٹرم کے ایجنٹ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ ہم بھی ان میں شامل ہو گے۔ اوپری منزل میں بھی چھوٹے بڑے کمرے اور طویل رہداریاں تھیں۔ ہم سب پوزیشنیں سنبھالے ہوئے وہاں پہنچے۔ میجر ریاض نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ دوساتھیوں نے ہمیں دیکھ کر اپنے ہاتھ کے اشارے سے وہیں روک دیا۔

اسی وقت وہاں سے دو چست لباس میں مسلح افراد،

تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب چونک پڑے۔

تاہم میجر باجوه نے اپنے تین ساتھیوں سے ہدایت کیا۔

”اوپر کوئی بھی ہو پہلی کوشش یہی کرنا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں، ورنہ بھون دینا گولیوں سے۔“

وہ تینوں بجلی کی سی پھرتی سے اوپر کو چلے گئے۔ ان کے ساتھ اب میں اور ایک ساتھی رہ گیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

”شہزی! تمہارے ساتھ اور کون ہے؟“

”کوئی نہیں سرا! لیکن ایک احتیاط کیجیے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اسپیکٹرم کے ایجنٹوں کے درمیان میں ایک ہمارا آدمی بھی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں عبید کے دونوں ساتھیوں کریم اور سجاد کے بارے میں بتا دیا۔ یہ بھی کہ عبید اور اس کا ایک ساتھی مشن پر قربان ہو چکے تھے۔ اب پتا نہیں کریم بچا تھا یا سجاد۔

”بے فکر رہو۔ پاور ایجنٹ اندھا دھند حرکت نہیں کرتے۔“ وہ بارعب اور مستحکم لہجے میں بولے۔ ”میں پھر بھی کیپٹن افتخار جنجوعہ کو ہدایت کیے دیتا ہوں۔“

کیپٹن افتخار جنجوعہ سے میں بھی بہ خوبی واقف تھا۔ یہ تقریباً میری ہی عمر کا وہی نوجوان تھا جس کے ساتھ میں نے پی ایس ایس کے ٹریننگ سینٹر میں تربیت حاصل کی تھی۔ میجر باجوه نے ایک مختصر ڈیوائس پر کیپٹن جنجوعہ سے رابطہ کر کے اس کے بارے میں بتا دیا پھر دوبارہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

”شہزی! وہ فائل کہاں ہے؟“

”میرے پاس ہے سرا! میں نے فرط جوش سے کہا اور ابھی میں نے اپنی شرٹ کے اوپری بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک... میرے دائیں جانب کوریڈور میں ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ ہم یکدم زینے کے خلا میں آ گئے، لیکن اسی وقت میری شکلی ہوئی سماعتوں نے کسی ٹھوس شے گرنے... کی آواز سنی۔ جسے صرف میں ہی نہیں میجر ریاض اور ان کے ساتھی نے بھی بھانپ لیا تھا، اور پھر ہم تینوں نے ہی بیک وقت بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لمبی جست بھری، جس وقت ہم تینوں اپنے بائیں ہاتھ والی مختصر اہداری کے فرش پر آ رہے تھے، ٹھیک اسی وقت دوسرا سماعت شکن دھماکا ہوا۔ اس بار دشمنوں نے ہینڈ گرینیڈ بہت قریب پھینکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے کچھ سیل آنکشی ذروں کے مانند... میرے چہرے اور ہاتھوں سے ٹکرائے۔ یہ جلتے ہوئے ٹکڑے

اندھا دھند فارنگ کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اگر ہم سامنے ہوتے تو وہ بے دریغ ہم تینوں کو بہ آسانی نشانہ بنا سکتے تھے، میں دل ہی دل میں اپنے ان دونوں ساتھیوں کے چوکنے پن کی داد دے رہا تھا۔ وہ ان دونوں دشمنوں کی پوزیشنیں پہلے ہی تاڑ چکے تھے جیسے ہی وہ فارنگ کرتے ہوئے ایک تنگ راہداری سے نمودار ہوئے تو ہمارے دونوں ساتھیوں نے ان پر برست فارنگ کر دیا۔ وہ چیخ مار کر گرے مگر دوسرے نے زخمی ہونے اور گرنے کے باوجود لیٹے لیٹے اپنی گن کا رخ ہمارے دونوں ساتھیوں کی طرف موڑ دیا۔ انہیں اس حملے کی توقع نہ تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب میجر باجوہ نے اپنے ہسٹول سے اس پر تلے اوپر دو فارنگ جھونک دیے۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت ان کے دونوں ساتھیوں نے اپنے افسر کی طرف دیکھ کر اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کھڑے کر کے مخصوص اشارہ کیا اور پھر ہم تینوں بھی ان میں شامل ہو گئے۔

”باقی ساتھی کہاں ہیں؟“ میجر باجوہ نے پوچھا۔

”سراوہ اندر دشمنوں کے پیچھے گئے ہیں۔ ہمیں یہاں رکنے کو کہا گیا ہے تاکہ کوئی ادھر سے فرار نہ ہونے پائے۔“ ایک نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

”اصل شکار کدھر ہیں؟“ میجر باجوہ نے پوچھا۔

”ابھی ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں لیکن یہاں وہ نہیں ہیں۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔ اس کی بات سنتے ہی وہ ہمیں اشارہ کرتے ہوئے واپس پلٹے۔

نیچے آتے ہی ہم نے آگے کی طرف پیش قدمی کی۔ میرے اندر ہلچل سی گئی تھی۔ وزیر جان اور ممتاز خان کے ابھی تک ہتھے چڑھنے کی خبر نہیں آئی تھی۔ اگرچہ پاور والوں کی اسٹیشن فور پر خاطر خواہ انداز میں چڑھائی ہوئی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کے سو فیصدی نتائج سامنے نہیں آئے تھے۔

اچانک میں نے اپنی سمت بدلی اور ان سے الگ ہو کر اپنی گن تھامے ایک طرف کھسک گیا۔

میرے ذہن میں اچانک ہی اس خفیہ تہ خانے کا خیال ابھرا تھا، جہاں ایک دن وزیر جان نے دھوکے سے مجھے اور اول خیر کو قید کر دیا تھا۔ میں اسی طرف بڑھا تھا۔

میں اکیلا تھا۔ میں نے اسی کمرے کا رخ کیا جس کے فرش پر اس تہ خانے کا راستہ جاتا تھا۔ بہ ظاہر وہ... اسٹیکٹرم کا ایک آئینٹل روم تھا۔ میں اسی طرف جانے والی راہداری میں دیوار کے ساتھ چپکا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ فارنگ

اب وقفے وقفے سے ہو رہی تھی۔ بارود کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جس سے دم گھٹنا محسوس ہو رہا تھا۔ ظاہر تو یہی ہوتا تھا کہ پاور والوں نے یہاں بڑی مؤثر کارروائی کر کے دشمنوں پر قابو پالیا تھا۔ لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اصل شکار کے سلسلے میں انہیں ابھی کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ یہاں مجھے کچھ لاشیں بھی زمین پر پڑی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

اپنے مطلوبہ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک میں ایک جگہ ٹھٹک کے رکا۔ سامنے ایک کشادہ جگہ پر مجھے کیپٹن افتخار اور اس کے تین ساتھی پوزیشنیں سنبھالے ہوئے نظر آئے۔ وہ ایک کمرے کے دروازے پر ہلکا بولنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ یہاں بھی مجھے تین چار لاشیں فرش پر پڑی نظر آئیں، ان میں ایک لاش کی وردی سے میں پہچانا تھا کہ وہ ہمارے ساتھی کی تھی، مجھے اس پر دکھ ہوا تھا۔ میں انہیں اپنے مشن میں مصروف چھوڑ کے آگے بڑھنے لگا تھا کہ اچانک کیپٹن باجوہ کی آواز پر میں بری طرح ٹھٹک کر رکا۔ وہ اپنے ساتھی سے چلا کر تھکسا نہ کہہ رہے تھے۔

”اصل شکار اس کمرے میں ہیں۔ دروازہ اڑادو، جلدی۔“ ان کے ایک ساتھی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور مذکورہ کمرے کے دروازے پر ہلکی ساخت کا دستی بم پھینکا۔ ایک دھماکا ہوا اور دروازے کے پرچے اڑ گئے۔ مجھے ایک دیوار کی آڑ تھی، لیکن وہ تینوں کمرے کے دروازے کے بالکل سامنے تھے۔ دروازے پرچے اڑتے ہی ایک اور بم اندر پھینکا گیا تھا۔ اور پھر کیپٹن باجوہ نے اپنے تینوں ساتھیوں سمیت پھرتی کے ساتھ اندر کی سمت پیش قدمی کی۔ میں بھی دیوار کی آڑ سے نکلا۔ ہیوی گن میرے ہاتھ میں تھی جو عبید کے آنجہانی ساتھی کی لاش پر سے اٹھالی تھی۔ اگرچہ ایک پستل بھی میری بیلٹ میں اڑ سا ہوا تھا۔

کیپٹن جنجوعہ کی اس بات نے مجھے چونکا دیا تھا کہ اندر اصل شکار موجود تھا۔ یقیناً ان کے کسی ساتھی نے بتایا ہوگا۔

یہ چاروں کمرے کی طرف لپکے اور لامحالہ میں نے بھی سر دست تہ خانے والے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ بدل دیا اور اسی مذکورہ کمرے کی جانب کیپٹن باجوہ کی ٹیم کے پیچھے لپکا تھا کہ اچانک اندر سے کسی نے طاقت ور گن کا منہ کھول دیا۔ لمبے بھر کے لیے تو میرے اپنے اوسان ہی خطا ہو گئے تھے، ہوش اس وقت آیا جب میں نے اپنے ساتھیوں کی کرب ناک آوازیں سنیں۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انہی کی وجہ سے میں دشمنوں کی فارنگ سے

لکھیں، میری آنکھوں میں خون اتر اہوا تھا۔ اور پھر اس سے پیشتر کے اس کی روح بھی نفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی اچانک مجھے اپنی سماعتوں میں میجر باجوہ کی آواز سنائی دی۔ ”نہیں شہزی! چھوڑ دو اسے۔“

میجر صاحب کی آواز سن کر میرا جنوں کچھ کم ہوا اور پھر ان کے دو ساتھیوں نے مجھے شانوں سے تھام کر آہستگی کے ساتھ زمین پر ممتاز خان کے اوپر سے اٹھایا۔

ممتاز خان کو فوراً گرفت میں لے لیا گیا تھا۔ جبکہ زخمی کیپٹن افتخار اور ان کے ایک ساتھی کو فوراً ان کے ساتھیوں نے ابتدائی طبی امداد دینی شروع کر دی تھی۔ میجر صاحب کا آپریشن کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ اسٹیشن فور پر پاور والوں کا قبضہ ہو چکا تھا، نیز اسپیکٹرم کے کئی کارندے بھی گرفت میں آچکے تھے، کچھ مارے بھی گئے تھے۔ لیکن ابھی ایک دشمن وزیر جان باقی تھا۔

میں نے اپنے حواسوں کو قابو میں کیا۔۔۔ اور تیزی سے اسی سمت کو دوڑا۔ جدھر تھوڑی دیر پہلے میں پیش قدمی کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

میں جلد ہی اس مطلوبہ کمرے میں جا پہنچا۔ یہاں بھی سب کچھ ابتری کی حالت میں ہی نظر آ رہا تھا۔ میں نے تہ خانے کا راستہ تلاشنے کی بے حد کوشش کی لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ میں نے فرش سے وہ دبیز غالیچہ بھی اکھاڑ پھینکا تھا۔ جس کے نیچے تہ خانہ تھا لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ میں میز کی طرف بڑھا اور وہاں چھٹیڑ چھاڑ کرنے پر مجھے ایک دروازہ کھولتے ہی ایک پینٹل نظر آ گیا۔ پینٹل کے ہر بن پر انگریزی کے الفاہیٹ درج تھے۔ اندازے سے میں نے ایک ایسے ہی۔۔۔ چھ والے بن کو پیش کیا تو اچانک کمرے میں ایک گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔ میں پینٹل چھوڑ کر اسی سمت کو لپکا۔ جہاں غالیچہ بچھا ہوا تھا وہاں ایک آٹھ مربع فٹ کا چوکور تاریک خلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے سل فون کی ٹارچ جلائی اور اس کی روشنی اندر پھینکی۔ تہ خانے کی زمین زیادہ گہری نہ تھی، میں چھلانگ لگا کر اندر اتر گیا۔ اور چاروں طرف روشنی ڈالنے لگا تو اچانک میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میرے سیدھے ہاتھ کی طرف تہ خانے کی دیوار پر ایک چار فٹ کا چوکور خلا دکھائی دیا۔ میرے چہرے پہ سلوٹیں نمودار ہو گئیں اور فرط جوش تلے میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس میں کیا شک تھا کہ میرا اصل شکار (وزیر جان) اسی راستے سے فرار ہوا ہوگا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اس خلا میں اتر گیا جس کی چھت کافی جھکی ہوئی تھی۔ یہ

محفوظ رہا تھا، کیونکہ وہ پہلے ہی میرے آگے تھے۔ اگرچہ انہوں نے فائرنگ کی آواز سنتے ہی فرش پر گر کے خود کو گولیوں کی زد سے بچانے کی سعی چاہی تھی، مگر سیدھی فائرنگ نے انہیں شاید چاٹ لیا تھا۔ میں جوش جنوں کی کیفیت میں آ گیا، مگر میری سیدھی تھی، میں نے لیلیٰ پر انگلی رکھ دی اور پھر نہیں ہٹائی۔ نشانہ اندر دھواں بھرے کمرے کا خلا تھا۔ جواب میں مجھے اندر سے ایک سے زائد دشمنوں کی چیخ سنائی دی۔ اور اسی طرح فائرنگ کرتے ہوئے میں نے جب کمرے کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے اندر کی جانب پیش قدمی کرنی چاہی تو اچانک مجھے اپنے قریب قدموں میں پڑے کیپٹن افتخار جنجوعہ اور ان کے ایک ساتھی کی کراہ نما آواز سنائی دی۔ میں اس طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ کیپٹن افتخار اور ان کا ایک ساتھی زندہ تھے، میں انہیں بھی سنبھالنے کے لیے جھکا ہوا تھا کہ اچانک کوئی کمرے سے نکل کر بھاگا۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا اور اپنے ازلی دشمن، اپنے بھائی لیتھ شاہ کے قاتل کو اس طرح راو فرار اختیار کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی طرف دوڑا۔ اور اپنے حلق سے ایک جوش جنوں کی سی غراہٹ خارج کرتے ہوئے میں نے اسے ایک ہی جست میں جالیا۔ اپنے بھاری بھر کم جٹے کے باعث وہ زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ میرے اوپر پڑتے ہی وہ نیچے آ رہا اور میں اسے فرش پر رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔

پھر سنبھلتے ہی میں اس کے سینے پر جا سوار ہوا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ایک ایک کر کے وہ سارے خوں ناک مناظر میری آنکھوں کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ کئی چہرے ان میں میرا بھائی لیتھ شاہ پھر آسیہ کی لاش میری نگاہ تصور میں آن کھڑی ہوئی، پھر معصوم آسیہ کا چہرہ، اور وہ سارے درد انگیز اور ظلم ناک مناظر جو اس سفاک شیطان کے رہین منت تھے، باری باری میری وحشت خوں رنگ آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔

”بس ممتاز خان! آج تیری بربریت اور چنگیزی کا دور ختم ہونے والا ہے۔ اب تجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔“ میں نے لبورنگ لہجے میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دیوچ لیا۔ وہ کٹی گھٹی آواز میں میری منتیں کرتے ہوئے بولا۔

”شش... شہزی! مم... مم... مم... محاف کر دو۔ مجھے جانے دو۔ میں تمہیں بہت سی دولت...“

مگر میں جوش جنوں تلے اس کا گلا دبا تا چلا گیا، اور اس کے حلق سے اب محض خرخراہٹ کی آوازیں برآمد ہونے

ایک سرنگ نما خلا تھا۔ میں نے اس میں جھکے جھکے دوڑتے ہوئے میجر باجوہ سے رابطہ کر کے انہیں اس تہ خانے کے بارے میں آگاہ کیا اور سرنگ میں اپنا سفر جاری رکھا۔ سرنگ سانپ کی طرح مل کھاتی ہوئی۔۔۔ محسوس ہو رہی تھی۔ سرنگ گہری ہونے کے باعث مجھے رفتہ رفتہ اس میں آکسیجن کی کمی کا بھی احساس ہونے لگا۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک خدشہ یہ بھی پریشان کرنے لگا تھا کہ کہیں آگے جا کر اپنے اختتام پر یہ سرنگ بند نہ کر دی گئی ہو۔ لیکن میرا نہیں خیال تھا کہ... وزیر جان کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ وہ سرنگ کا سرا بند کرنے کی تنگ و دو کرتا۔ جلد ہی میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ بائیں جانب مڑتے ہی مجھے ذرا دور ہی روشنی کی مدور سی جھلک دکھائی دی۔ میری رفتار تیز ہو گئی۔ میری سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ آکسیجن کی کمی اور ڈی ہائیڈریشن کے باعث میں اپنے اندر نا طاقتی بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن ایک عزم اور حوصلے نے مجھے چٹان بنا رکھا تھا۔ اور میری قوت ارادی کو اس پر غیظ و لوے نے ہمیز کر رکھا تھا کہ میں نے اپنے ان دونوں ازلی دشمن کو کسی صورت میں بھی بچ کر نہیں جانے دینا ہے۔ ایک میرے بھائی کا قاتل تھا، جو میری بروقت پھرتی کے باعث، پاور والوں کی گرفت میں آچکا تھا تو دوسرے نے میری ماں کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور اسے بے یار و مددگار چھوڑا تھا۔ وہ ابھی مفرور تھا۔

یہی وہ آتش غیظ تھی جس نے مجھے ڈھنے سے روکے رکھا تھا۔

میں جلد ہی ہانپتا ہوا اس روشن سرے کی طرف آ گیا اور یہاں سے تازہ ہوا کے جھونکوں نے میرا استقبال کیا تو حواس بھی کچھ معمول پہ آنے لگے۔ میں نے رائفل پھینک دی، پستول میری بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ میں نے اس تنگ سے سرے میں اپنے دونوں ہاتھ پھنسائے اور باہر آزاد فضا میں ابھر آیا۔

پیدہ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ اطراف کا جائزہ لینے پر مجھے حدنگاہ بنجر زمین اور ٹیلوں لمبوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ زمین پر بھر بھری مٹی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک لمحے کو میں نے سوچا۔ اگر وزیر جان یہاں سے فرار ہوا بھی ہوگا تو وہ ابھی زیادہ دور نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ مجھے زمین کا جائزہ لینے پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے نشان نظر نہیں آئے تھے۔ البتہ قدموں کے نشانوں نے مجھے ضرور چونکا دیا، جس کا مطلب تھا کہ میں بالکل صحیح سمت

پر جا رہا تھا۔ میں انہی قدموں کے نشانات کی راہ نمائی میں آگے بڑھ گیا اور تقریباً دوڑ لگا دی۔

اس سلسلے میں، میں نے فون پر میجر ریاض باجوہ کو "لیڈ" کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اگرچہ وہ اس طرح میرے وہاں سے اچانک نکل جانے کا مطلب سمجھ چکے تھے۔ بہر طور انہیں اس جگہ کے محل وقوع سے آگاہ کرنے کے بعد میں قدموں کے نشانات کی راہ نمائی میں آگے بڑھتا رہا۔ بلیک کوبرا فائل میرے سینے سے لگی ہوئی تھی اور میں بہ دستور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک مقام پر مجھے قدموں کے نشانات بائیں جانب کو مڑتے محسوس ہوئے، یہاں میں رکا اور جھک کر بہ غور کھوجیوں کی طرح قدموں کے نشانات کی "ہیٹ" بھانپنے لگا۔

یہاں قدموں کے نشانات کچھ گڈمڈ سے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے یہاں پہنچ کر کوئی تھوڑی دیر کے لیے رکا تھا اور پھر اس نے یک دم اپنا راستہ بدل لیا تھا لیکن چند قدموں کے بعد پھر وہ رک کر ذرا ٹھہرا اور پھر پلٹ کر دوسری سمت چل پڑا تھا۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ فراری اگر تو وزیر جان ہی تھا تو اسے راستے کا تعین کرنے میں مشکل پیش آرہی ہوگی، وہ بس اپنی جان بچانے کے لیے جس طرح بے سروسامانی کی حالت میں نکلا تھا تو جہاں اس کا منہ ہوا، وہ اس طرف نکل گیا تھا۔ ایسے شکار کو چھاپنا، کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہوتا۔

یہ سوچ کر ابھی میں نے اپنے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ مجھے اپنے عقب سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ یہ مخصوص، موٹے اور چوڑے ٹائروں والی جیپ تھی، اس میں میجر باجوہ اور چار ساتھی بھی براجمان تھے، ان میں دو اول خیر اور شکیلہ تھے۔ جنہیں عمارت سے باہر تعینات کیا گیا تھا۔ جبکہ زخمیوں کو اسپتال بھجوا دیا گیا تھا۔

مجھے وہاں دیکھ کر وہ سب نیچے اتر آئے اور میرے ایما پر وہ بھی قدموں کے نشانات کا تعین کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اس کے بعد ہم سب جیپ میں سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔ ہم پرامید تھے کہ ہمارا آخری شکار وزیر جان زیادہ دور نہیں گیا تھا اور کسی بھی لمحے وہ ہمارے نرغے میں آنے والا تھا۔ بشرطیکہ وہ وہی تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ



ہتھکڑاں

سیرینا راضی

مطمئن اور پُر لطف زندگی گزارنے والے ایک مصنف کی روداد... گمنام رہتے ہوئے اپنی کہانیوں کے لیے کردار کھوجنا اس کا کام اور شوق تھا... وہ خاموشی اور سکون کی طلب میں شور ہنگاموں سے دور رہنا چاہتا تھا... مگر تقدیر نے اسے ایک حادثے کا گواہ بنادیا...

قتل کی ایک فنکارانہ واردات کا قصہ... مجرم نے اپنا کردار بڑے سجاوے سے نبھایا تھا...

جائے وقوعہ کے گرد پولیس نے پیلے رنگ کا ٹیپ لگا کر اس پر بورڈ لگا دیا تھا۔ میں نے ٹیپ تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور باہر آ گیا حالانکہ میں اس حد کو پار نہیں کر رہا تھا پھر بھی ایک باوردی پولیس والے نے اپنا بھاری ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”انسپکٹر کسی وقت بھی یہاں آ سکتا ہے۔“

”بیس منٹ سے یہی کہا جا رہا ہے۔“ میں نے منہ بناتے ہوئے کہا اور پول کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس وقت

آٹھ بج رہے تھے اور میرے علاوہ وہاں دوسرا سولین
جیراڈیو کا جزل منبر تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری اور کامیابی
سے یہ بندوبست کر لیا تھا کہ اسپیکر کے آنے سے پہلے طبی عملہ
لاش کو وہاں سے ہٹا دے۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے میں اس
نے خوشامد کے ساتھ رشوت کا بھی سہارا لیا ہو کیونکہ لاش کی
وہاں زیادہ دیر تک موجودگی ہوٹل میں مقیم مہمانوں کے لیے
بے چینی کا سبب بن سکتی تھی۔ اس کی یہ تدبیر کارگر رہی اور
ایسولینس کے روانہ ہوتے ہی سب مہمان اپنے اپنے
کمروں میں چلے گئے۔

مسز آرٹلڈ پول کے کنارے بید کی کرسی پر بیٹھی ہوئی
تھی۔ اس نے اپنے پاؤں کرسی کے نیچے موڑ رکھے تھے جس
سے اس کا سختی جسم مزید چھوٹا لگ رہا تھا۔ ایک پولیس والا
اس سے کچھ قاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک کرسی کھینچی
اور اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بولی۔

”تم ہی وہ شخص ہو جس نے مینوٹ کی لاش دیکھی
تھی؟“

”ہاں، مجھے اس کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔“

”کیا اس نے مرنے سے پہلے کچھ کہا تھا؟“

”نہیں۔“

مجھے یوں لگا جیسے وہ یہ سن کر پُر سکون ہو گئی ہو لیکن میں
فوری طور پر اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔

”لیکن تم اسے جانتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہی
ہوں؟“

”ہماری ایک دو مرتبہ بات چیت ہوئی تھی۔“ میں
نے اسے اپنے ہنی مون کے بارے میں بتایا جب میں ایک
نوآموز مصنف تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں جم
کوننگ ہوں لیکن میں نے کہا نہیں۔ یہ شخص اتفاق ہے کہ
میری کہانی اس سے ملتی جلتی ہے۔“

”وہ یہاں آکر بہت خوش تھا۔“ یہ کہتے ہوئے مسز
آرٹلڈ کی آواز بھرا گئی۔

میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے بازو پر رکھا اور
دوسرے ہاتھ سے بریسلٹ نکالا۔ مجھے اطمینان تھا کہ میری
پشت پولیس والے کی طرف ہے اور وہ مجھے نہیں دیکھ رہا۔

مسز آرٹلڈ کی آنکھوں میں چمک ابھری اور اس نے جلدی
سے وہ بریسلٹ پکڑ لیا۔ انگلی سے اس کے ٹوٹے ہوئے جوڑ
کو چھوا اور اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ صاف ظاہر ہو رہا
تھا کہ یہ بریسلٹ اس کے لیے بہت اہم ہے۔

”یہ تمہیں کہاں سے ملا سٹر کوننگ؟“

”کیا تم نے لاش کا معائنہ کیا تھا؟“

”جہیں ایسولینس بلانے کے لیے استقبال کاؤنٹر
تک جانے میں کتنی دیر لگی؟“

”چند منٹ۔“

”کیا تم نے لاش کا معائنہ کیا تھا؟“

”تم مجھے صاف جم کہہ سکتی ہو۔“

”تمہارے شوہر کی لاش کے پاس ہی پڑا ہوا تھا۔“

”اوہ، اسے میں اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گی کہ یہ کسی
اور کے ہاتھ نہیں لگا۔ کیا میں تم سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ بات
ہم دونوں کے درمیان ہی رہے۔ کسی اور کو اس کا علم نہ ہو۔“

”کیوں؟“

”اگر یہ پولیس والوں کے ہاتھ لگ گیا تو...“ وہ

کہتے ہوئے رک گئی پھر بولی۔ ”مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا نہیں
لگ رہا لیکن یہاں سلی تعصب بہت زیادہ ہے۔“

”تمہیں ڈر ہے کہ وہ اسے اپنے پاس رکھ لیں گے
کیونکہ یہ بہت قیمتی ہے۔“

”ہاں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا۔ اس
سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ہم نے سائرن کی آواز سنی اور ایک
دوسری پولیس کار ہوٹل کے سامنے آکر رک گئی۔ چند سیکنڈ
بعد اس میں سے ایک چھوٹے قد کا فربہ انداز شخص برآمد ہوا
جس نے سر پر بیس بال کیپ پہن رکھی تھی۔ میں نے مسز
آرٹلڈ کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا اور کھڑا ہو گیا۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ اس نے کہا اور تالاب
کے پانی پر نظریں جمادیں۔ میں دوبارہ جائے واردات پر
آ گیا جبکہ وہاں کوئی واردات نہیں بد قسمتی سے ایک حادثہ
پیش آیا تھا۔

چھوٹے قد کا پولیس والا میرے پاس آکر بولا۔

”میں اسپیکر سوزا ہوں۔ تم نے ہی لاش دریافت کی تھی؟“

اس نے اپنی نوٹ بک دیکھنے کے بعد کہا۔ ”مرنے والے کا
نام مینوٹ آرٹلڈ ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

”ہاں، بالکل صحیح ہے۔ تمہاری انگریزی بہت اچھی
ہے اسپیکر۔“

”شکریہ۔ میرے کچھ رشتے دار شکاگو میں رہتے
ہیں۔ گوکہ میں خود امریکا کو پسند نہیں کرتا۔ تم نے کس وقت
لاش دیکھی تھی؟“

”ساڑھے سات بجے کے قریب۔ میں سات بج کر
پچیس منٹ پر ہوٹل سے روانہ ہوا تھا اور وہاں سے یہ قاصلہ
پانچ منٹ کا ہے۔“

”تمہیں ایسولینس بلانے کے لیے استقبال کاؤنٹر
تک جانے میں کتنی دیر لگی؟“

”چند منٹ۔“

”کیا تم نے لاش کا معائنہ کیا تھا؟“

ہنٹھکنڈی

اگلے روز میں اور شارلین ساحل سمندر پر گئے اور اسے حیراکی کے لباس میں دیکھ کر میرے ذہن سے بریسلٹ کا خیال نکل گیا۔ اپنے کمرے میں واپس آیا تو مجھے فون پر ایک پیغام ملا۔ میں نے ٹھن دیا تو اسپیکر کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ ”مجھے تم سے مزید کچھ سوالات کرنے ہیں۔ براہ کرم کل صبح آٹھ بجے پولیس اسٹیشن آ جاؤ۔ میں گاڑی بھیج دوں گا۔“

اس نے مجھے سوچنے کے لیے تقریباً چوبیس گھنٹے کا وقت دے دیا تھا اور میں حیران تھا کہ کیا اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ اس رات بھی شارلین کے ساتھ ڈنر کرتے ہوئے میں اسی بارے میں سوچتا رہا۔ وہ مجھے اپنی بھانج کی کہانی سنارہی تھی جو اپنا سب کچھ بیچ کر کینیڈا سے کیلی فورنیا منتقل ہو گئی تھی جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا بات ہے؟ کس سوچ میں گم ہو؟“

”نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے سنہلے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے کبھی غور کیا کہ چھٹیوں میں ذہن پر زیادہ بوجھ رہتا ہے مثلاً آپ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا کام پڑنے والا ہے۔“

”تم کیا کام کرتے ہو؟“

”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“

”جانتی ہوں لیکن میں نے کچھ اور سنا ہے۔ سوئنگ پول پر باتیں ہو رہی تھیں کہ تم ایک مشہور مصنف ہو اور فرضی نام سے سفر کر رہے ہو۔ کیا واقعی ایسا ہے؟“

”نہیں، میں پرانی کشتیاں فروخت کرتا ہوں۔“

”ایک ایسے شہر میں جہاں کوئی سمندر نہیں ہے۔“

”کیا کبھی تم نے گریٹ میک کا نام سنا ہے؟“

☆☆☆

مجھے کی صبح آٹھ بج کر دو منٹ پر ایک سیاہ کار ہوٹل کے دروازے پر آ کر رکی۔ اس کے برابر میں ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنی گاڑی میں بیٹھا اونگ رہا تھا جبکہ اطراف میں کچھ پرندے دانہ چک رہے تھے۔ ہوٹل کے داخلی دروازے پر سٹاٹا تھا اور گرمی کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے انگوٹھے سے حقہ لشت کی طرف اشارہ کیا اور میں وقت ضائع کیے بغیر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ وہ تنگ سڑکوں پر تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا چند منٹوں میں پولیس اسٹیشن پہنچ گیا جو کہ وسط شہر میں واقع تھا۔ اس کے ایک جانب زیر آب تیراکی کا دفتر اور دوسری جانب سی فوڈ

”ہاں، میں نے اس کی نبض دیکھی تھی۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔“

”تم نے اس کے بدن کو ہاتھ نہیں لگایا؟“

”نہیں، وہ مر چکا تھا۔“

اس کے بعد اسپیکٹر نے مجھ سے عام نوعیت کے سوالات کیے۔ مثلاً میرا پتا، پیشہ، روائی کی تاریخ وغیرہ وغیرہ۔

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اس کے سوالات کا سلسلہ ختم ہوا اور اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔ شارلین پیچھے کی میز پر بیٹھی وائٹ سے شغل کر رہی تھی اور اس کی نظریں ایک جوان جوڑے پر تھیں جو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے لیے ایک مشروب کا آرڈر دے دیا۔

”کیسا رہا؟“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ فکر مند نظر آرہی تھی اور مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگ رہا تھا۔

”وہ مجھے گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے بار بار ایک ہی طرح کے سوال کیے۔“

”ممکن ہے کہ وہ تمہارا کوئی جھوٹ پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔“

اس کی یہ بات بڑی ضرور لگی پھر بھی میں نے کچھ نہیں کہا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ افسوسناک نہیں ہے؟“

”ہاں، کوئی فرامیسی ہی چھٹیوں کے دوران میں بالکونی سے گرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے اسے دھکا دیا ہو؟“

”میں نے بھی اس بارے میں سوچا تھا۔ وہ بھی زیادہ تر بورچین کی طرح ٹپ دینے کے معاملے میں سببوں تھا لیکن اتنا بڑا بھی نہیں کہ کوئی ملازم شخص اس وجہ سے اسے کھڑکی سے نیچے پھینک دے۔“

”تم کتنی خوفناک باتیں کر رہے ہو۔“ وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

”چلو جانے دو۔ ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میں کھانا کھا چکی ہوں اور ویسے بھی تمہاری عادی نہیں ہونا چاہتی۔“

”کیوں، میں کوئی خطرناک شخص نہیں ہوں۔ میں نے صرف اس کی لاش دیکھی تھی۔ اسے قتل نہیں کیا۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا اور تم یہ بات ابھی طرح

جاننے ہو۔“

ریستوران تھا۔ اندر کا موسم باہر سے بھی زیادہ گرم تھا اور
نکسے کی ہوا بھی نا کافی معلوم ہو رہی تھی۔

انسپکٹر ایک چھوٹے سے کمرے میں چھوٹی سی میز کے
پچھے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی بیس بال کیپ عقب میں رکھے
کوٹریک پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مصافحہ کرنے کے
لیے کھڑا ہو گیا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

”اے، میرے خدا! بہت گرمی ہے۔ بہت سے
غیر ملکی سیاح اسے برداشت نہیں کر سکتے لیکن میں سمجھتا ہوں
کہ یہ جنت میں جانے کی قیمت ہے۔“

مجھے مسٹر آرنلڈ کا خیال آیا جو قبر کی گہرائی میں آرام
سے لیٹے ہوں گے۔

”تم حیران ہو رہے ہو گے کہ میں تم سے دوبارہ کیوں
بات کرنا چاہتا ہوں؟“ انسپکٹر نے کہا۔

”حیرانی کی بات ہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا
کہ یہ باتیں تم نے ہوٹل میں ہی کیوں نہیں کر لیں۔“

”ہوٹل میں پوچھے جانے والے سوالات رسمی نوعیت
کے تھے۔“ انسپکٹر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا جیسے وہ مناسب
الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ ”ہم ضرورت سے زیادہ اس جزیرے
پر آنے والے سیاحوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتے لیکن جب
کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو ہمیں تحقیق کرنا پڑتی ہے، چاہے وہ
کوئی بھی رخ اختیار کرے۔ پولیس کا کام بالکل ایسا ہے
جیسے کسی آوارہ عورت سے محبت کی جائے۔ آپ بھی نہیں جان
سکتے کہ وہ آپ کو کہاں لے جائے گی۔“

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔
”تم نے مسٹر آرنلڈ کی لاش کب دیکھی؟“

”تقریباً ساڑھے سات بجے کا وقت ہوگا۔ میں نے
الباٹروس سے نکلنے وقت گھڑی دیکھی تھی۔ سات بج کر پچیس
منٹ ہوئے تھے اور وہاں تک آنے میں مجھے پانچ منٹ
لگے ہوں گے لیکن یہ سب میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔“

”تمہیں ایسبولینس کو فون کرنے کے لیے استقبالیہ تک
پہنچنے میں کتنا وقت لگا؟“

”چند منٹ سے زیادہ نہیں۔“
”کیا تم نے لاش کا معائنہ کیا تھا؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں نے اس کی جیبوں کی
تلاشی لی ہوگی کہ شاید کچھ پیسے مل جائیں، نہیں۔ میں نے یہ
حرکت نہیں کی۔“ میں نے براہی سے کہا۔

”ناراض ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر کوننگ۔ یہ ایک
عام سا سوال ہے۔“

”جس کا جواب میں دو دن پہلے دے چکا ہوں۔
اب ان باتوں کو دہرانے کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے۔
کیا تمہیں کوئی سراغ مل گیا ہے؟“

اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”لاش
دیکھنے کے بعد تم سیدھے استقبالیہ کاؤنٹر پر گئے تھے؟“

”ہاں، میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ میں تمہارے اگلے
سوال کا جواب بھی دے رہا ہوں۔ میں نے جائے وقوعہ پر
کسی اور شخص کو نہیں دیکھا۔“

”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ناراض ہونے کی
ضرورت نہیں۔ یہ ایک معمول کی کارروائی ہے۔“

”کیا تمہیں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے اسی لیے تم
مجھ سے یہ سوالات دوبارہ پوچھ رہے ہو؟“

”میں کسی ایسے سیاح سے تفتیش کے بارے میں گفتگو
نہیں کرتا جو خود اس میں ملوث ہو۔“

”میں قطعی طور پر اس واقعے میں ملوث نہیں ہوں۔ یہ
میری بد قسمتی تھی کہ میں نے اس حادثے کے شکار شخص کی
لاش دیکھی۔“

”گویا تمہارے خیال میں وہ ایک حادثہ تھا؟“
انسپکٹر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”بالکل میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ ایک حادثہ تھا جب
تک کہ یہ نہ سوچا جائے کہ اس کی بیوی نے انشورنس میں
ملنے والی بھاری رقم کی خاطر اسے کھڑکی سے دھکا دیا ہوگا۔“

”یہ واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا جیسا کہ تمہارے
ناولوں میں ہوتا ہے۔“

میں نے اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔
”تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم ایک مشہور
جاسوسی ناول نگار ہو؟“

”میں نے بدھ کے روز یہ تمہیں بتا دیا تھا کہ ایک
مصنف ہوں۔“

”شاید ڈر رہے تھے کہ ہوٹل میں قیام کرنے والے
دوسرے مہمان تمہیں پہچان لیں گے؟“

”نہیں، میں تعطیلات کے دنوں میں کام گھر پر ہی
چھوڑ کر آتا ہوں۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں ایک
کامیاب مصنف ہوں تو وہ مجھ سے زیر تحمیل کہانیوں کے
بارے میں پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔“

”جیسا کہ مسٹر آرنلڈ نے کیا؟“ انسپکٹر نے چہیتے
ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

احتیاط

لڑکا اور لڑکی پارک کے ایک گوشے میں بیٹھ کر
دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے یا ادھر ادھر کی باتیں
کر رہے تھے۔ لڑکے میں کسی پیش دستی کا حوصلہ تھا نہ
ہمت۔

اسی دوران میں کتوں کا ایک جوڑا آوارہ گردی
کرتا ہوا وہاں آگلا۔ کتے نے سونگھتے سونگھتے کتیا کی
تھوحنی سے منہ لگا پا تو لڑکے کو فوری ایک بہانہ سوچ گیا۔
اس نے جھجکتے ہوئے لڑکی سے کہا۔ ”تم برانہ مانو
تو میں بھی۔۔۔“

لڑکی نے اس کی بات درمیان سے ہی اچک لی
اور بولی۔ ”ہاں، ہاں... ضرور... لیکن احتیاط
سے... کہیں کتیا تمہارا منہ نہ لوق لے۔“

حیران اقبال، کراچی

کرتا۔ اب مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا۔ کاش میں نے وہ
بریسلیف مسٹر آرنلڈ کے بجائے پولیس کو دے دیا ہوتا۔ ممکن
ہے کہ انسپٹر اس بیوہ کے پاس میری موجودگی کو غلط رنگ میں
دیکھ رہا ہو اور مجھے انصاف کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے
الزام میں گرفتار کرے۔

انسپٹر نے میری خاصی بے عزتی کر دی تھی۔ وہ سمجھ
رہا تھا کہ مجھے جیسے امیر امریکی کو تیسری دنیا کے پولیس اسٹیشن
میں بلانا مجھے توڑنے کے لیے کافی ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ
کسی بھی معقول شخص کے لیے یہ رویہ ناقابل برداشت تھا۔
ہوٹل پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور پانچ
منٹ بعد دروازے کو تالا لگا کر اوپری منزل پر واقع مسز
آرنلڈ کے سوٹ میں چلا گیا۔ ایک کرخت چہرے والی نرس
نے دروازہ کھولا جسے ہوٹل والوں نے مسز آرنلڈ کی خدمت
پر مامور کیا تھا۔ وہ مجھے اندر نہیں آنے دے رہی تھی اور
میرے ہسپانوی بولنے کے باوجود اس نے اپنے کھردرے
ہاتھ سے میرا راستہ روک دیا۔ میں چند لمحوں کے لیے ہاتھ
مسز آرنلڈ کی آواز سنائی دی۔ نرس نے میرے لیے راستہ
چھوڑ دیا اور میں اس کے پاس سے گزرتا ہوا اندر چلا گیا۔

مسز آرنلڈ ایک صوفے پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے
کمزور جسم پر ایک پتلا کیل پڑا ہوا تھا۔ اس نے سر کے نیچے

”تم وقوعہ کے بعد مسز آرنلڈ سے باتیں کر رہے تھے۔
میں جانتا چاہتا ہوں کہ تمہاری گفتگو کا موضوع کیا تھا؟“
”درحقیقت ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔
ہم تمہارے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس دوران میں
اسے لگی دیتا رہا۔“

”جس طرح تم کینیڈا سے آئی ہوئی عورت کا دل
بھلاتے رہتے ہو۔“

اس کا اشارہ واضح طور پر شارلین کی طرف تھا۔ مجھے
حیرت تو ہوئی لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

”تمہارے پاسپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے
گزشتہ برس کے دوران چند مرتبہ فرانس کا دورہ کیا۔ کیا تم
مسز آرنلڈ کو پہلے سے جانتے تھے؟“

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم مجھ سے کچھ
اگلوانے کی کوشش کر رہے ہو تو میں یہی کہوں گا کہ یہ وقت
ضائع کرنے والی بات ہے۔ میں پہلے ہی تمہیں سب کچھ بتا
چکا ہوں۔“

”مسٹر کوننگ، مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی ایسی بات
ضرور ہے جو تم مجھے نہیں بتا رہے لیکن مجھے یہ کہنے دو کہ اس
جزیرے پر بھی انصاف ضرور ہوتا ہے۔ چاہے اس کا تعلق
کسی غیر ملکی سیاح سے ہی کیوں نہ ہو۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ گویا اس بات
کا اشارہ تھا کہ وہ اپنی بات ختم کر چکا ہے جب میں واپس
جانے کے لیے دروازے تک پہنچا تو اس نے مجھے مخاطب
کرتے ہوئے کہا۔ ”میری بیوی نے تمہاری ایک کتاب
پڑھی ہے۔“

”کون سی؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”دی کور آپ۔“
”اسے یہ کتاب کیسی لگی؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ نہیں سمجھتی کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے، وہ قابل
یقین ہے۔“

میں غصے میں دروازہ بند کیے بغیر باہر آ گیا۔ واپسی کا
سفر اور زیادہ تکلیف دہ تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے کے دوران میں
گرمی اور زیادہ بڑھ گئی تھی لیکن میری پریشانی کی وجہ کچھ اور
تھی۔ انسپٹر سمجھ رہا تھا کہ میں اس سے کچھ چھپا رہا ہوں لیکن
اسے بریسلیف کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ کیا اسے
یقین ہے کہ میرے اور مسز آرنلڈ کے درمیان کوئی تعلق
ہے؟ کیا کسی نے مجھے اس رات وہاں دیکھا تھا؟ نہیں۔ اگر
کسی نے دیکھا ہوتا تو انسپٹر مجھ سے مختلف انداز میں گفتگو

دو ٹکے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا۔ وہ درمیانی عمر سے بھی زیادہ کی لگ رہی تھی۔ اس کی نظریں چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ بولی۔

”اوہ، یہ تم ہو جم۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے کہ تم مجھے دیکھنے آئے۔ تم واقعی ایک شریف انسان ہو۔“

نرس نے میرا بازو پکڑا اور ہسپانوی زبان میں احتجاج کرنے لگی لیکن مسز آرنلڈ نے سر کے اشارے سے اسے باہر بھیج دیا۔

میں کافی کی میز پر بیٹھ گیا۔ وہاں چائے کی آدمی پیالی اور کچھ ٹیکن رکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں ایک طرف کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم پہلے شخص ہو جو مجھ سے ملنے آئے اور یہ نہیں پوچھا کہ میں کیسی ہوں۔“ مسز آرنلڈ نے کہا۔

”مجھے رسمی گفتگو پسند نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میرے شوہر کو بھی یہ پسند نہیں تھا اسی لیے وہ تم سے باتیں کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔“

”میں تم سے اسی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

”بنیوٹ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنے جذبات کا اظہار کر سکیں لیکن میں جانتی تھی کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے۔ پینتیس سال ساتھ گزارنے کے بعد ایک بیوی اپنے شوہر کو اچھی طرح سمجھنے لگتی ہے اور وہ آپس میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ کیا تم شادی شدہ ہو جم؟“

”میری ایک شادی ہوئی تھی۔“ میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا ہوا؟“

”ہمارے درمیان ایسا تعلق قائم نہ ہو سکا کہ تمہاری طرح سکون سے خاموشی کی زبان میں گفتگو کر سکیں۔ ہم دونوں بہت اونچی آواز میں گفتگو کرتے تھے اور ہمیشہ لڑتے رہتے تھے۔“

”اوہ، اب میں سمجھی۔“ اس نے ایک ٹیکن اٹھایا اور آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”اگلے سال ہماری شادی کی پینتیسویں سالگرہ ہونے والی تھی۔ ہم اس موقع پر یونان جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔“

میں نے اسے روکنے دیا۔ جانتا تھا کہ کچھ کہنا بیکار ہو گا۔ جب اس کی حالت سنبھلی تو میں نے کہا۔

”مسز آرنلڈ! میں ابھی ابھی پولیس اسٹیشن سے واپس

آ رہا ہوں۔ انسپکٹر نے مجھے دوبارہ بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔“

اگر وہ یہ سن کر حیران ہوئی ہوگی تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا اور بولی۔ ”کیوں؟“

”لگتا ہے کہ اسے مجھ پر شک ہے کہ میں نے اسے وہ چیز نہیں دی جو پولیس کو دینی چاہیے تھی۔“

”وہ بے وقوف ہے اور اکیلے ہی سب چیزوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔“

”میں خود بھی یہی سوچ کر حیران ہو رہا ہوں۔“

مسز آرنلڈ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ وہ

ان چیزوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بہت سے مقامی لوگ سیاحوں سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ہم امیر لوگ ہیں۔“

”تو یہ بات ہے؟“ میں نے کہا۔

”وہ بنیوٹ کا کیرا بھی لے گیا۔ کیا اس نے یہ بات تمہیں بتائی؟“

”نہیں، اس نے کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی مجھے کوئی بات بتائے گا۔“

اس کے چہرے پر نرمی آگئی اور وہ بولی۔ ”یقیناً نہیں۔ پولیس والوں کا کام صرف سوالات کرنا ہوتا ہے۔“

”وہ کیرا کیوں لے گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”کیونکہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔

”تم مجھے بتاؤ کہ بنیوٹ کے کیرے کا اس واقعے سے کیا تعلق ہے۔ وہ بہت قیمتی کیرا تھا جو میں نے اس کی سالگرہ پر اسے دیا تھا۔“

نرس ایک ٹرے ہاتھ میں پکڑے کمرے میں داخل ہوئی جس میں سوپ اور پانی کا گلاس رکھا ہوا تھا۔

”یہ میرا سوپ پینے کا وقت ہے۔ مجبوراً مجھے تم سے جانے کے لیے کہنا پڑے گا۔“

میں دروازے کی طرف بڑھا اور باہر جانے سے پہلے مڑ کے دیکھا۔ مسز آرنلڈ بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھی تھی، اس نے ٹرے اپنی رانوں پر رکھ لی۔ ایک چھپا اٹھایا اور اس سے سوپ پینے لگی۔

میں نے صبح کا بقیہ حصہ سوئٹنگ پول پر گزارا، اور دو انگریز بچوں کو فٹ بال کھیلتے دیکھتا رہا۔ جیب اکٹھاٹ محسوس ہونے لگی تو شارلین کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ دروازے کی کھنٹی بجائی اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر

ہتھکڑیاں

شارلین اتر پورٹ گئے اور فیصلہ کیا کہ اپنی اپنی منزل پر روانہ ہونے سے پہلے اکٹھے بیٹھ کر کافی پیئیں گے۔ اس کے بعد ہم ایک کتابوں کی دکان کے پاس سے گزرے جہاں کتابوں کے سٹے ایڈیشن رکھے ہوئے تھے۔ وہ کوئی کتاب خریدنے اندر چلی گئی اور میں باہر کھڑا شوکیس میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد شارلین باہر آئی اور مجھے ایک کتاب پکڑاتے ہوئے بولی۔ ”ان کے پاس صرف پیپر بیک ایڈیشن ہیں۔ کیا تم اس پر اپنے دستخط کر سکتے ہو؟“

وہ میرا تازہ ترین ناول تھا۔ میں نے اس سے قلم لیا اور فلیپ کے اندر دنی صے پر دستخط کر دیے۔ اس نے وہ تحریر پڑھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تم بہت چالاک ہو۔“

راستے میں ہم نے مسز آرنلڈ کو دیکھا جو اپنی نرس کی مدد سے ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا اور کندھے اوپر کواٹھے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح چل رہی تھی جیسے پیراٹھانے میں بہت زور لگاتا پڑ رہا ہو۔

اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے وہ کسی خطرناک بیماری سے صحت یاب یا گہرے صدمے سے باہر آئی ہو۔ ہم اس گیٹ تک پہنچے جہاں سے شارلین کو رخصت ہونا تھا۔ مجھے یہ منظر بھی اچھا نہیں لگا۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنا اور رابطے میں رہنے کے وعدے کرنا جو کبھی پورے نہیں ہوئے۔

میں اسی وقت اس منحوس اسپیکر کی شکل دکھائی دی۔ وہ دوڑتا ہوا ہماری طرف ہی آرہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنی بیس سال کیپ اتاری اور ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔ ”مسز آرنلڈ۔“ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

”وہ پہلے ہی جہاز پر سوار ہو چکی ہے۔“ میں نے بورڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر جہاز کی روانگی کا نشان چمک رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے معدے میں گڑبڑ محسوس ہونے لگی۔

”کیا میں تم سے علیحدگی میں بات کر سکتا ہوں؟“ اس نے مجھے ٹیکسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یقیناً۔“ میں نے کہا اور شارلین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے چند منٹ دے سکتی ہو؟“

”بالکل۔“ وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”لیکن

داخل ہو گیا۔ وہ اپنے بستر پر پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی اور اس نے جسم کو ایک بڑے تولیے سے ڈھانپ رکھا تھا۔

”اوہ میرے خدا کتنی گری ہے۔ تیز دھوپ میں پورا بدن جھلس کر رہ گیا۔“

”تمہیں اپنے آرام کا خیال رکھنا چاہیے۔“ میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

”تم آج صبح کہاں گئے تھے؟“ اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ساحل پر گیا تھا۔“

”کیا تم ساحل پر بھی شوفر کے ساتھ جاتے ہو؟“

”تم نے مجھے دیکھا تھا؟“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے، میں نے نہیں لیکن کسی اور نے ضرور تمہیں دیکھا ہے۔“

”بہت اچھا ہوا کہ ہماری شادی نہیں ہوئی، میں تمہارے ہوتے ہوئے دہری زندگی نہیں گزار سکتا۔“

”یہ کوئی جواب نہیں ہے جبکہ میں نے ابھی کوئی بات بھی نہیں کی۔“ وہ بولی۔ ”کیا اس کا کوئی تعلق مسز آرنلڈ سے ہے؟“

”ممکن ہے۔“ میں نے تیل کی بوتل لے کر اس کی کمر پر مالش کرنا شروع کر دی۔

”میں نے پول پر لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا ہے کہ پولیس مسٹر آرنلڈ کی موت کو حادثہ ماننے پر تیار نہیں۔“

”تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟“

”تم رونو لٹو کو جانتے ہو جو ہمارا سفری گائیڈ ہے؟“

”ہاں وہی چھوٹے قد کا آدمی جو اونچی آواز میں بولتا ہے۔“

”اے باتیں کرنے کا شوق ہے اور اس کا ایک کزن مقامی پولیس میں بھی ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ پولیس کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کر سکی جس نے بدھ کے روز مسز آرنلڈ کو پورے وقت ڈائننگ روم میں دیکھا ہو۔ تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو مسٹر مسٹری رائٹر؟“

میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی اور میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ دوپہر تک شارلین بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ہم دونوں وسط شہر گئے اور بندرگاہ کے نزدیک ایک ریسٹوران میں سی فوڈ پر مشتمل مہنگا ترین کھانا کھایا۔ اس کے بعد سے مجھے اسپیکر کا کوئی فون موصول نہیں ہوا تھا۔ اتوار والے دن میں اور

”یہ تصویر ڈنر کے دوران لی گئی جس رات مسٹر آرنلڈ کا قتل ہوا۔“

”قتل؟“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے میرے رد عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک اور تصویر نکالی اور اسے مسٹر آرنلڈ کی تصویر کے برابر میں رکھ دیا۔ اس میں پوسٹ مارٹم کی میز پر ایک بازو نظر آ رہا تھا جو یقیناً مسٹر آرنلڈ کا ہی ہوگا۔ میں نے اسے ڈنر جیکٹ کی گہرے نیلے رنگ کی آستین کی وجہ سے پہچان لیا۔ وہ آستین اوپر کو چڑھی ہوئی تھی اور اس کلائی پر بھی ویسا ہی بھاری سونے کا بریسلٹ نظر آ رہا تھا جیسا مجھے مسٹر آرنلڈ کی لاش کے پاس سے ملا اور جسے میں نے اسی رات اس کی بیوی کے حوالے کر دیا تھا۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ میں نے معصوم بننے ہوئے کہا۔

”تمہیں مسٹر آرنلڈ کی لاش کے پاس سے جو بریسلٹ ملا وہ اس کی بیوی کا تھا اور یہ دونوں بریسلٹ ایک جیسے ہی تھے۔“

”ایک منٹ۔“ میں جلدی سے بول پڑا۔ ”میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے مسٹر آرنلڈ کی لاش کے پاس سے کوئی بریسلٹ ملا تھا۔ تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ایسا کوئی دوسرا بریسلٹ بھی تھا۔“

”مجھے اس دوسرے بریسلٹ کے بارے میں علم ہے کیونکہ میں اسے دیکھ چکا ہوں۔“

”کہاں؟“

”مسٹر آرنلڈ نے مجھے دکھایا تھا جب میں دوسری مرتبہ اس سے ملنے گیا۔ یہ قتل بدھ کی رات کو ہوا تھا۔ جمعرات کی صبح تم سے پولیس اسٹیشن میں بات کرنے کے بعد میں نے کمرے میں مسٹر آرنلڈ کی تصویر دیکھی چنانچہ میں اس سے دوبارہ بات کرنے کے لیے ہوٹل گیا۔ تب اس نے بتایا کہ ڈنر کے دوران اس نے بریسلٹ اتار دیا تھا کیونکہ اس کی چین نکل گئی تھی۔ اس کا کہنا صحیح ہے۔ چین ضرور الگ ہوئی تھی لیکن اس وقت نہیں۔“

اچانک ہی رپورٹ مجھے چھوٹا اور تنگ محسوس ہونے لگا حالانکہ ہم ایک کھلی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے جہاں چھت سے فرش تک کھڑکیاں نصب تھیں۔ انسپکٹر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”اس کا بریسلٹ ڈنر کے دوران میں الگ نہیں ہوا تھا بلکہ جب اس نے اپنے شوہر کو بالکونی سے دھکا دیا تو اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر

یہ سب کیا ہے؟“ انسپکٹر مجھے دھکیلتا ہوا ایک قریبی میز تک لے گیا۔ میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے کہ تم محض مجھے خدا حافظ کہنے نہیں آئے۔“

انسپکٹر نے اپنی جیب سے پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”میرے لیے یہ کوئی خوشگوار بات نہیں ہے۔“ اس نے اپنی ٹوپی میز پر رکھ دی اور میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”اس کیس کے حوالے سے کوئی بات مجھے شروع سے ہی پریشان کر رہی تھی۔ پہلے میں نے مسٹر آرنلڈ سے بات کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اتنی غمزہ نہیں تھی جتنا کہ اسے ہونا چاہیے تھا۔ اگر کسی کے شوہر کی موت اس طرح واقع ہو تو بیوی اسے پوری طرح سمجھ نہیں پاتی اور اسے یقین نہیں آتا کہ ایسا ممکن ہے لیکن وہ اس طرح ظاہر کر رہی تھی جیسے اسے اس کی توقع ہو۔“

”تمہیں کیا توقع تھی، اسے کیا کرنا چاہیے تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی ہوٹل کی لابی میں آتی اور بال کھول کر آنسو بہانا شروع کر دیتی؟“

”واقعی تم ایک باکمال مصنف ہو مسٹر کوننگ۔ مسٹر آرنلڈ نے مجھے بتایا کہ اس کا شوہر بیمار تھا اور بدھ کی شام اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی سنجیدہ نوعیت کی بیماری بھی ہو سکتی ہے لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق وہ بالکل صحت مند تھا۔ یہاں تک کہ اس نے شراب بھی نہیں پی رکھی تھی لیکن اس رپورٹ سے مزید کچھ معلوم نہ ہو سکا جب تک کہ میں نے مسٹر آرنلڈ کے ڈیجیٹل کیمرے میں وہ تصویر نہیں دیکھی۔“

”کون سی تصویر؟ اور وہ کیمرہ تم اپنے ساتھ کیوں لے گئے تھے؟“

”مسٹر آرنلڈ نے مجھے بتایا تھا کہ جس وقت اس کا شوہر ڈائننگ روم سے اپنے کمرے میں واپس آیا تو یہ کیمرہ اس کے پاس تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے فولڈر نکالا اور ایک تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ اس میں مسٹر آرنلڈ پیراڈیسو کے مرکزی ڈائننگ ہال میں ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے باپاں ہاتھ اپنی ٹھوڑی اور دایاں ہاتھ میز پر رکھا ہوا تھا اور کلائی میں ایک بھاری سونے کا بریسلٹ پہن رکھا تھا اور وہ بالکل ایسا ہی تھا جو مجھے مسٹر آرنلڈ کی لاش کے پاس سے ملا تھا۔

بیوی کا بازو پکڑ لیا اور اسی کشمکش میں وہ بریسلٹ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔“

میں وہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہ رہا تھا لیکن میری ٹانگیں پتھر کی ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”دوسرا سرا میرے ہاتھ اس وقت آیا جب میں نے یہ تصویر دیکھی۔ میرے اسٹنٹ نے مجھے بتایا کہ ڈائمنگ روم میں موجود تمام مہمانوں سے سوالات کرنے کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ مسز آرنلڈ پورے وقت ڈائمنگ روم میں موجود نہیں تھی۔ یہ جاننے کے بعد میں ایک اور نتیجہ پر پہنچ گیا۔“

”گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ اپنے شوہر کے پیچھے چلتی ہوئی کمرے تک گئی اور اسے بالکونی سے دھکا دے دیا۔ یہ انتہائی احمقانہ خیال ہے۔“

”اگر اسے احمقانہ سمجھتے ہو تو شاید تم نے اس کی مختلف منصوبہ بندی کی ہوگی۔“

”کیسی منصوبہ بندی۔ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”مسز آرنلڈ اپنے شوہر کو قتل کرنا چاہ رہی تھی لیکن اسے طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا چنانچہ اس نے تم سے رابطہ کیا کیونکہ تم ایک کامیاب جاسوسی مصنف ہو اور تمہارے ذہن میں اس طرح کے ہزاروں آئیڈیاز رہتے ہیں۔ یقیناً تم ایسا طریقہ جانتے تھے جو قابل یقین نظر آئے۔“

”تم یہ کہنا تو نہیں چاہ رہے کہ مسز آرنلڈ کی موت سے میرا کوئی تعلق ہے؟“

انسپکٹر نے ایک اور سگریٹ سلاگتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مسز آرنلڈ کو بتایا کہ یہ کام کس طرح کرنا چاہیے اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا کہ جائے وقوعہ سے غیر حاضری ظاہر کرنے کے لیے یہ قتل ڈنر کے دوران ہونا چاہیے جہاں بہت سارے گواہ موجود ہوں گے اور کسی کو بھی ٹھیک طریقے سے یہ یاد نہیں رہے گا کہ ڈنر کے دوران پورے وقت ڈائمنگ ہال میں کون موجود تھا اور کون نہیں۔ تم نے اسے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ مسز اینڈرسن سے ضرور بات کرے تاکہ وہ بوڑھی عورت بعد میں بھی اسے یاد کر سکے۔“

”تمہاری کہانی میں بہت جھول ہے اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ اس کا منصوبہ تھا تب بھی وہ کیسے یقین کر سکتی تھی کہ اس کا شوہر ڈنر کے دوران میں ضرور اٹھ کر اپنے کمرے میں جائے گا۔“

”ممکن ہے کہ اسی نے آرنلڈ کو یہ کہہ کر کمرے میں بھیجا ہو کہ وہ کوئی چیز بھول آئی ہے اور وہ جا کر اسے لے

کراچی

پاکینہ

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی دبیر کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں

آئے اور جب وہ گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔
تم البائوس میں انتظار کر رہے تھے اور یہ انتظار کُل ہونے
تک جاری رہا لیکن پھر تمہیں تجسّس ہوا یا تم نے محسوس کیا ہو
گا کہ مسز آرٹلڈ اس صورتِ حال سے نہیں نمٹ سکے گی اور
اسے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن تمہارے پہنچنے
سے پہلے آرٹلڈ مر چکا تھا۔ مسز آرٹلڈ نے تمہیں بتایا کہ
گرنے سے پہلے اس کا بریسلٹ شوہر کے ہاتھ میں آ گیا
تھا۔ تم نے اسے واپس ڈانٹنگ ہال میں جانے کا مشورہ
دیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی وہاں اس کی غیر موجودگی کا نوٹس
لے پھر تم لاش کے پاس گئے اور تمہیں وہ بریسلٹ مل گیا
جو تم نے اسی رات یا شاید بعد میں مسز آرٹلڈ کو دے دیا۔
میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام
اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس سے زیادہ
احتمالہ بات آج تک نہیں سنی۔“

”اس کا ایک چشم دید گواہ موجود ہے۔ ہوٹل کے ٹور
گائیڈ رولوفو نے تمہیں اس وقت دیکھا جب تم ایسولینس
کے لیے فون کرنے ہوٹل کے استقبالیہ کی طرف جا رہے
تھے۔“

”پھر تم نے جسے کی صبح پولیس اسٹیشن میں یہ بات
کیوں نہیں کہی؟“

”کیونکہ اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم نے لاش
کے پاس سے بریسلٹ اٹھایا۔ اس کا پتا آج چلا اور صبح ٹور
گائیڈ یہ بات بتانے میرے پاس آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ
یہ کوئی اہم بات نہیں ہے لیکن جب اسے اپنے کزن سے
معلوم ہوا کہ مقتول کے پاس ایک سونے کا بریسلٹ تھا تو
اس نے مجھے بتانا ضروری سمجھا۔ میں انتہائی تیز رفتاری سے
گاڑی چلاتا ہوا یہاں تک آیا لیکن پھر بھی قائل کو نہیں پکڑ سکا
البتہ شریک جرم ہاتھ آ گیا۔“

”اگر مجھ سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے تو صرف یہ کہ میں
نے انصاف کے راستے میں رکاوٹ ڈالی۔ واقعی مجھے وہ
بریسلٹ پولیس کو دینا چاہیے تھا لیکن میں نے سوچا کہ یہ مسٹر
آرٹلڈ کی ملکیت ہے اس لیے ان کی بیوی کو ہی دے دوں۔“
میں ان دونوں تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک میں
درمیانی عمر کی عورت سونے کا بریسلٹ پہنے ہوئے تھی اور
دوسری تصویر میں اس کے شوہر کا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے
بھی ویسا ہی بریسلٹ پہن رکھا تھا۔ میرا دل چاہا کہ
دباڑیں مار کر رونا شروع کر دوں۔ میں نے اپنی صفائی
پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ نہیں چاہتی تھی کہ پولیس اس

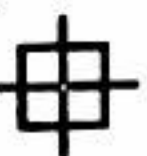
بریسلٹ کو ضبط کر لے چنانچہ میں نے وہ اسے واپس کر
دیا۔“ اس لمحے مجھے اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس
ہوئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بریسلٹ مسز آرٹلڈ کے لیے
پہننا بن جائے گا۔

انسپکٹر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اپنی جیب سے
تھکڑیوں کی جوڑی نکالتے ہوئے بولا۔ ”یہ ایک اور
بریسلٹ ہے اور میں چاہوں گا کہ تم اس کے بارے میں
بھی غور کرو مسٹر کوننگ۔“

اس نے تھکڑی کے دونوں حصے میرے سامنے
لہراتے ہوئے کہا۔ ”گوکہ یہ سونے کی نہیں ہے لیکن
بریسلٹ جیسی ہی ہے۔ کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمہیں فراموشی
نیشنل مینوٹ آرٹلڈ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔“
”تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ میں مسٹر آرٹلڈ کو
کیوں قتل کروں گا۔ مسز آرٹلڈ کے لیے۔ تم نے دیکھا ہے کہ
وہ ایک بوڑھی اور بیمار عورت ہے اور نہ ہی پیسوں کی خاطر
ایسا کر سکتا ہوں۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔“

”ہمارے پاس اصل وجہ جاننے کے لیے بہت وقت
ہو گا۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”کھڑے ہو جاؤ۔ میں دوبارہ نہیں
کہوں گا۔“

میرے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ
نہیں تھا۔ شارلین میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے انسپکٹر
سے کہا کہ وہ اس کے سامنے مجھے تھکڑی نہ لگائے۔ وہ بے
رنخی سے بولا۔ ”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے
میرے ہاتھوں میں تھکڑی پہنا دی اور مجھے لے کر اتر پورٹ
کی عمارت سے باہر نکل گیا۔ یہ سچ ہے کہ میرے پاس
دولت کی کمی نہیں لیکن پیسے کی ہوس نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔
مسز آرٹلڈ اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔
کیونکہ اس کے مرنے کی صورت میں وہ اس کی ڈھیروں
دولت اور جائیداد کی بلا شرکتِ غیرے مالک بن جاتی، اس
کے علاوہ انشورنس کی مد میں بھی اسے لاکھوں ڈالر ملتے۔ اس
نے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ شوہر کو قتل کرنے کا محفوظ ترین
طریقہ جاننا چاہ رہی تھی۔ میں نے ہی اسے یہ راستہ بتایا۔
مسز آرٹلڈ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اس خدمت کے عوض
ایک لاکھ ڈالر دے گی لیکن وہ مجھے بتائے بغیر چپکے سے کل
گئی اور مجھے پولیس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ
ہی مجھے شارلین کی دوستی سے بھی محروم ہونا پڑا۔ اسے کہتے
ہیں... نہ خدا ہی ملانہ وصالِ صنم...



جوکر

میرا اقبال

کمپنی کو شک تھا کہ سالانہ رپورٹ میں کوئی گزبڑ ہے... گوشواروں میں بھی نمایاں فرق نظر آرہا تھا... کمپنی نے اپنے ایک خاص ملازم کو تمام حساب کتاب چیک کرنے کے لیے روانہ کیا... اور پھر اس کے قتل کی خبر نے سب کو ششدر کر دیا...

غیر معمولی ذہن، حافظے کے مالک شخص کا طریقہ تحقیق...



وہ واقعی ایک منحوس دن تھا جب اُسے اچانک ہی ہوشن جانے کا حکم ملا۔ اسے لون اسٹار کے ایک زیر التوا معاہدے میں غیر متوقع طور پر ہونے والی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ مارتھا کی مہربانی سے فوری طور پر پہلی پرواز اور ہوٹل میں بکنگ کا انتظام ہو گیا۔ اس نے گھر آ کر جلدی جلدی اپنا ہینڈ کیوری بیگ تیار کیا اور بیوی سے الوداعی ملاقات کر کے ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اور نصف شب کے قریب ہوشن پہنچ گیا۔ اس وقت وہاں کوئی

جو کہ

فون کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے نام سے کمرار یزروتھا لیکن وہ یہاں نہیں پہنچا جبکہ دو بلاک کے فاصلے پر اس کی لاش سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس پورے معاملے میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے لیکن دونوں شہروں کی پولیس نے اُسے..... اس کی آواز ٹوٹنے لگی۔

”عام رہزنی کا کیس قرار دے دیا۔“ میں نے اس کی طرف سے جملہ مکمل کیا۔

”لیفٹیننٹ فلیس کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں شاید تم کچھ مدد کر سکو۔“

”مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی مسز مورسین۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں تمہارے پاس آجاتی ہوں۔ اپنا پتا سمجھا دو۔“

میں منٹ بعد ایک نیلے رنگ کی ٹیکس کار میرے ڈرائیوے میں آکر رکی۔ جون مورسین درمیانے قد کی عورت تھی۔ اس نے نیوی کالر کا پینٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں اسے اپنے دفتر میں لے گیا اور کافی کی پیشکش کی۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور بولا۔

”مجھے کچھ معلومات درکار ہوں گی، مسز مورسین۔ تمہارا شوہر بولٹ مین میں کیا کام کرتا تھا اور کس پوزیشن پر تھا؟“

”وہ ان کے فنانشل ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا تھا۔ اس کا کام مالی امور کی نگرانی کرنا تھا۔“

”اور اسے انہوں نے ہوشن بھیج دیا؟“

”ہاں، بالکل اچانک۔ وہ بمشکل تمام اپنا وینڈ کیری بیک کر سکا۔“

”کیا اس نے تمہیں اس عجلت کی وجہ بتائی تھی؟“

”وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے بس یہ بتایا کہ کمپنی کے سب سے بڑے شاپنگ مال کے کرائے داروں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ہوٹل پہنچتے ہی وہ مجھے فون کرے گا۔“

میں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کلپ بورڈ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اسٹار اسٹیٹ آرمر۔ تم نے ہوٹل کا یہی نام بتایا تھا۔“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس نے مجھے کوئی فون نہیں کیا۔ البتہ صبح چار بجے ہوشن پولیس کی کال ضرور موصول ہوئی تھی۔“ اس نے لمحہ بھر رکنے کے بعد کہا۔ ”انہوں نے مجھے بتایا کہ پال کو ہوٹل سے دو بلاک

درد میں کمی واقع ہوئی اور پھر بالکل ختم ہو گیا۔ وہ مر چکا تھا۔

☆☆☆

”کیا میں پرائیویٹ سراغ رساں ایل روڈ منٹگری سے مخاطب ہوں۔“ کوئی عورت پریشانی کے عالم میں بول رہی تھی۔

”جی ہاں، میں روڈ منٹگری ہی بول رہا ہوں۔“

”میں جون مورسین ہوں۔ فلاڈلفیا پولیس کے لیفٹیننٹ فلیس نے تمہیں فون کرنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ میں تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بات کر سکوں۔“

”تمہارا شوہر، کیا ہوا اُسے؟“

”پال مورسین، وہ مر گیا ہے مسٹر منٹگری۔“

”اُدھ، یہ سن کر افسوس ہوا مسز مورسین۔“ میں نے رسماً تعزیت کرتے ہوئے کہا۔

”اُسے ہوشن میں قتل کر دیا گیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ رہزنی کی واردات تھی۔“

”وہ ہوشن کیوں گیا تھا؟“

”وہ فلاڈلفیا کی کمپنی بولٹ مین ڈیولپمنٹ میں کام کرتا تھا۔ انہوں نے ہی اسے کسی کام سے ہوشن بھیجا جہاں وہ ایک سڑک پر مردہ پایا گیا۔ اس کی موت چاقو کے وار سے ہوئی۔“

اب میری پوری توجہ اس جانب ہو چکی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کب کی بات ہے؟“

”تین ہفتے ہو گئے۔ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ پولیس مجھے کچھ بتائے۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں کہ کوئی اس معاملے میں کچھ کرے۔“

”میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ.....“

”میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ یہی کہ یہ بھی بد قسمتی سے ایک عام اسٹریٹ کرائم ہے لیکن میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں مسٹر منٹگری۔ وہ ایسا شخص نہیں ہے کہ رات کے ایک بجے سڑکوں پر آوارہ گردی کرے۔“

میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا وہ.....؟“

اس نے پھر میری بات کاٹ دی۔ ”پولیس نے بھی پہلی بات یہی پوچھی تھی لیکن وہ شرابی نہیں تھا۔ ایک بات اور مسٹر منٹگری۔ از پورٹ جانے سے پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسٹار اسٹیٹ آرمر ہوٹل میں قیام کرے گا جب ہوشن پولیس نے فون پر مجھے یہ افسوسناک خبر سنا لی تو میں نے ہوٹل

کے فاصلے پر چاقو کے وار سے ہلاک کر دیا گیا ہے۔“
”کچھ یاد ہے کہ بات کرنے والا کون تھا؟“
”سارجنٹ پورٹر۔“

میں نے یہ نام بھی اپنے کلب بورڈ پر لکھ لیا اور بولا۔
”کیا سارجنٹ پورٹر نے ہوٹل کا ریکارڈ چیک کرنے کے بارے میں کوئی بات کی تھی؟“

”اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ پال ہوٹل نہیں پہنچا۔ میں نے بھی اپنے طور پر معلوم کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اگرچہ پال کی ریزرویشن تھی لیکن وہ ہوٹل نہیں آیا۔“

”ہوں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا شوہر بہت عجلت میں ہوسٹن گیا لیکن ہوٹل نہیں پہنچا بلکہ اس کی لاش دو بلاک کے فاصلے پر ملی۔ یہ عقل میں آنے والی بات نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہاں کی پولیس پہلے ہی اسے ایک اسٹریٹ کرائم سمجھ کر کیس بند کر چکی ہوگی۔“

”اسی لیے مجھے امید ہے مسٹر ٹھکری کہ تم یہ جاننے کی کوشش کرو گے کہ درحقیقت کیا ہوا تھا؟“

”میں وعدہ نہیں کر سکتا مسز مورسین لیکن جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے۔ اس سے میں موجودہ معلومات سے بہت زیادہ جاننے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”یہ بھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کافی ہو گا مسٹر ٹھکری۔“

”براہ کرم مجھے روڈ کہہ کر مخاطب کرو۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے اپنی فیس اور ایڈوائس کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

اس نے باہر کی طرف جھانکا پھر سیزیمیوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ابھی تک گھر میں کوئی آواز نہیں سنی۔ کیا تم تنہا رہتے ہو؟“

”میری بیوی نے طلاق لے لی تھی۔“

جون مورسین نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے اپنا پرس کھولا اور چیک بک نکالتے ہوئے بولی۔ ”تم نے پانچ سوڈا الرایڈوائس میں کہے تھے۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے چیک پکڑا دیا اور گاڑی میں بیٹھ کر شیشہ نیچے کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے ایک بات پولیس کو نہیں بتائی جو مجھے اس لیے غیر ضروری لگی کہ پولیس اسے رہزنی کی واردات سمجھ رہی ہے۔“

”تم مجھے بتا سکتی ہو۔“

”پال اپنے دفتر میں ہونے والی کسی بات سے

پریشان تھا گوکہ اس نے یہ بات مجھے کبھی نہیں بتائی لیکن میں اندازہ لگا سکتی ہوں۔“

”دفتر میں ہونے والی کوئی بات؟ وہ کیا ہو سکتی ہے؟“
”یہی تو میں بھی جاننا چاہ رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کا شیشہ اوپر کیا اور گاڑی چلا دی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سارجنٹ پورٹر کا نمبر ملایا اور اپنا تعارف کروانے کے بعد بتایا کہ میں پال مورسین کی موت کی تحقیقات کر رہا ہوں۔

”میں تمہاری کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔ وہ سڑک پر مردہ حالت میں پایا گیا۔ یہ سراغ بھی نہیں مل سکا کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا۔“

”اس کی بیوی نے مجھے بتایا ہے کہ کمپنی نے اسے شارٹ نوٹس پر ہوسٹن بھیجا تھا اور وہاں اشار اسٹیٹ آرمرز میں اس کے لیے کمرابک تھا۔ یہ ہوٹل اس جگہ سے دو بلاک کے فاصلے پر ہے جہاں سے اس کی لاش ملی۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ اس جگہ کیسے پہنچا؟“

”ہم نے سب سے پہلے تو یہ چیک کیا کہ وہ کون تھا۔ اس کا والٹ تو چھینا جا چکا تھا لیکن اس کی جیب میں واپسی کا ٹکٹ موجود تھا پھر اس کے ہینڈ کیری پر لگے ہوئے ٹیگ سے بھی اس کا نام اور بزنس ایڈریس معلوم ہو گیا۔ صلی الصباح فلاڈلفیا فون کرنے سے یہ تصدیق ہو گئی کہ وہ مورسین تھا۔

ہم نے وہاں موجود دونوں ہوٹلوں کا ریکارڈ چیک کیا اور یہ تصدیق ہو گئی کہ اس کے لیے اشار اسٹیٹ آرمرز میں کمراریزرو تھا لیکن وہ وہاں نہیں پہنچا۔“

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر پیدل کیوں گیا۔ صرف ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے کسی بد مزاج ٹیکسی ڈرائیور سے بحث کی ہو اور اس نے اسے وہاں اتار دیا ہو۔ یہ ایک مفروضہ بھی ہو سکتا ہے لیکن فی الحال یہی بات ذہن میں آرہی ہے۔“

”ان دنوں یہاں رات میں ٹیکسی سروس بند ہے۔ رات بارہ بجے سے صبح چھ بجے تک ٹیکسی نہیں چلتی اس لیے یہ مفروضہ بھی غلط ہے۔ اس کے وہاں جانے کی کوئی اور وجہ ہو گی۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی تو تمہیں بتا دوں گا اور تم بھی ایسا ہی کرنا۔“

میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اب تک کی معلومات کے مطابق مورسین ہوٹل نہیں پہنچا لیکن اس کی لاش وہاں سے صرف دو بلاک کے فاصلے پر ملی۔ اس کے بارے میں

کام کی باتیں

☆ سنے اتنے نہ دیکھو کہ اگر ان کی تعبیر ملے تو جیون کم پڑ جائے۔

☆ خواہشوں کے سمندر میں خوابوں کے جزیرے ساحل سے دور لے جاسکتے ہیں۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو غریبوں کی مدد کے لیے کی جائے۔

☆ علم کی محبت اور استاد کی عزت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

☆ کسی دوست کو بار بار آزمائش میں مت ڈالو۔ ہو سکتا ہے، وہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کی آزمائش پر پورا نہ اتر سکے اور آپ ایک اچھے دوست سے محروم ہو جائیں۔

☆ خوش اخلاقی سے کچھ خرچ نہیں ہوتا بلکہ یہ آپ کا وقار بڑھاتی ہے۔

☆ دشمن کے حسن سلوک پر مت اعتماد کرو کیونکہ پانی کو جتنا ابال دیا جائے، وہ آگ بجھا دیتا ہے۔

☆ بوڑھے کا مشورہ جوان کی قوت بازو سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

گدھا

ایک صاحب گھبرائے ہوئے گھر آئے اور بیوی سے بولے۔ ”بیگم میں دفتر سے گھر آ رہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا...“

اتنے میں ان کی ایک بچی بول اٹھی۔ ”امی شمینہ نے میری گڑیا توڑ دی ہے۔“

”اچھا بیٹی ہم تمہیں دوسری لے دیں گے۔“ شوہر نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”ہاں بیگم میں کہہ رہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا...“

اتنے میں لڑکا بول اٹھا۔ ”امی، امی مجھے گڈو نے مارا ہے۔“

بیوی چلا کر بولی۔ ”بھئی خدا کے لیے چپ ہو جاؤ، مجھے گدھے کی بات سننے دو۔“

یہ فرض کر لیا گیا کہ کسی نے راہ چلتے ہوئے اسے چاقو کے وار سے ہلاک کر دیا کیونکہ نصف شب کے بعد شہر میں ٹیکسی نہیں چلتی۔ دو دن گزر چکے تھے اور اس دوران صرف اتنی پیش رفت ہوئی کہ میں نے ہوسٹل میں سارجنٹ پورٹر سے ٹیلی فون پر بات کر لی۔ ابھی میں نے صبح کی کافی ختم کی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس مرتبہ پورٹر نے مجھے فون کیا تھا۔

”گزشتہ روز تمہیں یہ بات نہیں بتا سکا کیونکہ مجھے خود بعد میں معلوم ہو۔ مورسین کے مرنے کے ایک دن بعد اتر پورٹ کے صفائی والے عملے کو اس کا والٹ کچرے کے ڈرم سے مل گیا تھا۔ اس پر مورسین کے علاوہ کسی اور کی انگلیوں کے نشانات بھی ہیں۔“

”اس کی بیوی کے؟“

”نہیں، ہم نے کمپیوٹر کی مدد سے معلوم کر لیا ہے۔ یہ نشانات کارل مارٹن کی انگلیوں کے ہیں۔ ہم اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسے ہی کچھ معلوم ہوا، تمہیں بتا دیا جائے گا۔“

”اس تازہ ترین معلومات کے لیے شکریہ لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم نے اس معاملے میں اتنی مستعدی کیوں دکھائی؟“

”اسے ایک فیور سمجھ لو۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم مجھے اس معاملے سے دور رکھنا چاہ رہے ہو کہ کہیں میں اپنے طور پر اس شخص سے کچھ اگلوانے کی کوشش نہ کروں۔“

”یوں ہی سمجھ لو۔ ہم نے اس شخص مارٹن کو در یافت کیا ہے۔ تمہیں اس معاملے میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود ہی اس سے حقیقت معلوم کر لیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں اچھی خبر سناؤں گا۔“

سہ پہر تین بجے سارجنٹ پورٹر نے دوبارہ فون کیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز میں جوش نمایاں تھا، ہم نے اسے پکڑ لیا۔ وہ بالٹی مور میں اپنی بہن کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے فرضی نام سے سفر کیا اور یہ بھول بیٹھا کہ مین شادیاں کرنے کے بعد بھی وہ اپنے اصلی نام سے چھٹکارا حاصل کر سکے گا۔ کمپیوٹر نے ایک بار پھر اسے پکڑ لیا۔ وہ بالٹی مور کا رہنے والا نہیں ہے۔ اس کا آخری پتہ نیوجرسی کا ہے۔ وہ لحوہ بھر کے لیے رکا پھر کہنے لگا۔ ”اب تم جو کچھ بھی کرو گے وہ محض ریکی خانہ چوری ہوگی۔ سوری، ہمیں افسوس ہے کہ تمہاری آمدنی ماری گئی۔“

پورٹر کا خیال بظاہر درست تھا۔ میں نے ایک ایسے

کیس میں ہاتھ ڈالا تھا جس میں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے نقشہ نہیں دیکھا۔ نیوجرسی کا علاقہ کیمڈین، فلاڈلفیا سے گزرنے والے دریا کی دوسری طرف تھا۔ اس کے علاوہ پورٹر نے اس بارے میں بھی ایک لفظ نہیں کہا کہ پال مورین ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر کیا کر رہا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی روٹ نمبر چھ سو گیارہ پر واقع ایک بڑی عمارت کے پارکنگ ایریا میں اس طرح کھڑی کی کہ عمارت کے داخلی دروازے تک بہ آسانی پیدل جا سکوں۔ گراؤنڈ فلور پر دکانیں، ریسٹوران اور ایک چھوٹا سا پارک تھا جبکہ بالائی منزل پر بولٹ مین ڈیولپمنٹ ہیڈ کوارٹر کے دفاتر تھے۔ اوپر جانے کے لیے دو سیڑھیاں تھیں، داہنی ہاتھ والی ملازمین کے لیے مخصوص تھی جبکہ بائیں جانب والی پر کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں اسی راستے سے اوپر چلا گیا۔ استقبال پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں؟“

”میں تمہارے مالیاتی شعبے کے سربراہ سے بات کرنا

چاہتا ہوں۔“

”وہ کمپنی کے نائب صدر وینوپین ہیں، کیا تم نے

ملاقات کا وقت لے رکھا ہے؟“

”مسٹر وینوپین کو بتا دو کہ سراغ رساں منگمری،

مورین کے کیس کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہے۔“

اس نے فون اٹھا کر وینوپین کو میری آمد کی اطلاع

دی اور فون رکھتے ہوئے بولی۔ ”بائیں جانب چوٹھا کمرہ

ہے۔“

”بہت بہت شکریہ مائی ڈیر۔“

اس بار اس نے غور سے مجھے دیکھا اور مسکرا دی۔ میں

بائیں جانب بنے ہوئے کمروں کی طرف چل دیا۔ چوتھے

دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا ہوا تھا۔ ”والٹر

وینوپین۔ چیف فنانشل آفیسر۔“

میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر چلا

گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کیمین تھا۔ وہاں ایک چالیس سالہ

عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کمپیوٹر سے نظریں ہٹاتے

ہوئے کہا۔ ”سراغ رساں منگمری۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ اندرونی دروازے

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اندر چلے جاؤ۔“

ایک بڑی سی میز کے پیچھے وینوپین بیٹھا ہوا تھا۔ اس

نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارا تعلق فلاڈلفیا پولیس سے

ہے؟“

”نہیں، میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور میری

خدمات مسز مورین نے حاصل کی ہیں۔“

”جون نے پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات

کیوں حاصل کیں؟“

”اسے حیرانی اس بات پر ہے کہ جب پال کی ہوٹل

میں ریزرویشن تھی تو وہ ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر اس

جگہ کیا کر رہا تھا جہاں سے اس کی لاش ملی اور یہی بات

میرے لیے بھی باعث حیرت ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ

باتیں ہیں۔“

”مثلاً؟“

وینوپین مجھ سے ملنے کے لیے جگہ پر کھڑا نہیں ہوا، نہ

ہی اس نے مجھے کرسی پیش کی۔ بہر حال میں خود ہی ایک کرسی

پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”مثلاً یہ کہ پال نے اشار اسٹیٹ آرمر

میں ریزرویشن کروائی تھی۔ وہ وہاں نہیں پہنچا لیکن وہاں

سے چند فٹ کے فاصلے پر اس کی لاش ضرور مل گئی۔“

”ہم سب ہی اس پر حیران ہیں۔“ وہ مونچھوں پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں چیف فنانشل آفیسر ہوں۔ سراغ رساں

نہیں۔“

”یہاں مورین کی کیا فہرست داریاں تھیں؟“ میں

نے پوچھا۔

”کمپنی کی تمام مالی سرگرمیوں کو کمپیوٹر ائز کرتا۔“

”پبلک ریلیشننگ نہیں؟“ میں نے ایک چبھتا ہوا

سوال کیا۔

”یقیناً نہیں لیکن تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟“

”اس نے اپنی بیوی کو بتایا تھا کہ اسے ہوسٹن بھیجا

جا رہا ہے تاکہ وہ تمہارے ایک کرائے دار کے ساتھ ہونے

والا مسئلہ حل کرے۔“

”وہ مالی مسئلہ تھا اور مورین کا شمار ہمارے مالیاتی

ماہرین میں ہوتا تھا۔“

”تمہارے ڈپارٹمنٹ میں اور کتنے لوگ ہیں؟“

”صرف دو۔ چارلی ڈیون پورٹ تمام بلوں اور

ادائیگیوں کو دیکھتا ہے جبکہ مارٹن فرینکلن ریکارڈ کیپنگ

کرتی ہے۔ پال ہمارا کمپیوٹر ایکسپرٹ تھا۔“

”یقیناً یہ کسی راہزن نے اس کا والٹ چھیننے کے لیے کیا ہوگا۔“ وہ طنز آمیز لہجے میں بولا۔ ”یہ اندازہ تو تم میری مدد کے بغیر بھی لگا سکتے تھے۔“

میں نے دیکھا کہ مارتھا کی نظریں چھت کی جانب اٹھ گئی تھیں پھر چارلی سے کہا۔ ”تم کچھ زیادہ پریشان نظر نہیں آرہے؟“

”ہم سب پریشان ہیں۔ کچھ لوگ اس پر اچھے طریقے سے قابو پا لیتے ہیں جو کچھ ہوا، وہ بہت شرمناک ہے لیکن کوئی بھی اس بارے میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔“

”یہ درست نہیں ہے چارلی۔ ہوسٹن پولیس نے قاتل کو گرفتار کر لیا ہے۔“

”تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”اس کا نام مارٹن ہے اور پولیس کو پال کے والٹ پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔“

”تم مذاق کر رہے ہو؟“ اس نے دوبارہ کہا۔

”اے بالٹی مور سے پکڑا گیا ہے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”وہ وہاں قتل کرنے کے بعد چھپا ہوا تھا لیکن اس کا تعلق کیڈزین سے ہے۔“

”اس کے علاوہ تمہیں کچھ معلوم ہوا؟“

”میں نہیں جانتا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے۔“ اس مسخرے سے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ لہذا میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس کچھ معلومات ہیں تو مجھے فون کر دینا۔“ میں نے اس کی میز پر اپنا کارڈ رکھا اور مارتھا کے پاس آ گیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانے میں پہل کی۔

”مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم مسز مورسین کی مدد کر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے کاغذ کا ایک پرزہ میری منگی میں دبا دیا۔

میں نے اپنی کار میں بیٹھ کر وہ رقعہ پڑھا۔ ”یہاں سے آدھے میل کے فاصلے پر گرینز گرل ہے۔ میں وہاں بیس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔“

میں دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا اور ایک الگ تھلک کونے میں ایسی میز منتخب کی جہاں کوئی نہ دیکھ سکے۔

میں نے کافی منگوائی اور دروازے پر نظریں جما دیں۔ تقریباً نو منٹ بعد وہ آگئی۔ اس نے ہال کا جائزہ لیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی تیزی سے میری طرف آئی۔

”میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔“ اس نے کہا پھر ویر

”کیا تم نے کارل مارٹن کا نام سنا ہے؟“

اس کی بھویں تن گئیں اور وہ ناگواری سے بولا۔ ”یہ کون ہے؟“

”یہ وہی شخص ہے جس نے پال مورسین کو قتل کیا ہے۔“

”میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا۔ تم نے کہاں سے سن لیا؟“

”ہوسٹن پولیس سے۔ مارٹن کو گزشتہ روز بالٹی مور سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”پھر تو یہ کیس ختم ہو گیا۔“ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ابھی کچھ باتوں کا جواب ملنا باقی ہے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔“

”اس کی گرفتاری کے بعد وہ سب دور ہو گئیں۔“

اس نے جس لہجے میں یہ بات کہی، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجھے جو کچھ وینوین سے معلوم کرنا تھا، وہ میں نے معلوم کر لیا۔ میں کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”تمہارے وقت کا بہت شکریہ۔ اگر تم کوئی اور بات بتانا چاہو جو اس کیس میں مددگار ثابت ہو تو مجھے فون کر دینا۔“

یہ کہہ کر میں نے اس کی میز پر اپنا کارڈ پھینکا اور کمرے سے باہر آ گیا لیکن عمارت سے باہر جانے کے بجائے اس کمرے میں چلا گیا جہاں فنانس ڈیپارٹمنٹ کا عملہ بیٹھا کرتا تھا۔ وہاں صرف تین میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک خالی میز کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ پال مورسین کی ہوگی۔ دروازے کے ساتھ والی میز پر ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی جس کی عمر بیس پچیس کے قریب ہوگی۔ اس نے اپنے بال پونی کی شکل میں باندھ رکھے تھے اور آنکھوں پر نازک سا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس نے کوئی زیور نہیں پہنا ہوا تھا البتہ اس کے بلاؤز کے کالر میں ایک سرخ پن لگی ہوئی تھی۔

”مارتھا فرینکلن۔“ میں نے اس کی میز پر رکھی ہوئی نیم پلیٹ پڑھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔“ دوسری میز پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ ”میرا نام چارلی ڈیون پورٹ ہے میں پولیس سراغ رساں کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ ہمیں تمہاری آمد کی اطلاع پہلے ہی مل گئی تھی۔“

”میرا تعلق پولیس سے نہیں بلکہ میں پرائیویٹ سراغ رساں روڈ منٹگری ہوں اور جون مورسین کے لیے کام کر رہا ہوں۔“ میں نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کوئی شخص پال مورسین کو قتل کرنا چاہتا ہوگا؟“

سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”سینڈوچ اور چائے۔“
 ویٹر کے جانے کے بعد میں نے مارتھا سے کہا۔ ”غالباً تم مجھے
 کوئی خاص بات بتانا چاہ رہی ہو؟“
 ”کچھ ایسا ہی ہے۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی پھر آگے
 کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”گزشتہ دو ہفتوں سے پال کسی
 بارے میں پریشان نظر آ رہا تھا۔“
 ”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کیا بات ہو سکتی ہے؟“
 ویٹر چائے اور کافی لے کر آ گیا۔ اس کے جانے کے
 بعد میں نے کہا۔ ”تمہارا خیال ہے کہ پال کسی وجہ سے
 پریشان تھا۔ کوئی ایسی بات جو اسے معلوم ہوگئی تھی یا خود اس
 سے کوئی حرکت سرزد ہوگئی تھی؟“
 ”میں کیسے بتا سکتی ہوں؟“
 ”وہ پشیمان لگ رہا تھا یا ناراض؟“ میں نے کہا۔
 اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”کاش میں
 زیادہ توجہ دے سکتی۔ فی الحال صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ وہ
 پریشان لگ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس سے تمہیں
 کوئی مدد مل سکے۔“
 ”اپنے آپ کو کم مت سمجھو مارتھا۔ جو کچھ ہمیں معلوم
 ہے۔ پہلے اس پر بات کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ کیا پال نے
 اسٹار اسٹیٹ آرمرز میں کراہک کروایا تھا؟“
 ”ہاں، میں نے ہی فون پر اس کی ریزرویشن
 کروائی تھی۔“
 ”کیا تم جانتی ہو کہ ہوشن براؤنچ کو کیا مالی مسئلہ
 درپیش تھا؟“
 ”چارلی نے اس سلسلے میں مسٹر وینوچین کو کچھ بتایا تھا
 پھر انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ پال کے لیے ہوائی جہاز
 کے ٹکٹ اور ہوٹل میں ریزرویشن کا انتظام کروں۔“
 ”لیکن پال ہوٹل نہیں پہنچا۔“
 ”ہاں، پولیس نے مسٹر وینوچین کو یہی بتایا تھا پھر میں
 نے بھی اپنے طور پر ہوٹل والوں سے پوچھا۔“
 ”تمہاری وہاں کس سے بات ہوئی تھی؟“
 ”اس کا نام ایرون ہے۔ ایرون ہولٹ۔ وہ
 رجسٹریشن ڈیسک پر نائٹ منجر ہے۔ اس نے تصدیق کی کہ
 پال ہوٹل نہیں پہنچا تھا۔“ پھر وہ اپنی رسٹ وائچ دیکھتے
 ہوئے بولی۔ ”اب مجھ چلنا چاہیے۔ میں جو کچھ جانتی تھی وہ
 میں نے بتا دیا جو کافی نہیں ہے۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ
 پال بھی کسی اجنبی سڑک پر آوارہ گردی نہیں کر سکتا۔ وہ بہت
 نفیس اور نظم و ضبط میں رہنے والا شخص تھا۔“ یہ کہتے ہوئے

اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے پال کی ادائیگی کے لیے اپنا
 پرس کھولا۔
 ”رہنے دو۔ یہ میری طرف سے ہے۔“ میں نے
 کہا۔ ”چلو، میں تمہیں کارٹک چھوڑ دوں۔“
 ”نہیں، کوئی شخص ہمیں ایک ساتھ دیکھ سکتا ہے۔“
 ”تم اس حد تک پریشان ہو؟“ میں نے حیران
 ہوتے ہوئے کہا۔
 ”مجبوری ہے۔ ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔“
 میں اسے دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا
 رہا۔ اس کی چال میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔ میں نے ویٹر کو بلا
 کر بل کے لیے کہا۔ اس وقت تک میں اپنا ذہن تیار کر چکا
 تھا۔ یہاں بیٹھ کر کچھ نہیں ہو سکتا۔ مورسین کو ہوشن بھیجا گیا
 تھا اور وہیں اس کا قتل ہوا۔ اگر جون اخراجات برداشت
 کرے تو مجھے خود ہوشن جانا ہوگا۔
 میں نے بھی فون کر کے اسٹار اسٹیٹ آرمرز میں
 ریزرویشن کروائی اور اسی پر دروازہ کا انتخاب کیا جس سے
 مورسین گیا تھا۔ دوران سفر میں نے ایک بار پھر تمام
 واقعات کا جائزہ لیا۔ ہوشن کی پولیس نے مارٹن کو گرفتار کر
 کے اسے اسٹریٹ کرائم کا کیس بنا دیا تھا اور مورسین کی سڑک
 پر موجودگی کو سرے سے نظر انداز کر دیا جبکہ میرے لیے یہ
 جاننا بہت ضروری تھا کہ مورسین رات کے ایک بجے اس
 سڑک پر پیدل کیوں گیا تھا؟
 جہاز نے نصف شب سے قبل ہوشن کے ہوائی
 اڈے پر لینڈ کیا۔ میرے پاس صرف ایک ہینڈ کیڑی تھا۔
 اس لیے مجھے سامان کے انتظار میں وقت ضائع کرنے کی
 ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود جب میں ٹرمینل کی
 عمارت سے باہر آیا تو بارہ بج چکے تھے اور وہاں کوئی ٹیکسی
 نظر نہیں آرہی تھی۔ میں انٹرپورٹ کی شٹل بس میں سوار ہو گیا
 جس میں میرے علاوہ تین مسافر اور تھے جو انٹرپورٹ کے
 نزدیک ہی حیات ایجنسی پر اتر گئے۔ ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر
 مجھے دیکھا اور بولا۔ ”تمہیں اسٹار آرمرز جانا ہے؟“
 ”تم وہاں جا چکے ہو؟“
 ”ہاں، دو ہفتے پہلے میں نے ایک مسافر کو وہاں اتارا
 تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسے کسی نے قتل کر دیا۔“
 ”اوہ میرے خدا، کیسا عجیب اتفاق ہے۔ میں نے
 آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اسے ہوٹل کے
 دروازے پر ہی اتارا تھا؟“
 ”ظاہر ہے اور کہاں اتارتا۔“

جو کہ

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ ایک حادثہ تھا۔ ہم سب کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔“
 میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔
 ”میں نے سنا ہے کہ اس نے بھی یہاں کمرابک کر دیا تھا؟“
 ”یہ صحیح ہے لیکن وہ یہاں نہیں پہنچا۔“

میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مجھے کچھ نظر آ گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ”جس شٹل سے میں آیا ہوں۔ اس کے ڈرائیور کا کہنا ہے کہ اس نے پال مورسین کو بھی ہوٹل کے دروازے پر اتارا تھا۔ تمہارا خیال ہے کہ وہ بس سے اتر کر سڑک رچل رہا ہوگا۔“

”جو واقعہ پیش آیا“ اس سے تو یہی لگتا ہے۔“ اس کی پتلیاں ایک بار پھر سکڑ گئیں اور اس نے اپنے ہاتھ کاؤنٹر کے پیچھے چھپا لیے۔ یہ جھوٹ بولنے کی ایک اور نشانی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا ایرون کہ پال کورات کے وقت سڑک پر پیدل چلنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اس کے پاس اس ہوٹل میں رات گزارنے کے لیے ایک محفوظ جگہ تھی اور اس نے یہاں کمرابھی بک کر دیا رکھا تھا۔“

اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں سر ہلا دیا۔ اب اس کی آنکھیں میرے بجائے کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔ یہ جھوٹ بولنے کی تیسری نشانی تھی لیکن میں نے اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا اور دوستانہ لہجے میں گفتگو کرتا رہا۔

”مجھے یقین ہے کہ سڑک پر جو واقعہ پیش آیا، اس سے تمہیں گہرا صدمہ پہنچا ہوگا اور تم بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہو گے کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا۔ اگر تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو تو ضرور بتاؤ ورنہ تمہارے دل پر ہمیشہ ایک بوجھ رہے گا۔“

وہ اپنی جگہ سے لڑکھڑایا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے کاؤنٹر پکڑ لیا پھر مایوسی سے کندھے اچکا کر بولا۔

”ہم اسے مذاق سمجھ رہے تھے۔“

”کیسا مذاق؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے اپنی ہتھیلیاں کاؤنٹر پر رکھیں اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے مورسین کے پرانے دوستوں میں سے ایک کی کال موصول ہوئی۔ شاید مورسین نے کالج کے دنوں میں اس کے ساتھ کوئی حرکت کی ہوگی۔ اسی لیے اس کے لہجے سے بغض جھلک رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مورسین سے ایک پرانا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ہوشن میں رات بارہ بجے کے بعد ٹیکسی

”تم نے اسے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”نہیں، وہ میرا آخری اسٹاپ تھا اور میں گھر جانا چاہ رہا تھا لیکن وہ اس کے علاوہ کہاں جاسکتا تھا؟“
 ”اچھا سوال ہے۔“ میں نے سوچا اور اب اسی نکتے پر مجھے آگے بڑھنا تھا۔

دس منٹ بعد ہم اشار اسٹیٹ آرمرز پہنچ چکے تھے۔ میں نے بس ڈرائیور کو دس ڈالر بطور ٹپ دیے اور بس سے اتر گیا۔ استقبال پر بیٹھا ہوا شخص نیوی بلیو جیکٹ پہنے ہوئے تھا جس کی جیب پر ہوٹل کا لوگو لگا ہوا تھا۔ اس نے سفید رنگ کی قمیص اور نیوی بلیو رنگ کی ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے اور وہ کلین شیو تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”گڈ ایوننگ سر۔“

”روڈ منٹری۔“ میں نے کاؤنٹر پر رکھی اس کے نام کی تختی پڑھی اور کہا۔ ”مسٹر ایرون ہولٹ“ میری یہاں ریزرویشن ہے۔“

اس نے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، تمہارے لیے ایک بہت عمدہ کمرہ مخصوص ہے جہاں سے تم پورے شہر کا نظارہ کر سکتے ہو۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں نے بہت شارٹ نوٹس پر ریزرویشن کروائی تھی اس لیے ڈر رہا تھا کہ کہیں تمہارے سارے کمرے بھر نہ گئے ہوں۔“

”سال کے اس حصے میں زیادہ رش نہیں ہوتا۔ دیے بھی ہم ہنگامی ضرورت کے لیے کچھ کمرے محفوظ رکھتے ہیں۔“ اس نے میری طرف رجسٹریشن فارم بڑھایا اور میں نے اس پر دستخط کر دیے۔

”کیا مجھے اپنا بیگ خود لے جانا ہوگا؟“

”میں فون کر کے لڑکے کو بلاتا ہوں۔ وہ تمہارا سامان

لے جائے گا۔“

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ میں نے مرکزی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چند روز قبل جو واقعہ پیش آیا، وہ بہت ہی افسوسناک تھا۔“

ایرون کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ ”تمہارا اشارہ کس جانب ہے؟“

”پال مورسین جسے یہاں سے دو بلاک کے فاصلے پر جا تو مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔“

نہیں چلتی۔ اس طرح مورین کو دوسرے ہوٹل تک پیدل جانا پڑے گا اور اس طرح اس کا حساب برابر ہو جائے گا۔“
 ”تم نے اس فون کرنے والے کا نام اور نمبر نوٹ کیا تھا؟“
 ”نہیں، وہ بلاک کر دیا گیا تھا اس لیے اس کا نام اور نمبر معلوم نہ ہو سکا۔“

”اور تم اس کی باتوں میں آگئے؟“
 ”میں اس کھیل کا حصہ بننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن اس نے کہا کہ یہ کام اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جب مجھے اس کا بھیجا ہوا لفافہ ملا تو اس میں ایک خط رکھا ہوا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر میں راضی ہوں تو اسے فون پر بتا دوں ورنہ پیسے واپس کر دوں۔“

”پیسے؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔
 ”اس میں سو ڈالر مالیت کے دس نوٹ تھے اور اس کے عوض مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ مورین کی ریزرویشن سے انکار کر دوں۔“

”تم نے لفافے پر ڈاک خانہ کی مہر دیکھی تھی؟“
 ”آرڈر مورہ لی اے۔“

یہ فلا ڈلفیا کا مضافاتی علاقہ تھا۔ لگتا تھا کہ لفافہ بھیجنے والا اتنا ہوشیار نہیں جتنا وہ اپنے آپ کو سمجھ رہا تھا۔ بالآخر ایرون نے مجھ سے نظریں ملائیں اور کہا۔ ”میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اسے ایک مذاق ہی سمجھا تھا۔“

”تم نے یہ بات ہوشن پولیس کو کیوں نہیں بتائی؟“
 میں نے پوچھا۔

”میں خوف زدہ ہو گیا تھا۔ یوں لگا جیسے میں اس قتل میں مددگار ہوں۔“

”اور اب؟“
 ”میں اس عملی مذاق کا بے گناہ تماشا بنی ہوں۔ تمہارا اندازہ تھا کہ تم سے جھوٹ بول رہا ہوں اور میں خود بھی سمجھ رہا تھا کہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں سے کچھ چھپانا بہت مشکل ہے۔“

”بہت برا ہوا کہ تم اتنی آسانی سے بک گئے۔“
 وہ رات میں نے ہوٹل کے عالی شان کمرے میں گزاری۔ اس طرح مجھے مزید غور کرنے کے لیے وقت مل گیا۔ فون کرنے والے کو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ مورین کو ہوشن بھیجا جائے گا۔ اسے اتنا وقت درکار تھا کہ ایرون کو رشوت کی پیشکش کر سکے جبکہ مورین کو آخر وقت تک ہوشن جانے کا علم نہیں تھا اور اسے یہ بات روائگی کی صبح معلوم ہوئی۔ اب اس حقیقت تک پہنچنے میں کوئی دشواری

نہیں ہوئی کہ اس ڈرائے کا مرکزی کردار مورین سے بہت قریب تھا یا وہ بولٹ مین کمپنی میں کام کرتا تھا۔

ناشنا کرنے کے بعد میں نے واپسی کا ارادہ کیا اور ٹیکسی کے ذریعے ائرپورٹ آ گیا۔ راستے میں بھی میرا ذہن اسی کیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ بات واضح تھی کہ پال مورین کو کسی منصوبے کے تحت ہوشن بھیجا گیا تھا تاکہ اسے خاموش کیا جاسکے۔ شاید وہ بولٹ مین کے چار افراد پر مشتمل فنانس ڈپارٹمنٹ کے بارے میں کچھ جان گیا تھا۔

کسی بڑی کمپنی میں گھسنا میرا کام نہیں تھا۔ اس کے لیے مجھے ایک راستہ چاہیے اور میں جانتا تھا کہ کس طرح اس میں داخل ہوا جاسکتا ہے۔ فلا ڈلفیا واپس آنے کے ایک دن بعد میں مارٹھا سے اس کے اپارٹمنٹ میں ملا۔ اس کا اپارٹمنٹ چھوٹا مگر بے حد صاف ستھرا تھا۔ اس میں لیونگ روم، بیڈ روم اور کچن جیسی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ کچن کے ساتھ ہی کونے میں ایک کمپیوٹر اور پرنٹر بھی رکھا ہوا تھا۔

میں نے اسے ایرون ہولٹ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا اور پوچھا۔ ”تمہیں پال کے کالج کا نام معلوم ہے؟ وہ بولی۔“ ”یونیورسٹی آف پنسلوانیا۔ یہ فلا ڈلفیا میں ہی ہے۔“

”چارلی ڈیون ہولٹ کے بارے میں کیا کہو گی؟“
 ”تم سمجھتے ہو کہ وہ...“

”وہ دیکھنے میں مجھے جوکر ہی لگ رہا تھا۔ لہذا اگر ایرون کی بیان کردہ کہانی کو ذہن میں رکھوں تو پہلا شک اسی پر جاتا ہے۔“

”تم چارلی کے بارے میں ایک بات نہیں جانتے۔ وہ میری لینڈ یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے۔ کسی کو مورین کے جانے کا پتا نہیں تھا۔ اس لیے جوکر کی خمیوری کو تو نظر انداز کر دو۔ یہ کہانی قتل کے محرکات پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ ذرا سوچو کہ مورین کے کسی پرانے کالج فیلو کو جس کا تعلق بولٹ مین سے نہ ہو، یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ مورین ہوشن جارہا ہے اور کب؟ جبکہ پال کو بھی اپنے جانے کا عین وقت پر علم ہوا، اور اسے وہاں کیوں بھیجا گیا تھا؟“

”کیونکہ چارلی نے وینوہین کو بتایا تھا کہ ہوشن میں ایک بڑے کرائے دار نے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے جس کے لیے کسی کو وہاں بھیجنا بہت ضروری ہے۔ مارٹن کی بروقت آمد بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ قاتل کا تعلق کیمڈین سے ہے۔ ممکن ہے کہ اسے دو دن پہلے بھیج دیا گیا ہو کہ وہ وہاں پہنچ کر موقع کا انتظار کرے۔“



مفتگو کے بارے میں بتایا لیکن اب تک کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی جس سے مسئلے کے حل کی جانب پیشرفت ہو سکے۔ مجھے امید تھی کہ مارتھا اپنے کمپیوٹر کے ذریعے کچھ نہ کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

تین دن بعد رات ساڑھے تین بجے مارتھانے مجھے فون پر بتایا۔ ”میں نے چارلی کے کمپیوٹر کو پوری طرح کھنکال ڈالا اور ایک بے قاعدگی کا پتا چلا ہی لیا۔“

”یہ تین بڑے سپارٹرز کی طرف سے بھیجے جانے والے بلوں سے متعلق ہے۔ بولٹ مین سے جو ادائیگیاں کی گئیں وہ ان بلوں سے کچھ زیادہ تھیں۔“

”کتنی زیادہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک منٹ، دیکھ کر بتاتی ہوں۔“

کئی منٹ بعد اس نے بتایا۔ ”میں تمہیں ایک مثال دے رہی ہوں۔ راک ہل اسفالت نے 1,340,045 ڈالر کا بیل بھیجا تھا لیکن انہیں 1,348,045 ڈالر کی ادائیگی ہوئی۔“

”ممکن ہے کہ ٹائپنگ کی غلطی کی وجہ سے صفر کی جگہ آٹھ لکھ دیا گیا ہو۔“

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راک ہل کے متعلقہ بندے کو آٹھ ہزار ڈالر زیادہ ادا کر دیے گئے ہوں جس نے آدمی

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ چارلی نے اسے وہاں بھجوا دیا کیونکہ وہ مورسین کو قتل کرنا چاہ رہا تھا لیکن چارلی ایسا کیوں کرے گا۔ شاید اس لیے کہ مورسین کو وہ بات معلوم ہوگئی تھی۔“

”تم اس وقت بالکل کلیسا کے ممبر کی طرح بول رہی ہو۔“
اس کا ہاتھ اپنے کالر پر گیا اور وہ بولی۔ ”تم سرخ پن
کے بارے میں جانتے ہو۔ تمہارا مشاہدہ بہت تیز ہے سراغ
رساں منکری۔“

”وہ میں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا جب ہم تمہارے دفتر میں ملے تھے لیکن اس وقت تم نے وہ پن نہیں لگائی ہوئی ہے۔“

”میں اسے کام کے دوران میں لگاتی ہوں۔“

”تم بہت ہوشیار ہو۔ اب ہمیں آگے بڑھنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے مشکل کام میرے لیے چھوڑ دیا۔ وہ کیا بات تھی جس نے پال کو پریشان کر دیا اور اسی وجہ سے وہ مارا گیا۔“

”ہم دونوں ایک ہی سمت میں سوچ رہے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے آگے بڑھنے کا راستہ نہیں مل رہا۔“

”تم کسی غلط روی کے بارے میں سوچ رہے ہو؟“
 ”میرا اندازہ ہے کہ حسابات میں کچھ گڑبڑ ہے لیکن
 اس کے کھوج لگانے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“
 ”تم ڈیپارٹمنٹ کے کمپیوٹر ڈیٹا کے بارے میں سوچ
 رہے ہو؟“

”وینوچین نے بتایا تھا کہ تم ریکارڈ کیپنگ کرتی ہو لیکن میں نے تمہاری میز پر ایک کمپیوٹر دیکھا تھا اور یہاں بھی.....“ میں نے اس کے گھر میں رکھے ہوئے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔

”مجھے تمام ریکارڈ کمپیوٹر ائزڈ کرنا ہوتا ہے۔“
میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہاری
چارلی اور پال کے کمپیوٹر تک رسائی ہے؟“
”نہیں لیکن جب ان کے کمپیوٹر کام نہیں کرتے تو وہ
مجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ اس طرح مجھے ان کے پاس ورڈ
معلوم ہو گئے ہیں اور میں یہاں بیٹھ کر بھی ان کے کمپیوٹر تک
رسائی حاصل کر سکتی ہوں۔“

”اگر تمہیں کوئی ایسی بات معلوم ہو جس سے ہمیں آگے بڑھنے میں مدد مل سکے تو سب سے پہلے مجھے بتانا۔“

دو دن گزر گئے لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ میں نے جون مورین کو اب تک کی کارروائی سے آگاہ کیا اور خاص طور پر اسے ایرون ہولٹ سے ہونے والی

رقم اپنی جیب میں رکھی اور آدمی.....

”چارلی ڈیون پورٹ کے حصے میں آئی۔ یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے لیکن اگر یہ سلسلہ چند سالوں سے چل رہا ہے تو اچھی خاصی رقم خرد برد ہو چکی ہوگی۔ اب تک تم نے ایسے کتنے بل دیکھے؟“

”گزشتہ بارہ مہینے کا ڈیٹا دیکھنے پر ایسی گیارہ مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ جن میں حال ہی میں ہونے والا سب سے بڑا نمین چالیس ہزار ڈالر کا ہے۔ اگر بارہ مہینے کا حساب لگایا جائے تو مجموعی طور پر یہ رقم ایک لاکھ ستائیس ہزار ڈالر بنتی ہے۔“

”پھر بھی یہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس رقم کے لیے اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لیا جاسکتا ہے؟“

”چارلی پانچ سال سے کمپنی میں ہے۔ اس حساب سے اس نے کتنا کمایا ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے کہا ”اور جب چارلی کو شک ہوا کہ پال اس بارے میں جان گیا ہے تو اس نے اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے ایرون کو دیے جانے والے سو ڈالر کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ چارلی نے مارٹن کو کتنا معاوضہ دیا ہوگا۔ میرے دماغ میں ایک بات اور بھی آئی ہے وینوین کے بارے میں کیا کہتی ہو؟“

”میں بھی اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوں لیکن اس کے دفتر میں کمپیوٹر نہیں ہے لہذا ہمیں اخبارات کی رپورٹوں میں وسیع تحقیقات کے نتائج پر انحصار کرنا پڑے گا۔“

”میں تمہارا احسان مند ہوں مارتھا۔“ میں نے کہا۔ میں نے پولیس کی مدد حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور اپنے دوست لیفٹیننٹ اشین قلم کو فون کر کے ساری کہانی گوش گزار کر دی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق کہا۔ ”تم نے خود ہی سارا کیس حل کر لیا۔ اب اسے میرے گلے میں کیوں ڈال رہے ہو؟“

”کسی بھی پرائیویٹ سراغ رساں کی طرح میں بھی ایک شہری کو گرفتار کر سکتا ہوں لیکن میرے پاس تو گن بھی نہیں ہے۔ میں تو بس ایک ریسرچ کرنے والا شخص ہوں۔ اب تم اسے سنبھالو، مجھے پلمسی کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔“ دو ہفتے بعد چھاپے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ بدھ کی صبح دس بجے بولٹ مین کے فنانس ڈپارٹمنٹ میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میں چند منٹ پہلے وہاں پہنچ گیا۔ مارتھا نے

گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ چارلی نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”تم نے کوئی نئی بات معلوم کی یا مارتھا سے ملنے کے بہانے چلے آئے؟“

پھر اس نے میرے عقب میں جھانکا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دو سادہ لباس اور دو وردی میں ملبوس پولیس والے راہداری سے گزر کر ہماری طرف آرہے تھے۔ چارلی نے اپنی کرسی کو پیچھے کی طرف دھکیلا اور ہال وے کی طرف جانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر مجھے بھی اپنا حصہ ڈالنا پڑا اور میں نے آگے بڑھ کر اسے قابو کر لیا۔

جب پولیس والے چارلی کو ہتھکڑی لگا کر لے جا رہے تھے میں نے مارتھا سے کہا۔ ”میں اب بھی تمہارا احسان مند ہوں۔“

”بار بار یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”کم از کم آج کی رات ڈنر تو میرے ساتھ کرلو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گا۔“ تھوڑی سی گفتیش کے بعد وینوین اس معاملے میں بے تصور پایا گیا لیکن اسے بدانتظامی کا ذمے دار قرار دیا گیا اور تھوڑے عرصے بعد ہی مارتھا کو اس کی جگہ عارضی طور پر ذمے داری سونپ دی گئی جو بعد میں مستقل ہو گئی۔

جب وہ ڈنر پر آئی تو اس کی سچ دھج نرالی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا اور ریسٹوران میں داخل ہوتے ہی اپنا چشمہ اتار کر پرس میں رکھ لیا۔ اس نے سرخ بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس لباس میں غضب ڈھارہی تھی لیکن وہ سرخ پن اب بھی اس کے کالر میں لگی ہوئی تھی۔ کھانا ختم ہوا تو میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”مارتھا، کیا تم مجھ پر ایک احسان اور کر سکتی ہو؟“

اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولی۔ ”کیا تم ساری زندگی میرے احسانوں کے بوجھ تلے گزارنا چاہتے ہو؟“

”اسے میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔“

”ٹھیک ہے پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے کہا۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ رات کی رنگینیاں اپنے شباب پر تھیں۔ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

کی بھرپور جدوجہد کرنے لگا۔ اس کشمکش میں جیت بالآخر
ایس کی ہو گئی اور رابرٹسن کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے چہرے
کی رنگت نیلی ہو چکی تھی، زبان باہر نکل آئی تھی اور نبض بھی رک
گئی تھی۔

ہاں، رابرٹسن مر چکا تھا۔
ایس نے اپنے لیے ایک جام تیار کیا اور خاموشی کے
ساتھ اپنی اس کامیابی کا جشن منانے لگا۔ اب وہ وجود میں آنے
والی واحد ٹائم مشین کا اکلوتا مالک تھا۔

یہ ایک پرفیکٹ مرڈر ہو گا... اتنا پرفیکٹ کہ اس کا
تصور ذہن میں آتے ہی ایس کے ہونٹوں پر ایک دلاویز
مسکراہٹ ابھر آئی اور اس نے اپنی پوری توجہ اپنے کام پر
مرکوز کر دی۔

وہ دبے پاؤں ایس رابرٹسن سائنٹیفک کے اپنے پارٹنر
رابرٹسن کے عقب میں پہنچا اور ٹائیلون کی رسی اس کی گردن میں
ڈال کر اسے مضبوطی کے ساتھ کسے لگا۔
رابرٹسن نے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے اور خود کو بچانے

چونکا دینے والے انجام سے مزین... مغرب کی جدت پسندی...

جدید سے جدید تراویجات انسانوں کے لیے ہیں... ایک ایسی ہی
سائنسی ایجاد کا تحیر خیز قصہ وہ بھرپور... مستحکم اور
پُر یقین... مگر اچانک ہی سب کچھ تہس نہس ہو گیا... وہ یقین
سے بے یقینی کے خلامیں پرواز کر گیا...

پرفیکٹ مرڈر

بابر نعیم



اس کا نرا احمق سائنس دان ساتھی رابرٹسن اس ٹائم مشین کو انسانیت کی بہتری کے لیے استعمال میں لانا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس ٹائم مشین کے ذریعے ماضی میں جا کر ایسی تبدیلیاں لے آئے جو تاریخ کو بدل دے یا مستقبل میں سفر کر کے ان بیماریوں کا علاج ڈھونڈ کر لے آئے جو حال میں ناقابل علاج ثابت ہو رہی تھیں جیسے کہ ایڈز، ہیپاٹائٹس سی، شوگر وغیرہ۔ لیکن ایس۔ ایس اپنی اس ایجاد کو اچھے کاموں کے لیے وقف کرنے پر قطعی آمادہ نہیں تھا۔ اسے یہ بات انتہائی مضحکہ خیز لگتی تھی کہ اس ایجاد سے بڑے بڑے فائدے اور منافع نہ حاصل کیا جائے۔ اس کا موٹو یہی تھا کہ فیض سب سے پہلے خود حاصل کرنا چاہیے۔

اور اب وہ اپنے اس موٹو پر آسانی سے عمل کر سکتا تھا۔ وہ اس ٹائم مشین کو خطیر رقوم کے عوض کرائے پر دے کر جلد ہی دولت مند بن سکتا تھا۔

لیکن اس انتہائی پرفیکٹ مرڈر کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ابھی ایک حتمی عمل باقی تھا۔۔۔ لاش کو ٹھکانے لگانا۔

وہ رابرٹسن کی لاش کو کسی جھیل میں نہیں پھینکنا چاہتا تھا۔ نہ ہی کسی بھٹی میں جلانا چاہتا تھا اور نہ ہی کسی آگ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔۔۔ قطعی نہیں۔

اس کا ذہن ایک نئی اختراع چاہتا تھا۔ ایک ایسا منصوبہ، ایک ایسی اختراع جس میں ڈی این اے کے امکان کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے تاکہ ڈراؤنے خواب اس کی زندگی اجیرن نہ کر سکیں۔

ایس نے ٹائم مشین اشارت کردی اور رابرٹسن کی لاش کو گھسیٹ کر ٹائم مشین میں لے آیا۔

”تمہارے مستقبل میں سفر کرنے کا وقت آگیا ہے، رابرٹسن اولڈ بوائے۔“ ایس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اسے کون سے سال میں بھیجنا چاہیے؟ ایس نے خود سے پوچھا۔ سن 2099 میں؟ نہیں، کوئی جفت نمبر ہونا چاہیے لیکن اتنی دور کا سال ہونا چاہیے کہ اس سلسلے میں اس پر کبھی کوئی مقدمہ نہ چل سکے۔

تو پھر سال 2120، ٹھیک رہے گا۔

ایس نے مشین میں چند نمبر ڈائل کیے۔ مشین میں بھن بھن کی سی آواز آنے لگی۔ ایس کو اطمینان ہو گیا۔ وہ سکون سے بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

مشین نے آن ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ ایس نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ یہ مشکل ایک منٹ لگا ہوگا۔

ایس نے مشین کے ویو فائنڈر کا جائزہ لینا شروع کیا۔

اسکرین پر ایک عجیب سی دنیا کا منظر تھا۔ ہر طرف چمکدار دھاتوں کی بنی ہوئی بلند و بالا عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ متحرک روشن فٹ پاتھوں پر انسانوں کے ساتھ روبوٹ بھی رواں دواں نظر آ رہے تھے۔

ایس نے رابرٹسن کی لاش آؤٹ کے پھسلواں چیمبر میں لڑھکا دی اور ایجنٹ کا مٹن دبا دیا۔

”گڈ بائے اولڈ بوائے۔“ ایس بڑبڑایا۔

پھر وہ رابرٹسن کے بے حس و حرکت جسم کو قلابازیاں کھاتے بائیسویں صدی کی دنیا کی جانب لپکتے دیکھتا رہا۔ اس دوران اس نے تیزی کے ساتھ اس مشین پر حال کا وقت اور تاریخ بھی ڈائل کر دی تھی جہاں وہ خود کچھ دیر پہلے موجود تھا۔

ایک بار پھر ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ واپس حال میں آچکا تھا۔ ہر شے اسی طرح اپنی جگہ موجود تھی جس حالت میں وہ انہیں چھوڑ گیا تھا۔ اس کی لیبارٹری، باہر کے سمندر کا نظارہ۔۔۔ باہر سڑک پر اس کا پسندیدہ کیفے!

ایس کو اب بھوک لگ رہی تھی۔ وہ اپنے پسندیدہ کیفے میں چلا گیا اور اپنے لیے اسپیشل ڈنر کا آرڈر دیا۔ کھانے سے بھرپور لطف اٹھانے کے بعد اس نے ویٹرس کو فیاضی کے ساتھ ٹپ بھی دی اور سیٹیاں بجاتا، گنگنا تا ہوا اپنے گھر کی جانب چل دیا۔

اسے احساس تھا کہ آئندہ چند دنوں میں لوگ رابرٹسن کے بارے میں اس سے سوالات پوچھنا شروع ہو جائیں گے۔ لیکن اسے اس بات کی قطعی فکر نہیں تھی۔

درحقیقت اس کا منصوبہ تو یہ تھا کہ رابرٹسن کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہونے والوں میں سب سے پہلی آواز اسی کی ہو۔ وہ اس سلسلے میں رابرٹسن کی گاہے بے گاہے رہنے والی گرل فرینڈ کے بارے میں بھی شبہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ کہیں اس نے رابرٹسن کو قتل نہ کر دیا ہو۔

اور اگر پولیس خود اس کے بارے میں کوئی شبہ کرتی ہے تو۔۔۔

تو پھر کیا ہوا؟ کسی قسم کا ثبوت تو موجود نہیں تھا۔ رابرٹسن کی لاش سو سال کے بعد ہی سامنے آئے گی۔ اس وقت تک تو وہ خود بھی مر چکا ہوگا۔ تب کوئی اس کا کیا بگاڑ سکے گا؟

ایس اس رات اطمینان کی نیند سو گیا۔ یہ خیال اس کے لیے انتہائی اطمینان بخش تھا کہ وہ جلد ہی ایک امیر کبیر آدمی بن جائے گا۔

☆☆☆

اس کا فوری طور پر پولیس کو خبر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں

مہنگی پینٹنگز

پکاسو نے اپنے چند دوستوں کو لُچ پر مدعو کیا۔
دوستوں میں سے ایک نے کھانا کھاتے ہوئے کمرے کو
بغور دیکھا اور بولا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں تمہاری کوئی پینٹنگ
دیوار پر کہیں نظر نہیں آرہی ہے، تمہیں اپنی پینٹنگز ناپسند
ہیں۔“

پکاسو جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”دراصل بات یہ
ہے کہ مجھے اپنی پینٹنگز بے حد پسند ہیں لیکن افسوس کہ یہ
اس قدر گراں قیمت ہیں کہ میں انہیں خریدنے کے متعلق
سوچ بھی نہیں سکتا۔“

☆☆☆

تیسری شادی

ایک عورت (اپنی سہیلی سے): ”سنا ہے تم تیسری
شادی کر رہی ہو؟“
عورت: ”بالکل صحیح اور اصل بات یہ ہے کہ میرا
پہلا شوہر اللہ کو پیارا ہو گیا اور دوسرا پڑوسن کو۔“

فتح پورلیہ سے سید محی الدین اشفاق



واپس اپنے دور میں بھی بھیج دیا تاکہ میں انصاف کا تقاضا پورا
کر سکوں۔“

”پولیس...“ الفاظ بہ مشکل تمام ایس کے حلق سے ادا
ہورہے تھے۔ ”تم... تم بچ نہیں سکو گے... تم...“

”یہ تمہاری خام خیالی ہے، پارٹنر۔ میں صاف بچ نکلوں
گا۔ تم نے مجھے بہت عمدہ سبق سکھایا ہے۔ میں تمہاری غلطی ہرگز
نہیں دہراؤں گا۔ میں تمہیں آگے مستقبل میں نہیں بھیجوں گا۔
میں تمہیں ماضی میں پہنچا دوں گا تاکہ تم کبھی لوٹ کر واپس نہ
آسکو۔“

یہ کہہ کر رابرٹسن نے ایس کی گردن میں لپٹی ہوئی رسی کو
ایک جھٹکا دیا۔

ایس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور اس کا ذہن
تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ پہلے سیدھا اپنی لیبارٹری جائے گا،
وہاں چند گھنٹے گزارنے کے بعد پھر رابرٹسن کی رہائش گاہ فون
کرے گا جیسے وہ اپنے پارٹنر کے بارے میں فکر مند ہو کہ وہ
کہاں رہ گیا ہے۔

صبح کا وقت تیزی سے گزر گیا۔

ایس نے اس دوران رابرٹسن کے فون پر جواب
ریکارڈ کرنے والی مشین پر دو پیغام چھوڑے۔ پہلے پیغام میں
اس نے قدرے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا تھا۔ البتہ دوسرے پیغام
میں اس کے لہجے سے فکر مندی عیاں تھی۔
اس نے سوچا کہ وہ پولیس کو لُچ کے بعد ہی فون کرے گا۔

☆☆☆

اپنے پسندیدہ کیفے میں شاندار سلاڈ سے لطف اندوز
ہونے کے دوران وہ خاموشی سے ان چرب زباں جملوں کی
ریہرسل کرتا رہا جنہیں وہ رابرٹسن کے بارے میں اپنی تشویش
کے اظہار کے طور پر پولیس کے روبرو استعمال کرنا چاہتا تھا۔

لُچ سے واپس اپنی لیبارٹری جاتے ہوئے وہ بے حد
خوش تھا۔ اب وہ کسی پرائیویٹ انڈسٹری یا حکومتی اداروں
کے لیے گھٹیا معاوضے پر کام نہیں کرے گا۔ آئندہ ہفتے تک
اس کی حیرت انگیز ٹائم مشین تمام میڈیا پر شہ سرخیوں کی
زینت ہوگی۔ اس پُرسرت خیال سے وہ خوشی سے پھولے
نہیں سارہا تھا۔

لیبارٹری میں داخل ہوتے ہی اسے فوری طور پر کسی قسم
کی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ لیبارٹری کے تمام دروازے لاک تھے
لیکن اس کے باوجود بھی...

ٹائم مشین کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”یہ کیا...“ ایس ٹائم مشین کی جانب لپکا۔

تب کسی نے عقب سے اسے جکڑ لیا اور اس کی گردن
میں ایک رسی لپیٹ دی۔

”ہیلپ!“ ایس نے ہانپتے ہوئے پکارا۔

”اب بہت دیر ہو گئی، پارٹنر۔“ رابرٹسن کی آواز
آبھری۔

ایسا ممکن نہیں ہو سکتا، ایس نے سوچا۔ اسے تو میں نے
مردہ حالت میں سن 2120ء میں پہنچا دیا تھا۔

لیکن یہ ممکن ہو گیا تھا۔

اس کی وضاحت رابرٹسن نے خود ہی کر دی۔ ”تم نے
مجھے ایک حیرت انگیز دور میں پہنچا دیا تھا۔ میرا جسم تو مردہ ہو گیا
تھا لیکن میرا دماغ زندہ تھا۔ مستقبل کے لوگ بے حد ترقی یافتہ
ہیں۔ انہوں نے نہ صرف میرے جسم کو زندہ کر دیا بلکہ مجھے



حرصِ دوراں

کاشفِ زبیر

پریت کی اونچی چوٹی کو دیکھنے سے یوں لگتا ہے کہ وہ دور نہیں... بلکہ پریت کے دامن سے بالکل قریب تر ہے... لیکن جب پتھریلے راستے اور برف سے بچھی سرد و سخت راہیں طے کرنی ہوں تو چڑھتے جاؤ... بڑھتے جاؤ... مگر نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ قدموں سے دور کھسکتی چلی جاتی ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی ناتراشیدہ راستوں پر گامزن تھے... قدم قدم پر موت انہیں گلے لگانے کو تیار تھی... مگر ان کا حوصلہ... ہمت اور عقابی نگاہیں پہاڑوں کی چٹانوں پر مسلسل چڑھنے پر آمادہ تھیں... انہیں ہر صورت چوٹی تک پہنچنا تھا... سنسنی... تجسس... کے سنگ ہم قدم... دیوانوں اور فرزانوں کا سفرِ روزن...

گل و گلزار اور فطرت کے حسین نظاروں کو انانی لہو سے

داغ دار کر دینے والوں کے گھٹاؤنے کردار کی جھلکیاں...

طرف سے ایک دین نمودار ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ سڑک کے کنارے رکی اور اس سے ایک جوڑا اُترا۔ وہ اپنا سامان اتار رہا تھا۔ ان کے پاس تین بڑے بیگ تھے اور دو افراد کے لحاظ سے یہ خاصا سامان تھا جبکہ ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ اس نے جینز کے ساتھ پوری آستین کی شرٹ اور اوپر کسی قدر ڈھیلا ہاف سویٹر پہنا ہوا تھا۔ لڑکی کی عمر پچیس چھپیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ دلکش اور اپنے حلیے سے قطع نظر مشرقی نقوش رکھنے والی لڑکی تھی۔ مرد پیشین کے آس پاس تھا اور اس کے سرخی مائل بال پیچھے کی طرف جھے ہوئے تھے۔ ناک تلے سرخ رنگ کی ہلکی موچھیں تھیں۔ اپنے انداز اور حلیے سے وہ اسمارٹ اور تیز طرار شخص لگ رہا تھا۔ دین کے آگے جانے کے بعد ان دونوں نے ایک ایک بیگ اٹھایا اور اس کی طرف آنے لگے۔

”ہیلو۔“ مرد نے نزدیک آ کر کہا۔ ”کیا تم بھی کرٹوک کی طرف جا رہے ہو۔“

وہ تقریباً چالیس برس کا خوش شکل اور کسرتی جسم کا مضبوط مرد تھا۔ اس نے بغیر آستین کی جیکٹ کے نیچے نصف آستین کی ٹی شرٹ پہنی تھی۔ جینز کی پتلون کے ساتھ اس نے شخصوں تک اونچے جوگر اور گلے میں فلسطینی رومال باندھا ہوا تھا۔ وہ لکڑیوں کی ٹکون سے لگی کیتلی میں چائے بنا رہا تھا۔ کچی سڑک سے ذرا دور ایک بلند ہوتے پہاڑ کے دامن میں شام کا اندھیرا بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے پہنچا تھا۔ اس نے سب سے پہلے لکڑیاں جمع کر کے الاؤ روشن کیا اور چائے کی کیتلی چڑھائی تھی۔ نزدیک ہی اس کا بڑا سارک سک رکھا ہوا تھا۔ یہ ہم جوؤں اور ہائیکرز کے استعمال میں آنے والا مخصوص بیگ تھا۔ اس میں خاصا سامان آجاتا ہے اور یہ مضبوط بھی ہوتا ہے۔ پھر اسے آسانی سے پشت پر یوں باندھا جاسکتا ہے کہ چلنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

سورج مغرب کی طرف ڈھل چکا تھا۔ نیچے میدان کی

ان کے درمیان گپ شپ ہوتی رہی۔ عمر داؤد ایک سرکاری ادارے میں آفیسر تھا۔ وہ سارے سال تنہی سے اپنے فرائض سرانجام دیتا تھا اور گرمیوں میں اس کا مشغلہ لم کینگ اور ٹریکنگ تھا۔ دو مہینے کے لیے وہ سامان باندھتا اور روانہ ہو جاتا تھا۔ سفر کا بیشتر حصہ وہ پیدل چلتا تھا۔ ہاں اگر فاصلہ طویل ہو تو وہ گاڑی کر لیتا تھا۔ جیسے آج وہ ایک شمالی شہر سے یہاں تک دین سے پہنچا تھا۔ دین نے تین گھنٹے میں اسے یہاں پہنچایا تھا اور صبح وہ یہاں سے آگے سفر کا آغاز کرتا۔ سڑک یہیں تک تھی اور اس کے بعد سارا سفر کچے پکے راستوں پر تھا۔ عمر پہلی بار اس طرف آیا تھا۔ اس نے ظفر اور مائرہ کو یہی بتایا تھا۔ ان دونوں کا اس مخصوص ٹریک پر یہ دوسرا سفر تھا۔ وہ پچھلے سال

یہاں آئے تھے اور یہ جگہ انہیں اتنی اچھی لگی

آدمی نے سر ہلایا۔ ”ہاں لیکن میری منزل اس سے آگے کر توک کلیئیر ہے۔“
”ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں۔“ لڑکی نے بے تکلفی سے کہا۔
”میں راؤ ظفر ہوں۔“ مرد نے تعارف کرایا۔ ”یہ مائرہ ہے۔“

”تم لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔“ مرد نے سر ہلایا۔
”مجھے عمر داؤد کہتے ہیں۔“

”اگر تم اجازت دو تو ہم بھی یہیں پڑاؤ ڈال لیں؟“ ظفر نے پوچھا تو عمر مسکرایا۔

”یہ جگہ کسی کی ملکیت نہیں ہے جو چاہے رک سکتا ہے اور جہاں مرضی ہو رک سکتا ہے۔“

جب تک ظفر اس سے بات کر رہا تھا مائرہ جا کر تیسرا بیگ بھی اٹھا لائی۔ عمر کو عجیب لگا تھا۔ اصولاً مرد ہونے کے ناتے یہ کام ظفر کو کرنا چاہیے تھا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں صنفی امتیاز کے قائل نہ ہوں۔ ظفر نے مائرہ کا صرف تعارف کرایا تھا، اس سے اپنا تعلق واضح نہیں کیا تھا۔ وہ کم سے کم میاں بیوی تو نہیں تھے یا اگر تھے تو بہت منفرد قسم کے میاں بیوی تھے۔ عمر کی طرف سے چائے کی پیشکش انہوں نے

شکر یہ کے ساتھ قبول کر لی۔ عمر نے جہاں الاؤ جلایا تھا یہ جگہ الاؤ کے لیے ہی مخصوص تھی۔ چھوٹی سی پیالے نما جگہ کے گرد بڑے سائز کے پتھر بہ طور نشست کے رکھے تھے۔ جو مسلسل الاؤ جلانے سے سیاہ ہو چکے تھے۔ وہ دونوں پتھروں پر آگے۔ چائے کے لیے انہوں نے اپنے دھاتی گنگ نکال لیے تھے۔ یہ دھری تہ والے تھے جن میں گرم چیز زیادہ دیر تک گرم رہتی تھی۔ چائے نوشی کے دوران عمر نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”تمہارا سامان کچھ زیادہ نہیں ہے؟“
”ہاں لیکن ہم نے پورٹ لیا ہے۔ وہ رات یا صبح کسی وقت اوپر سے آئے گا۔“
”آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟“ مائرہ نے پوچھا۔

”ملک کے سب سے بڑے شہر سے۔ مگر ان دنوں میری پوسٹنگ دارالحکومت میں ہے۔“
ظفر مسکرایا۔ ”اور ہم ملک کے دوسرے بڑے شہر کے باسی ہیں۔“

کہ وہ اس سال بھی یہاں آئے تھے۔ مائرہ ایک بڑے اخبار کے لیے فوٹو گرافی کرتی تھی۔ البتہ ظفر نے صرف اتنا بتایا کہ وہ بزنس کرتا تھا۔ ان کی زیادہ تر گفتگو ٹریک کے بارے میں ہوئی تھی۔

تاریکی چھانے پر عمر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے رک سک سے خیمہ نکال کر لگانا شروع کر دیا۔ یہ کسی قدر اگلو نما خیمہ تھا۔ اس کا ابتدائی حصہ تقریباً چار فٹ قطر کے گنبد جیسا تھا۔ اس گنبد سے ایک حصہ باہر نکلا ہوا تھا اور خیمے کی صورت ٹیبل ٹینس کے بے جیسی تھی۔ ظفر اور مائرہ نے اپنے لیے چھوٹے خیمے نما سلپنگ بیگ نکالے تھے۔ عمر کا رک سک اس کے خیمے میں آگیا تھا مگر ان کے سامان کے لیے سلپنگ بیگز میں جگہ نہیں تھی۔ جس وقت وہ خیمے لگا رہے تھے جنوب کی طرف سے ایک ہلتی روشنی نمودار ہوئی تھی جو اسی طرف آرہی تھی۔ اس علاقے میں یہی ایک سڑک تھی، اس کے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف ٹیپسی علاقہ تھا۔ چند منٹ بعد کسی قدر طویل قامت اور دبے جسم کا ایک ادھیڑ عمر شخص ان کے سامنے تھا۔

اس کے اچھے بال کچھڑی ہو رہے تھے اور اس نے پشت پر ایک چھوٹا بیگ باندھ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ڈاکنگ اسٹک اور دوسرے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ تھی۔ اس کا پھولا سانس بتا رہا تھا کہ وہ خاصی دور سے پیدل آرہا ہے۔ وہ الاؤ کے پاس ہتھ پر بیٹھ کر سانس درست کرنے لگا۔ عمر نے بچ جانے والی چائے اسے گرم کر کے دی جو اس نے شکرے کے ساتھ قبول کر لی۔ چائے کا گگ خالی کر کے اس نے پھر شکریہ ادا کیا اور بولا۔

”جس گاڑی میں، میں آرہا تھا وہ یہاں سے کوئی سات میل پہلے خراب ہو گئی اور اس کے بعد کسی گاڑی والے نے لفٹ بھی نہیں دی۔“

مائرہ نے ہمدردی سے کہا۔ ”سات میل بہت ہوتے ہیں، آپ تھک گئے ہوں گے؟“

”ہاں مگر کچھ دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ شاید وہ ایک عورت کے سامنے خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مختصر بیگ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس خیمہ یا سلپنگ بیگ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے بیگ سے ایک ربر شیٹ نکالی اور اس میں ہوا بھر کر نیچے بچھا کر اس پر لیٹ گیا۔ ظفر اور مائرہ نے باقاعدہ ڈنر کیا تھا۔ انہوں نے ٹن پیک کھانے گرم کر کے کھائے تھے۔ عمر نے خشک چنے اور ابلے ہوئے لوبیا کے ایک ٹن سے ڈنر کیا

تھا۔ البتہ چوتھا فرد جس نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا تھا اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا بھی نہیں۔ سب ہی نو بجے تک اپنے خیموں اور سلپنگ بیگز میں سونے چلے گئے تھے کیونکہ انہیں یہاں سے صبح سویرے روانہ ہونا تھا۔ کل کا سفر سب سے دشوار تھا جو خشک اور گرم پہاڑوں سے گزرتا تھا اور وہاں نہ تو سبزہ تھا اور نہ پینے کے لیے پانی۔ اس لیے سڑک سے سفر کا آغاز کرنے والے ہانگرز اور ٹریکرز صبح سویرے اپنے سفر کا آغاز کرتے تھے۔

صبح عمر کی آنکھ کھلی تو باہر تاریکی تھی۔ اس کے خیال میں وہ سب سے پہلے اٹھا تھا کیونکہ باہر خاموشی تھی۔ مگر جب وہ خیمے سے باہر آیا تو اس نے ادھیڑ عمر شخص کو الاؤ کے بچتے انگاروں کے پاس بیٹھے سگار پیتے پایا۔ عمر نے ناشتے کے لیے دلیا چڑھا دیا اور پھر خیمہ سمیٹنے لگا۔ اس دوران میں ظفر اور مائرہ بھی جاگ گئے تھے۔ عمر کے پاس خشک دودھ تھا جسے اس نے دلیے کے ساتھ استعمال کیا اور کچھ دیر میں گرم کر دیا تیار تھا۔ اس نے ان تینوں کو بھی پیٹکش کی مگر صرف ادھیڑ عمر آدمی نے اس کی پیٹکش قبول کی۔ مائرہ اور ظفر کے پاس ابلے انڈے، ڈبل روٹی اور مکھن تھا، انہوں نے ان چیزوں سے ناشتا کیا تھا۔ دلیے کے ساتھ کافی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی مائرہ اور ظفر نے بھی سامان باندھنا شروع کر دیا۔ ابھی تاریکی تھی کہ اوپر پہاڑ سے ایک ہیولا نیچے آتا دکھائی دیا۔ نزدیک آنے پر وہ مائرہ اور ظفر کے لیے آنے والا پورٹر ثابت ہوا۔ اس نے آتے ہی پُر زور انداز میں سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔

”امارا نام گل خان پورٹر ہے۔“

عمر ہنسا۔ ”پورٹر تمہارے نام کا حصہ ہے۔“

”نہیں جی۔“ اس نے جھینپ کر کہا۔ ”ام پورٹر ہے

اس لیے سب گل خان پورٹر کہتا ہے، اس سے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔“

”کیا تمہارے علاقے میں بہت سے گل خان ہیں؟“ مائرہ بولی۔

”بوت سے بھی زیادہ، ہر تیسرا آدمی اور گل خان اے۔ ام گل خان پورٹر کہلاتا ہے۔“ اس نے کہا اور ظفر و مائرہ کے بیگز کا جائزہ لیا۔ اس نے دو بیگز اٹھالے اور ایک ظفر نے اٹھایا تھا۔ عمر نے اپنا رک سک پیک کر لیا تھا۔ اس نے گل خان سے پوچھا۔ ”اس راستے پر اتنا سامان اٹھا کر سفر کر لو گے؟“

”اوپر گدھا ہے، وہ نیچے نہیں آسکتا۔ سامان وہ

اٹھائے گا۔“

ادھیڑ عمر آدمی سب سے پہلے اپنا سامان پیک کر چکا تھا اور اس وقت پتھر پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ جب سب روانہ ہوئے تو وہ آخر میں اٹھا تھا۔ مارہ آگے گل خان کے ساتھ تھی اور ظفر عمر کے ساتھ چل رہا تھا۔ ظفر نے کہا۔ ”یہ آدمی کچھ عجیب نہیں ہے۔“

عمر نے شانے اچکائے۔ ”ہم سب عجیب ہیں۔ پہاڑوں کی طرف آنے والے عجیب ہی ہوتے ہیں۔“

”اس نے تعارف نہیں کرایا اور نہ ہی ہم سے ہمارے نام پوچھے۔“

”ضرورت بھی کیا ہے، ہم جانتے ہیں وہ انسان ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہم بھی انسان ہیں۔“

”اس کے پاس سامان بھی کم ہے۔“

”سفر کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ انسان کم سے کم سامان کے ساتھ گزارا کرے۔“ عمر نے کہا۔ ذرا سی دیر میں وہ خاصی بلندی پر آگئے تھے۔ اگرچہ موسم خشک تھا لیکن عمر نے آج پوری آستین کی شرٹ پہنی تھی اور جیکٹ اتار دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جیسے ہی سورج نکلے گا یہاں خشک چٹانیں چٹنا شروع ہو جائیں گی اور اس کے بعد ان کے چند گھنٹے بہت سخت گزریں گے۔ وہ سورج نکلنے اور اس کی تپش پھیلنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لینا چاہتے تھے اس لیے عمر نے زبان کے بجائے پیروں کو حرکت دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہ سر جھکائے تیز قدموں سے ڈھلان پر چڑھ رہا تھا۔ بلندی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سورج نکلنے سے پہلے روشنی ہو چکی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ رہا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ خاصا پیچھے ہو گا مگر اسے حیرت ہوئی جب اس نے اسے مشکل سے سو قدم پیچھے پایا۔ ظفر نے حیرت سے کہا۔

”یہ اتنی جلدی یہاں تک آگیا۔“

”یہ ہلکا ہے، سامان میں بھی اور جسمانی طور پر بھی شاید اس لیے ہم سے تیز ہے۔“

”کل تو یہ ایسے ہانپ رہا تھا جیسے دے کا مریض ہو۔“

”سات میل چلنا آسان نہیں ہے، وہ بھی دن کے آخری حصے میں۔ ابھی یہ تازہ دم ہے، شام تک دیکھیں گے اس کا اسٹیمنا۔“

وہ جس پہاڑ کے اوپری حصے میں تھے اس کے آگے ایک چلا سارا سستہ بھوری چٹانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا

خصوصی دوراں

مزید بلندی کی طرف جا رہا تھا مگر یہاں پہاڑ نہیں تھے بلکہ یہ پلیٹو قسم کا میدان تھا جس میں چٹانوں کا راج تھا۔ گل خان پہلے پہنچ کر اپنے گدھے پر سامان لا رہا تھا اور ساتھ ہی مارہ کو اپنے علاقے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مارہ کے تاثرات بتا رہے تھے کہ کوئی سنجیدہ یا تشویشناک بات ہے، اس نے آواز دے کر ظفر کو بلایا تو وہ اس کی طرف چلا گیا۔ عمر کے پاس پانی کی ایک بڑی بوتل تھی جس میں تقریباً دس لیٹر پانی تھا۔ اسے امید تھی کہ اس راستے پر پانی کی یہ مقدار کافی رہے گی۔ عمران کے پاس سے گزرا تو وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔

مارہ: ”یہ کیسے ہوا ہے؟“

ظفر گل خان سے: ”تم لوگ کچھ کر نہیں رہے ہو؟“

مارہ: ”تمہاری طرف پولیس ہوتی ہے؟“

پولیس کا نام سن کر عمر رک گیا۔ ”کوئی مسئلہ ہوا ہے؟“

مارہ نے سر ہلایا۔ ”بچھلے ایک ہفتے میں ان کے

گاؤں میں دو بچے قتل ہو چکے ہیں۔ ایک دن کے وقفے سے۔“

”ان کو جنوں نے مارا اے۔“ گل خان نے یقین سے کہا۔

”اور مسجد کا مولوی صیب بتایا اے۔“

ان تینوں نے اگرچہ گل خان کی بات کا یقین نہیں کیا

تھا مگر انہوں نے اس کا اظہار کرنے سے بھی گریز کیا۔ اس کے بجائے عمر نے پوچھا۔ ”بچوں کی موت کیسے ہوئی؟“

”جنوں نے ان کو جنگل میں پکڑا اور درختوں سے مار

مار کر مار دیا۔“ گل خان نے تشویش سے کہا۔ ”اب اور بچے

لوگ گھر میں رہتا اے باہر نہیں جاتا۔“

گل خان نے سامان لا دیا تھا اس لیے وہ فوری

روانہ ہو گیا۔ اس نے انہیں بھی جلدی چلنے کو کہا۔ اس وقت

مشرق کی سمت سے سورج نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی اولین

کرنوں میں بھی گرمانش تھی۔ حیرت انگیز بات تھی کل عمر سچ

سمندر سے صرف ساڑھے چار فٹ بلند ایک قصبے میں تھا اور

وہاں بھری دوپہر میں بھی موسم اچھا تھا۔ کمرؤں میں خشکی تھی

اور پنکھا چلانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید

اس لیے کہ وہاں نزدیک ہی دریا بہہ رہا تھا اور آس پاس بے

تھا شا سبزہ تھا۔ جبکہ یہاں سچ سمندر سے چھ ہزار فٹ کی

بلندی پر سوائے نگی چٹانوں کے اور کچھ نہیں تھا اور یہ چٹانیں

بھی کچھ اس قسم کی تھیں جو دھوپ پڑتے ہی گرم ہونا شروع

ہو جاتی تھیں اور ان سے گرمانش پھوٹنے لگتی تھی۔ عمر کی

گھڑی میں آلٹی میٹر بھی تھا جو بلندی بتاتا تھا۔ ایک جن

دبانے سے اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ سطح سمندر سے کتنی بلندی پر ہے۔

یہاں ہوا ہلکی ہو گئی تھی اور اسے سینے میں کھینچنے کے لیے ذرا زور لگانا پڑا رہا تھا۔ عمر جانتا تھا کہ اس علاقے میں جو دنیا سے کٹے ہوئے تھے جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ چوری ڈکیتی نایاب تھی اور اگر کل ہو جاتا تو قاتل فوری پکڑا جاتا تھا۔ اندھے جرائم نہیں ہوتے تھے۔ عورتوں کے خلاف جرائم نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیونکہ عورتیں وہاں پوری طرح مردوں کے کنٹرول میں تھیں اور ان کی اپنی کوئی انفرادی زندگی نہیں تھی۔ ہر مرد کو علم ہوتا تھا کہ اس کی بیوی، بیٹی اور بہن کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟ لوگوں میں قناعت تھی اور بیرونی ترقی کی جھلک جو یہاں سیاحوں، کوہ پیماؤں اور مہم جوؤں کی صورت میں آتی تھی وہ بھی ان میں لالچ پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ جرائم کی طرح تعلیم کی شرح بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

گرمی تیز ہونے لگی تھی اس لیے عمر نے مناسب سمجھا کہ رفتار تیز کر دے۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا تو ادھیڑ عمر شخص اتنے ہی قاصدے پر تھا۔ وہ ایک مستقل رفتار اور مستقل مزاجی سے چل رہا تھا۔ مگر یہاں سے عمر کی رفتار کی وجہ سے باقی افراد سے اس کا فاصلہ بڑھنے لگا۔ صرف گل خان اس سے آگے تھا جو گدھے کو لے کر چل رہا تھا۔ دوپہر تک گرمی بے پناہ ہو گئی تھی اگرچہ یہ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی مگر اسے برداشت کرنا ہی تھا۔ عمر کی بوتل نصف سے زیادہ خالی ہو گئی تھی اور اب وہ بہت احتیاط سے پانی استعمال کر رہا تھا۔ ہر چند سوگز کے بعد وہ ایک گھونٹ پانی پیتا تھا جو اب بوتل میں گرم ہو گیا تھا اس کے باوجود اسے زیادہ پانی پینے سے روکنے کے لیے خود پر جبر کرنا پڑتا تھا۔ سہ پہر کے آخری حصے میں جب پانی ختم ہو گیا تھا اور پیاس اپنے عروج پر تھی تب اسے اس پورے علاقے کا پہلا سبزہ نظر آیا تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ شام کے تیزی سے تاریک اور خشک ہوتے سائے میں ایک اسکول کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے مقامی لڑکی سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ لڑکی گل خان ان کے لیے کہیں سے لایا تھا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں جو راستے میں آتا تھا، پوچھنے پر گل خان نے اس کا نام شیخ بتایا تھا۔

”کرتوک یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ہے۔“

مارہ نے عمر کی طرف دیکھا۔ ”آپ تو کہہ رہے تھے

کہ آپ پہلے یہاں آچکے ہیں؟“

عمر نے سر ہلایا۔ ”میں دوسری طرف سے آیا تھا۔ اس راستے سے یہ میرا پہلا سفر ہے۔ میں کرتوک کلیجہ تک جانا چاہتا ہوں۔ پہلے میں ناکام رہا کیونکہ اس طرف سے راستہ بہت مشکل تھا، مجھے راستے سے واپس جانا پڑا تھا۔“

”ہم پہلے بھی آچکے ہیں۔“ مارہ نے کہا۔ ”ہمیں معلوم تھا کہ راستے میں شدید گرمی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم ٹھنڈے پانی کا بندوبست کر کے آئے تھے۔“

”میرا تقریباً ختم ہو گیا تھا۔“ عمر سنجیدگی سے بولا۔

”اگر چند منٹ اور مجھے سبزہ نظر نہ آتا تو میں گر جاتا۔“

گل خان گدھے سے سامان اتار کر اسے برآمدے میں رکھ کر گدھے کو کھیتوں میں چھوڑ آیا تھا۔ اسکول کے احاطے میں لمبی گھاس تھی اس لیے انہوں نے برآمدے میں رکنے کو ترجیح دی۔ ادھیڑ عمر شخص الگ تھلک بیٹھا تھا اور اس نے گل خان سے دوسری بار لمبی طلب کی تھی۔ عمر کو حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے پاس زیادہ پانی نہیں تھا اور اس نے ایک چھوٹی بوتل کے سہارے یہ سفر کیا تھا۔ مگر اس کی حالت ان سب سے بہتر تھی۔ اس نے راستے میں ملنے والی پہلی پانی کی کھال جو کھیتوں کی طرف سے بہتی آرہی تھی اس سے دل بھر کر پانی پیا تھا۔ لڑکی کو وہ ٹھہکتا ہوا کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ مارہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”عجیب آدمی ہے، ذرا بھی کھلنے ملنے والا نہیں ہے۔“

عمر نے تبصرے سے گریز کیا۔ ظفر نے اپنا موبائل فون نکال کر سگنل چیک کیے۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے اس علاقے میں کام کرنے والی سم لی تھی مگر اس کے سگنل بھی ہر جگہ دستیاب نہیں تھے۔ کم سے کم اب تک اسے سگنل نہیں ملا تھا اور وہ مایوس تھا۔ اس نے سر جھٹک کر کہا۔ ”میں نے بیکار میں سم لی۔“

”یہ اس جگہ کام کرے گی جہاں آس پاس کوئی آرمی انشالیشن ہو۔“ عمر نے بتایا۔ ”یہ نیٹ ورک آرمی کے لیے ہے مگر اب عام لوگ بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ہنگامی صورت حال میں کام آتا ہے۔“

”مگر یہاں تو سگنل نہیں ہیں۔“

”یہاں آبادی ہے، جہاں آبادی نہیں ہوگی وہاں اس کے سگنل ملیں گے۔“

گل خان نے تائید کی۔ ”آپ فیک کہتا اے۔ ادھر ہمارے گاؤں سے اوپر سگنل ملتا اے۔ ام کو بھی ادھر سے پیغام ملا کہ پورٹر کا ضرورت اے۔“

ظفر چونکا۔ ”تمہارے پاس موبائل ہے۔“

نہ آئے اس کا الزام جنوں بھوتوں پر لگا دو۔“

عمر اس سے متفق تھا۔ ”مگر ان سے بحث کا قاعدہ نہیں ہے، یہ لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔“

”وہی صدیوں پرانا مرض جہالت۔“ ضیاء نے کہا اور سمجھ جانے والے سگار کو جلانے لگا۔ مائرہ اور ظفر بھی باہر نکل آئے تھے وہ تاریکی چھانے سے پہلے اس علاقے کو دیکھ لینا اور اس کی خوب صورتی کو اپنے گیسروں میں محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ مائرہ کے پاس جدید ترین ڈیجیٹل کیمرہ تھا۔ اس کی ایک تصویر میں ضیاء بھی آ رہا تھا، اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ ”مہربانی کر کے مجھے فریم سے باہر رکھو۔“

”فریم میں تو آپ خود آ رہے ہیں۔“ مائرہ نے کہا۔ ضیاء وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ اسکول کی طرف چلا گیا تھا۔ ظفر نے کہا۔

”اے تصویر میں آنا بھی پسند نہیں ہے۔“

”آپ سے اس کی بات ہوئی؟“ مائرہ نے تصویر لینے کے بعد عمر سے پوچھا۔ اس نے سر ہلایا۔

”اس نے اپنا نام ضیاء منصور بتایا ہے۔“

”چلو نام تو معلوم ہوا۔“ ظفر ہنسا۔

چند منٹ بعد تاریکی اتنی تیزی سے آئی کہ اس پاس کا منظر غائب ہی ہو گیا۔ عمر نے کہا۔ ”آدھے گھنٹے بعد چاند نکل آئے گا اور آج شاید تیرہویں کا چاند ہے اس لیے بہت روشنی ہوگی۔“

”ہم تب آئیں گے۔“ مائرہ بولی۔ ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”گل خان نے ڈنر کا بندوبست یہیں سے کرنے کو کہا ہے۔“ ظفر نے اطلاع دی۔

”یہ تو اچھی بات ہے ہمارا فوڈ بچے گا۔“ مائرہ بولی۔ عمر کا خیال تھا کہ گل خان نے صرف ان کے لیے لچ کا بندوبست کیا ہوگا۔ جب وہ کچھ دیر بعد گاؤں کی طرف سے آیا تو اس نے روٹیوں کی چھابی پکڑی ہوئی مٹی جس میں کپڑے میں لپیٹی ہوئی گرم روٹیاں اور ایک چھوٹی ہانڈی میں سالن تھا۔ یہ مقامی سبزیوں اور گوشت سے بنا ہوا سالن تھا۔ عمر اپنے لیے ڈنر تیار کرنے جا رہا تھا مگر گل خان نے اسے روک دیا۔

”یہ سب کے لیے اے۔ اور گاؤں والا میمان نواز اے۔“

روٹیاں اور سالن خاصا تھا، انہوں نے سیر ہو کر کھایا۔ ڈنر کے عمر نے سب کے لیے کافی بتائی۔ گل خان برتن

گل خان ہنسا۔ ”اور سب کے پاس موبائل نہیں اوتا۔ فیکیدار کے پاس اے، اس کا اور شہر کے ٹورسٹ ایجنسی سے رابطہ اوتا اے۔ وہ ٹورسٹ ایجنٹ اور فیکیدار کو فون کرتا۔ وہ پورٹر بیٹا۔ ابھی ام کو بیٹا۔“

اسی اور آرام نے عمر کو تازہ دم کر دیا تھا۔ وہ اٹھا اور ٹھٹھا ہوا باہر نکل آیا۔ اسکول کے عقب میں ڈھلان پر گاؤں تھا اور سامنے کھیت بکھرے ہوئے تھے جو نشیب میں خاصی دور تک گئے تھے۔ اوپر سے نالیوں میں شفاف پانی بہتا ہوا آ رہا تھا۔ گل خان کا گدھا ایک کھیت میں چر رہا تھا جس میں فصل نہیں لگائی گئی تھی مگر اس میں بے شمار پھولدار پودے اگے ہوئے تھے۔ خوراک نہ صرف دیکھنے میں اچھی بلکہ لذیذ بھی تھی کیونکہ گدھا دل جمعی سے پودے چر رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کھیت کے کنارے کھڑا سگار کے کش لے رہا تھا۔ عمر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے عمر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم لوگ میرے بارے میں متجسس ہو گے؟“

”زیادہ نہیں۔“ عمر نے سکون سے کہا۔ ”ویسے جہاں چار آدمی ہوں تو وہ ایک دوسرے کے بارے میں جانتا چاہتے ہیں۔“

”احتمالاً بات، انسان انسان سے بھاگ کر ایسے دیرانوں میں آتا ہے اور پھر یہاں بھی تعارف کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔“ اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”یہ فطرت ہے اور انسان فطرت سے نہیں بھاگ سکتا۔ کیا تم بھی کر توک جا رہے ہو؟“

”ہاں لیکن ابھی میں نے راستے میں سنا ہے وہاں دو بچوں کو مار دیا ہے۔“

”میں نے بھی سنا ہے۔“ عمر نے ظفر سے کہا۔ ”اس علاقے میں جرائم بہت کم ہیں اور اس قسم کے جرائم نہیں ہوتے۔“

ادھیڑ عمر نے شانے اچکائے۔ ”کیا کہا جاسکتا ہے، جنونی کہیں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔“

”تم نے ابھی سے فیصلہ کر لیا کہ یہ کسی جنونی کا کام ہے سٹر.....“

”ضیاء منصور۔“ اس نے پہلی بار اپنا نام بتایا۔ ”ہاں میرا خیال ہے معصوم بچوں کو کوئی جنونی ہی قتل کر سکتا ہے۔“

”عمر داؤد۔“ اس نے بھی نام بتایا۔ ”گل خان کا کہنا ہے اور شاید ان لوگوں کا یہی خیال ہے کہ بچوں کی موت میں جنوں کا ہاتھ ہے۔“

”رہش۔“ ضیاء نے حقارت سے کہا۔ ”جو چیز سمجھ میں

واپس کرنے گیا تھا اس لیے اس کی کافی کیتلی میں چھوڑ دی کہ گرم رہے۔ رات ہوتے ہی خنکی تیزی سے آئی تھی۔ کافی پی کر مائرہ نے اپنا کمر اسنبالا اور باہر چلی گئی۔ چاند نکل آیا تھا اور صاف آسمان کی وجہ سے بہت روشن تھا۔ عمر اپنا خیمہ لگانے لگا پھر بیگ اندر رکھ کر وہ باہر آیا۔ اسے ظفر نظر نہیں آیا، اس کا خیال تھا کہ وہ مائرہ کے ساتھ ہو گا مگر مائرہ باہر اکیلی تھی اور زاویے بدل کر تصویریں لے رہی تھی۔ عمر نے محسوس کیا کہ وہ اچھی فوٹو گرافر تھی۔ وہ ایسے زاویے لے رہی تھی جس میں وادی کا حسن کھل کر سامنے آئے۔ وہ ایک درخت کے کٹے تنے پر بیٹھ گیا۔ اس نے مائرہ کے کام میں مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ تصویریں لے کر خود اس کی طرف آئی۔ عمر نے اس کے لیے تنا خالی کیا تو وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی۔

”فوٹو گرافی مشکل کام ہے۔ ایک زمانے میں مجھے بھی شوق ہوا تھا مگر پھر میں نے چھوڑ دیا۔“

مائرہ نے اپنے کھلے بال درست کیے۔ ”آپ نے ٹھیک کہا۔ میں نے بہت محنت کی ہے لیکن اب بھی سیکھ رہی ہوں۔ شاید آنے والے سال میری تصویروں کی ایگزیشن ہو۔ زیادہ تر تصویریں اسی علاقے کی ہوں گی۔“

”ظفر کو فوٹو گرافی سے دلچسپی نہیں ہے۔“

”اسے فوٹو گرافی سے نفرت ہے۔“

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ دونوں کا مشترکہ شوق ہے۔“

”صرف میرا شوق اور پروفیشن ہے۔“ مائرہ نے تصدیق کی۔ عمر نے محسوس کیا کہ ظفر کے بارے میں بات کرتے ہوئے مائرہ کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔ پھر اس نے موضوع بدل دیا۔ ”آپ کا شوق کیا ہے؟“

”گھومنا، پھرنا اور نئی جگہوں پر جانا۔“ عمر نے کہا۔

”میری کوشش ہوتی ہے کہ گرما میں مجھے زیادہ سے زیادہ چھٹیاں مل جائیں۔“

”آپ اکیلے ہیں، کبھی بیوی بچوں کو نہیں لائے۔“

”اگر ہوتے تو ضرور لاتا۔“ عمر مسکرایا۔ ”بیوی تھی مگر اسے میرے اسی شوق سے جڑ تھی۔ طلاق کی وجوہات میں اس نے یہ وجہ بھی شامل کی تھی کہ میں ٹک کر گھر میں نہیں بیٹھتا ہوں۔“

”اوہ! افسوس ہوا۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا اچھی عورت تھی۔ اب ہم دونوں ہی خوش ہیں۔“

”بچے نہیں ہوئے؟“ مائرہ نے تجسس سے پوچھا۔

”دوبارہ وہ امید سے ہوئی تھی مگر معاملہ ختم ہو گیا۔“

مائرہ کی صورت بتا رہی تھی کہ اسے سچ سچ افسوس ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”بچے رونق ہوتے ہیں۔“

”میں آپ سے متفق ہوں۔ کیا آپ کے؟“

مائرہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ”میں ان میرڈ ہوں۔ کبھی لیں کہ میری اور ظفر کی انکیج منٹ ہے۔ ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔“

”سوری، میں سمجھا کہ آپ کپل ہیں۔“

مائرہ نے جھرجھری لی۔ ”سردی ہو گئی ہے۔“

”آئیں اندر چلیں۔“ عمر نے کہا۔ وہ اسکول میں آئے تو ظفر آ گیا تھا اور گل خان برآمدے میں ایک دیسی کبیل میں لیٹا ہوا سو رہا تھا۔ ضیا بھی اپنے ہوا بھرے گدے پر لیٹ کر گیا تھا۔ اس کے پاس اوڑھنے کو بہ ظاہر صرف ایک ہلکا سا کبیل تھا۔ عمر نے اپنے خیمے میں جانے سے پہلے اس سے کہا۔ ”اگر تمہارے پاس خیمہ نہیں ہے تو کر توک سے آگے نہیں جاسکو گے۔“

”تم فکر مت کرو۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا تو عمر شانے اچکا کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ گلیشیر یا اس کے آس پاس رات بنا خیمے کے نہیں گزاری جاسکتی تھی۔ وہاں درجہ حرارت رات میں منفی سے نیچے چلا جاتا تھا اور ایسے میں بارش ہو جاتی تو بھیگ کر آدمی بیمار پڑ سکتا تھا اور وہاں مدد ملنا بھی محال تھا۔ مگر ضیا اس بارے میں بے فکر تھا۔ ظفر نے اطلاع دی۔

”ہم صبح ہوتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔“

”اگر میں نے رات اچھی نیند لی تو تمہارے ساتھ چلوں گا ورنہ تمہارے بعد آؤں گا۔“ عمر نے کہا اور زپ بند کر لی۔ اس کا خیمہ ایسا تھا کہ اس کا اوپری حصہ جالی والا تھا لیکن بارش کی صورت میں ایک اور چادر سے اسے مکمل واٹر پروف کر سکتا تھا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی سے بڑا کوئی کیڑا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ سارے دن کی ٹھکن اب دکھتے جسم کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی۔ اسے سات آٹھ گھنٹے کی نیند کی ضرورت تھی، اس کا جسم خود ٹھیک ہو جاتا۔ جس وقت اسے نیند آئی مائرہ اور ظفر کے درمیان ہونے والی گفتگو شاید تلخ ہو چلی تھی کیونکہ کبھی کبھی مائرہ کی آواز بلند ہو جاتی تھی۔ عمر نے سنا مگر وہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ ان کے درمیان وجہ تنازع کیا ہے؟ شاید کوئی معمولی سی بات تھی کیونکہ صبح ان کے ہنسنے سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اس وقت خوشگوار موڈ میں تھے۔

حوص دوراں

آ رہے تھے۔ آنے والے اطلاع دے رہے تھے کہ کرتوک گلیشیر پر موسم نہایت خراب تھا اور ان میں سے بیشتر راستے سے واپس آ گئے تھے۔ عمر فکر مند نہیں تھا۔ اس کا تجربہ تھا کہ جب ٹریکزر کسی مشکل مقام کی طرف جا رہے ہوں تو آنے والے بری خبریں ہی دیتے تھے۔ یہ آدمی کی اپنی قسمت پر ہوتا ہے کہ آگے اسے کیا ملے گا۔ اس علاقے میں موسم چند گھنٹوں میں خراب اور صاف ہو جاتا تھا۔ راستے میں جنگل اور جھاڑیوں سے بھرے ٹیلے آ رہے تھے۔ کہیں کہیں چٹانیں تھیں۔ مگر یہاں سبزہ غالب تھا۔ جا بہ جا پہاڑی جھرنے بہہ رہے تھے جن کا ٹھنڈا پانی آب حیات سے کم نہیں تھا۔ اس نے پہلے جھرنے سے اپنی بوتل بھری تھی مگر اس سے ایک گھونٹ لینے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ وہ براہ راست بہتے جھرنوں سے پانی پیتا رہا تھا۔

راستے میں ایک جگہ لگی اسٹراپیڈ کی جھاڑی سے اس نے بچے ہوئے پھل کھائے اور اپنا بیج مکمل کر لیا۔ دوران سفر جہاں الاؤ جلانے کی گنجائش نہیں تھی وہاں وہ بھنے خشک چنوں سے بیج کرتا تھا۔ اس کے پاس راشن محدود تھا کیونکہ زیادہ راشن لانے کی صورت میں وزن بڑھ جاتا اور اسے پورٹر کرنا پڑتا جبکہ وہ اکیلا سفر کرنا پسند کرتا تھا۔ اس لیے اس کی کوشش ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ گزرا کرے اور اگر راستے میں کھانے کو کچھ مل جائے تو یہ سب سے اچھی بات ہوتی تھی۔ سہ پہر تک ایک مشکل درے سے گزر کر اس نے کرتوک گاؤں کی وادی میں قدم رکھا۔ یہ صدیوں پرانا گاؤں اسی نام کے گلیشیر کے عین نیچے واقع تھا۔ وادی کو چاروں طرف سے اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا اور اس کی ڈھلوانوں پر گھنے جنگل تھے۔ بالکل وسط میں کاشت کاری کے لیے زمین تھی جو تہ در تہ ڈھلوانوں پر بلند ہوتی گاؤں سے جا مل رہی تھی۔

بلاشبہ یہ ایک خوب صورت جگہ تھی۔ عمر نشیب میں گاؤں کی طرف اترنے لگا۔ وہ کھیتوں تک پہنچا تو خلاف توقع وہاں بچوں کا غول نہیں تھا جو ہر باہر سے آنے والے کا استقبال اس امید پر کرتے تھے کہ وہ انہیں کھانے کو چاکلیٹ، ٹانی یا چیونگم دے گا۔ مقامی تو نہیں مگر غیر ملکی سیاح ایسی چیزیں لاتے تھے اور فراغ دلی سے بچوں میں بانٹتے تھے۔ عمر کے پاس ایک شاپر تھا جس میں چھوٹی چاکلیٹ اور چیونگم بھری ہوئی تھیں۔ مگر انہیں لینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ کھیتوں میں عورتیں کام کر رہی تھیں اور عورتیں ہی ڈھلوانوں پر آنے والے سرما کے لیے گھاس کاٹ رہی تھیں اور لکڑی

عمر خود کو تروتازہ محسوس کر رہا تھا مگر اس کا جلدی اٹھنے کا موڈ نہیں تھا۔ البتہ اس نے ذرا سی زپ کھول لی تاکہ صبح کی تازہ ہوا کو زیادہ محسوس کر سکے۔ اس نے جھانک کر ان دونوں کو دیکھا۔

”گڈ مارننگ۔“

”مارننگ۔“ مازہ نے کہا۔ وہ اپنا سلیپنگ بیگ لپیٹ رہی تھی۔ ”ہم نے آپ کی کیتلی استعمال کی چائے کے لیے، امید ہے آپ نے برا نہیں مانا ہوگا۔“

”بالکل بھی نہیں۔“

”اس میں چائے ہے اور انگاروں پر ہے۔“

عمر ہنسا۔ ”اس صورت میں تو بالکل برا نہیں مانا۔“

وہ ان کے روانہ ہونے کے بعد خیمے سے نکلا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ضیا جا چکا ہوگا۔ مگر وہ وہیں موجود تھا اور برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا آئینے میں دیکھ کر استرے سے شیو کر رہا تھا۔ چائے کم تھی مگر عمر نے اس کے لیے بھی تھوڑی نکال لی۔ ناشتے میں اس نے تیار دلیا دودھ کے ساتھ لیا تھا۔ عمر نے ضیا سے پوچھا۔ ”آج تم روانہ نہیں ہوئے۔“

”کل مشکل سفر تھا اس لیے جلد روانہ ہوا۔ ورنہ میں آرام سے اور آس پاس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہوا سفر کرتا ہوں۔ مجھے منزل پر پہنچنے کی زیادہ جلدی نہیں ہوتی۔“

یہ طویل ترین جملہ تھا جو ضیا نے اس سے ملاقات کے بعد کہا تھا۔ ناشتے کے بعد عمر نے اپنا رک سک پیک کیا اور چلنے کو تیار ہو گیا۔ ضیا نے اپنا بیگ پیک کر لیا تھا مگر وہ بدستور سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے شیو کی بھی مگر بالوں میں گنگھی کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ رات ہلکی سی بارش ہوئی تھی اور اگر وہ کسی کھلی جگہ ہوتے تو ضیا کو مشکل پیش آتی مگر وہ اس معاملے میں بالکل بے پروا تھا۔ برآمدے میں ایک ڈبا رکھا تھا جس پر چندہ برائے ترقی اسکول لکھا ہوا تھا۔ عمر نے اس میں کچھ رقم ڈالی اور آگے روانہ ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ ڈبا ان سیاحوں اور ٹریکزر کے لیے تھا جو یہاں رات میں مفت قیام کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ اسکول کا حق بنتا تھا۔ مازہ اور ظفر کو روانہ ہوئے ایک گھنٹا ہو گیا تھا اور گل خان اپنے گدھے کے ہمراہ منزلیں مارتا جاتا تھا اور مڑ کر نہیں دیکھتا تھا جیسا کہ پورٹرز کی عادت ہوتی ہے۔

عمر کچے راستے پر پانی سے بچتا ہوا چل رہا تھا۔ اس دوران میں اسے کچھ ملکی وغیرہ کی سیاح و ٹریکزر ملے۔ کچھ تو

جمع کر رہی تھیں۔ یہ سارے کام یہاں عورتوں کے سپرد تھے۔ مرد موٹی چراتے تھے اور پورٹر کا کام کرتے تھے، ان میں سے کچھ شہروں میں جا کر محنت مزدوری کرتے تھے۔ یہاں ذرائع زندگی کم تھے اور جو تھے ان سے بھی زیادہ آمدنی نہیں ہوتی تھی۔

گاؤں کے چوک پر بھی ویرانی تھی۔ عمر اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ چند سونفوس اور شاید پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل اس چھوٹے سے گاؤں میں دو معصوم بچوں کی ہلاکت معمولی واقعہ نہیں تھی، اس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ واقعات کی سنگینی نظر آنے والی ہر صورت پر واضح تھی اور گاؤں میں بھی بچے غائب تھے۔ دو جانیں گنوانے کے بعد لوگ ہم گئے تھے اور انہوں نے بچوں کو گھروں میں بند کر لیا تھا۔ گاؤں کا واحد ہوٹل چوک کے پاس ہی تھا۔ یہاں کھانے اور رہائش دونوں کا بندوبست تھا۔ لیکن خستہ حال ہوٹل میں طعام و قیام دونوں کے ریٹ نہایت نامناسب تھے۔ عمر کہیں پڑاؤ ڈالنے کی سوچ رہا تھا کہ اسے گل خان آتا دکھائی دیا۔ اس نے گرم جوشی سے عمر سے ہاتھ ملایا۔

”آپ دیر کر دیا صیب، اور آپ کا انتظار اوتا۔“
انتظار گاؤں کے اوپری حصے میں ایک چھوٹے سے باغ میں ہو رہا تھا جس میں سیب اور خوبانی کے کچھ درخت تھے۔ پھل ابھی پک رہا تھا اور باغ کے وسط سے پانی کی چھوٹی سی نالی بہہ رہی تھی۔ زمین پر پھٹی گھاس تھی اور اس سے سکون آمیز بخ اٹھ رہی تھی۔ مارہ اور ظفر اسی سبزے پر براجمان قبوے کے ساتھ مقامی طرز کے چھوٹے کچے کھا رہے تھے۔ یہ مہمان داری گل خان کی طرف سے تھی۔ باغ بھی اسی کا تھا۔ اس نے عمر کو دعوت دی۔ ”آؤ آؤ صیب اور بیٹو۔“

عمر شرمندہ ہو گیا اس نے کہا۔ ”یار میں نے تمہیں پورٹ نہیں کیا ہے جو تم میری مہمان داری اور فکر بھی کرو۔“
”فکر نہیں صیب۔“ اس نے فراغ دلی سے کہا۔ ”تم اور آیتو امارا میمان ہوا۔“

”آجائیں۔“ مارہ نے کہا۔ ”اگر یہ جگہ جنت ہے تو سمجھ لیں کہ ہم جنت کے مزے کر رہے ہیں۔ کفرانِ نعمت نہ کریں۔“

”ضیا کہاں ہے؟“ ظفر نے پوچھا۔ عمر نے رک سک اتارا اور نیچے بیٹھ گیا تھا۔ گل خان اس کے لیے قبوہ نکال رہا تھا۔ کچے کھڑے میں لپٹے ہوئے اور گرم تھے۔ یہ کچھ دیر پہلے ہی کے تھے۔ عمر نے جواب دیا۔

”جب میں روانہ ہوا تو وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔“
گل خان نے رات کے کھانے کے لیے معذرت کی۔ ”سالن نہیں اسے پر روٹی مل جائے گا۔“
”اس کی ضرورت نہیں ہے، میرے پاس خوراک ہے۔“ عمر نے اپنا رک سک تھپکا۔ مارہ نے اس کی تائید کی۔

”تم فکر مت کرو گل خان، تم نے پہلے ہی بہت کچھ کر دیا ہے۔“

”ام روٹی لائے گا۔ باقی خوراک آگے کے لیے رکھو۔“ گل خان نے کہا اور گھر چلا گیا اس کا گھر نزدیک ہی تھا۔ تاریکی میں کچھ وقت تھا۔ مارہ نے اپنا کیمرا نکالتے ہوئے کہا۔

”میں اس خوب صورت جگہ کے کچھ شاٹ لے لوں۔“

”میں آرام کروں گا۔“ ظفر نے کہا۔

”اور میں خود کو تروتازہ کروں گا۔“ عمر نے جوتے

موزے اتارتے ہوئے کہا۔ اس نے جیکٹ بھی اتار دی اور

صابن نکال کر پانی کی نالی کی طرف بڑھا جس کا پانی سیدھا

گلیخیر سے آ رہا تھا اس لیے تقریباً پکھلی برف بھی مگر اس نے

سچ عج عمر کو تروتازہ کر دیا۔ آج اس نے بہت دن بعد پاؤں

دھوئے تھے۔ منہ ہاتھ چھوٹے سے تولیے سے خشک کر کے

اس نے جیکٹ اور جوتے موزے پہنے اور اپنا خیمہ لگانے

لگا۔ ظفر ترپال بچھا کر لیٹا ہوا موبائل کے سینڈ فری سے کچھ سن

رہا تھا۔ عمر باغ سے باہر آیا تو اسے مارہ ذرا اوپر ایک ٹیلے

پر کیمرے سے گلیخیر کی تصویریں لیتی نظر آئی۔ وہ باغ کی

چوڑے پتھروں سے بنی منڈیر نما دیوار پر بیٹھ گیا۔ مارہ

نے اسے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر اپنی طرف بلایا۔ عمر اس کے

پاس پہنچا تو وہ بیچانی لہجے میں بولی۔ ”میرے خدا، ذرا

دیکھیں کیا منظر ہے۔“

سورج کی آخری کرنیں گلیخیر پر پڑ کر اسے مختلف

رنگ دے رہی تھیں اور وہ اس وقت قوس قزح بنا ہوا تھا۔ یہ

سارا منظر بس چند منٹ کا تھا اور مارہ مسلسل تصویریں لے

رہی تھی۔ پانچ منٹ بعد گلیخیر سنہری ہو گیا اور پھر اس کا نچلا

حصہ تاریک ہونے لگا۔ دس منٹ بعد یہ تاریکی اس چوٹی

تک پہنچ گئی جہاں سے گلیخیر شروع ہو رہا تھا۔ نیچے وادی

گہرے رنگ کے سائے میں آگئی تھی اور یہ سب واقعی سحر

انگیز تھا۔ مارہ نے کیمرا رکھا اور عمر سے پوچھا۔ ”ظفر کہاں

ہے؟“

”ترپال پر لینا ہے ہینڈ فری لگائے ہوئے۔“
 ”اسے اس جگہ بھی ایسی چیزوں کی پڑی رہتی ہے۔
 میں اس سے کہتی ہوں کہ ہم یہاں فطرت کو دیکھنے آئے
 ہیں۔ یہ سب تو ہمیں شہر میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔“
 ”کل رات بھی شاید تم لوگوں میں یہی بحث ہو رہی
 تھی؟“ عمر نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔
 ”نہیں وہ دوسرا مسئلہ تھا۔۔۔۔۔۔“ مارہ بولتے ہوئے
 رکی۔

”سوری میرا خیال ہے یہ تمہارا پرسل ہے۔“
 ”نہیں۔“ مارہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ”ظفر کو کہیں
 سے پتا چلا ہے کہ اس گاؤں کے اوپر کہیں قیمتی پتھر پائے
 جاتے ہیں۔ اس نے گل خان سے پوچھا تھا اور مجھے یہ بات
 اچھی نہیں لگی۔“

”میں نے بھی سنا ہے۔ لیکن اس علاقے میں تقریباً
 ہر جگہ ایسی اسٹوریز عام ہیں۔“
 ”ظفر کا کہنا ہے کہ اس نے کچھ پتھر دیکھے ہیں اور وہ
 بہت اعلیٰ درجے کے اور بہت قیمتی ہیں۔ بین الاقوامی معیار
 کے سمجھ لیں۔“

”ممکن ہے مگر اس قسم کے قصبے ننانوے فیصد صرف
 قصبے ہوتے ہیں اور ان میں حقیقت کا عنصر صرف ایک فیصد
 ہوتا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں نے ظفر کو منع کیا تھا
 کیونکہ یہاں دو سنگین واقعات ہو چکے ہیں اور مقامی لوگ
 باہر سے آنے والوں کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔“
 ”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”گل خان نے بتایا ہے۔“ مارہ نے جواب دیا۔
 ”یہی وجہ ہے سیاح اور ٹریڈرز اب یہاں سے جا رہے
 ہیں۔“

”شاید ان کی موجودگی میں یہ واقعات ہوئے ہیں۔
 اس لیے وہ واپس جا رہے ہیں۔ لیکن ہم ابھی آئے ہیں اس
 لیے ہم پر شک نہیں کیا جاسکتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس کے باوجود ہمیں
 احتیاط کرنی چاہیے۔ گل خان اچھا آدمی ہے مگر یہاں سب
 اس کی طرح اچھے نہیں ہوں گے۔“

عمر نے محسوس کیا کہ مارہ ذہین لڑکی تھی اور مثبت
 انداز میں سوچتی تھی۔ اگر ظفر قیمتی پتھروں کے چکر میں تھا تو
 یہ چکر اس کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ مارہ
 ٹھیک کہہ رہی تھی اس علاقے کے لوگ اچھے تھے مگر وہ بہت

سے معاملات میں سخت بھی تھے۔ جب وہ واپس آئے تو باغ
 میں ضیا بھی آچکا تھا۔ وہ اپنا ہوا سے بھرنے والا گدا بچھائے
 آرام کر رہا تھا۔ مارہ نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بالکل خالی سفر
 کر رہا ہے، میرا خیال ہے اس کے پاس کھانے کو بھی خاص
 نہیں ہے۔“

”مگر مجھے یہ غریب نہیں لگتا۔ ہو سکتا ہے اسے بالکل
 ہی بے سروسامانی کی عادت ہو۔“
 ”پتا نہیں کیوں یہ شخص مجھے اچھا نہیں لگا۔“

عمر نے موضوع بدل دیا۔ ”تم لوگوں کا کل کیا
 پروگرام ہے؟“

”گل خان کا کہنا ہے کہ کلیشیر کی طرف جانے کے
 لیے صبح سویرے جانا لازمی ہے کیونکہ دس گیارہ بجے تک
 راستے میں آنے والے نالوں میں پانی آجاتا ہے اور انہیں
 پار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک رات ایک دن اور اگلی رات ٹھہر کر
 ہم اسی طرح صبح سویرے واپس آسکتے ہیں۔“

”پھر کیا ارادہ ہے؟“
 ”مسلل دو دن سفر نے مجھے تو تھکا دیا ہے۔ پھر میں
 چاہتی ہوں کہ کل دن کی روشنی میں یہاں کے کچھ شائس لوں
 ورنہ کلیشیر سے واپسی کے فوراً بعد ہم یہاں سے روانہ ہو
 جائیں گے۔“

”گل خان راستہ جانتا ہے؟“

”ہاں وہی ہمیں لے جائے گا۔“

وہ اندر پہنچ گئے تھے اور مارہ اپنے خیمے کی طرف چلی
 گئی۔ وہ اب تک لی ہوئی تصاویر ایک یو ایس بی میں منتقل کر
 رہی تھی۔ کمرے کی میزوری ہائی ریزولوشن تصاویر کی وجہ
 سے جلد بھر جاتی تھی۔ عمر ضیا کے پاس بیٹھ گیا۔ ”لگتا ہے تم
 گھومتے پھرتے آئے ہو؟“

”ہاں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بھی بہت گھوم پھر
 رہے ہو۔“ ضیا کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ اس کا اشارہ یقیناً مارہ
 کی طرف تھا۔ ”یہ دونوں میاں بیوی ہیں؟“

”تم کیا سمجھتے ہو؟“

”میرا خیال ہے نہیں ہیں۔“

عمر نے آگے کچھ نہیں کہا۔ ضیا سگار پی رہا تھا اور اس
 کی پو یہاں کی نہایت شفاف ہوا میں بہت واضح محسوس ہو
 رہی تھی۔ کچھ دیر میں گل خان لکڑیاں لے آیا اور الاؤ
 جلانے لگا۔ الاؤ جلا کر اس نے پوچھا۔ ”صبح کا کیا پروگرام
 ہے؟“

”میرا ارادہ جانے کا ہے۔“ ظفر نے کہا۔

لاش اوپر جنگل سے ملی۔ دوسرا بچہ اس کے اگلے دن غائب ہوا اور وہ کھیلنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے اسے ایک باہر کے آدمی کے ساتھ جاتے دیکھا تھا اور اگلے دن اس کی لاش بھی جنگل سے ملی۔

”وہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ باہر کا آدمی تھا۔“

”حلیہ۔“ ظفر نے جواب دیا۔ مائرہ آگئی تھی اور رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے ٹن کھول کر قیمہ نکالا اور آلو قیمہ بنانے لگی۔ روٹی مکئی کی تھی اور خاصی بڑی تھی۔ عمر نے مشکل سے ایک کھائی تھی۔ گل خان نے چار روٹیاں بھجوائی تھیں جو ان کے لیے کافی تھیں۔ مائرہ نے کہا۔ ”مگر گل خان کا کہنا ہے کہ یہ جنات کی کارروائی ہے۔ تب گاؤں والے باہر سے آنے والوں کو کیوں الزام دے رہے ہیں؟“

ظفر ترپال سے اٹھ بیٹھا اور اپنے جے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”وہ دونوں کو آپس میں گڈمڈ کر رہے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جنات غیر ملکیوں کے روپ میں یہاں آئے تھے۔“

”سوال یہ ہے کہ بچوں سے کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“ مائرہ نے کہا تو ظفر نے خیال ظاہر کیا۔

”جاہل لوگ اس بارے میں بے شمار مفروضے بنا سکتے ہیں کہ بچوں نے بے خیالی میں کسی جن کے بچے کو نقصان پہنچایا یا کسی جگہ کو ناپاک کیا۔ ایسی کوئی بھی وجہ پیش کی جاسکتی ہے۔ جبکہ یہ کرمیل کیس ہے۔ بچے انسانوں نے مارے ہیں اور اس کے پیچھے کوئی وجہ ہے۔“

ضیا نہیں آیا تھا۔ مائرہ اور ظفر نے بھی کھانا کھا لیا اور کافی بنانے کی ذمہ داری مائرہ نے لی۔ اس نے بہت اچھی کافی بنائی تھی۔ وہ الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ مائرہ نے کہا۔ ”ضیا کہاں گیا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ ظفر بولا۔ ”وہ اسے گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہیں وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گیا ہو۔“

ظفر گیا تو مائرہ نے کہا۔ ”حیرت ہے اسے ضیا کی اتنی فکر ہے۔“

”فکر کرنی پڑتی ہے۔ بے شک ہم اجنبی ہیں مگر اس علاقے میں ایک دوسرے کا خیال رکھنا ضروری ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”آپ نے کافی اچھی بنائی ہے۔“

”شکریہ۔“ مائرہ خوش ہو گئی۔ ”آپ بھی صبح چلیں گے؟“

”فیک اے ام صبح آجائے گا پر روشنی سے پہلے جانا اے۔“

”میں تھک گئی ہوں اور آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

مائرہ نے احتجاج کیا۔ ”ہم پرسوں بھی جاسکتے ہیں۔“

”آرام ہم واپس آکر بھی کر سکتے ہیں۔“ ظفر نے

حتی لہجے میں کہا اور گل خان کی طرف دیکھا۔ ”تم صبح آجاؤ ہم تیار ملیں گے۔“

مائرہ نے ظفر کو غصے سے دیکھا اور پاؤں پٹختی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ گل خان نے سر ہلایا۔ ”اب ام صبح آئے گا۔ روٹی امارا بیٹا لائے گا۔“

عمر نے اپنے سامان سے لائٹ نکالی اور اس کی روشنی میں اپنا سامان دیکھنے لگا۔ خوراک کا جائزہ لیا اس کے پاس ٹن بند اور خشک خوراک تھی۔ اس میں خشک کیا ہوا گوشت بھی تھا، اس نے گوشت کے چند پارچے نکالے اور انہیں الاؤ پر بھوننے لگا۔ ضیا نے گل خان کے جانے کے بعد کہا۔ ”گاؤں والے سبے ہوئے ہیں۔“

”ان کے دو بچے مارے گئے ہیں۔“

”ان کا خشک باہر سے آنے والوں پر ہے۔“ ظفر

نے کہا۔

”لیکن ہم تو ابھی آئے ہیں۔“ عمر نے کہا اور بھن جانے والے ٹکڑے کو چکھ کر دیکھا۔ ”جو پہلے تھے وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ راستے میں مجھے کم سے کم ایک درجن افراد ملے۔“

”مجھے زیادہ ملے۔“ ضیا نے کہا۔ ”اس کا مطلب

ہے کہ گاؤں والے مختلف موڈ میں ہیں۔ ورنہ یہ لوگ سیاہوں کو پسند کرتے ہیں کہ ان سے ان کی روزی چلتی ہے۔“

”تب ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔“ عمر نے کہا۔ ”اپنے

کام سے کام رکھنا ایسے موقع پر سب سے بہترین پالیسی ثابت ہوتی ہے۔“

”ان معاملات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ ضیا

نے کہا اور اٹھ کر باغ سے باہر نکل گیا۔ آدھے گھنٹے بعد گل

خان کا بیٹا روٹی لے کر آیا، یہ تقریباً دس سال کا خوب صورت اور صحت مند بچہ تھا۔ عمر کو حیرت ہوئی کہ گل خان نے

اسے باہر کیوں آنے دیا جبکہ گاؤں کے سارے بچے اپنے

گھروں میں قید تھے۔ شاید اس لیے کہ اس کا گھر بالکل

پاس ہی تھا۔ اس کے جانے کے بعد ظفر نے کہا۔

”گل خان نے بتایا ہے کہ پہلا بچہ آج سے آٹھ دن

پہلے چشمے پر پانی لینے گیا اور غائب ہو گیا۔ اگلے دن اس کی

عمر بچکچایا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟ گل خان تم لوگوں کا پورٹ اور گائیڈ ہے۔“

”تو کیا ہوا؟“ مارہ نے کہا۔ ”ہم گروپ بنا کر سفر کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”ظفر اس بات کو محسوس نہ کرے۔“

”آپ اس کی فکر مت کریں۔“ مارہ اعتماد سے بولی تو عمر نے سر ہلایا۔ وہ راضی تھا۔ کیونکہ صبح سویرے اٹھنا تھا اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ اب سو جائے۔ مگر وہ خیمے میں اس وقت گیا جب ظفر اور ضیا آگئے۔ دونوں خاموش تھے اور ان کے منہ بنے ہوئے تھے۔ ضیا نے اپنے حصے کی روٹی پر مکھن لگایا اور کھا کر گدے پر لیٹ گیا۔ مارہ بھی اپنے سلیپنگ بیگ نما خیمے میں جا چکی تھی۔ سب سے آخر میں ظفر سونے کے لیے لیٹا۔ وہی سب سے پہلے اٹھا تھا اور اس نے عمر کا خیمہ ہلایا۔

”اٹھ جاؤ اگر ہمارے ساتھ چلنا ہے تو؟“

عمر نے گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ خیمے سے باہر آیا اور اس نے سب سے پہلے خیمہ پیک کیا۔ شتے کے لیے گل خان کچے لے آیا تھا اور مارہ نے چائے تیار کی۔ عمر، ظفر کے ساتھ اس کا سامان پیک کرانے لگا۔ وہ صرف خیمے اور ضروری سامان لے جا رہے تھے باقی سامان یہاں گل خان کے گھر چھوڑ کر جاتے کیونکہ گدھا ان کے ساتھ نہیں جاسکتا تھا۔ گل خان کے ساتھ اس کا بیٹا آیا تھا۔ اضافی سامان وہ واپس لے گیا اور جب وہ روانگی کے لیے تیار ہو رہے تھے تو لڑکا بھی آگیا۔ عمر کو پہلی بار خیال آیا اور اس نے گل خان سے پوچھا۔ ”تمہارا بیٹا بھی چلے گا؟“

”سومت خان بڑا ادا گیا اے۔“ گل خان فخر سے بولا۔ ”اس اگست میں گیارہ سال کا او جائے گا۔ تین سال بعد اس کا شادی بنائے گا تب تک یہ کمانے والا او جائے گا۔ ابھی سے کام سیکے گا تو کمائے گا۔“

مارہ نے حیرت سے کہا۔ ”تم صرف چودہ پندرہ سال کی عمر میں اس کی شادی کر دو گے؟“

”مارے اور بچہ لوگ جیسے ای شادی کے قابل ہوتا اے ان کا شادی بنا دیا جاتا اے۔“ گل خان نے کہا اور سامان کا بیگ اپنی پشت پر لادنے لگا۔ مارہ اور ظفر نے ہلکا پھلکا سامان اٹھایا ہوا تھا جیسے پانی کی بوتلیں اور کیمرا وغیرہ۔ ضیا چادر اوڑھے سو رہا تھا اور یہ ظاہر اس کا ارادہ کہیں جانے کا نہیں تھا۔ وہ پانچوں سورج نکلنے سے پہلے وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ عمر نے اپنا سارا سامان ساتھ رکھا تھا۔ باغ

سے نکلنے کے بعد اس نے ظفر سے پوچھا۔ ”ضیا تمہیں کہاں ملا تھا؟“

”ادھر گاؤں کی مسجد میں۔“ ظفر نے جواب دیا۔ ”وہ لوگوں سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے منع کیا تو بک بک کرنے لگا۔“

اب عمر سمجھا کہ رات ان دونوں کا منہ کیوں بنا ہوا تھا۔ جب تک وہ اوپری جنگل میں پہنچے مشرق سے سورج نمودار ہونے لگا تھا اور آس پاس کا منظر واضح ہو رہا تھا۔ گل خان نے اشارے سے بتایا۔ ”پیلے بچہ کالا لاش اور ملا تھا۔“

زمین پر گہرے رنگ کے دھبے تھے اور ایسے ہی دھبے آس پاس درختوں کے تنوں پر تھے۔ یہ یقیناً خون کے دھبے تھے۔ شاید اسی لیے یہ کہا جا رہا تھا کہ جنوں نے بچے کو درختوں سے ٹکرا کر مارا تھا۔ مارہ دکھی ہو گئی تھی اور ظفر بے پروائی سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔ عمر نے پوچھا۔ ”گاؤں والوں نے پولیس میں رپورٹ کرائی؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”کرائی تھی پر وہ کیا کر سکتا اے۔ یہ جنوں کا چکرا اے۔“

یہ جگہ گاؤں سے خاصے فاصلے پر تھی۔ بچہ از خود یہاں نہیں آسکتا تھا۔ اسے کوئی لے کر آیا تھا۔ دوسرے بچے کی لاش اس سے ذرا آگے ملی تھی اور یہاں بھی زمین اور درختوں پر خون آلود نشانات تھے۔ دونوں بچوں کی عمریں سات آٹھ سال تھیں۔ عمر اور گل خان ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سومت مارہ کے ساتھ تھا اور ظفر سب سے پیچھے تھا۔ عمر، گل خان سے سوالات کر رہا تھا اور وہ بتا رہا تھا۔ دونوں بچوں کے باپ پورٹ اور گائیڈ تھے مگر نکلے تھے۔ کام کم کرتے تھے اور زیادہ تر گھر میں پڑے رہتے تھے اس کے باوجود ان کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ گل خان نے سرگوشی میں کہا۔ ”اور مشور اے دونوں بندوں کو قیمتی پتھر کا جگہ پتا اے۔ وہ اور سے پتھر نکال کر شہر لے جا کر بیچتا اے۔“

”کسی نے ان کے پاس پتھر دیکھے ہیں؟“

گل خان نے سر ہلایا۔ ”کئی لوگ نے دیکھا اے۔“

”جن لوگوں کو پتا ہے وہ دوسروں سے چھپاتے ہوں گے پھر ان دونوں کو کیسے پتا چلا کہ پتھر کہاں سے ملتے ہیں؟“

اس سوال کے جواب میں گل خان ہچکچایا۔ ”پتا تقریباً سب کو اے، پر ہر کوئی اور نہیں جانتا۔ پتھر کلیجہ سے نکلنے والے پانی کے آس پاس ملتا اے، اور بوت خطرہ ہوتا اے۔“

حصہ دوراں

والے راستے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور سے راستا مشکل اے۔ دیک کر آرام سے چلنا اوگا۔“

اب وہ کلیئیر کے نزدیک تھے۔ گل خان نے سومت کو اپنے پاس کر لیا تھا۔ اس کے پیچھے مارہ تھی۔ پھر ظفر اور سب سے آخر میں عمر تھا۔ یہاں سے راستہ ایک پتلی سی ڈھلان کی صورت میں اوپر جا رہا تھا۔ اس کے ایک طرف پہاڑ تھا جس کے اوپر کلیئیر جھکا ہوا تھا اور دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر بھی خاصا سبزہ تھا البتہ بڑے درخت یہاں کم دکھائی دے رہے تھے۔ زیادہ تر جھاڑیاں تھیں جن میں رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ بعض جھاڑیاں اتنی رنگین تھیں کہ بجائے خود ایک بڑا پھول لگ رہی تھیں۔ راستہ باریک بجری سے بنا ہوا تھا اور پاؤں رکھنے پر یہ بجری پھسلتی اور کرکراتی تھی۔ دونوں صورتوں میں اس پر سفر کرنے والے کو بہت الجھن ہوتی۔ سومت خان کچھ ہی دیر میں مارہ سے قریب ہو گیا تھا اور وہ اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ جہاں مشکل پیش آتی وہ اسے اپنا سہارا پیش کر دیتا تھا۔ حالانکہ وہ چھوٹا تھا مگر مارہ اس کا دل رکھنے کے لیے ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا سہارا قبول کر لیتی تھی۔

عمر کی ساری توجہ راستے اور اپنے توازن پر تھی کیونکہ اس کی پشت پر تقریباً پچیس کلو گرام وزن تھا۔ اس کے ساتھ وہ اس خطرناک ڈھلان پر آس پاس کے مناظر سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اسی وقت آس پاس دیکھتا تھا جب اسے کھڑے ہونے کے لیے جگہ ملتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ کلیئیر کے پاس ہو رہے تھے۔ نالائیچے نشیب میں چلا گیا تھا اور وہ اس کے اوپر سفر کر رہے تھے۔ یہاں سے بائیں طرف مڑے اور کلیئیر کے دہانے سے دور جانے لگے۔ یہاں نالے کے پار ایک چھوٹا جنگل تھا۔ اس سے آگے کہیں کلیئیر کا دہانہ تھا۔ گل خان سب سے آگے ایک پہاڑی کے سامنے کھڑا تھا جس کی ڈھلان چھوٹے گول پتھروں سے بھری تھی اور انہیں اس پر چڑھنا تھا۔ عمر آگے آیا اور اس نے گل خان سے کہا۔ ”سامان سمیت اس پر چڑھنا ممکن نہیں ہے۔“

”پیلے ام جاتا اے۔“ اس نے بیگ اتارا اور خود پتھروں پر پاؤں مارتا ہوا آسانی سے اوپر چلا گیا۔ وہ ایسے راستوں اور ڈھلانوں کا عادی تھا۔ اوپر جا کر اس نے نیچے رسی پھینکی اور انہوں نے باری باری اپنا سامان اوپر بھیجا۔ مگر سامان گھسٹتا ہوا گیا تھا اور ان کے لیے اس طرح گھسیٹ کر جانا ممکن نہیں تھا۔ اگر وہ رسی کا سہارا لیتے تو پیروں تلے سے

گل خان کی بات نے عمر کو چونکا دیا۔ ”تم بھی جانتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”فیک سے نہیں پر ام کوشش کرے تو تلاش کر سکتا اے۔“

”تب تم نے تلاش کیوں نہیں کیا؟“

گل خان کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے جواب دیا۔ ”ام اس طرح سے پیسا کمانے کو اچا نہیں سمجھتا اے۔ ام محنت کر کے کماتا اے۔ یہ فیک طریقہ اے۔“

عمر نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ”تمہاری سوچ بہت اچھی ہے۔ لیکن بہت کم لوگ اس طرح سوچتے ہیں۔“

”پر ام سوچتا اے۔ ام نے دیکھا جو لوگ آسانی سے پیسا کماتا اے۔ اس کا پیسا سات پریشانی بی لاتا اے۔ اماں باب نے ام کو یہ سوچ بتایا۔ اب ام اپنے بیٹے کو بتاتا اے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ان لوگوں کے بچے مارے گئے جو قیمتی پتھر لاتے ہیں اور اس سے کماتے ہیں۔“

”سامنے کا بات اے۔“ گل خان نے آہستہ سے کہا۔ ”اب گاؤں کا سب لوگ یہ بات کرتا اے۔“

وہ جنگل عبور کر کے اس کے آخری حصے میں پہنچ گئے تھے۔ سورج نکل آیا تھا اور اب وادی اور پہاڑ پوری طرح روشنی میں تھے۔ جنگل جہاں ختم ہو رہا تھا وہاں سے کلیئیر کا آغاز تھا۔ یہ کہنا زیادہ درست ہوتا کہ جہاں کلیئیر ختم ہو رہا تھا وہاں سے جنگل کا آغاز تھا۔ یہاں بلندی سطح سمندر سے دس ہزار فٹ تھی۔ جنگل ختم ہوتے ہی ان کا واسطہ اس نالے سے پڑا جس سے کلیئیر کا پانی نیچے وادی تک جاتا تھا۔ رات میں سردی سے برف پگھلنا بند ہو جاتی تھی اور نالے میں پانی نہیں ہوتا تھا، جیسے ہی سورج نکلتا برف پگھلنا شروع ہوتی اور نالے میں پانی آ جاتا۔ اس کی چوڑائی پندرہ سے بیس فٹ اور گہرائی چھ فٹ تک تھی۔ ڈھلان ہونے کی وجہ سے اس میں پتھر کم تھے۔ اس لیے پانی زیادہ ہونے کی صورت میں اسے عبور نہیں کیا جاسکتا تھا، اسے صرف اسی وقت عبور کیا جاسکتا تھا جب اس میں پانی نہ ہو یا بہت کم ہو۔ اس وقت پانی بہت کم تھا۔ انہوں نے اسے آٹھ بجے عبور کر لیا۔ گل خان نے بتایا۔

”دس بجے اور پانی بوت او جاتا اے۔“

”شام میں پانی کب کم ہوتا ہے؟“ یہ سوال مارہ نے کیا تھا۔

”رات بارہ بجے تک۔“ گل خان نے اوپر جانے

متحرک نکل جاتے اور وہ کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے
 ری کو صرف حفاظتی تدبیر کے طور پر رکھا کہ لڑھک کر پتلی
 پگ ڈنڈی کے پار کھائی میں نہ چلے جائیں۔ سومت خان
 نے باپ کی بیرونی کی اور اسی کی طرح پاؤں مارتا اور چلا
 گیا۔ عمر کو بھی خاص مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ وہ ایک دو مقام
 پر ذرا سا ڈمکایا تھا مگر فوراً سنبھل گیا تھا۔ مارہ بھی اس کی
 طرح ڈمکائی مگر گری نہیں تھی۔ البتہ ظفر کو سامان کی طرح
 اوپر کھینچتا پڑا تھا۔ اس نے جتنی بار کوشش کی اتنی ہی بار گرا
 تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ سب پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے تھے
 اور ظفر ہانپ رہا تھا۔ اس جگہ سے صحیح معنوں میں کر توک
 کلیخیر کا آغاز ہو رہا تھا۔ گل خان نے اشارہ کیا۔

”یہ اور اس کا چوٹا والا برف اے۔ بڑا برف اوپر
 اے۔ اس پہاڑی کے پار۔۔۔“

وہ جس پہاڑی پر چڑھ کر آئے تھے اس کے اور اس
 سے اوپر والی پہاڑی کے درمیان کلیخیر کا ایک حصہ گھومتا ہوا
 نیچے جا رہا تھا۔ یہاں یہ نصف کلومیٹر طویل اور کوئی ڈیڑھ
 سے دو سو گز چوڑا تھا۔ مارہ نے اشارہ کیا۔ ”ہمیں برف پر
 جانا ہوگا؟“

”برف ٹیک نہیں اے۔“ گل خان نے انکار کیا۔
 ”ام اور پہاڑی سے اوپر جائے گا۔“

”یہاں سے کیوں نہیں؟“ ظفر نے پوچھا تو عمر نے
 جواب دیا۔

”یہاں برف نرم ہے اور اس کے نیچے خلا ہو سکتے
 ہیں۔ اس پر چلنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“

”مگر پہاڑی تک جانے کے لیے بھی تو ہمیں اس
 خطرے سے گزرنا ہوگا۔“

”پانچ سو میٹرز کے مقابلے میں ڈیڑھ سو میٹرز کا سفر
 یقیناً کم خطرناک ہوگا۔“ عمر نے اپنے رک سک سے ری کا
 بندل نکالا۔ ”سب ایک ری سے منسلک ہو جائیں تاکہ کوئی
 پوشیدہ گڑھے میں گرے تو اسے بچایا جاسکے۔“

سب اس ری سے منسلک ہو گئے اور آپس میں پانچ
 پانچ میٹرز کا فاصلہ دے کر کلیخیر سے گزرنے لگے۔ یہاں
 جمی گل خان سب سے آگے تھا۔ وہ اپنی چھری کی مدد سے
 آگے برف کی مضبوطی کا اندازہ لگاتا اور پھر آگے قدم رکھتا
 تھا۔ اس کے پیچھے سومت، پھر مارہ و ظفر اور سب سے آخر
 میں عمر تھا۔ انہوں نے پھونک پھونک کر کلیخیر کا یہ حصہ بخیر
 خوبی طے کر لیا۔ مگر اگلا مرحلہ بھی کم مشکل نہیں تھا۔ دوسری
 پہاڑی بھر بھری مٹی پر مشتمل تھی اور اس پر قدم بجانا محال

تھا۔ سب سے اہم بات کہ سرے سے کوئی راستہ ہی نہیں
 تھا۔ بس نہایت ترچھی ڈھلان پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھتے
 چلے جائیں۔ کیونکہ کہیں رکنے یا لڑکھڑانے کا مطلب تھا نیچے
 واپسی۔ یہاں کھائی میں جانے کا امکان تو نہیں تھا مگر سوگزی کی
 بلندی سے لڑھک کر نیچے آنے کے بعد آدمی کپڑے جھاڑ کر
 فوری کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مارہ نے انکار کیا۔ ”میں اس
 پر نہیں چڑھ سکتی۔“

گل خان نے کہا۔ ”اس پر ری سے بی نہیں چڑھ سکتا
 اے۔“

خلاف توقع ظفر نے اسے حوصلہ دیا۔ ”چڑھ سکتے
 ہیں۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔“

”اگر نہیں چڑھ سکے تو اس کا مطلب ہوگا یہاں سے
 واپسی۔“ عمر نے کہا تو گل خان نے واضح کیا۔

”واپسی کل صبح اودگا۔ ابی نالے میں پانی آ گیا اے۔
 اور کیمپ لگانے کا جگہ لی نہیں اے۔“

گل خان کی بتائی صورت حال خاصی سنگین تھی۔ اس
 لیے مارہ نے خود کو اوپر چڑھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے
 پہاڑی کی ایک ڈھلان کی طرف اشارہ کیا جو کلیخیر کے عین
 اوپر تھی اور ذرا کم ترچھی تھی۔ ”ادھر سے چلا جائے تو کیسا
 رہے گا؟“

”یہ بھی مشکل ہے اور لڑھکنے کی صورت میں آدمی
 سیدھا کلیخیر پر گرے گا۔“ عمر نے جائزہ لے کر کہا۔ مگر ظفر

نے مارہ کی تائید کی تو مجبوراً گل خان اور عمر بھی راضی ہو
 گئے۔ گل خان اور سومت آرام سے چلے گئے۔ عمر، مارہ کے

پیچھے تھا۔ ظفر سب سے پیچھے تھا۔ ڈھلان پر تیز قدم رکھتا پڑ
 رہے تھے کیونکہ دو قدم اوپر جانے کے بعد آدمی پھسل کر ایک

قدم واپس بھی آتا تھا۔ یہ نہایت مشکل اور مشقت بھرا کام
 تھا جو انہیں سوگزی تک مسلسل کرنا تھا بلکہ اس کٹاؤ نما ڈھلان پر

یہ زیادہ طویل تھا۔ عمر کی نظریں مارہ کے قدموں پر تھیں۔
 اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ اس ڈھلان پر لازمی لڑکھڑائے

۔۔۔ گی اور وہ خود کو اس کے لیے پہلے سے تیار کر رہا تھا۔ اس
 کی چھٹی حس کا اشارہ درست ثابت ہوا جب مارہ پہاڑی کی

چوٹی کے پاس پہنچ کر لڑکھڑائی۔ اس کا ایک پاؤں پھسلا اور
 دوسرا جمار ہا، نتیجے میں وہ گری اور سیدھی کٹاؤ کی طرف گئی۔

عمر آگے کی طرف گرا، اس کے بائیں ہاتھ میں نوکدار
 کلہاڑی تھی۔ اس نے اسے ڈھلان پر مارا اور دائیں ہاتھ

سے مارہ کی کمر سے بندھی بیلٹ سے نکلے ری تھام لی۔ وہ
 جھٹکے سے رکی اور فوراً ہی عمر کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں

مارہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اوپر سرکنے لگی۔ وہ ڈھلان سے کسی چھپکلی کی طرح چٹی ہوئی تھی۔ گل خان آگے آیا اور اس نے رسی پھینکی جو مارہ نے پکڑ لی پھر اس نے اسے اوپر کھینچ لیا۔ پھر رسی کے سہارے ہی عمر اور ظفر بھی آئے تھے کیونکہ چوٹی کے اس آخری حصے میں ڈھلان زیادہ تھی اور یہاں ریت پھسل رہی تھی۔ چوٹی اوپر سے سطح تھی اور اس کا ایک سرا نیچے آتے گلیشیر سے جا نکلتا تھا۔ پہاں بلندی بارہ ہزار فٹ سے اوپر تھی۔ ہوا ہلکی اور بہت سخی تھی۔ سانس لینے پر لگتا تھا سرد ہوا سینے میں جا رہی ہے۔ ذرا سی جدوجہد نے ان سب کو ہانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دو پہر ہو چکی تھی اور ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا۔۔۔۔۔ ان کو کچھ دیر وہاں قیام اور لٹچ کرنا تھا۔ عمر نے اپنے لیے فرائی آلو کا ایک ٹن نکالا تھا۔ مارہ اور ظفر بھی لٹچ کرنے لگے۔ گل خان اپنے کھانے کے لیے میٹھی روٹی لایا تھا۔ عمر الگ بیٹھا ہوا تھا۔ مارہ اس کے لیے کافی لے آئی۔

”شکریہ۔“ مارہ نے کافی دینے ہوئے کہا۔

”فارگیٹ اٹ، میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔“

عمر نے کافی کا گم لیا۔ کھانے کے بعد گل خان اور اس کا بیٹا

سے گرفت میں لے لیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ عمر ڈھلان پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ کلہاڑی نے اسے سرکنے سے روکا ہوا تھا مگر مارہ کا وزن اسے کٹاؤ کی طرف کھینچ رہا تھا۔ مارہ کے پاؤں خلا میں تھے اور سینے تک اس کا جسم کٹاؤ سے ٹکا ہوا تھا۔ عمر اسے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنا ایک پاؤں اوپر لے آئے تاکہ بوجھ کم ہو ورنہ وہ دونوں نیچے چلے جائیں گے۔ مارہ بدحواس ہو رہی تھی اور کئی بار کہنے کے بعد عمر کی بات اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ اس نے کوشش کر کے اپنا دایاں پاؤں ڈھلان پر رکھا اور اسی لمحے عمر کی کلہاڑی ڈھلان سے نکل آئی۔ مارہ جو ایک پاؤں اوپر لے آئی تھی جھٹکے سے اس کا پاؤں دوبارہ نیچے گیا اور اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

عمر بھی لڑکھڑایا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ نیچے جاتا اس نے پھرتی سے کلہاڑی دوبارہ ڈھلان پر ماری۔ وہ ایک بار پھر رک گیا تھا۔ اس بار مارہ نے ہوش سے کام لیا۔ وہ ممکن حد تک کٹاؤ سے چپک گئی اور آہستہ سے پاؤں اوپر لائی۔ جیسے ہی اس کا ایک پاؤں کنارے پر آیا۔ عمر پر اس کا وزن کم ہوا تھا اور اس نے اسے اوپر کھینچ لیا۔ وہ اب کنارے لیٹی ہانپ رہی تھی۔ مگر خطرے کی حد سے نکل آئی تھی۔ عمر نے کہا۔ ”اسی طرح لیٹے لیٹے اوپر سرکو، یہاں اٹھنا

ہر شمارہ خاص نمبر

لیکن خاص نمبر کی بات ہی کچھ اور ہے

سرگزشت

نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری 2016ء

پلاسٹک سرائی

انتہائی چونکا دینے والے، حیرت زدہ اور لرزادینے والے واقعات

ایک ایسا شمارہ جسے آپ مجلد کر کر رکھنے پر مجبور ہو جائیں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر یہ شمارہ مختص کرالیں

ٹیلے سے کچھ چٹن رہے تھے۔ مارہ نے پوچھا۔ ”گل خان سے آپ کی کیا بات ہوئی تھی؟“

”کب؟“

”جب آپ دونوں جنگل میں تھے۔“ مارہ بولی۔

”میں ذرا فاصلے پر تھی لیکن مجھے لگا کہ آپ دونوں کے درمیان کسی خاص موضوع پر بات ہو رہی ہے۔“

”موضوع خاص نہیں تھا۔ ہم بچوں کے قتل پر بات کر رہے تھے۔ گل خان کا خیال ہے کہ بچوں کا قتل اصل میں ان کے باپ کی وجہ سے ہوا ہے جو کہیں سے قیمتی پتھر لاتے ہیں اور اسے فروخت کر کے پیسے کماتے ہیں۔“

مارہ چونکی۔ ”کسی نے بچوں کو قیمتی پتھروں کے پیچھے قتل کیا ہے؟“

”نہیں، گل خان اسے مکافاتِ عمل کہہ رہا ہے، اس کا نقطہ نظر ہے کہ آسان پیسا آزمائشیں لاتا ہے اور دیکھا جائے تو وہ غلط نہیں کہہ رہا ہے جب آدمی کے پاس بنا محنت کے پیسا آتا ہے تو وہ اپنے ساتھ نقصان بھی لاتا ہے۔“

مارہ نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”میرا نہیں خیال کہ آپ جیسا آدمی اس طرح سوچتا ہوگا۔“

”سیدھی بات تو کوئی بھی سوچ سکتا ہے۔“

”اگر ان بچوں کے باپ قیمتی پتھر نکال رہے تھے تو اس سے کسی کا کیا نقصان ہو رہا تھا۔“

”سچی بات ہے کہ میں نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا۔“ عمر نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میرے نزدیک یہ ایک ضمنی اور غیر متعلق معاملہ ہے۔“

”بعض اوقات ضمنی اور غیر متعلق معاملات بھی متعلق ہو جاتے ہیں۔“

”اگر ایسا ہوا تو دیکھا جائے گا۔“ عمر نے کہا اور خالی مگ اسے واپس کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ گل خان کے پاس آیا جو بیٹے کے ہمراہ ٹیلے سے جڑی بوٹیاں چن رہا تھا۔ عمر کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

”صیب یہ بوت کام کا بوٹی اے۔ یہ دیکھو اس سے سردی کا علاج اوتا اے۔“ اس نے ایک عتابی پتوں والی بوٹی دکھائی۔ ”جب کسی کو سردی لگتا اے تو اسے دودھ میں ملا کر دیتا اے سردی ٹیک اوجاتا اے۔“ پھر اس نے گول گوندی جیسے پھل دکھائے۔ ”اسے کھانے سے جوڑ کا درد نہیں ہوتا۔ بوڑا لوگ اسے کھا کر ٹیک اوجاتا اے۔ ام اپنا باپ کے واسطے لے کر جاتا۔“

دونوں باپ بیٹے بوٹیاں جمع کر کے انہیں الگ الگ

تھیلوں میں ڈال رہے تھے۔۔۔۔۔ جڑی بوٹیوں سے فارغ ہو کر گل خان رات کو آگ جلانے کے لیے خشک جھاڑیاں جمع کر رہا تھا۔ لکڑی یہاں بھی نہیں تھی مگر سوکھ جانے والی جھاڑیاں تھیں۔ وہ کچھ لکڑی نیچے سے لایا تھا اور کچھ یہاں سے خشک ہو جانے والے چھوٹے پودے جمع کر لیے تھے۔ عمر اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس نے گل خان سے پوچھا۔ ”اس میں کس طرف سے جانا ہے؟“

”اور کلیخیر سے۔“ اس نے کہا اور دور چوٹی کے دامن کی طرف اشارہ کیا۔ ”شام تک اور ر کے گا اور رات واپس اور ر کے گا۔“

”رات ادھر کیوں نہیں رک سکتے؟“

”اور رات سردی بوت ہوتا۔ آپ ام برداشت نہیں کر سکتا۔“

”کلیخیر کا دہانہ کہاں ہے؟“

”اور کٹاؤ کے نیچے جد رہا مارہ بی بی لنگ گیا تھا۔“

یہ اصل میں کر توک چوٹی کا بیس کیمپ تھا اور عمر وہیں تک جانا چاہتا تھا مگر اس کے لیے ایک کلومیٹر چوڑے کلیخیر پر سے گزرنا پڑتا اور یہ اس سفر کا سب سے خطرناک حصہ تھا۔ گل خان کا کہنا تھا کہ یہ نچلے کلیخیر سے کم خطرناک تھا کیونکہ یہاں برف سخت اور جمی ہوئی تھی مگر اس کی چوڑائی زیادہ تھی اور راستے میں گڑھوں سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ انہیں رسی کی مدد سے اس کے پار جانا تھا۔ ڈیڑھ بجے وہ روانہ ہوئے۔ گرمی سے برف نرم پڑ گئی تھی اور ان کے پیروں تلے دب رہی تھی۔ سب نے اسٹک لی ہوئی تھیں اور آگے بڑھنے سے پہلے وہ اس سے برف دبا کر دیکھتے تھے کہ اس کے نیچے خلا تو نہیں ہے۔ کلیخیر کے اندر ندیاں رواں تھیں جن میں پانی بہنے کی آواز باہر تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ ندیاں مل کر ایک دریا کی صورت میں کلیخیر کے دہانے سے باہر آئیں اور نیچے موجود نالے سے اس کا پانی کر توک گاؤں تک جاتا تھا۔

احتیاط کی وجہ سے آگے بڑھنے کی رفتار سست تھی اور کلیخیر پر سردی زیادہ تھی۔ ان کے ہاتھ اور چہرے سن ہوئے جا رہے تھے۔ اوپر سے تیز دھوپ انہیں جلا رہی تھی۔ عمر اور بانی سب نے اپنا سامان سطح چوٹی پر چھوڑ دیا تھا اور اس وقت ہلکے ہو کر چل رہے تھے۔ عمر کی ساری توجہ برف پر تھی اس کے باوجود اچانک ہی اس کے پیروں تلے برف چٹکی اور وہ بے ساختہ پیچھے ہٹا۔ اس کے پیچھے ہٹتے ہی برف کا ایک ٹکڑا اندر جا گرا تھا۔ گل خان اس سے بچ کر گزرا تھا اور عمر کا اس پر پاؤں آ گیا تھا۔ اس نے نمودار ہونے

والے خلا کے کنارے اسٹک ماری تو مزید برف اندر گری تھی۔ اس نے مڑ کر ظفر اور مارہ کو اشارہ کیا کہ وہ اس سے بچ کر آگے جائیں۔ وہ خود بھی گڑھے سے دور رہ کر آگے بڑھا تھا۔ مارہ نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اندر جھانکا اور خوف زدہ ہو گئی تھی۔ کلیخیر پار کرنے کے بعد اس نے سستاتے ہوئے بتایا کہ گڑھے کے اندر تاریکی تھی اور اس تاریکی میں عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔ ظفر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ بچوں کے قاتل جنات اسی کلیخیر کے گڑھوں میں رہتے ہوں۔“

سومت کچھ دور بیٹھا ہوا تھا۔ مارہ نے ظفر کو گھورا۔

”تمہیں بچے کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔“

”تم فکر مت کرو سومت بہادر بچہ ہے۔“ ظفر نے بدستور طنزیہ انداز میں کہا۔ ”یہ جنات سے نہیں ڈرتا۔“

”ام کسی سے نہیں ڈرتا۔“ سومت نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کر اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔ اس نے اتنی سردی میں بھی ایک معمولی سویٹر اور ملیشیا کی شلوار ٹیص پہنی ہوئی تھی۔ رات گزارنے کے لیے گل خان بھیڑ کے بالوں سے بنے کمرے کے ساتھ لایا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے اس کے پاس پلاسٹک شیٹ تھی۔ مارہ کو اس کی فکر تھی، اس نے عمر سے کہا۔

”سومت رات کیسے گزارے گا، اس کے پاس تو سردی سے بچاؤ۔۔۔ والا لباس بھی نہیں ہے۔“

”وہ اس سردی کا عادی ہے اگر وہ عادی نہ ہوتا تو گل خان اسے یہاں نہ لاتا۔“ عمر نے مارہ کو تسلی دی مگر اس کی فکر کم نہیں ہوئی۔ وہ ڈھائی بجے یہاں پہنچے تھے اور گل خان نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر موسم ٹھیک رہا تو وہ پانچ بجے تک یہاں رکھیں گے۔ دوسری صورت میں موسم کی خرابی نمودار ہوتے ہی وہ واپسی کی راہ اختیار کریں گے۔ کیونکہ اگر وہ یہاں پھنس گئے تو ان کے لیے آنے والی رات بہت مشکل ثابت ہو سکتی تھی۔ کچھ سستانے کے بعد مارہ نے اپنا کیمرا بیگ اٹھایا اور اس میں سے کیمرا اور دوسرا سامان نکالنے لگی۔ یہاں تصویر لینے کے لیے وہ پاور لینس کے ساتھ ٹرائی پوڈ بھی لائی تھی۔ کیمرے کی اضافی بیٹریاں سولر چارج میں چارج ہونے کے لیے لگا دی تھیں۔ یہاں کہیں بجلی نہیں تھی اس لیے وہ موبائل اور کیمرے کی بیٹری چارج کرنے کے لیے سولر چارج لائی تھی جو سورج کی روشنی کو بجلی میں تبدیل کر کے بیٹریاں چارج کرتا تھا۔ عمر نے اپنی گھڑی میں

نصب آلٹی میٹر دیکھا۔ یہاں بلندی ساڑھے تیرہ ہزار فٹ تھی۔ اس نے گل خان سے کہا۔

”کیا خیال ہے ڈھلان پر چلیں جہاں تک آسانی سے جاسکتے ہوں۔“

”صیب امارے پاس بوٹ نہیں اے۔“ گل خان نے عذر پیش کیا۔ اس کا اشارہ کوہ پیما کی لیے مخصوص جوتوں کی طرف تھا۔

”میں چلتا ہوں۔“ خلاف توقع ظفر بولا۔ ”میرے جوتے ٹھیک ہیں لیکن میرے پاس رسی اور کلہاڑی نہیں ہے۔“

”میرے پاس ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”مگر فکر مت کرو ہم اتنا آگے نہیں جائیں گے کہ رسی اور کلہاڑی کے استعمال کی ضرورت پڑے۔“

وہ چوٹی کے نیچے کسی قدر پھیلی ڈھلان کی طرف بڑھے۔ یہ ظاہر یہ زیادہ بلند نہیں لگ رہی تھی مگر جب انہوں نے چڑھنا شروع کیا اور آدھے گھنٹے بعد ایک جگہ ر کے تو وہ حیران ہوئے تھے۔ وہ اتنی بلندی پر آ گئے تھے کہ نیچے موجود گل خان، مارہ اور سومت نقطوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ظفر نے حیرت سے کہا۔ ”میرے خدا، ہم اتنی بلندی پر آ گئے ہیں اور پتا ہی نہیں چلا۔“

وہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور یہاں سانس لینا مزید دشوار ہو رہا تھا۔ اب وہ مستقل ہانپنے کے انداز میں سانس لے رہے تھے۔ یہاں سے ڈھلوان شروع ہو جاتا تھا اور اس سے اوپر جانا ان کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ آکسیجن کی کمی جان لیوا بھی ہو سکتی تھی۔ اس لیے وہ اسی جگہ رک گئے۔ یہاں برف نہیں تھی بلکہ سیاہی مائل ریت تھی۔ جویوں چمک رہی تھی جیسے بہت باریک سیاہ ہیرے ہوں۔ ظفر نے اسے ہاتھ میں لے کر ہوا میں چھوڑا تو وہ دھوپ میں چمکتی ہوئی نیچے گرنے لگی۔ ظفر نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے یہاں قیمتی پتھر ملتے ہوں گے؟“

”ناردرن ایریا میں اکثر جگہوں کے بارے میں سنا ہوا ہے کہ وہاں قیمتی پتھر ملتے ہیں۔“ عمر نے سر ہلایا۔ ”میں نے چھوٹے قصبوں اور شہروں میں دکانوں پر یہ پتھر بکتے بھی دیکھے ہیں۔ مگر وہ صرف خوب صورت ہوتے ہیں ان کا شمار جواہرات میں نہیں کیا جاسکتا ہے۔“

”لیکن میں نے دیکھے ہیں۔“ ظفر نے پراسرار سے انداز میں کہا۔ وہ سچ سچ جواہر ہیں اور بہت قیمتی ہیں۔“

”کہاں دیکھے ہیں؟“

اس بار ظفر نے انکار کیا۔ ”میں ان چکروں میں پڑنے والا آدمی نہیں ہوں میں بزنس میں ہوں۔ میں یہاں ان لوگوں کی تلاش میں ہوں، جو یہ پتھر فروخت کرتے ہیں۔ میں ان سے مستقل بنیادوں پر معاہدہ کروں گا اور وہ جتنے بھی پتھر نکالیں گے میں سب خرید لوں گا۔“

”مگر اس بزنس میں خطرہ ہے۔“ عمر نے پُر خیال نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم دو بچوں کے قتل کو بھول رہے ہو۔“

”یہ گل خان کی اپنی سوچ ہے۔ ضروری نہیں ہے ان بچوں کا قتل قیمتی پتھروں کی وجہ سے ہوا ہو۔“

”اگر ایک بچہ مارا گیا ہوتا تو سمجھ میں آتا کہ کسی نے دشمنی میں ایسا کیا ہے مگر دو الگ گھروں کے بچوں کی ایک جیسی موت بتا رہی ہے کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ پھر دونوں گھرانوں کے سربراہ قیمتی پتھر فروخت کرتے ہیں۔“

ظفر نے سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ ساڑھے تین بج گئے ہیں۔“

اترائی زیادہ مشکل تھی کیونکہ اکثر جگہوں پر پھسلواں ریت تھی۔ وہ چار بجے تک نیچے پہنچے تھے۔ مارہ بہت خوش تھی۔ اس نے جوش سے کہا۔ ”آج میں نے اپنی زندگی کی سب سے بہترین تصویریں لی ہیں۔ مائی گاڈ! کیا سین ہیں یہاں پر۔“

گل خان ایک طرف کھڑا اوپر چوٹی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمر اس کے پاس چلا آیا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

گل خان نے اشارہ کیا۔ ”صیب وہ بادل دیکھو۔“ چوٹی کے پاس ایک ڈسک نما بادل تھا۔ مگر یہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ ابی دس منٹ میں بنا اے۔ اگر یہ دس منٹ میں اور بڑا ہوا تو ام اور سے واپس جائے گا۔“

دس منٹ سے بھی پہلے عمر نے محسوس کر لیا کہ بادل کے حجم میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ مارہ کے پاس آیا جو بدستور فوٹو گرافی میں مگن تھی۔ اس نے اس دوران میں چارج شدہ بیٹری بھی تبدیل کی تھی۔ عمر نے اسے بادل کے بارے میں بتایا تو اس نے انکار کیا۔ ”میں اتنی جلدی نہیں جانے والی۔ ابھی تو بہت سے سین ہیں۔“

ظفر بھی آگیا اس نے مارہ سے کہا۔ ”گل خان یہاں کارہنہ والا ہے اور اسے یہاں کے موسم کا بہتر علم ہے اس لیے ہمیں اس کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔“

گل خان بھی چلا آیا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایک شخص کے پاس جس نے کرتوک کے ایک آدمی

سے انہیں خریدا تھا اور اس نے آگے ان پتھروں کو چار گنا زیادہ قیمت پر فروخت کیا۔ ان میں سے ایک پتھر میں نے بھی لیا تھا۔“ ظفر نے کہا اور اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے کپڑے کی چھوٹی سی گھسی نکالی اور اس کی ڈوری کھول کر اسے گھسی پر الٹا توڑ دیا کے انڈے سے ذرا چھوٹا سبز پتھر باہر نکل آیا۔ یہ تاثر اشدہ تھا مگر دیکھنے میں تراشا ہوا لگ رہا تھا۔ ”میں نے یہ اسی ہزار روپے میں لیا ہے اور ایک جیولر نے مجھے اس کے بدلے ڈیڑھ لاکھ کی پیش کش کی تھی مگر میں نے فروخت نہیں کیا۔“

عمر غور سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ ظفر نے اسے دیا نہیں تھا اس لیے اس نے پتھر لینے کی کوشش نہیں کی۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہ پتھر ہمیں سے گیا ہے؟“

ظفر نے سر ہلایا۔ ”اگرچہ میں اس آدمی سے ملا نہیں ہوں لیکن جس نے پتھر خریدے تھے اس نے یہی بتایا ہے کہ فروخت کرنے والا کرتوک کارہائشی تھا اور ظاہر ہے اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔“

”اگر وہ فراڈ ہوا تو؟“

”نہیں، میں اسے جانتا ہوں۔“ ظفر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”واقفیت کی وجہ سے میں اس سے یہ پتھر اتنی کم قیمت میں لینے میں کامیاب ہوا۔“

”تم نے اور پتھر بھی دیکھے ہوں گے، کچھ اندازہ ہے کہ بیچنے والے نے کتنی بڑی لاٹ بیچی ہوگی؟“

”اس نے کم سے کم سو پتھر بیچے تھے۔ نصف اس سے کم سائز کے ہوں گے اور باقی اتنے ہی یا اس سے ذرا بڑے سائز کے ہوں گے۔“

عمر نے حیرت سے دیکھا۔ ”اگرچہ مجھے پتھروں کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اتنے بڑے پتھر بہت کم ملتے ہیں۔ اگر وہ شخص ایک ہی لاٹ میں اتنے پتھر لایا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ جہاں سے لایا ہے وہاں ایسے بہت پتھر ہیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”کہیں تم ان پتھروں کے چکر میں تو یہاں نہیں آئے ہو؟“

ظفر نے سر ہلایا۔ ”ہاں، میرے آنے کا اصل مقصد یہی ہے۔“

”تم اس جگہ کی کھوج میں ہو جہاں سے پتھر مل سکتے

ہیں؟“

”خواب موسم آنے والا ہے۔ اگر موسم خراب ہو تو کلیئیر پر سفر فیک نہیں ہوتا ہے۔“

اوپر بادل کا حجم اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس نے چوٹی کو چھپا لیا تھا اور وہ تیزی سے اس کی چٹائی ڈھلانوں کی طرف آ رہا تھا۔ مارہ نے موسم کے تیز دیکھے تو بادل ناخواستہ اپنا کیمرا اور سامان پیک کرنے لگی۔ وہ روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ ساڑھے چار بجے وہ بیس کیمپ سے کلیئیر پر اترنے لگے۔ موسم بدل رہا تھا۔ ہوا میں تندی اور خشکی آگئی تھی، اس کا اثر کلیئیر پر بھی ہوا تھا اور اس کی نرم برف اب جم رہی تھی۔ اس پر قدم اٹھانا آسان ہو گیا تھا مگر ساتھ ہی یہ زیادہ خطرناک بھی ہو گئی تھی کیونکہ جی ہوئی برف کے بارے میں کہنا مشکل تھا کہ یہ صرف ایک پرت ہے یا پھر ٹھوس بلاک۔ ابھی وہ آغاز میں تھے کہ آسمان پر بادل چھا گئے اور دھوپ غائب ہو گئی۔ ساتھ ہی ہوا میں تندی اور رخ آنے لگی تھی۔ ہوا انہیں بائیں طرف دھکیل رہی تھی یعنی کلیئیر کی ڈھلان پر اور انہیں سیدھ میں سطح چوٹی تک جانا تھا۔

عمر اس بار درمیان میں تھا کیونکہ اسی کے پاس برف میں گاڑنے والی کلباڑی تھی۔ اگر کوئی برف تلے چھپے غار میں گر جاتا تو وہی اسے بچانے کے لیے کلباڑی استعمال کر سکتا تھا۔ سب سے آگے گل خان تھا۔ اس کے پیچھے ظفر، عمر کے پیچھے بالترتیب مارہ اور سومت تھے۔ وہ ایک لائن میں سفر کر رہے تھے۔ وہ وسط کلیئیر تک پہنچے تھے کہ موسم کی خرابی طوفانی صورت اختیار کر گئی۔۔۔ برف گرنے لگی تھی اور تیز ہوا گالے اڑا رہی تھی۔ ہوا کے شور میں انہیں آپس میں بات کرنے کے لیے بھی چیخ کر بات کرنی پڑ رہی تھی۔ گل خان کو سومت کی فکر تھی، وہ بار بار مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر سومت کے لیے سب سے پیچھے رہنا ہی مناسب تھا۔ برف جم کر سخت اور اب پھسلواں ہو رہی تھی اور ہر تھوڑی دیر بعد ان میں سے کوئی نیچے گر رہا تھا۔ ہوا بھی اپنا زور استعمال کر رہی تھی۔ مگر جیسے جیسے وہ کلیئیر کے کنارے کی طرف جا رہے تھے، چھپے غاروں کے خطرے سے نکلنے جا رہے تھے۔ یہاں ان کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

بالآخر انہوں نے کلیئیر عبور کیا اور ہوار چوٹی پر قدم رکھا۔ موسم یہاں بھی خراب تھا مگر اس میں شدت نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا سامان اٹھایا اور چوٹی کے نچلے حصے کی طرف جانے لگے۔ جہاں ایک چھبے نما چٹان تھی اور وہ اس کے نیچے محفوظ تھے۔ مگر ذرا سی دیر میں سردی اور رخ ہواؤں نے ان

کا بڑا حال کر دیا تھا۔ گل خان نے کبل نکال لیے تھے اور وہ بیٹے سمیت ان میں لپٹ گیا تھا۔ مارہ اور ظفر نے سلیپنگ بیگز بچھائے اور ان میں گھس گئے۔ عمر بارہ رہ گیا کیونکہ نہ تو یہاں جگہ تھی کہ خیمہ لگاتا اور طوفان اسے خیمہ لگانے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اس لیے وہ چٹان کی جڑ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ اور چہرہ چھپا لیا تھا۔ رفتہ رفتہ طوفان کی شدت کم ہونے لگی۔ اوپر بادل چھٹ رہے تھے اور کچھ دیر میں سورج نکل آیا۔ گل خان نے کبل ہٹاتے ہوئے انہیں جھاڑا اور بولا۔

”ابی نیچے جانا ہوگا۔“

”اس وقت۔“ عمر نے تاریک ہوتے آسمان کو

دیکھا۔ ”کچھ دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔“

”اب اور بوت سردی اور گا رات میں۔“ اس نے

کہا۔ ”ابھی اور نہیں رہے سکتا۔“

”نالا جو رات بارہ بجے رکتا ہے۔“ مارہ نے اسے

یاد دلایا۔

”وہ ابی رک گیا اور گا۔ طوفان سے کلیئیر جم گیا ہے۔“

اس لیے نالا بھی رک گیا اور گا۔“

عمر محسوس کر رہا تھا کہ گل خان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس وقت بھی سردی بہت زیادہ ہو گئی تھی اور رات تک اس میں نہ جانے کتنا اضافہ ہوتا۔ ان کا یہاں سے جانا ہی مناسب تھا۔ مختصر بحث کے بعد وہ تیار ہوئے۔ انہوں نے سامان پیک کیا اور نیچے اترنے لگے۔ کناؤ والی ڈھلان سے اترتے ہوئے انہیں بہت احتیاط کرنی پڑی تھی۔ کسی نہ کسی طرح انہوں نے اسے عبور کر کے کلیئیر کے چھوٹے حصے تک رسائی حاصل کی۔ اسے پار کر کے وہ جنگل میں پہنچ جاتے۔ گل خان کا کہنا تھا کہ وہ رات وہیں بسر کریں گے۔ مگر ابھی نالا عبور کرنا باقی تھا اگر اس میں پانی ہوتا تو انہیں انتظار کرنا پڑتا کہ پانی آنا بند ہو جائے تو نالا عبور کر سکیں۔ چھوٹا کلیئیر بھی غیر متوقع طوفان اور سردی سے جم گیا تھا، اس پر سفر کرنا آسان ثابت ہوا اور وہ اسے پار کر کے جب دوسری طرف پہنچے تو نالے میں پانی کم رہ گیا تھا۔ انہوں نے اسے بھی آرام سے پار کر لیا اور جنگل میں آگے تھے۔ تب تک تاریکی مکمل ہو گئی تھی اور انہوں نے برقی لائٹیں نکال لی تھیں۔

”یہاں تو موسم بہت اچھا ہے۔“ مارہ نے کہا۔

”اوپر سردی زیادہ تھی۔“

گل خان نے ایک جگہ دیکھی جہاں آرام سے پڑاؤ

”اس میں کوئی نہ کوئی مشکل ہوتی ہے۔“ ظفر نے پُر
تفکر لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی فطرت کا اصول ہے کہ قیمتی چیز
آسانی سے نہیں ملتی ہے اور مقدار میں زیادہ نہیں ہوتی
ہے۔“

”جیسے اچھی عورت۔“ عمر نے پُر خیال انداز میں
ماڑہ کی طرف دیکھا جو ٹیب سے میموری اسٹک لگا کر اپنی
کھینچی تصویروں کا جائزہ لے رہی تھی۔
ظفر مسکراتے لگا۔ ”دوست، لگتا ہے تم کسی غلط فہمی کا
شکار ہو۔“

قارئین متوجہ ہوں

پچھا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں
کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پُرچا نہیں ملتا۔
ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
ہے کہ پُرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پُرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 فیز 11 ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

ہر پُرچا کی قیمت 100 روپے ہے

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ڈالا جاسکتا تھا۔ وہ سومت کی مدد سے پتھر جمع کر کے الاؤ کی
تیاری کرنے لگا۔ ظفر ابھی تک نالے کے کنارے کھڑا تھا
اور اوپر دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان کی طرف آیا۔ عمر اپنا
رک سک رکھ کر سستار ہا تھا۔ وزنی رک سک کے ساتھ سفر
کرنا آسان نہیں تھا۔ ظفر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے
آہستہ سے کہا۔ ”گلیشیر کا دہانہ یہاں سے زیادہ دور نہیں
ہے۔“

عمر، گل خان سے سن چکا تھا کہ قیمتی پتھر گلیشیر کے
دہانے کے آس پاس سے ملتے ہیں۔ مگر اس نے ماڑہ کو بھی
نہیں بتایا تھا۔ اس لیے وہ ظفر کے منہ سے سن کر چونکا۔ ”اگر
گلیشیر کا دہانہ یہاں سے نزدیک ہے تو ہمیں اس سے کیا؟“
ظفر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”واقعی تمہیں کچھ نہیں
معلوم ہے۔“

”تم اپنی بات کرو۔“ عمر نے خشک لہجے میں کہا۔
”یہ چھوڑو کہ مجھے کیا معلوم ہے اور کیا نہیں۔“

”قیمتی پتھر دہانے کے آس پاس سے ملتے ہیں۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”گلیشیر اپنے وزن سے پہاڑ اور زمین کو کاٹتا ہے۔
پھر اس کے اندر پانی بہتا ہے جو مٹی اور اس کے ساتھ پتھر
باہر لاتا ہے۔ ان پتھروں میں قیمتی پتھر بھی ہوتے ہیں۔
باہر آنے پر پانی دہانے کے پاس مٹی کے ساتھ پتھر بھی
چھوڑتا ہے۔ اب تم جان گئے ہو گے کہ قیمتی پتھر گلیشیر کے
دہانے کے پاس کیسے ملتے ہیں۔“

”لیکن ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب یہاں
زمین تلے قیمتی پتھر کی کانیں ہوں۔“

”ضروری نہیں ہے۔“ ظفر نے نفی میں سر ہلایا۔
”قیمتی پتھر چٹانوں میں بے پناہ دباؤ کی وجہ سے بنتے
ہیں۔ یہ تھوڑے سے بھی ہو سکتے ہیں یعنی ان کی باقاعدہ کان
ہونا ضروری نہیں ہے۔ باقاعدہ کانیں میدانی علاقوں
میں ہوتی ہیں اور وہ بھی دریاؤں کے آس پاس پائی جاتی
ہیں۔“

”لگتا ہے تم نے اس فیلڈ میں خاصی ریسرچ کی
ہے۔“

”ہاں کیونکہ میں اس بزنس میں آنا چاہتا ہوں۔“
”اگر تم جانتے ہو اور گاؤں والے بھی جانتے ہیں کہ
ہیرے کہاں سے مل سکتے ہیں تو تم لوگ حاصل کیوں نہیں کر
لیتے۔“

”اس وقت میں بھوک کا شکار ہوں۔“ عمر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ڈنر کرنے جا رہا ہوں۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے کہ میں نے گلیشیر پر سفر کے دوران چاکلیٹ کا بڑا پار لیا تھا۔ میں آرام سے کھاؤں گا۔“

عمر بھوک اور تھکن دونوں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے رک سک سے اپنا خوراک کا ذخیرہ نکالا اور اس کا جائزہ لیا۔ اس نے ٹوٹا پھل اور فرائی مٹر کاٹن نکالا اور الاؤ پر انہیں گرم کرنے لگا۔ اس نے ٹن کھولا اور پھلی کی خوشبو پھیلی تو سومت بے چین ہو گیا۔ شاید اسے پھلی پسند تھی۔ عمر نے اسے بھی ایک پیس دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ اس کی خوشی دیکھتے ہوئے عمر نے آدھا ٹن اسے دے دیا۔ گل خان نے کہا۔ ”صیب آپ کا دامارے پاس خوراک اے۔“

”نہیں یار بچے کو پسند ہے اسے کھانے دو۔ اگر مجھے بھوک لگی تو میں کچھ اور نکال لوں گا۔“

مگر عمر کا گزارا ہو گیا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ کافی تیار کرنے لگا۔ وہ سیاہ اور بغیر شکر کے کافی لیتا تھا۔ مارہ کریم اور شکر کے ساتھ لیتی تھی البتہ ظفر اور گل خان دونوں سیاہ کافی کے شوقین تھے۔ اس لیے اس نے انہیں بھی کافی پیش کی۔ پھلی سے خوش سومت نے جواب میں عمر کے لیے خیمہ لگا دیا۔ اس نے منع کیا مگر وہ مانا نہیں تھا۔ جہاں اس کی سمجھ میں نہیں آتا وہ عمر سے پوچھ لیتا تھا۔ بالآخر اس نے خیمہ لگا ہی لیا۔ پھر مارہ اور ظفر کے سلیپنگ بیگز نکال کر بچھانے لگا۔ یہ کام کر کے وہ باپ کے ساتھ قیشی روٹی کھانے لگا۔ مارہ اور ظفر بھی ڈنر کی تیاری کر رہے تھے۔ عمر فارغ تھا اور الاؤ کے پاس بیٹھا تھا، اسے ضیا کا خیال آیا۔

”شاید وہ اکیلے اس طرف آنے کی ہمت نہیں کر سکا۔“ ظفر نے کہا۔

”وہ اکیلے سفر کرنے والا آدمی ہے۔“ عمر نے تردید کی۔ ”اس کے لیے کہیں بھی جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ شاید یہاں آنا اس کے پروگرام میں شامل نہیں ہے۔“

ظفر نے حیرت سے کہا۔ ”تب کیا وہ کرتوک گاؤں دیکھنے آیا ہے۔“

”یا شاید وہ بھی قیمتی پتھروں کے چکر میں آیا ہو۔“ مارہ نے کہا تو وہ چونک گئے۔

”لگتا تو نہیں ہے۔“ عمر نے کہا۔

”آدمی اندر سے کیا ہے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ مارہ پاستا کا پیک الاؤ پر گرم کرنے لگی۔ یہ بھی ٹن کی طرح تیار کھاتا تھا۔ صرف گرم کرنے کی ضرورت تھی۔

”اگر وہ پتھروں کے چکر میں آیا ہوتا تو لازمی ہمارے ساتھ آتا۔“ ظفر بولا۔ ”پتھر اسے گاؤں میں ملنے سے رہے۔“

”ممکن ہے وہ تمہاری طرح ان لوگوں سے رابطہ کرنا چاہ رہا ہو جو قیمتی پتھر ملنے کی جگہ سے واقف ہیں۔ اس کے لیے یقیناً گاؤں ہی بہترین جگہ ہے۔“

عمر کی بات پر ظفر متفکر ہو گیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر وہ پتھروں کے چکر میں آیا ہے تو لازمی گاؤں میں بات کرے گا۔“

گل خان اور سومت جلد سو گئے تھے۔ یہاں جانوروں کا خطرہ نہیں تھا اس لیے پہرا دینے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی چوری کا خطرہ تھا۔ سردی یہاں بھی خاصی زیادہ تھی اور درجہ حرارت منفی کے آس پاس میں تھا۔ گل خان اور سومت دو درختوں کے درمیان چھوٹی سی جگہ میں گول مول ہو کر لیٹے تھے۔ وہاں سردی کا اثر کم تھا۔ عمر الاؤ کے قریب بیٹھا تھا اور اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ظفر اور مارہ نے بھی ڈنر مکمل کر لیا۔ مارہ نے چائے بنائی تو اس نے عمر کو بھی پیش کی۔ اسے نیند آرہی تھی۔ اس نے صرف گرمائش کی وجہ سے چائے لے لی اور نگ خالی کرتے ہی وہ اٹھ گیا۔ ظفر نے کہا۔ ”ابھی صرف نو بجے ہیں۔“

”میں تھکا ہوا ہوں۔“ عمر نے معذرت کی۔ ”صبح ملاقات ہوگی۔“

کیونکہ وہ نالا عبور کر چکے تھے اس لیے صبح اٹھنے کی فکر نہیں تھی۔ وہ آرام سے اٹھ کر دو ٹھنڈے میں کرتوک پہنچ سکتے تھے۔ یوں مارہ کی خواہش پوری ہو جاتی جو ایک دن اور کرتوک میں رکنا چاہتی تھی۔ عمر لینا تو فوراً ہی سو گیا تھا۔ حالانکہ سردی چھ رہی تھی اور اس کا خیمہ اندر سے گرم نہیں ہوا تھا مگر نیند ایسی تھی کہ اس حالت میں بھی حاوی آگئی۔ عمر نے خواب میں دیکھا کہ وہ گلیشیر پر ہیں اور وہاں گل خان اور سومت اس کے ساتھ ہیں۔ وہ احتیاط سے گلیشیر کی نرم برف پر چل رہے ہیں۔ اچانک برف ٹوٹتی ہے اور سومت نمودار ہونے والے غار میں گر جاتا ہے۔ گل خان چلاتا ہے اور سومت کو نکالنے کے لیے بھاگتا ہے۔ وہ غار کے کنارے پہنچ کر جھک جاتا ہے اور چلا چلا کر سومت کو آوازیں دے رہا ہوتا ہے۔ پھر ان آوازوں میں مارہ اور ظفر کی آوازیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ اچانک عمر کی آنکھ کھلی تو اسے لگا باہر سے بچ بچ ان تینوں کی آوازیں آرہی ہیں اور وہ سومت کو ہی پکار رہے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور خیمے کی زپ کھولی۔

اس کے جانے کے دس منٹ بعد وہ اس کی تلاش میں نکلا تھا۔ اس کی آوازیں سن کر ظفر اور مارہ بھی آگئے تھے اور سب سے آخر میں عمر باہر آیا تھا۔ اس نے گل خان کو تسلی دی کہ سومت مل جائے گا۔ اس نے کہا۔

”ہمیں نالے میں اتر کر چیک کرنا ہوگا۔ ممکن ہے وہ اندر اترتے ہوئے گر گیا ہو اور اسے چوٹ لگی ہو۔ بچہ ہے ہم سکتا ہے اور بے ہوش بھی ہو سکتا ہے۔“

”ام نیچے جاتا اے۔“ گل خان نے کہا اور نالے میں اترنے لگا۔ عمر اسے دیکھتا رہا پھر وہ بھی نالے میں اتر آیا۔ اس نے گل خان سے کہا۔

”تم نیچے کی طرف جاؤ، میں اوپر کی طرف جاتا ہوں۔“

گل خان نے سر ہلایا اور نیچے کی طرف بڑھ گیا۔ عمر اوپر جانے لگا۔ نالے میں موجود پانی برف بن گیا تھا اور یہ برف اس کے پیروں تلے آکر کرچ کرچ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ رہی تھی۔ نالے کے اندر اوپر سے ہوا آرہی تھی اور یہ بخ بستہ تھی۔ پورے گرم کپڑوں، دستانوں اور ادنیٰ ٹوپی میں بھی وہ ٹھہر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سومت ہوشیار بچہ ہے اور وہ راستہ بھٹک بھی نہیں سکتا۔ اوپر چاند نکلا ہوا تھا اور جنگل میں بھی خاصی روشنی تھی۔ اس لیے اندھیرے میں بھٹک جانے کا امکان بھی نہیں تھا۔ اگر وہ کسی مشکل کا شکار ہوا تھا تو ان کی آوازوں کا جواب دے سکتا تھا۔ مگر اس کی طرف سے خاموشی بتا رہی تھی کہ یا تو وہ ہوش میں نہیں تھا یا یہاں سے دور جا چکا تھا۔ نالا اب پھیل رہا تھا اور اس کے کناروں کی اونچائی کم ہو رہی تھی۔ اچانک ایسی آواز آئی جیسے کسی نے سسکی لی ہو۔ عمر رک گیا۔

☆☆☆

ظفر اور مارہ جنگل کے پاس تھے۔ مارہ، ظفر کے پیچھے تھی اور وہ مختلف سمتوں میں ٹارچ اور برقی لائٹیں کی روشنی ڈال رہے تھے۔ اچانک مارہ نے کہا۔ ”یہ کیا ہے؟“ مارہ آگے بڑھی اور اس نے زمین سے کچھ اٹھایا۔ ظفر آگے آیا تو مارہ نے اسے دکھایا۔ ”یہ ثانی میں نے سومت کو دی تھی۔“

ظفر نے اس پاس روشنی ڈالی۔ ”اس کا مطلب ہے وہ یہاں آیا تھا۔“

”شاید وہ اسی جنگل میں گیا ہے۔“ مارہ نے کہا اور سومت کو آواز دینے لگی۔

”ہمیں گل خان اور عمر کو بتانا چاہیے۔“ ظفر نے کہا۔

”کیا ہوا؟“

”سومت غائب ہے۔“ قریب سے مارہ کی آواز آئی تو عمر جیکٹ کی زپ بند کرتا ہوا باہر آیا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا اور اوپر گلیشیر کی طرف سے بخ ہوا آرہی تھی۔ اس نے اپنی موٹی ادنیٰ ٹوپی اور دستانے بھی نکال لیے تھے۔ ظفر اور گل خان پڑاؤ سے باہر تھے۔ وہ سومت کو پکار رہے تھے مگر اس کی طرف سے جواب نہیں آرہا تھا۔ عمر نے مارہ سے کہا۔

”تم یہیں رکو۔“

”مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔“ اس نے عمر کا بازو تھام لیا۔ عمر نے ایک نظر اسے دیکھا اور سر ہلایا۔

”او کے، تم بھی آؤ۔“

عمر نے اپنی برقی لائٹیں اور تیز روشنی والی ٹارچ نکالی۔ ٹارچ اس نے مارہ کو دے دی تھی۔ وہ باہر آئے تو گل خان نالے تک چلا گیا تھا جبکہ ظفر نالے کے دائیں طرف موجود جنگل کے ساتھ تھا۔ اس جنگل کے پاس گلیشیر کا دہانہ تھا۔ وہ طاقتور ٹارچ سے درختوں میں دیکھ رہا تھا۔ مارہ اس کی طرف بڑھ گئی اور عمر، گل خان کے پاس آیا۔ وہ بیٹے کی کم شدگی پر سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ عمر اس کے ساتھ مل کر نالے میں روشنی ڈالنے لگا۔ اس وقت پانی کی آمد بالکل رک گئی تھی اور بس کہیں کہیں تقریباً جم جانے والا پانی تھا۔ عمر نے پوچھا۔ ”سومت کیسے گیا؟“

”اسے چوٹا حاجت ہوتا۔“ گل خان نے کہا۔ ”وہ ام کو جگا کر اور بول کر گیا۔“

”تم نے اسے اس طرف آتے دیکھا تھا؟“

گل خان نے سر ہلایا۔ ”وہ ادراہی آتا۔“

”ممکن ہے وہ جنگل میں چلا گیا ہو۔“

گل خان نے انکار کیا۔ ”ادراہ حاجت کے واسطے جنگل یا درخت میں جانا اچانک نہیں ہوتا۔ لوگ جنات سے ڈرتا۔ اور جھاڑی یا نالے میں جاتا۔“

یہاں دو طرف جنگل تھا اور ایک طرف نالا۔ اس کے پار گلیشیر تھا اور وہاں جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ایک بچہ ہرگز اس طرف نہیں جاسکتا تھا۔ عمر نے پوچھا۔ ”کیا وہ نیچے گاؤں کی طرف نہیں جاسکتا۔“

”اکیلا نہیں جاسکتا اور اس موسم میں؟“ گل خان مسلسل نفی میں سر ہلارہا تھا پھر اس نے سومت کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ عمر بھی آواز دے رہا تھا۔ گل خان کے سامنے سومت کو غائب ہوئے آدھا گھٹنا ہونے کو آیا تھا۔

طرف بڑھنے لگی جہاں ظفر نے کسی آدمی کی جھلک دیکھی تھی۔
ظفر اسے جانتا ہوا دیکھ رہا تھا، اس نے زیر لب کچھ کہا اور
واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

گل خان نیچے جا رہا تھا مگر کئی سو گز تک نیچے آنے کے
بعد بھی اسے نالے میں کسی کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔ اس کی
چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ سومت اس سمت نہیں آیا تھا۔ وہ ایک
جگہ رک گیا اور سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اپنے بچے کو کہاں
تلاش کرے۔ اچانک اسے اوپر سے کسی کے چلانے کی
آواز آئی اور وہ تیزی سے پلٹا۔ اسے خیال آیا کہ شاید
سومت مل گیا ہے۔ اوپر آنے پر اس نے ظفر کی آواز پہچان
لی جو اسے اور عمر کو پکار رہا تھا۔ گل خان نے چلا کر اسے بتایا
کہ وہ نالے میں ہے۔ ظفر نالے کے کنارے نمودار ہوا۔
اس کے پاس برقی لائٹیں تھیں۔ گل خان ایک جگہ سے اوپر
چڑھا اور نالے سے باہر آ گیا۔ ظفر بدحواس تھا اس نے کہا۔
”گل خان جلدی چلو، میں نے اور مارہ نے اوپر والے
جنگل میں ایک آدمی کو دیکھا ہے۔“

”آدمی... سومت نہیں ملا؟“

”نہیں مگر تم سوچو کہ تمہارا بیٹا غائب ہے اور یہاں
ایک اجنبی آدمی بھی ہے۔ عمر کہاں ہے؟“
”وہ اوپر گیا اے۔“ گل خان نے نالے کی طرف
اشارہ کیا۔ ”آپ نے عمر صیب کو تو نہیں دیکھا؟“
”نہیں وہ طویل قامت تھا اور اس نے سیاہ رنگ کی
جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ عمر کی جیکٹ میں اور نیچے رنگ بھی
ہے۔“ ظفر نے کہا۔ ”جلدی چلو مارہ بھی اوپر ہی ہے۔
اسے ثانی ملی ہے جو اس نے سومت کو دی تھی۔“
گل خان اور ظفر اوپر کی طرف بڑھنے لگے۔

☆☆☆

عمر رک گیا، سسکی جیسی آواز نسوانی یا بچے کی تھی۔ مگر
یہاں ہوا چل رہی تھی اور یہ آواز ہوا کی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ
رک کر سماعت پر زور دینے لگا۔ مگر آواز دوبارہ نہیں آئی
تھی۔ ایک منٹ بعد وہ دوبارہ آگے بڑھنے لگا۔ یہاں
ہواؤں کا شور بڑھ گیا تھا۔ ہوا چوٹی سے اتر کر کلیخیر سے
ہوتی ہوئی نیچے آرہی تھی اور اس میں بہت زیادہ خشکی تھی۔ عمر
احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ نالے سے تقریباً باہر آ گیا
تھا اور یہاں اسے کچھ نیچے چھوٹا جنگل دکھائی دیا۔ یہاں جا بھ
جا گیلی بگری کے ڈھیر تھے اور یہ اصل میں کلیخیر کا دہانہ تھا۔
زمین بہت زیادہ اونچی نیچی تھی۔ اچانک اسے لگا کہ کوئی

مارہ نے مڑ کر دیکھا۔ ”مگر وہ ہیں کہاں؟“
گل خان اور عمر نالے کے پاس تھے مگر اب وہ وہاں
نظر نہیں آرہے تھے۔ یا تو وہ نالے میں اتر گئے تھے یا پھر
نچلے جنگل کی طرف گئے تھے۔ مارہ نے کہا۔ ”ان کو چھوڑو
ہمیں آگے جانا چاہیے، ہو سکتا ہے سومت کو مدد کی ضرورت
ہو۔ ہم ان کے چکر میں کیوں وقت ضائع کریں۔“

ظفر جنگل میں جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا مگر مارہ کے
اصرار پر وہ مان گیا اور وہ دونوں اوپر کی طرف بڑھے۔
یہاں جنگل میں اونچے درخت کم تھے مگر یہ اوپر سے پھیلے
ہوئے اور گھنے تھے اس لیے چاند کی روشنی نیچے تک کم آرہی
تھی۔ اگر ان کے پاس برقی لائٹیں اور ٹارچ نہ ہوتی تو اس
جگہ سڑ کر نا آسان نہ ہوتا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ نیچے کے
مقابلے میں یہاں سردی زیادہ تھی۔ وہ رہ رہ کر سومت کو پکار
رہے تھے۔ اچانک ظفر نے مارہ کو روک دیا۔ وہ ایک
درخت کی آڑ میں ہو گیا تھا اور اس نے مارہ کو بھی کھینچ لیا تھا۔
وہ پریشان ہو گئی۔ ”کیا... کیا ہوا؟“

”شش... ادھر کوئی ہے۔“ ظفر نے جنگل کے
آخری حصے کی طرف اشارہ کیا۔

”سومت؟“ مارہ نے بے تابی سے پوچھا۔
”نہیں، وہ بڑا آدمی تھا اور ہم میں سے نہیں ہے۔“
ظفر نے گھبرائے انداز میں کہا۔ ”مارہ ہمیں واپس جانا
ہوگا۔ گل خان اور عمر کے ساتھ واپس آنا ہوگا۔“
”یہاں کوئی ہے اور اگر سومت اس کے پاس ہے تو
ہم اسے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“ مارہ
بولی۔ ”ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ ظفر بولا۔ ”اگر یہ وہی دو
بچوں کا قاتل ہے تو کیا ہم ایک قاتل سے لڑ سکتے ہیں؟“
”وہ ایک ہے اور ہم دو ہیں۔“ مارہ نے کہا اور اس
پاس دیکھ کر اس نے زمین سے ایک لکڑی اٹھالی۔ یہ چارنٹ
طویل اور خاصی مضبوط تھی۔ ”ہم اسے قابو میں کر سکتے
ہیں۔“

ظفر نے مارہ کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”تم پاگل
ہو گئی ہو۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کسی دوسرے کی خاطر خطرہ
مول لینے کی۔“

مارہ نے غصے سے اسے دیکھا۔ ”ٹھیک ہے اگر تم
نہیں جا رہے تو میں اکیلی جاؤں گی۔ میں اس بچے کو کسی
درندے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔“

مارہ نے اپنی ٹارچ بند کر دی اور دبے قدموں اس

آس پاس ہے، اسے آہٹ سی سنائی دی تھی۔ وہ رک گیا اور پھر سماعت پر زور دینے لگا۔ پھر اسے لگا کہ سامنے والے بجری کے ٹیلے کے عقب میں کوئی تھا۔ وہ دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ سومت کو آواز دے مگر پھر چمٹی حس کے اشارے پر اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس سے پہلے وہ ٹیلے کے پاس جاتا اچانک عقب سے روشنی لہرائی، اس نے مڑ کر دیکھا تو مارہ نہ تھی۔ اس نے عمر کو دیکھ لیا تھا، وہ تیزی سے اس کے پاس آئی۔

”آپ سومت ملا؟“

”نہیں اور تم یہاں اکیلی ہو، ظفر کہاں ہے؟“

”اسے یہاں کوئی آدمی دکھائی دیا تھا اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔“ مارہ نے کسی قدر نفی سے کہا۔ ”اسے اپنی جان بہت پیاری ہے اور بچے کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔“

کسی آدمی کا سن کر عمر چوکنا ہو گیا۔ ”تب تمہیں بھی یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا۔“

”مجھے اس محسوس بچے کی فکر ہے۔“

عمر نے پلٹ کر بجری کے ٹیلے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ”مجھے اس طرف کسی کی موجودگی محسوس ہوئی تھی۔“

مارہ سہم گئی اور اس نے لکڑی مضبوطی سے تھام لی۔ عمر اسے وہیں رکنے کا کہہ کر ٹیلے تک آیا اور پھر اس نے اس کے گرد گھوم کر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ واپس آیا۔ ”یہاں کوئی نہیں ہے مگر اب مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی ہے اور سومت کو اسی نے غائب کیا ہے۔“

مارہ آس پاس دیکھ رہی تھی۔ وہ چونکی اور ایک سمت اشارہ کیا۔ ”وہاں مجھے روشنی کی جھلک دکھائی دی ہے۔“

عمر نے دیکھا مگر اس سمت اب تاریکی تھی۔ اس نے مارہ کو پیچھے کیا اور خود آگے بڑھا۔ یہ غار تھا جو زمین کے اندر جا رہا تھا۔ عمر نے برقی لائٹیں آگے کی تو اسے غار کے اندرونی حصے میں کسی کے پاؤں نظر آئے۔ اس نے مارہ سے کہا۔ ”اندر کوئی ہے؟“

مارہ نے جھک کر دیکھا اور جوش سے بولی۔ ”یہ سومت ہے۔“

وہ غار میں اترنا چاہتی تھی مگر عمر نے روک دیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”عجلت نہیں، ہمیں اس شخص کو بھی دیکھنا ہے جو یہاں موجود ہے۔“

مارہ نے جھک کر ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی اور اچھی

طرح دیکھ کر بولی۔ ”اندر کوئی نہیں ہے۔“

وہ دونوں پھسلتی بجری پر پاؤں رکھتے ہوئے اندر اترے۔ سومت غار میں اس حالت میں پڑا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں بندھے تھے۔ منہ پر ٹیپ لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بولنے سے قاصر تھا۔ مگر وہ ہوش میں تھا اور روشنی میں کسمسار ہا تھا۔ شاید اسے ان کی آوازیں آگئی تھیں اور اب وہ آزاد ہونے کے لیے بے چین تھا۔ مارہ لپک کر اس کے پاس پہنچی اور اس کے منہ سے ٹیپ اتارتے ہوئے کہا۔ ”سومت، کیسے ہو تم؟“

”میں ٹیک اے۔“ بچے نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”وہ ادراے۔“

”وہ کون؟“ عمر نے پوچھا۔

”وہ جس نے ام کو ادھر پکڑا اور باند دیا۔ وہ۔۔۔۔۔“

اسی لمحے غار کے باہر سے آہٹ ہوئی اور ایک آواز آئی۔ ”میں بتاتا ہوں۔ تم دونوں اپنے ہاتھ اوپر کر لو۔ میرے پاس پستول ہے اور اس میں گولیاں بھی ہیں۔“

☆☆☆

گل خان اور ظفر جنگل میں تھے۔ انہیں آگے کہیں روشنی نظر نہیں آرہی تھی۔ گل خان نے آہستہ سے کہا۔ ”ادھر کوئی نہیں اے۔“

”میں نے آدمی کو اوپر دیکھا تھا۔“ ظفر نے اشارہ کیا۔ ”جہاں جنگل ختم ہو رہا ہے۔“

گل خان ٹکڑے ہو گیا۔ ”ادھر گلیشیر کا آنا اے۔“

اچانک اوپر کہیں روشنی لہرائی۔ ظفر نے اس سمت اشارہ کیا اور وہ اوپر بڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ جنگل کے آخری حصے میں تھے اور اس سے آگے کسی قدر ڈھلان کے بعد گلیشیر کا دہانہ شروع ہو رہا تھا۔ وہاں جا بجا پتھر اور بجری کے ڈھیر تھے۔ گلیشیر میں خاموشی تھی کیونکہ رات کے وقت ٹھنڈکی وجہ سے گلیشیر جم جاتا تھا۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ اور برف ٹپکنے کا عمل رک جاتا تھا۔ مگر اس طرف سے نہایت بچ ہوا آرہی تھی۔ اس طرف جو روشنی نظر آرہی تھی اب وہ غائب تھی۔ گل خان سومت کو آواز دینے جا رہا تھا مگر ظفر نے اسے بروقت روک لیا۔ اس نے اشارہ کیا۔ ”ادھر کوئی ہے؟“

گل خان نہیں دیکھ سکا تھا۔ ”کدھر کون اے؟“

”ایک سایہ مگر اس نے روشنی نہیں کی تھی۔“ ظفر بولا۔

”اگر وہ مارہ ہوتی تو روشنی کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔“

گل خان کے پاس مضبوط چھڑی تھی، وہ اس نے بلند

”وہ بزدل نہیں آئے گا۔“ عمر نے کہا تو گل خان نے اس کی تائید کی۔

”وہ اور لی بی کو چوڑ کر باگ کیا تھا۔“

مارہ رہ رہ کر ظفر کو پکار رہی تھی اور اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ مارہ نے کانپتی آواز میں ضیا سے کہا۔ ”وہ یہاں نہیں ہے۔“

”اگر نہیں ہے تو تم مرو گی۔“ اس نے پستول کا رخ مارہ کی طرف کر دیا اور بلند آواز سے بولا۔ ”ظفر تم جہاں ہو اگر میرے تین گنتے تک سامنے نہیں آئے تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔“

”اسٹاپ!“ ایک طرف سے ظفر کی آواز آئی۔ تین کہتے ہی ضیا نے پستول گولی چلانے کے انداز میں سیدھا کر لیا تھا اور مارہ نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر خلاف توقع ظفر سامنے آ گیا۔ وہ ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ بلند کر رکھے تھے۔ ”گولی مت چلاتا۔“ ضیا اپنی کامیابی پر مسکرانے لگا۔ ”اچھا ہوا تم سامنے آ گئے ورنہ شادی سے پہلے رنڈوے ہو جاتے۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ عمر نے پوچھا۔

”بتایا تو ہے میں قیمتی پتھروں کی جائے وقوع تک جانا چاہتا ہوں۔“ ضیا نے کہا اور گل خان کی طرف دیکھا۔ ”یہ مجھے لے کر جائے گا۔“

”ان سب کو جانے دو، میں تم کو لے کر جائے گا۔“ گل خان نے کہا۔

”نہیں، سب چلیں گے۔“ ضیا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اگر کسی نے انکار کیا تو میں یہاں اس کی لاش چھوڑ کر جاؤں گا۔ اب سوچ لو کس نے جانا ہے اور کون نہیں جانا چاہتا۔“

سب خاموش رہے تو ضیا نے ظفر سے کہا۔ ”سب راضی ہیں، تم اس ٹیلے کے اوپر پڑا تھیلا اٹھا لو۔“

بجری کے ایک چھ سات فٹ اونچے ڈھیر پر کیوس کا تھیلا پڑا تھا۔ ظفر نے اسے اٹھایا تو اس میں سے دھات کے ٹکڑے کی آواز آئی۔ تھیلا وزنی تھا۔ ضیا نے عمر اور گل خان کو حکم دیا کہ وہ برقی لائٹیں اس طرح رکھیں کہ آس پاس روشنی رہے اور سب اس کی نظروں میں رہیں۔ وہ آگے روانہ ہوئے تو عمر نے اس سے کہا۔ ”اگر تمہیں وہ جگہ مل جائے جہاں قیمتی پتھر ہوتے ہیں تب بھی وہ تمہیں ایسے تو نہیں مل سکتے۔ وہ مٹی میں دبے ہوتے ہیں اور انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ضیا نے جواب دیا۔ ”میں تم سب کو کس لیے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

ظفر چونکا۔ ”کیا مطلب، تم ہم سے قیمتی پتھر تلاش کراؤ گے؟“

”بالکل۔“ ضیا نے پستول لہرا کر کہا۔ ”اور تم تلاش کرو گے اگر زندہ رہنا چاہتے ہو۔“

”یہ ایک رات میں ہونے والا کام نہیں ہے۔“ عمر نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے اور میرے پاس وقت کی کمی نہیں ہے۔“

”ام کوکل واپس جانا اے۔“ گل خان نے کہا۔ ”اگر ام نہیں گیا تو امارا تلاش شروع ہو جائے گا۔“

”نہیں ہوگا۔“ ضیا نے اطمینان سے کہا۔ ”میں گاؤں والوں کو بتا کر آیا ہوں کہ ہم کر توک کلیشیئر پار کر کے دوسری طرف سے جائیں گے اور گل خان ہمارے ساتھ ہوگا۔ یہ سفر ایک ہفتے کا ہے اس لیے ایک ہفتے تک تو کوئی نہیں آئے گا۔“

”گاؤں والوں نے تمہارے جھوٹ پر یقین کر لیا۔“

عمر نے بے یقینی سے کہا۔ ”وہاں ہمارا سامان ہے۔“

ضیا مسکرایا۔ ”میں وہ سامان بھی ساتھ لے آیا ہوں۔ گاؤں والے مجھے تمہارا سامان سمجھ رہے تھے اس لیے انہوں نے میری بات کا اعتبار کر لیا۔“

گل خان بجری اور پتھر کے ڈھیروں کے درمیان گھوم رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے وہ جگہ مل نہیں رہی تھی۔ ضیا نے یہ بات محسوس کر لی۔ اس نے گل خان سے کہا۔ ”کیا بات ہے، اب تک ہم اس جگہ نہیں پہنچے؟“

گل خان نے بے بسی سے کہا۔ ”ام کو وہ جگہ نہیں مل رہا۔“

”تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ یہ جگہ کتنی بڑی ہے جو تم کو وہ جگہ نہیں مل رہی۔“

”اور اندیرا اے اور سب جگا ایک سا اے۔“

عمر نے کہا۔ ”تم صبح بھی تلاش کر سکتے ہو۔“

”نہیں، ہمیں صبح سے پہلے تلاش کرنا ہے۔“ ضیا نے غصے سے کہا اور پستول کا رخ سمت کی طرف کر دیا۔ اس نے گل خان کی طرف دیکھا۔ ”اگر تم نے آدھے گھنٹے میں وہ جگہ تلاش نہیں کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“

”ام کو شش کرتا اے۔“ گل خان نے گھبرا کر کہا۔

”تم کو شش کرو۔ ان دونوں کے ساتھ۔“ اس نے عمر

شریف آدمی

ایک شریف آدمی کی خواہشات ہی کیا ہوتی ہیں۔ بس ایک بیوی جو اسے سچا پیار دے، ایسی بیوی جو امور خانہ داری اور کھانا پکانے میں اپنی مثال آپ ہو، ایسی بیوی جو فضول خرچ نہ ہو، وہ بیوی جو ہر وقت اپنے مجازی خدا کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہے... یہ مل جائے تو اس دنیاوی زندگی میں ہی جنت کا مزہ آ جاتا ہے... شرط صرف اتنی سی ہوتی ہے کہ اس کی چاروں بیویاں ایک چھت کے نیچے مل جل کر رہیں، فساد برپا نہ کریں۔

بیچہ وطنی سے شریف احمد کا خواب

جاتے ہیں۔“
گل خان جوش سے بولا۔ ”ظفر صیب فیک بولا۔ ایسا ای غارے۔“

عمر نے اوپر کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں بلندی پر جا کر دیکھنا ہوگا۔ چاند بلند ہو رہا ہے، اس کی چاندنی میں یہ ساری جگہ واضح نظر آئے گی۔“

وہ برف، بھری اور پتھروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بلندی کی طرف آئے۔ یہ کلیئیر کا کنارہ تھا اور یہاں برف سخت تھی۔ انہوں نے یہاں سے نیچے پھیلی زمین کا جائزہ لیا۔ یہ تقریباً چار ہیکٹر پر مشتمل جگہ تھی۔ زمین زیادہ نہیں تھی لیکن وہاں شیب و فرازا تھے زیادہ تھے کہ آدمی گھنٹوں بھی کسی خاص جگہ کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ مگر گل خان کو کچھ یاد آیا اور اس نے ایک سمت اشارہ کیا۔ ”امارا خیال اے اس طرف اے۔“

”تب تم وہاں جاؤ۔ میں یہاں سے تم پر نظر رکھوں گا۔ اگر تم غلط سمت جاؤ گے تو میں لائین جلا بجا کر اشارہ دوں گا۔“ عمر نے کہا تو گل خان نیچے اترنے لگا۔ ظفر، عمر کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”ہم اس جنونی کے لیے کام کر رہے ہیں، مجھے یقین ہے کام کرانے کے بعد وہ ہمیں مار دے گا۔“

”شاید لیکن فی الحال ہم مجبور ہیں۔“ عمر نے گل خان کو جاتے دیکھ کر کہا۔ اس نے وہ جگہ ذہن میں رکھی تھی جس کی نشان دہی گل خان نے کی تھی۔ گل خان اسی سمت جا رہا تھا

اور ظفر کی طرف اشارہ کیا۔ ”بچہ اور لڑکی میرے ساتھ ہوں گے۔ جب تم پتھروں والی جگہ تلاش کر لو گے تو اسی غار میں آ جانا۔“

”میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ مائرہ نے انکار کیا۔

”تم انکار نہیں کر سکتیں۔“ ضیا نے سومت کا بازو پکڑ لیا اور پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ ”بولو کیا کہتی ہو؟“

”میں چل رہی ہوں۔“ مائرہ گھبرا گئی۔ ”پلیز پستول اس سے دور کرو۔“

ضیا سومت اور مائرہ کو لے کر پیچھے ہٹا اور اس نے گل خان کو خبردار کیا۔ ”تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔“ وہ تینوں اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ظفر نے پاؤں پیچ کر کہا۔ ”یہ پاگل ہے۔“

”یقیناً وہ قیمتی پتھر کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”مگر اس وقت اس نے ہوشیاری سے کام لیا ہے۔“ ”وہ کیسے؟“ ظفر بولا۔

”وہ جانتا ہے کہ اتنے سارے لوگوں پر بیک وقت نظر نہیں رکھ سکتا اس لیے وہ ہم سے سب سے کمزور فریق چن کر لے گیا ہے۔ سومت کی وجہ سے گل خان مجبور ہے اور تم مائرہ کی وجہ سے۔“

”لیکن تمہاری کوئی مجبوری نہیں ہے۔“ ظفر کے لہجے میں طنز تھا۔

”ہاں میری مجبوری نہیں ہے لیکن میں تم لوگوں کا ساتھ دوں گا۔“ عمر نے کہا اور گل خان کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہیں وہ جگہ یاد نہیں آ رہی؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ام اپنے بچے کا جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“

”تب یاد کرو بلکہ تلاش کرو۔ اس کی کوئی نشانی ہو گی؟“

گل خان نے ذہن پر زور ڈالا اور بولا۔ ”اور کلیئیر کا چوڑا زمین غار بن گیا۔ جیسی پتھر اسی غار میں ملتا ہے۔“ ”تمہارا مطلب ہے ویسا ہی غار جہاں سے سومت ملا ہے؟“

گل خان نے نشی میں سر ہلایا۔ ”ایسا نہیں ہے۔“ ظفر بولا۔ ”میں سمجھ گیا۔ جب کلیئیر کسی جگہ کی زمین چھوڑتا ہے تو وہاں مٹی اور برف رہ جاتی ہے۔ بعد میں کسی گرم سال میں برف پگھلنے سے اس زمین میں غار سے بن

اس لیے عمر کو اسے اشارہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔
ظفر نے اگلا اعتراض کیا۔

”اشارے کی کیا ضرورت ہے، وہ اتنا دور نہیں ہے
کہ ہماری آواز نہ سن سکے۔“

”مناسب ہوگا کہ ضیا تک ہماری آواز نہ جائے۔“
عمر نے کہا۔

”اس سے کیا ہوگا۔“ ظفر کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ”ہوگا
وہی جو وہ چاہے گا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ان دو بچوں کا قاتل
بھی وہی ہے۔“

”اس کا کہنا ہے کہ وہ پہلی بار یہاں آیا ہے۔“
”کیا کہہ سکتے ہیں، ہو سکتا ہے پہلے وہ چپکے سے آیا
ہو۔“

عمر نے نفی میں جواب دیا۔ ”اس علاقے میں کوئی
چپکے سے آ جا نہیں سکتا۔“

”ایسے آدمی کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔“
ظفر بولا۔ نیچے گل خان اب تک لائین لے کر گھوم رہا تھا اور
اب اس نے لائین ایک جگہ رکھ کر اس کی روشنی میں ہاتھ ہلاتا
شروع کر دیا تھا۔ عمر نے نیچے کی طرف قدم بڑھائے۔
”چلو، وہ بلا رہا ہے۔“

وہ روشنی کو نظر میں رکھتے ہوئے گل خان تک پہنچنے میں
کامیاب رہے۔ وہ پرجوش ہو رہا تھا اس نے اضطرابی لہجے
میں زمین سے جھانکتے تاریک سوراخ کی طرف اشارہ کیا۔
”امارا خیال اسے یہ ای اے۔“

عمر آگے آیا اور اس نے اندر تارچ کی روشنی ڈالی۔
غار کی اونچائی اور چوڑائی کم تھی اور یہ کسی سرنگ کی طرح نیچے
جا رہا تھا۔ عمر نے کہا۔ ”تم دونوں یہیں رکو میں اندر جاتا
ہوں اور کوئی اندر نہ آئے، نہ زمین پر زور سے چلے یہ غار
بیٹھ سکتا ہے۔“

گل خان نے کہا۔ ”اس واسطے بی ام نے کبی اور
پتھر نکالنے کا نہیں سوچا۔ گاؤں کا کئی لوگ ادرا آیا اور غار میں
دفن او گیا۔“

ظفر نے کہا۔ ”تو یہ وجہ ہے کہ ہر کوئی پتھر نہیں نکالتا۔
یہاں باقاعدہ کان بھی نہیں بنائی جاسکتی اور سرد موسم کی وجہ
سے کھدائی آسان نہیں ہوتی ہے۔“

”بالکل خطرہ بہت زیادہ ہے۔“ عمر کہتے ہوئے
احتیاط سے اندر اتر گیا۔ اس نے چھت کی مٹی کو چھو کر دیکھا
وہ سخت اور بہ ظاہر جمی ہوئی تھی لیکن کیا کہا جاسکتا تھا کہ کب
یہ اپنی جگہ چھوڑ دے۔ وہ اندر داخل ہوا اور اس نے روشنی

ڈالی تو غارتقریباً پانچ گز کی گہرائی میں جانے کے بعد سیدھا
ہو رہا تھا اور مزید نیچے آنے پر وہ دائیں بائیں دو حصوں میں
بٹا نظر آیا۔ عمر نیچے آیا۔ اسے جھلکا پڑ رہا تھا ورنہ اس کا سر
چھت سے ٹکراتا۔ اس نے دائیں طرف کی سرنگ چنی اور
آگے جا کر یہ مزید دو حصوں میں بٹ گئی۔ یہ سرنگوں کا پورا
جال لگ رہا تھا۔ فرش پر کہیں کہیں کھدائی کی مٹی پڑی ہوئی
تھی اور یہ کھدائی دائیں بائیں دیواروں سے کی گئی تھی مگر اتنی
احتیاط سے کہ چھت ذرا بھی غیر متوازن نہیں ہوئی تھی۔ عمر
نے دل ہی دل میں ان لوگوں کو داد دی جنہوں نے یہاں
سے قیمتی پتھر نکالے تھے۔ انہوں نے سرنگوں میں حفاظت کا
پورا خیال رکھا تھا۔ کہیں بھی اسے اتنا نہیں کھودا تھا کہ وہ
سرنگ غیر متوازن ہو کر بیٹھ جائے۔ مگر خطرہ پھر بھی تھا۔

اسے کہیں کہیں دیواروں میں چمک سی دکھائی دی مگر
جب اس نے اس جگہ کو کرید تو وہاں سے سیاہ چمکتی ریت کا
موٹا ذرا نکلا۔ یقیناً نکالنے والوں نے یہاں سے ریت اتنی
احتیاط سے چھانی تھی کہ قیمتی پتھر کا معمولی سا ٹکڑا بھی ان کی
نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ عمر سوچ رہا تھا کہ یہ ہفتوں
نہیں مہینوں کا کام تھا اور ضیا ان سے چند دن میں یہ کام
کروانا چاہتا تھا جو یہ ظاہر ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوسری
طرف اتنے عرصے انہیں اپنے قابو میں رکھنا بھی ممکن نہیں
تھا۔ ضیا نہ تو ہمہ وقت جاگ سکتا تھا اور نہ ہی بیک وقت سب
کی نگرانی کر سکتا تھا۔ عمر حیران تھا کہ ضیا نے کیا سوچ کر یہ
قدم اٹھایا تھا۔ اگر یہاں مارے جانے والے دو بچوں کا
قاتل وہی تھا تو اس کے دیوانے پن میں شبہ نہیں تھا۔ مگر اس
کی یہ دیوانگی صرف دوسروں کی زندگی سے کھیلنے کی حد تک
تھی۔ اپنے لیے وہ بہت ہوشیار اور فرزانہ تھا۔

وہ واپسی کے لیے مڑا تھا کہ اس کا جوتا ریت کے
ایک ڈھیر سے ٹکرایا۔ جمی ریت کا ایک ٹکڑا الگ ہو کر گرا اور
روشنی میں اس میں کوئی چیز چمکتی دکھائی دی تھی۔ عمر نے جھک
کر دیکھا، اس کا خیال تھا کہ یہ بھی سیاہ ریت کا کوئی ٹکڑا ہو
گا۔ مگر خلاف توقع اسے سبزی مائل چمک نظر آئی۔ اس نے
ریت کا ٹکڑا اٹھایا جو سوجی کے خشک حلوے کی طرح جما ہوا
تھا۔ عمر نے اسے زمین پر مارا اور ریت بکھر گئی۔ چند لمحے
بعد وہ تقریباً ڈیڑھ انچ لمبے اور ایک انچ چوڑے اور موٹے
سبز پتھر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ زمرود تھا تو یقیناً بہت
زیادہ قیمتی تھا۔ اس نے اسے صاف کر کے جیکٹ میں رکھا
اور سرنگوں سے باہر آنے لگا۔ ہر بار دائیں طرف کی سرنگ
منتخب کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ جاتے ہوئے اسے بائیں

”سب جائیں گے۔“ ضیا نے پستول لہرا کر کہا۔
مجبوراً وہ سب باری باری اندر اترے۔ ظفر ڈرا ہوا تھا کہ
غار اچانک نہ بیٹھ جائے۔ عمر انہیں غار کے اندر تک لایا۔ وہ
اس جگہ پہنچ کر رکا جہاں تک وہ پہنچا تھا۔

”میں یہاں تک آیا تھا۔ تم دیکھ رہے ہو یہاں تک
کھدائی کی جا چکی ہے اور ان سرنگوں کی اس سے زیادہ
کھدائی ممکن نہیں ہے۔ پتھروں کی تلاش کے لیے آخری
سروں پر کھدائی کرنی ہوگی۔ اس طرح سے کھدائی کے لیے
بہت سا وقت درکار ہوگا۔“

ضیا کے چہرے پر چند لمحے کے لیے ٹھکر نظر آیا۔ مگر پھر
اس نے شانے جھٹکے۔ ”تم تینوں کھدائی شروع کرو۔ اوزار
اس تھیلے میں ہیں۔ ہمارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ اگر اس
ایک ہفتے میں مجھے مطلوبہ مقدار میں قیمتی پتھر مل گئے تو ٹھیک
ہے۔“

”کیا ٹھیک ہے؟“ ظفر نے جلدی سے کہا۔ ”اگر ایسا
نہ ہوا تو؟“

ضیا کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔۔۔۔۔
”تب تم خود دیکھ لو گے۔“

کچھ دیر بعد غار میں وہ تینوں رہ گئے تھے۔ ضیا،
سومت اور مارہ کو لے کر چلا گیا تھا۔ جاتے ہوئے وہ ان
سے کہہ گیا تھا کہ وہ کام شروع کریں۔ وہ کچھ دیر میں واپس
آتا ہے۔ گل خان اور ظفر فکر مند تھے کہ وہ سومت اور مارہ
کو کہاں لے گیا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہر کام سوچ سمجھ کر
کر رہا ہے، اسے معلوم تھا کہ کس وقت اسے کیا کرنا ہے۔
عمر سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”پہلے میں اسے دیوانہ سمجھ رہا
تھا مگر اب پتا چل رہا ہے وہ ہوشیار ہے۔ اس نے یقیناً کوئی
ٹھکانا تلاش کر لیا ہے جہاں وہ ان دونوں کو قید رکھے گا ہمارا
سامان بھی وہیں ہوگا اور اس میں اتنی خوراک ہے جو آرام
سے ایک ہفتہ چل سکتی ہے۔“

”کیسے قید رکھ سکتا ہے۔“ ظفر نے انکا وکیا۔ ”کیا
اس نے باقاعدہ قید خانہ بنا لیا ہے۔ وہ سوئے گا یا کہیں
جائے گا نہیں جو اس کی غیر موجودگی سے ہم فائدہ نہ اٹھا
سکیں۔“

”مجھے یقین ہے اس نے فول پروف بندوبست کر لیا
ہوگا۔“

”ام کو کام کرنا چاہیے۔“ گل خان نے کہا۔ ”وہ ابی
آئے گا اور دیکھے گا۔“

”پہلے تو ہمیں کسی سرنگ کے آخری حصے تک پہنچنا ہوگا

سرنگ منتخب کرنی پڑی اور وہ راستہ بھٹکے بغیر باہر آ گیا۔ وہاں
صرف ظفر تھا اور گل خان غائب تھا۔

”تم نے بہت دیر کر دی۔“ ظفر بولا۔ ”ہم تو ڈر گئے
تھے کہ تم کسی مشکل میں پھنس گئے ہو۔“

”مشکل میں تو ہم ہیں۔ گل خان کہاں ہے؟“

”وہ ضیا کو بتانے گیا ہے کہ اس نے جگہ تلاش کر لی
ہے، اسے ڈر ہے کہ دیر کی تو وہ اس کے بیٹے کو نقصان نہ پہنچا
دے۔“

”یہ شخص میری سمجھ سے باہر ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”میں
جو اندر دیکھ کر آیا ہوں اس جگہ قیمتی پتھر تلاش کرنا آسان
نہیں ہے۔ اندر سرنگ در سرنگیں ہیں اور میں شاید آدھے
راستے سے واپس آ گیا۔“

ظفر نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں لیکن یہ شخص سمجھتا
ہے کہ اندر قیمتی پتھر ایک ڈھیر کی صورت میں ہوں گے۔ ہم
اس کے لیے بوری بھر کر لے آئیں گے۔“

عمر کو بوری پر یاد آیا۔ ”تھیلے میں کیا ہے؟“

ظفر نے تھیلہ ایک طرف رکھ دیا تھا، اس نے کھول کر
دیکھا تو اس میں کھدائی کے چھوٹے اوزار تھے۔ چھوٹے
نیچے اور کدالیں۔ ریت چھاننے والی چھلنیاں بھی تھیں۔
”وہ پہلے سے تیاری کر کے آیا ہے۔“

”وہ آگئے۔“ ظفر نے اشارہ کیا۔ ایک طرف سے
روشنی جھلک رہی تھی اور پھر وہ چاروں سامنے آئے۔ ضیا نے
پستول کا رخ سومت کی طرف کر رکھا تھا۔ آگے آتے ہوئے
اس نے گل خان سے کہا۔

”اگر یہ جگہ قیمتی پتھر والی نہ ہوئی تو میں تمہیں اور
تمہارے بیٹے کو اسی جگہ دفن کر دوں گا۔“

”اس نے ٹھیک کہا ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”قیمتی پتھر
اسی جگہ سے نکالے جاتے رہے ہیں، میں اندر تک ہو کر آیا
ہوں۔“

”تمہیں کوئی قیمتی پتھر ملا؟“ ضیا نے بے تابی سے
پوچھا۔

”اندر قیمتی پتھروں کے ڈھیر لگے ہیں۔“ عمر نے
استہزاء سے انداز میں کہا۔ ”کھدائی کی ضرورت بھی نہیں ہے،
چل کر سمیٹ لو، لیکن تم صرف ایک بوری لائے ہو۔“

ضیا کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”اندر
چلو۔“

ظفر غار کے دہانے کو پرتشویں نظروں سے دیکھ رہا
تھا، اس نے کہا۔ ”میں اندر نہیں جاؤں گا۔“

جہاں ہم کھدائی کر سکیں۔“

”میرے خدا یہاں کس قدر بخ ہے۔“ ظفر نے جھرجھری لی۔ ”اتنی سردی کی صفائی کیسے کر سکتے ہیں؟“

عمر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس بار وہ ہر رنگ میں جھانک رہے تھے اور بالآخر ایک سرنگ انہیں نیم کھدی ہوئی مل گئی۔ اسے مزید کھودا جاسکتا تھا۔ انہوں نے اوزار نکالے۔ مگر عمر نے انہیں روک دیا۔ ”سب کا ایک جگہ کام کرنا مناسب نہیں ہے اور جس طرح سرنگ کی چھت اور دیواریں ہیں بالکل اسی طرح آگے بھی کھدائی کرنی ہوگی۔ ذرا سی بے احتیاطی ہمیں اس جگہ زندہ دفن کر دے گی۔“

گل خان اور ظفر اپنے لیے جگہ تلاش کرنے لگے۔ انہیں بھی نیم کھدی سرنگیں مل گئیں۔ یہ اس غار کا آخری حصہ بھی تھا اور بیشتر سرنگیں آگے سے بندل رہی تھیں۔ عمر نے ایک بیلچہ، ایک کدال اور ایک چھلنی لے لی تھی۔ چھلنی اتنی باریک تھی کہ اس سے ایک قیراط کا پتھر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ کدال کی نوک مار کر نیچے مٹی گرانے لگا۔ مٹی اتنی سخت تھی کہ بکھرنے کے بجائے اس کے ٹکڑے گر رہے تھے۔ خاصے ٹکڑے گرانے کے بعد عمر انہیں چھلنی میں ڈال کر چھاننے لگا۔ چھاننے کا کام سب سے مشکل اور صبر آزما تھا کیونکہ چھلنی کو مسلسل ہلانے سے ریت بکھر رہی تھی اور یہ اتنی بخ تھی کہ اسے ہاتھ لگانا بھی مشکل تھا۔ ایک کلو گرام ریت چھاننے میں ایک منٹ سے زیادہ کا وقت لگ رہا تھا۔ ایک گھنٹے کی محنت کے بعد اس نے کوئی بیس بائیس کلو گرام ریت چھان لی تھی مگر نتیجہ صفر نکلا تھا۔ اسے معمولی سا پتھر بھی نہیں ملا تھا۔

وہ تھک کر ہانپنے لگا تھا۔ اس نے سرنگ سے باہر آ کر گل خان اور ظفر کو آواز دی۔ وہ دونوں بھی تھک گئے تھے اور اس کام سے بیزار تھے اس لیے اس کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئے۔ گل خان کو ایک چھوٹا پتھر ملا تھا۔ یہ نیلگوں رنگ کا تھا اور مشکل سے کالی مرچ کے دانے جتنا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”بوت مشکل کام آئے۔“

”ٹھیک کہا۔“ ظفر بولا۔ ”یہ یہاں رہنے والے ہی کر سکتے ہیں۔“

”لیکن تم تینوں کو کرنا ہے۔“ ایک طرف سے ضیا نمودار ہوا تھا۔ اس نے چالاکی سے کام لیا تھا اور بتا روشنی اور آہٹ کے آیا تھا اس لیے انہیں علم نہیں تھا کہ وہ وہاں موجود ہے اور نہ جانے کب سے ہے۔ عمر نے اس سے کہا۔ ”ہم اس طرح اندھا دھند کام نہیں کر سکتے۔ ہمارے

سامنے ایک ٹارگٹ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمہیں پوری بھر کر پتھر دیں اور تم کہو کہ تم نے دو پوری کا سو چاہا تھا۔“

ضیا مسکراتے لگا۔ ”تم چالاک آدمی ہو۔ تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ واقعی ایک ٹارگٹ سیٹ کرنا چاہیے اور تم تینوں اس کے مطابق کام کرو گے۔“ ضیا نے اپنی جیکٹ میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی۔ اس نے وہ تھیلی زمین پر الٹ دی اور اس میں سے سبز اور نیلگوں رنگ کے کوئی نصف درجن پتھر نکل کر زمین پر بکھر گئے۔ اس میں سب سے بڑا پتھر کبوتر کے انڈے کے سائز کا تھا اور سب سے چھوٹا مٹر کے دانے جتنا۔ ضیا نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے ان سائزوں کے سو سے ڈیڑھ سو تک پتھر چاہئیں۔ یہاں زمرہ کے ساتھ نیلم اور یاقوت بھی ملتا ہے مگر یاقوت کم ہوتا ہے وہ سرخ رنگ کا پتھر ہوتا ہے۔“

”سو سے ڈیڑھ سو کا تک سمجھ میں نہیں آیا۔“ ظفر نے اعتراض کیا۔

”اگر بڑے پتھر زیادہ ہوں تو سو بھی کافی ہوں گے لیکن اگر پتھر چھوٹے ہوئے تو ڈیڑھ سو ہونے چاہئیں۔“

”ام کو یہ ملا اے۔“ گل خان نے نیلگوں پتھر اس کے حوالے کیا۔ اس نے لے کر دیکھا۔

”اچھا ہے لیکن میرے معیار کا نہیں ہے۔ اس قسم کے جتنے بھی پتھر ملیں وہ تمہارے ہوں گے۔“ ضیا نے کہا مگر پتھر گل خان کو واپس کرنے کے بجائے اسے بھی تھیلی میں ڈال لیا۔

”ہم مسلسل کام نہیں کر سکتے۔“ عمر نے کہا۔ ”ہمیں آرام اور خوراک کی ضرورت بھی ہوگی۔“

”میں نے اس کا شیڈول بھی بنا لیا ہے۔ تم لوگ چھ گھنٹے کام اور چھ گھنٹے آرام کرو گے۔ خوراک آرام کے وقفے میں مہیا کی جائے گی۔ تم لوگ اسی غار میں رہو گے۔ میں تمہارے لیے سامان لے آیا ہوں۔“

”سومت اور مائرہ کہاں ہیں؟“ عمر نے پوچھا۔

”وہ محفوظ جگہ اور بالکل ٹھیک ہیں۔ میں ان کی دیکھ بھال بھی کروں گا۔“ ضیا نے کہا اور انہیں غار کے آغاز میں لے کر آیا۔ وہ ان کے سلیپنگ بیگز لے آیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ گل خان کے لیے گرم پتلون، جوتے اور جیکٹ بھی لایا تھا۔ وہ ایسے لباس میں نہیں تھا کہ آرام سے کام کر سکتا۔ ”تم تینوں میں سے کوئی یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔ رفع حاجت کے لیے بھی اندر کوئی جگہ بنا لو۔ اگر کوئی باہر نکلا تو وہ مجھ سے چھپا نہیں رہے گا اور اس کا انجام سب کے سامنے ہو

گا۔ ”ضیا نے کہتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ ”صبح کے چھ بجنے والے ہیں۔ تم بارہ بجے تک کام کر دو گے۔ میں کسی وقت بھی دیکھنے آؤں گا۔“

ضیا انہیں وارننگ دے کر چلا گیا۔ عمر نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”میں نے ٹھیک کہا تھا اس نے ہر پہلو پر غور کیا ہوا ہے؟“

”لیکن اس نے سومت اور مائرہ کو کیسے قید کیا ہوگا؟“

”ممکن ہے اس نے انہیں کہیں باندھ دیا ہو۔ اس کے پاس زنجیریں اور جھکڑیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ دونوں کسی صورت انہیں نہیں توڑ سکتے۔“ عمر نے خیال پیش کیا اور کھڑا ہو گیا۔ ”چلو وہ چیک کرنے کی دھمکی دے کر گیا ہے۔ کہیں سچ سچ نہ چیک کرنے آجائے۔“

وہ تینوں غار میں اپنے اپنے حصوں میں آئے اور کھدائی کرنے میں لگ گئے۔ یہ بالکل اندر کے حصے تھے اس لیے یہاں مسلسل برقی لائٹیں روشن رکھنا پڑ رہی تھیں۔ دوپہر تک ان کی بیٹری کا چارج بالکل ختم ہو گیا اور جب وہ بارہ بجے غار کے بیرونی حصے تک آئے تو یہ بند ہونے والی ہو رہی تھیں۔ مگر جب وہ آرام والی جگہ پہنچے تو انہیں وہاں چارج شدہ برقی لائٹیں رکھی نظر آئیں۔ ان کے ساتھ وہاں ٹن بند خوراک بھی تھی اور اسے گرم کرنے کے لیے الاؤ کی لکڑیاں بھی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے آگ جلائی اور خوراک گرم کرنے لگے۔ بھوک سے سب کا برا حال تھا۔ اس دوران میں تینوں نے اپنی کارگزاری بھی ایک دوسرے کو دکھائی۔ انہیں درمیانے اور چھوٹے سائز کے کوئی ایک درجن پتھر ملے تھے مگر ان میں کوئی بہت قیمتی پتھر نہیں تھا۔ صرف تین اس سائز کے تھے جو ضیا نے انہیں دکھائے تھے۔ باقی نو اس سے چھوٹے سائز کے تھے۔

”یہ تو لگ رہا ہے کہ سارے پتھر ہمارے لحاظ سے مل جائیں گے۔“ ظفر نے کہا۔

”پر ام اس سے فائدہ اٹانے کا واسطے زندا نہیں او گا۔“ گل خان نے فکر سے کہا۔ ”اگر اس داؤس نے امارا بچہ کو نہ پکڑا اوتا تو ام مر کر بی اس کا کام ناکرتا۔ ام کو یقین اے اگر ام نے اسے پتھر دے بی دیا تب بی یہ کسی کو نہیں چوڑے گا۔“

باہر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ دن صاف اور روشن تھا۔ وہ کھاپی کر آرام کرنے لگے۔ گل خان نے رفع حاجت کے لیے ایک جگہ مخصوص کر لی تھی، وہ وہاں گڑھے کھود کر اپنا کام چلا سکتے تھے اس سے گندگی اور بدبو بھی نہیں پھیلی۔ وہ سب

بے خبر سو رہے تھے کہ ضیا نے آواز دے کر انہیں بیدار کیا۔ ”اٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ کام کا وقت ہو گیا ہے۔“

وہ سب اٹھ گئے۔ انہوں نے ملنے والے پتھر ایک جگہ جمع کر لیے تھے۔ ضیا ان کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے شک سے کہا۔ ”تم لوگوں کو بس یہی ملا ہے؟“

”ظاہر ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”اگر ہم کچھ چھپائیں گے بھی تو تم ہمیں کہاں چھوڑو گے۔“

”مائرہ کہاں ہے؟“ ظفر نے کہا۔

”سومت کدراے؟“ گل خان نے بھی سوال کیا۔

”دونوں محفوظ ہیں۔“ ضیا نے کہا۔

”ام کو یقین نہیں اے۔“ گل خان جذباتی ہو رہا تھا۔

”تم دو بچوں کو مارا اب ان کو بی مار سکتا اے۔“

”وہ زندہ ہیں، میں تم کو یقین دلا سکتا ہوں۔“ ضیا نے

کہا اور جیکٹ سے ایک واکی ٹاک ٹکالا اور اس کا بٹن دبا کر

بولی۔ ”مائرہ تم سن رہی ہو؟“

”ہاں میں سن رہی ہوں۔“ کچھ دیر بعد مائرہ کی

آواز آئی۔

”گل خان سومت کی آواز سننا چاہتا ہے اس سے

بات کراؤ۔“

”بابا تم کدراے۔“ سومت کی آواز آئی۔ ”اس نے

ام کو اور قید کیا اے۔“

”تم نے سن لیا۔“ ضیا نے گل خان کی طرف دیکھا۔

”میری مائرہ سے بات کراؤ۔“ ظفر نے کہا تو ضیا نے

واکی ٹاک اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بے تابی سے

پوچھا۔ ”مائرہ تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ وہ بولی۔ ”اس نے ہمیں

زنجیروں اور جھکڑی سے باندھ دیا ہے مگر اس کے علاوہ اور

کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ ظفر نے جذباتی لہجے میں

کہا اور ضیا نے اس سے واکی ٹاک واپس لے لیا۔

”شاہاش کام شروع کرو۔ مجھے رزلٹ چاہیے۔“

وہ چارج شدہ برقی لائٹیں لے کر اندر غار میں

آئے۔ پہلے والی لائٹیں ضیا لے گیا تھا۔ اندر جاتے ہوئے

عمر نے آہستہ سے ان دونوں سے کہا۔ ”میرے ذہن میں

ایک خیال آرہا ہے لیکن پہلے ہم ایک گھنٹا کام کریں گے۔

اس کے بعد میں تم دونوں کو بتاؤں گا۔“

وہ تینوں اپنے اپنے حصوں میں آگئے اور مٹی کی

کھدائی اور اس کی چھان بین میں لگ گئے۔ اتفاق کی بات

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11 ایمینسٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

تھی کہ ایک گھنٹے میں عمر کو چار بڑے پتھر ملے۔ ان میں تین
زمرہ تھے اور ایک نایاب تھا۔ پتھر قیمتی لگ رہے تھے۔ عمر نے
انہیں اور جو پتھر اسے اتفاقی ملا تھا ان سب کو اسی غار میں
ایک جگہ دیوار کی جڑ میں چھوٹا سا گڑھا کر کے دفن کر دیا
اور ریت برابر کر دی۔ ایک گھنٹے بعد وہ باہر آیا اور اس نے
ان دونوں کو آواز دی۔ وہ اپنے غاروں سے باہر آئے۔ عمر
نے پہلے ایک لائٹن مکینہ حد تک دوری پر رکھی جہاں سے ضیا
آ سکتا تھا اور پھر وہ ایک جگہ جمع ہوئے۔ عمر نے آہستہ سے
کہا۔

”ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ ماثرہ اور سومت کس جگہ قید
ہیں اور وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے اگر
ہم کسی طرح ضیا پر قابو پالیں تو انہیں تلاش کر سکتے ہیں۔“
”پر کا بول کیسے پائے؟“ گل خان نے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے وہ چپکے سے اس طرف آتا ہے اور
دیکھتا ہے کہ ہم کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ ایسے کسی موقع پر ہم
اس پر قابو پا سکتے ہیں۔“

”اگر ہم اس پر قابو پانے کے لیے گھات لگائیں گے
تو کام کون کرے گا؟“

”دو کام کریں گے اور ایک گھات لگائے گا۔“ عمر
نے کہا۔ ”یہ کام میں کروں گا۔“

”ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔“ ظفر نے کہا تو عمر
مسکرایا۔

”تم اوزاروں کو بھول رہے ہو، یہ بہترین ہتھیار بھی
ہیں۔“

وہ گفتگو کے دوران دیکھ رہے تھے کہ ضیا تو نہیں آرہا
ہے مگر روشنی میں کوئی اس طرف آتا نظر نہیں آیا تھا۔ طے ہوا
کہ وہ تین گھنٹے کام کریں گے اور اس کے بعد عمر گھات
لگائے گا۔ مزید ایک گھنٹے بعد عمر سرنگ کے بیرونی حصے کی
طرف آیا اور اس نے گھات لگانے کے لیے ایک ناممل غار
کا انتخاب کیا جس کے آگے چٹان آگئی تھی اور اسے ادھورا
چھوڑ دیا گیا تھا۔ عمر نے اس کی ایک طرف کی دیوار میں
کھدائی کر کے چھ سات انچ کا ایسا خلا بنالیا جس میں وہ خود
کھڑا ہو سکتا تھا اور نکلنے والی مٹی اس نے زمین پر ہموار کر کے
پھیلا دی۔ ضیا کو غار کے آخری حصے میں جانے کے لیے اس
جگہ سے گزرنا پڑتا اور تب عمر اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ یہ کام
کر کے وہ واپس آیا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے
اور سردی پھر شدت اختیار کر گئی تھی۔ انہیں رات بارہ بجے
تک کام کرنا تھا۔ اس نے واپس آکر ان دونوں کو بتایا۔

”میں نے جگہ بتالی ہے اور نوبچے میں وہاں چلا جاؤں گا۔ ضیا پر حملہ کرتے ہی میں تم دونوں کو آواز دوں گا اور تم میری مدد کو آؤ گے۔ ممکن ہے میں اسے اکیلے قابو نہ کر سکوں۔“

”ام آئے گا آپ فکر نہ کرو۔“ گل خان نے کہا۔

البتہ ظفر ہچکچایا۔ ”لیکن ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔“

”جو تم اپنی جان بچانے کے لیے کر سکتے ہو۔“ عمر نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یاد رکھنا میری ناکامی کا مطلب سب کی موت ہوگا۔“

ظفر کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا ”بہتر ہوگا ہم اسے قابو کرنے کے بجائے اس کے لیے کام۔۔۔۔۔۔“

”اگر ہم نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا تب بھی امکان کم ہے کہ وہ ہمیں چھوڑے گا۔ وہ ہمیں گولی مار کر ہماری لاشیں یہیں ڈال جائے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہم کہاں گئے۔ اس طرح اس جگہ کاراز بھی راز رہے گا۔“

”آپ فیک بولا صیب۔ وہ قاتل اے، دو قتل کر چکا اے پانچ اور کر دے گا۔“

”اس لیے ہمیں اس پر قابو پانا ہی ہوگا۔۔۔ اگر وہ مارا جاتا ہے تب بھی پروا نہیں کرنی چاہیے۔“ عمر نے کہا اور اپنے غار کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ظفر دل سے ان کے ساتھ نہیں ہے، اسے خوف تھا کہ ناکامی کی صورت میں ضیا سب کے ساتھ اسے بھی مار دے گا۔ جس حصے میں کھدائی کر رہا تھا یہاں پتھر خاصی مقدار میں تھے۔ دوسرے گھنٹے میں بھی یہاں بہت کچھ نکلا تھا اور اس کا خاص حصہ عمر نے مٹی تلے چھپا دیا تھا۔ گل خان اور ظفر کو وہی چھوٹے موٹے پتھر مل رہے تھے۔ نوبچے اس نے لائین غار میں چھوڑی اور ان دونوں کو اطلاع دے کر باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاریکی میں وہ ٹول کر چل رہا تھا جب اس نے محسوس کیا کہ وہ گھات والی جگہ کے نزدیک آ گیا ہے تو اس نے اپنا موبائل نکال کر اس کی اسکرین روشن کی۔ ضیا نے ان کے پاس موجود چیزیں نہیں لی تھیں۔ ان کے موبائل بھی ان کے پاس تھے مگر یہاں موبائل سگنل نہیں تھے۔ آری نیٹ ورک بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ گھات والے غار تک آیا اور موبائل آف کر کے واپس رکھ لیا۔

وہ اپنے ساتھ کدال لایا تھا، اس کا ایک سرا ہتھوڑی کی طرح چھٹا تھا اور اس کی ایک ہی ضرب کسی کے حواس اڑانے کے لیے کافی ہوتی۔ عمر کو امید تھی کہ ضیا یہاں تک آنے کے لیے روشنی استعمال کرے گا اور یہی روشنی اسے

خبردار کر دے گی۔ وہ غار میں ساکت بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس طرح سے وقت گزاری کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ اسے اب ہوا تھا۔ وہ ہر کچھ دیر بعد گھڑی دیکھتا تو اسے سوئیاں اسی جگہ نظر آتیں۔ ایک گھنٹا بہت مشکل سے گزرا۔ اچانک غار کے بیرونی حصے کی طرف سے آہٹ ہوئی۔ کسی نے کوئی چیز زمین پر رکھی تھی پھر اسے سانس لینے کی تیز آواز سنائی دی۔ آنے والا ہانپ رہا تھا اور اسی طرف آ رہا تھا۔ عمر چونکا ہو گیا۔ خلاف توقع ضیا نے روشنی نہیں کی تھی۔ وہ تاریکی میں آ رہا تھا۔ عمر تذبذب میں رہ گیا کہ کیا وہ تاریکی میں حملہ کرے اور اگر حملہ کار گر نہ ہو تو ضیا اسے شوٹ کر دے گا۔ وہ ہچکچاتا رہ گیا اور ضیا اس کے پاس سے گزر گیا۔

اب اسے خدشہ ستا رہا تھا کہ اگر ضیا نے دیکھ لیا کہ وہ اپنے غار میں نہیں ہے تو وہ چونکا ہو جائے گا اور پھر اس پر قابو پانا آسان نہیں رہے گا۔ عمر غار کے بالکل کنارے آ گیا۔ اچانک اسے اندر سے ضیا کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ گل خان اور ظفر پر چلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ عمر کہاں ہے۔ وہ دونوں اسے یقین دلارہے تھے کہ انہیں نہیں معلوم۔ گل خان نے کہا کہ وہ رفع حاجت کے لیے جاسکتا ہے مگر ضیا اس کی بات کا یقین نہیں کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس صورت میں وہ لائین کیوں نہیں لے کر گیا؟ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اچانک ظفر نے بھانڈا پھوڑ دیا اس نے ضیا سے کہا۔ ”وہ گھات لگا کر تم پر حملہ کرنا چاہتا تھا اور آگے غار میں چھپا ہوا ہے۔ یہ اس کا پلان تھا ہم اس میں شامل نہیں ہیں۔ ہم نے منع کیا تھا مگر وہ خاموشی سے چلا گیا۔“

عمر نے دل ہی دل میں اسے گالی دی اور تیزی سے غار کے باہر والی سمت بڑھا۔ اب غار میں رہنے کا مطلب خودکشی بھی ہو سکتا تھا۔ باہر آتے ہی وہ تیزی سے بجری کے ڈھیروں کے درمیان آ گیا۔ اسے ظفر کی بزدلی پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا جس نے اس کا پلان ناکام بنا دیا اور سب کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ظفر اور گل خان ضیا کے قبضے میں تھے۔ وہ ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا مگر عمر کو امید تھی کہ وہ انہیں کچھ نہیں کہے گا۔ کیونکہ اگر وہ انہیں مار دے گا تو اس کے لیے کھدائی کون کرے گا۔ پھر ان دونوں کی مجبوریاں ضیا کے قبضے میں تھیں۔ عمر کی مجبوری نہیں تھی۔ اس لیے ضیا اب اسے پالیتا تو اسے مار دیتا۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ اس سے دور رہے۔ عمر کے لیے آسان کام یہ تھا کہ وہ یہاں سے گاؤں چلا جاتا اور

مارہ کو کہاں قید رکھا ہے تو وہ حیران ہوا مگر اس کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا، وہ تیزی سے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بڑی سی چٹان اس نے دور سے دیکھی تھی مگر اس کے نزدیک نہیں گیا تھا۔ کلیخیر کے دہانے کے علاقے سے نکلنے کے بعد اس نے احتیاط بالائے طاق رکھی اور ہر ممکن تیزی سے چلنے لگا۔ اگرچہ اس کے پاس سوائے موہاٹل کے اور کوئی چیز نہیں تھی مگر وہ روشنی کے لیے اسے بھی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ نالے کے ساتھ ہوتے ہوئے وہ جنگل میں داخل ہوا اور اس نے چٹان کا رخ کیا۔ وہ چلنے کے دوران بار بار پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں ضیا اس کے پیچھے تو نہیں آ رہا ہے۔ مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ چٹان کے پاس آ کر اس نے غار کی تلاش شروع کی مگر وہ اسے نظر نہیں آ رہے تھے۔ مجبوراً اس نے آہستہ سے آواز دی۔

”سومت، مارہ تم لوگ کہاں ہو؟“

”عمر صیب۔“ سومت کی آواز آئی مگر فوراً ایسا لگا جیسے اس کا منہ بند کر دیا گیا ہو۔ پھر مارہ کی آواز آئی۔

”عمر یہ آپ ہیں؟“

ان آوازوں سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ غار کہاں ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے ذرا اوپر چڑھنا ضروری تھا۔ اس نے اوپر چڑھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، میں ہوں۔“

”اوپر آ جاؤ ہم غار میں ہیں۔“ مارہ نے کہا۔ عمر اوپر آیا اور اسے غار کا تاریک دہانہ نظر آ گیا لیکن جیسے ہی اس نے غار میں قدم رکھا کوئی چیز اس کے سر سے لگی اور وہ منہ کے بل نیچے گرا تھا۔

☆☆☆

ضیا، ظفر اور گل خان کو ہینڈ زاپ کرائے ہوئے جنگل میں واقع چٹان تک لایا۔ گل خان اتنے عرصے سے یہاں آ جا رہا تھا مگر اسے علم نہیں تھا کہ اس چٹان میں کوئی غار بھی ہے۔ اس لیے وہ حیران ہوا اور اس وقت ظفر اور گل خان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ضیا نے نیچے سے مارہ کو آواز دی اور پوچھا۔ ”عمر آ گیا ہے؟“

”ہاں اور بے ہوش ہے۔“ مارہ چٹان کے اوپر ایک لائٹن کے ساتھ نمودار ہوئی۔ ”میں نے اس کے سر پر وار کیا تھا۔“

ظفر اور گل خان حیرت سے اب پاگل ہونے کے قریب تھے۔ ظفر نے چلا کر کہا۔ ”مارہ یہ کیا کہہ رہی ہو، تم اس شخص کے ساتھ مل گئی ہو۔“

”یہ ملی نہیں ہے شروع سے میرے ساتھ تھی۔“ ضیا

وہاں سے مدد لے کر آتا۔ لیکن اسے خطرہ تھا کہ اگر ضیا اسے نہ پاسکا تو وہ شاید ان چاروں کو قتل کر دے اور یہاں سے فرار ہو جائے۔

ضیا ان دونوں کو لے کر باہر نکل آیا تھا، اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”عمر، اگر تم سامنے نہیں آئے تو میں ان دونوں کو گولی مار دوں گا۔“

”خدا کے لیے۔“ ظفر نے مگھیا کر کہا۔ ”وہ یہاں سے جا چکا ہو گا اور اگر یہیں کہیں چھپا ہے تب بھی ہماری خاطر کیوں سامنے آئے گا۔ ہم اس کے کچھ نہیں لکتے کہ وہ ہماری خاطر جان خطرے میں ڈالے۔“

”اگر تم ام کو مار دے گا۔“ گل خان نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔ ”تو پتھر کا واسطے کدائی تمہارا باپ کرے گا۔“

گل خان کی بات اور لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ضیا سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہے۔ اس کا رویہ ظفر کے برعکس تھا۔ ضیا نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا اور دانت پیس کر بولا۔ ”کسی کو نہ سہی مگر میں تمہیں ضرور قتل کروں گا لیکن پہلے تمہارے سامنے تمہارے بیٹے کو قتل کروں گا۔“

گل خان غرا کر اس کی طرف بڑھا تھا کہ ضیا نے غار کیا اور گولی گل خان کے پیروں کے پاس لگی تھی۔ وہ رک گیا مگر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر امارا بچہ کا ذرا بھی نقصان ہوا تو ام تمہارا ٹکڑے کر دے گا۔“

”اگر میں یہ گولی تمہارے سینے میں اتار دیتا تو پھر تم کیسے میرے ٹکڑے کرتے۔“ ضیا ہنسا تو اس بار اس کی ہنسی میں دیوانگی تھی۔ ”تمہیں پتا ہے میں نے تمہارے بیٹے اور مارہ کو کہاں رکھا ہے؟“

”وہ کدرا ہے؟“

”کلیخیر کے بعد جنگل کے شروع میں بڑی سی چٹان میں جو غار ہے وہ اس میں ہیں۔“ ضیا نے کہا۔ ایک بار ہنسنے کے بعد وہ سنجیدہ اور ہوشیار نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

”چلو میں تمہیں تمہارے بیٹے سے ملوا دوں۔“

وہ تینوں ایک طرف روانہ ہوئے۔ ظفر آگے تھا اور اس کے پیچھے گل خان تھا۔ سب سے پیچھے ضیا تھا۔ ان کے پاس لائٹنیں تھیں مگر ضیا کی ہدایت پر سب بند کر دیں۔ اب وہ چاند کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔

☆☆☆

عمر رفتہ رفتہ ان سے دور ہو رہا تھا مگر ان کی آوازیں اس تک آ رہی تھیں اور پھر ضیا نے بتایا کہ اس نے سومت اور

ہنس۔" میں نے اسی وجہ سے غار کا پتا بتایا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ غار کا سنتے ہی اس طرف آئے گا اور مارہ اسے قابو کر لے گی۔"

"مارہ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔" ظفر نے بہ مشکل کہا۔ "تم اس قاتل کے ساتھ ہو اس نے دو بچوں کو مارا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" مارہ بے پروائی سے بولی۔ "اس نے ہیروں کی جگہ معلوم کرنے کے لیے ان بچوں کو تشدد کر کے مارا۔ لیکن اسے جگہ کا پتا نہیں چلا۔ یہ پلان اسے میں نے سمجھایا۔"

"لیکن یہ یہاں آیا کیسے تھا؟" ظفر نے پوچھا۔ "یہ تو کہہ رہا تھا کہ پہلی بار اس طرف آیا ہے۔"

اس سوال کا ضیا نے جواب دیا۔ "پہلے میں کسی اور حلیے میں آیا تھا۔ میرا سر گنجا تھا اور پیٹ لکلا ہوا تھا۔ چہرہ بھی مختلف تھا، اب میں دوسرے حلیے میں ہوں اور یہ میرا اصل حلیہ ہے۔"

گل خان کا غصے سے بُرا حال تھا۔ "داؤس تم معصوم بچہ کو اتنی بے دردی سے مارا۔"

"اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا بچہ ان میں شامل نہ ہو تو مجھے قیمتی پتھر تلاش کر کے دو۔" ضیا نے سرد لہجے میں کہا۔ "اب میں ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گا اور نگرانی کروں گا۔"

عمر غار کے دہانے کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اگر سر پر ٹوپی نہ ہوتی تو اس کا سر پھٹ جاتا اور شاید وہ بے ہوش ہو جاتا مگر اسے چکر آئے تھے اور رفتہ رفتہ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ مگر وہ یوں ساکت پڑا تھا جیسے گہری بے ہوشی میں ہو۔ ضیا نے اوپر آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عمر نے آنکھ کھول کر دیکھا تو مارہ اسے چند قدم کے فاصلے پر نظر آئی۔ اس نے جس دھاتی راڈ سے اس کے سر پر وار کیا تھا وہ وہیں پھینک دی تھی اور عمر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ جب اسے محسوس ہوا کہ اس کے حواس ٹھیک ہو رہے ہیں تو اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر راڈ گرفت میں کر لی۔ سومت اندر بے بسی سے بندھا ہوا تھا اور مارہ نے اس کے ہونٹوں پر ٹیپ لگا دیا تھا۔ عمر آہستہ سے اٹھا تو سومت نے اسے دیکھ لیا اور خوش ہو گیا۔ عمر پوری طرح کھڑا نہیں ہوا کہ وہ نیچے سے نظر آ جاتا۔ اس نے ذرا آگے ہو کر مارہ کو اسی کے سکوں میں ادا جی کی اور اس کے سر پر پیچھے سے ضرب لگائی۔ مارہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ نیچے گئی اور سیدھی ضیا پر

گری تھی۔ ضیا نیچے گرا اور اس بلائے ناگہانی سے اس کے ہاتھ سے پستول نکل گیا۔ گل خان نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور جھپٹ کر پستول اٹھالیا۔ دس سیکنڈ سے بھی پہلے صورت حال بدل گئی تھی۔ گل خان نے پستول کا رخ ضیا کی طرف کیا جو بے ہوش مارہ کو خود پر سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گل خان کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ ساکت ہو گیا۔ عمر نے اوپر سے کہا۔

"گولی مت چلانا۔ میں اسے زندہ گرفتار کروں گا۔"

ظفر چونکا۔ "گرفتار؟"

عمر نیچے آیا اور اس نے سب سے پہلے ضیا کے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے اسے پلاسٹک کی کس جانے والی ہتھکڑی لگائی اور پھر یہی سلوک مارہ کے ساتھ کیا۔ پھر اس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں گرفتار، میں ایف آئی اے کا افسر ہوں اور اس بار مہم جوئی کے بجائے ان معصوم بچوں کے قاتل کا پتا چلانے یہاں آیا ہوں۔ یہ ذمے داری مجھے اوپر سے سونپی گئی تھی اور خدا کا شکر ہے کہ قاتل ہاتھ آ گئے۔"

☆☆☆

دو دن بعد عمر کی روائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ مقامی پولیس کے چار سپاہی بھی تھے جو گرفتار ضیا اور مارہ کو دارالحکومت تک لے جاتے۔ ضیا کا تعلق مارہ کے شہر سے ہی تھا اور وہ اسی چینل کے لیے کام کرتا تھا جہاں مارہ فوٹو گرافر تھی۔ اس نے مارہ کو اپنے جال میں پھنسا لیا اور پھر اسے قیمتی پتھروں کا لالچ دیا۔ بے شک اس نے مارہ کو سبز باغ دکھائے تھے مگر یہ مارہ کا ذاتی فعل تھا جو وہ معصوم بچوں کے قاتل کے ساتھ مل گئی۔ ظفر کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ مارہ ایسی ہو سکتی تھی۔ گل خان نے گاؤں کے ان افراد سے اس کی بات کرادی تھی جو یہاں سے قیمتی پتھر نکالتے تھے اور انہوں نے ظفر سے معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ جو پتھر نکالیں گے ظفر ان سے خرید لے گا۔ گل خان عمر کا شکر گزار تھا کہ اس نے سب کی اور خاص طور سے اس کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ عمر نے جانے سے پہلے اسے وہ قیمتی پتھر دیے جو اس نے کھدائی کے دوران پائے تھے۔ گل خان نہیں لے رہا تھا مگر عمر نے یہ کہہ کر دیے کہ وہ سومت کو پڑھائے گا اور ان پتھروں کی فروخت سے جو رقم ملے گی وہ سومت کی تعلیم پر خرچ کرے گا۔ گل خان نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔



بساط

محمد فاروق انجم

زندگی کے اہم ترین موڑ پر مختلف راستے انسان کے منتظر ہوتے ہیں... اب یہ اس کا کام ہے کہ وہ اپنے لیے کون سا راستہ منتخب کرتا ہے... اپنی پسند کی راہ چن لینے والے شخص کی داستان... جس نے آتش انتقام میں ڈوب کے جرائم کو اپنے پیروں کی زنجیر بنا لیا تھا... ایک نازک اندام... معصوم صورت نے اسے اپنا اسیر کر لیا تھا... وہ ہر صورت اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لینا چاہتا تھا... مگر سفاکی کا لبادہ اوڑھے اس کے انتقام کی آگ سرد ہونے کے بجائے بھڑکتی ہی جا رہی تھی... خوشنما و خوش آہنگ لمحوں سے دور خونی رنگوں سے پُر کر دینے والی زندگی کے مناظر...

ایک مثلث کے گرد گھومتی کہانی جس میں سرکشی تھی...

درندگی تھی اور وابستگی... سرورق کی عبرت سا ماں تحریر...

تالیوں کی گونج میں سرد نثار اپنی نشست سے اٹھا اور پُر وقار انداز میں چلتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھا۔ اسٹیج پر شہر کا معروف صنعت کار ہاتھ میں ایوارڈ لیے مسکراتا ہوا اس کا منتظر تھا۔ سرد نے اس کے قریب جا کر پُر جوش انداز میں مصافحہ کیا اور ایوارڈ وصول کرنے کے بعد اسے بلند کر کے قریب میں موجود خواتین و حضرات سے داد سمیٹنے لگا۔ وہ ایک بڑے اور مقبول ٹیلی ویژن چینل کی ایوارڈ تقریب تھی جو براہ راست دکھائی جا رہی تھی۔ سرد اس چینل

کاسب سے کامیاب ڈراما رائٹر تھا جس کی ہر ڈراما سیریل نے ریکارڈ توڑ مقبولیت حاصل کی تھی اور اس سال بھی وہ بہترین ڈراما رائٹر کا ایوارڈ وصول کر رہا تھا۔

سرمہ کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ وہ وجیہ اور خوش پوش تھا۔ اپنی شکل و صورت اور جسمانی ساخت سے کسی ہیرو سے کم نہیں لگتا تھا لیکن وہ صرف لکھنا جانتا تھا اس لیے اس نے بھی اداکاری کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا حالانکہ اسے اداکاری کی پیشکش بھی ہو چکی تھی۔

وہ ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا، اپنے خاندان سے بالکل منفرد۔ شہر میں پڑھا اور اسی علاقے میں وہ ایک فلیٹ میں اکیلا اپنے خاندان اور ایک ملازم کے ساتھ رہائش پذیر تھا جبکہ اس کا سارا خاندان اپنے گاؤں میں تاحہ نگاہ چھلی ہوئی زمینوں اور باغوں کی ملکیت کے ساتھ آباد تھا۔

سرمہ پیسے کے لیے نہیں لکھتا تھا۔ پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی، وہ اشارہ کرتا تھا اور اس کے والدین اور بھائی ہر چیز اس کے سامنے حاضر کر دیتے تھے، لکھنا سرمہ کے لیے تسکین کا باعث تھا، یہ الگ بات تھی کہ اب اس تسکین کے ساتھ اسے منہ مانگا معاوضہ بھی مل رہا تھا۔

سرمہ نے اپنا ایوارڈ وصول کرنے کے بعد مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر چند الفاظ کہے اور اپنے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جانے لگا تو معروف صنعت کار نے مائیک سنبھالتے ہی سرمہ کو روک لیا۔

”میں نے سرمہ صاحب کا ایک انٹرویو پڑھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ خوبصورت گھڑیوں کے بہت شوقین ہیں۔ ان کے پاس کئی درجن گھڑیاں ہیں، وہ شرٹ پہننا بھول سکتے ہیں لیکن گھڑی باندھنا نہیں بھول سکتے۔“ صنعت کار مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا تو سرمہ بھی اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

صنعت کار پھر بولے۔ ”اس لیے آج میں ان کے لیے ایک گھڑی کا حقیر سا تحفہ لایا ہوں۔“

ساتھ گھڑی لڑکی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹرے ان کے سامنے کر دی۔ صنعت کار نے کپڑا ایک طرف ہٹایا تو خوبصورت بکس میں انتہائی خوبصورت اور چمکتی ہوئی گھڑی دکھائی دینے لگی۔ کسرے نے فوراً اس گھڑی کا کلوز اپ لیا اس ایوارڈ تقریب میں ایک بڑی اسکرین لگی ہوئی تھی۔ اس اسکرین کی مدد سے تقریب میں موجود سیکڑوں خواتین و حضرات نے گھڑی کا کلوز اپ دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

جیسے وہ سرمہ کے لیے خاص ڈیزائن کی گئی ہو۔

گھڑی کے کلوز میں صنعت کار کی آواز بلند ہوئی۔ ”یہ میں نے خاص سرمہ صاحب کے لیے ڈیزائن کرائی ہے۔ گھڑی کے اندر سونے سے ان کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔“ ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور سرمہ کے چہرے پر مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔

”یہ گھڑی میں ان کو پہنانا چاہتا ہوں۔“ صنعت کار نے کہا اور سرمہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ صنعت کار نے خود وہ گھڑی سرمہ کو پہنائی۔ سرمہ نے جو گھڑی پہلے پہن رکھی تھی، وہ اتار کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

سرمہ نے پہلے صنعت کار کا شکریہ ادا کیا اور پھر مائیک پر آ کر کہا۔ ”گھڑی کا یہ تحفہ میرے لیے یادگار ہے، تھینک یو۔“

ہال پھر تالیوں سے گونج اٹھا اور سب اپنی اپنی نشست پر چلے گئے اور تقریب مزید آگے بڑھنے لگی۔

سرمہ کو لاتعداد لوگ نیلی وژن کی اسکرین پر ایوارڈ لیتا ہوا دیکھ رہے تھے اور ان لاتعداد لوگوں میں ایک ماریہ بھی جس کے چہرے کی خوشی اور سرخی سب سے الگ تھی۔ اس کی آنکھیں نی دی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ اس کا دل خوشی میں معمور تھا۔ اس وقت وہ ایک بڑے پروڈکشن ہاؤس کے میک اپ روم میں اکیلی بیٹھی وہ تقریب دیکھ رہی تھی۔

ماریہ ایک چھوٹے سے شہر سے تین سال قبل اس بڑے شہر میں آئی تھی۔ اس کے والدین بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے اور اس کے ماموں نے اس کی پرورش کی تھی۔ ماریہ کا ماموں شو بیز کی دنیا میں لائٹ مین تھا۔ اس کی وساطت سے ماریہ کو ایک بڑی میک اپ آرٹسٹ انجم جبین نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ ماریہ بہت جلد اپنے کام میں اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ وہ انجم کے لیے لازم و ملزوم ہو گئی۔ ماریہ کا ماموں کام چھوڑ کر واپس اپنے شہر چلا گیا لیکن ماریہ کا اس شہر میں اچھا روزگار لگ گیا تھا اور انجم بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ انجم نے بھی ماریہ جیسی محنتی لڑکی اپنے پیٹھے میں پہلے نہیں دیکھی تھی۔

ماریہ کی ملاقات آٹھ ماہ قبل سرمہ سے اسی کے ڈرامے کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ پہلی نظر نے ہی سرمہ کو ماریہ کی طرف مائل کر دیا۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا اور چند ملاقاتوں کے بعد ایک دن اچانک سرمہ نے ماریہ کو چائے پر بلا لیا۔ ماریہ ڈری ہوئی اس کے سامنے براجمان تھی۔ اس

بیسرا کر لے۔ کام کے دوران توجہ بٹ گئی اور رات بھر نیند بھی نہیں آئی پھر دوسرے دن فون کر کے ماریہ نے سرمہ سے کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔

سرمہ کو واقعی ماریہ سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ دل اس کے حصار میں قید ہو گیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر ماریہ کو اپنی دلہن بنانا چاہتا تھا۔ ماریہ اور سرمہ کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ سرمہ نے تب تک ہی ماریہ کو کام کرنے کی اجازت دی تھی جب تک وہ دونوں شادی کے بندھن میں نہیں بندھ جاتے تھے۔

ایک دن سرمہ نے اپنے چند قریبی دوستوں کی موجودگی میں ماریہ کو ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی۔ اس معاملے کو میڈیا سے دور رکھا گیا تھا اور پوری طرح سے رازداری کا خیال رکھا گیا تھا۔ اس مختصری تقریب میں راشد اویس بھی تھا۔

راشد تقریباً سرمہ کا ہم عمر تھا۔ وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا اور کام کے دوران میں اس کی سرمہ کے ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اب دونوں میں ایک حد تک بے تکلفی بھی آ گئی تھی۔ وہ اپنی ذاتی باتیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کر لیتے تھے۔

راشد ایک باتونی شخص تھا اور اپنی باتوں سے دوسرے کو متاثر کرنا خوب جانتا تھا۔ سرمہ جب لکھتے ہوئے تھک جاتا تو وہ راشد کو فون کر کے اپنے پاس گپ شپ کے لیے بھی بلا لیتا تھا اگر راشد فارغ ہوتا تھا تو وہ اس کے فلیٹ میں چلا جاتا تھا۔

ماریہ کو انگوٹھی پہنانے کی اس مختصری تقریب میں سب خوش تھے۔ خوشی راشد کے چہرے سے بھی جھلک رہی تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل میں آگ کا ایک طوفان برپا ہے کیونکہ راشد دل ہی دل میں ماریہ کو بے حد پسند کرتا تھا۔ اس کے گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ سرمہ اور ماریہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ سرمہ نے اس بات کا تذکرہ بھی راشد سے نہیں کیا تھا۔

سرمہ اور ماریہ کا ملن راشد کے گلے میں کانٹے کی طرح پھنس گیا اور وہ اندر ہی اندر تھماتا رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ راشد نے بھی ایک دن ماریہ سے اپنے دل کی بات کہہ کر شادی کی پیشکش کی تھی۔ اس کی بات سن کر ماریہ نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے رخ لے لے میں کہا تھا۔

”تم سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں ساری زندگی کنواری رہ لوں۔“ ماریہ کو راشد بھی پسند نہیں تھا۔ اس کی نظروں سے ہی اسے خوف آتا تھا، جانے اس کی بات سن کر

وقت سرمہ نے ماریہ کو حیرت زدہ کر دیا جب اس نے کہا۔ ”لوگ کہتے ہیں میں لفظوں کا جادوگر ہوں لیکن آج مجھے اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔“

ماریہ نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے سرمہ کی طرف دیکھا۔ تب کچھ توقف کے بعد سرمہ بولا۔ ”مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“

یہ سنتے ہی ماریہ اپنی جگہ سے ایسے اچھلی جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ ماریہ نے سرمہ کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ ایک بڑے زمیندار کا بیٹا ہے۔ ساری زندگی اگر وہ ہاتھ ہلائے بغیر بھی بیٹھا رہے تو دولت کے انبار ختم نہ ہوں۔ ماریہ ایک معمولی لڑکی تھی لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ وہ بہت ہی خوبصورت اور اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔

سرمہ اپنی بات کہہ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جب ماریہ کی حیرت کم نہ ہوئی تو اس نے کہا۔

”کیا میری بات کا یقین نہیں ہے؟ کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہیں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو حسن پر فدا ہو کر زندگی کے بڑے فیصلے کر لیتے ہیں اور پھر جی بھر جانے کے بعد راہیں جدا کر کے زندگی بھر کا روگ دے دیتے ہیں؟“

ماریہ اس بار بھی چپ رہی، وہ پھر بولا۔ ”میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ تمہیں عزت دوں گا اور ساری زندگی تمہیں اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گا۔ اتنے سال اس چمکتی دنیا میں رہ کر مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی اور کبھی ایسے جذبات دل میں نہیں ابھڑے۔ اور جب محبت ہوئی تو اچانک ہی ہو گئی اور ایسی ہوئی ہے کہ تمہیں اپنانے کے لیے دل بے چین اور بھل رہا ہے۔“

ماریہ کے لیے وہ سب مسرت کا باعث تھا جو سرمہ کہہ رہا تھا۔ اس سے پہلے اسے آتے جاتے کئی جیلے سننے کو ملتے تھے، جنہیں وہ بہری بن کر نظر انداز کر دیتی تھی۔ سرمہ نے بڑی عزت سے اسے اپنے سامنے بٹھا کر اپنے دل کی بات کہی تھی۔

اس سے پہلے کہ ماریہ کچھ بولتی، ایک لڑکی آ گئی اور اس نے ماریہ سے کہا۔ ”آپ کو میم بلا رہی ہیں۔“

وہ پیغام دے کر چلی گئی اور ماریہ تذبذب میں تھی کہ وہ اٹھ کر جائے یا سرمہ کے حکم کا انتظار کرے۔

”تم جاؤ لیکن میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔“

سرمہ نے اپنا کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ماریہ نے وہ کارڈ لیا اور چلی گئی۔ اس کے بعد ماریہ کی سوچوں میں سرمہ کی باتیں گردش کرنے لگیں۔ جیسے خالی گھر میں کوئی اچانک

ماریہ کے منہ سے اتنا تلخ جملہ کیوں نکل گیا تھا۔ ماریہ کہہ کر چلی گئی اور راشد دانت پیستارہ گیا۔

ایوارڈ کی تقریب نیلی وٹن پر دکھائی جا رہی تھی اور ماریہ خوشی سے سرمہ کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ماریہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بولی۔

”یس آ جاؤ۔“

دروازہ کھلا تو راشد کا چہرہ دکھائی دیا۔ ”مصرف تو نہیں ہو۔“ راشد اندر آتے ہی ایک طرف بیٹھ گیا۔

”ایوارڈ شو دیکھ رہی ہوں۔“ ماریہ بولی۔ راشد کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا تھا۔

”مبارک ہو! سرمہ کو اس سال بھی بہترین رائٹر کا ایوارڈ ملا ہے۔“ راشد بظاہر خوش ہو کر کہہ رہا تھا لیکن اس کا دل بھنے ہوئے گوشت کی طرح تھا۔ راشد کا یہی کمال تھا کہ وہ اپنے اندر کی نفرت اور خیالات کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ ”مجھے یقین تھا کہ ایوارڈ سرمہ کو ہی ملے گا۔“ ماریہ کا سفید چہرہ سرخی سے بھر گیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے جانے کے لیے اپنے بیگ کی طرف بڑھی۔

”سرمہ کمال کا رائٹر ہے۔ وہ زبردست کہانی لکھتا ہے۔ پھر جاندار مکالموں سے وہ ڈراما دیکھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ وہ شکار بھی کھیلتا ہے اور اس کا نشانہ زبردست ہے۔ وہ ایسا تیراک ہے کہ منہ پر آکسیجن ماسک چڑھائے بغیر گہرے پانی میں اتر کر تیر سکتا ہے۔“ راشد مسلسل اس کی خوبیاں بیان کرنے لگا۔

”ہاں میں جانتی ہوں، انہیں قدرت نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔“ ماریہ نے اپنا سامان ہینڈ بیگ میں رکھ کر اس کی زپ بند کی۔

”کیا تم اس کے بارے میں ایک بات اور بھی جانتی ہو؟“ راشد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“ ماریہ نے پلٹ کر راشد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے جیسے وہ راشد کی شکل بھی دیکھنا نہ چاہتی ہو۔

”ڈرامے لکھنے سے پہلے سرمہ نے ایک ناول بھی لکھا تھا۔ اس ناول کی کہانی ایک ایسے قاتل کے گرد گھومتی ہے جو قتل کرتا ہے اور کوئی نشان بھی نہیں چھوڑتا۔ تم جانتی نہیں ہو کہ وہ ناول ہاتھوں ہاتھ بک گیا تھا اور پبلشر کی منتوں کے باوجود اس نے پھر کوئی ناول نہیں لکھا اور شو بزم میں آ گیا۔ سرمہ اچھا شکاری تھا، شکار کھیلتا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ کیا

کرتا ہے، مجھے معلوم نہیں کیونکہ سرمہ مستقل مزاج نہیں ہے۔ وہ وقت آنے پر پہلے کو چھوڑ کر دوسرے کو پکڑنے کے لیے اس کی جانب بڑھ جاتا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ ماریہ نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر پوچھا۔

راشد نے کچھ توقف کیا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”سرمہ مستقل مزاج نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے شوق چھوڑ سکتا ہے تو تمہیں تو وہ ایسے چھوڑ دے گا جیسے چنگی بجائی جاتی ہے۔“

”تم مجھ پر ایک احسان کرو گے؟“ ماریہ کا لہجہ کچھ تلخ سا ہو گیا۔

”حکم کرو۔“ راشد مسکرایا۔

”برائے مہربانی اپنا یہ تھوڑا لے کر میرے سامنے مت آیا کرو۔ تمہاری شکل دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔“ ماریہ نے تیز لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل کر اس نے پوری قوت سے دروازہ بند کیا۔ راشد کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی، بولا۔

”ایک موقع کی تلاش ہے، پھر تم تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح میری مٹھی میں نہ ہوئیں تو میرا بھی نام راشد نہیں۔ گن گن کر ایک ایک لفظ کا بدلہ لوں گا۔“

☆☆☆

راشد سے ماریہ کو نفرت تھی۔ وہ شروع دن سے ہی اسے اچھا نہیں لگتا تھا اور جس دن سے اس نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا تب سے تو وہ اسے اور بھی برا لگنے لگا تھا۔ ماریہ نے کئی بار سوچا کہ وہ اس کا ذکر سرمہ سے کر دے، جیسے ہی سرمہ کے علم میں راشد کی باتیں آئیں گی تو پھر وہ راشد کو ایسا سبق سکھائے گا کہ بھی راشد کی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ ماریہ کے سامنے سے بھی گزر سکے۔ لیکن پھر وہ چپ ہو جاتی تھی کہ سرمہ پہلے ہی اپنے کام میں اس قدر مصروف ہے کہ اس کو پریشان کرنا مناسب نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ جلد ہی شادی کرنے والے تھے۔

ماریہ اپنی جگہ ٹھیک سوچ رہی تھی لیکن وہ اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ راشد جو دکھائی دیتا ہے، وہ اس سے بالکل برعکس تھا۔ وہ ایک ایسا سانپ تھا جو وقت آنے پر دودھ پلانے والے کوڈسنے میں دیر نہیں لگاتا۔

راشد کی باتوں کو دماغ سے نکالنے کا موقع تب ماریہ کو اچانک مل گیا جب سرمہ کا فون آ گیا۔

”کیا مجھ سے کوئی ناراضی ہے ماریہ۔“ سرمہ نے

کہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے، اور میری والدہ بھی مجھ سے یہ شکوہ نہ کریں کہ میں ان کی عیادت کرنے آیا ہوں اور اس دوران بھی اپنے کام میں مصروف ہوں۔ اس لیے میں نے اپنے وہ نمبر فی الحال بند کر دیے ہیں اور نیا نمبر لے لیا ہے۔ میرا یہ نمبر ان دو پروڈکشن کمپنیوں کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ تم یہ نمبر ماریہ کو دے دینا تا کہ وہ میرے رابطے میں رہے۔“ سرمہ نے یہ کہہ کر اپنے وزیٹنگ کارڈ پر نیا نمبر لکھا اور راشد کی طرف بڑھا دیا۔ ”میں ماریہ سے فون پر بھی بات کر سکتا تھا لیکن میں اسے خود مل کر بتانا چاہتا تھا، لیکن اس مصروفیت میں اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے۔“

”ویسے بھی بھٹی صاحب کی سیریل ہے وہ تو کسی کی بھی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ آپ بے فکر ہو جائیں میں یہ نمبر ابھی ماریہ کو پہنچا دوں گا۔“ راشد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ سرمہ نے اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے لہجے میں تغیر لا کر کہا۔ ”ماریہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ اس کا نام تمیز سے لیا کرو۔“

راشد یکدم گھبرا گیا۔ ”سوری...“

”مجھے جلدی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ میرا یہ کام کر دینا، میں لنچ بریک پر ماریہ سے رابطہ کروں گا۔“ سرمہ نے کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کچھ دیر کے بعد اس کی کار اس عمارت سے نکل رہی تھی۔

راشد کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ”ماریہ کا نام عزت سے لوں... اب دیکھنا میں کیا کرتا ہوں اس کے ساتھ۔“

راشد کو جیسے موقع مل گیا تھا۔ وہ موقع جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نے وزیٹنگ کارڈ اپنی جیب میں ڈالا اور میک اپ روم کی طرف چلا گیا۔

ماریہ ایک فنکارہ کامیک اپ کرنے میں مصروف تھی۔ میک اپ روم میں لوگوں کا رش تھا اور ایک پلچل سی برپا تھی۔ مسلسل شوٹنگ ہو رہی تھی اور آج رات تک کام مکمل کرنا تھا اس لیے ہر کوئی مصروف تھا۔ راشد وہاں پر موجود لوگوں کے ساتھ دعا سلام کرتا ہوا ماریہ کے پاس چلا گیا۔ ماریہ کا ہینڈ بیگ ایک طرف پڑا تھا۔ راشد بہانے سے ماریہ کے ساتھ باتیں کرنے لگا اور اس دوران اس نے غیر محسوس طریقے سے ماریہ کا ہینڈ بیگ نیچے گرا دیا۔

”سوری میں اٹھاتا ہوں...“ راشد نیچے جھکا۔ سب اپنے دھیان میں مصروف تھے۔ راشد نے برق رفتاری سے ہینڈ بیگ کی زپ کھولی اور اندر سے اس کا موبائل فون نکال

پوچھا۔ ”نہیں... بالکل بھی نہیں۔“ ماریہ گھبرا کر سوچنے لگی۔

”مجھے ایوارڈ ملا اور تم نے مجھے مبارکباد بھی نہیں دی۔“ سرمہ نے پیار سے شکوہ کیا۔

”میں دراصل آپ کی کامیابی کی مبارکباد آپ کو ڈرنیبل پر دینا چاہتی تھی۔“ ماریہ جلدی سے بولی۔

”اچھا... تو پھر دیر کیسی۔ کل رات کا ڈنر ہم ایک ساتھ کرتے ہیں۔“ سرمہ مسکرایا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔“ ماریہ خوش ہو گئی۔ کچھ اور باتوں کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔

دوسرے دن ایک اہم ڈرامے کی شوٹنگ ہو رہی تھی اور ماریہ میک اپ روم میں مصروف تھی کہ اچانک باہر سرمہ کی کار آ کر رکی۔ وہ جلدی میں بھی تھا اور چہرے پر کچھ پریشانی بھی تھی۔

ابھی سرمہ نے کار سے اپنا ایک پیجر باہر رکھا ہی تھا کہ کچھ فاصلے پر براجمان راشد بھاگتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

”آپ کے ڈرامے کی شوٹنگ تو دوسرے فلور پر ہو رہی ہے۔“ راشد نے پاس جاتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم جانتے ہو کہ اس وقت ماریہ کہاں ملے گی؟“ سرمہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

”جی وہ میک اپ روم میں مصروف ہے دراصل اس ڈرامے سیریل کا کلائمیکس چل رہا ہے اور مسلسل رات تک شوٹنگ ہے اس وقت تک کسی کے پاس سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔“ راشد نے سرمہ کا جائزہ لیا۔

”میں ماریہ سے مل لوں۔“ سرمہ میک اپ روم کی طرف جانے لگا تو اچانک رک گیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس موقع پر کسی سے پانچ منٹ بات کرنی بھی مشکل ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ماریہ کو ڈسٹرب نہ کروں۔“ سرمہ پھر راشد کے پاس آ گیا۔ ”مجھے ایمر جنسی اپنے گاؤں جانا پڑ رہا ہے۔ میری والدہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے اور مجھے شاید وہاں ہفتہ، دس دن لگ جائیں۔“

”آپ مجھے حکم کریں، میرے ذمے کیا کام لگانا چاہتے ہیں، میں حاضر ہوں۔“ راشد جلدی سے بولا۔

”میں نے ان پروڈکشن کمپنیوں کو تو آگاہ کر دیا ہے جن کے ساتھ میں کام کر رہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ مجھے دن میں کئی فون آتے ہیں جو میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ میرا موبائل فون جیسے ہی اوپن ہوتا ہے وہ مسلسل بجنے لگتا ہے۔ کیونکہ میں اپنی والدہ کے پاس جا رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں

کراہتی جیب میں ڈال کر زپ بند کر کے ونڈ بیگ اسی جگہ پر رکھ دیا۔

ماریہ اپنے کام میں مصروف تھی اس لیے اس کی توجہ اس جانب گئی ہی نہیں۔ راشد نے کچھ دیر اس سے باتیں کیں اور پھر میک اپ روم سے باہر نکل گیا۔ ماریہ نے ایک پل کے لیے بھی اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا آنا اسے اتنا ناگوار گزرا تھا کہ اس نے اذکارہ کے چہرے پر ہاتھ چلاتے ہوئے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوگی، وہ راشد کے بارے میں سرمد کو سب کچھ بتا دے گی تاکہ اس سے اس کی جان چھوٹ جائے۔

باہر جاتے ہی راشد نے ماریہ کا موبائل فون جیب سے نکالا اور اسے کھول کر اس کی بیٹری الگ کر دی۔ پھر اس نے سم نکال کر اپنی دوسری جیب میں ڈال لی اور تیزی سے چلتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

☆☆☆

ماریہ کو تمام دن ایک پل کے لیے بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ رات کے ساڑھے دس بجے ماریہ اپنے کام سے فارغ ہوئی تو وہ بری طرح سے تھک چکی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے بستر پر گر جائے۔ انجم اور ماریہ ایک ہی بلڈنگ میں آنے والے تھے۔ ٹھکانے سے چور ماریہ نے پوچھا۔

”کب تک چلنے کا ارادہ ہے؟“

”تم چلی جاؤ، میں ابھی رکوں گی۔“ انجم نے کہا اور ماریہ اجازت لے کر چلی گئی۔

پروڈکشن ہاؤس سے اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ دس منٹ میں پیدل فلیٹ پر پہنچ گئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا، کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر بیٹھ کر اپنا بیگ کھولا اور اس کی تلاش یہاں تک بڑھ گئی کہ اس نے اپنا بیگ ہی الٹ دیا۔

اس کے بعد اس نے ایک ایک چیز بیگ میں واپس ڈالی لیکن اس کا موبائل فون اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ ماریہ کی پریشانی اور تشویش دوچند ہو گئی۔ وہ بار بار اپنے بیگ کو دیکھ رہی تھی اور یاد کر رہی تھی کہ اس نے آخری کال سن کر اپنا موبائل فون کہیں وہاں شلف میں ہی تو نہیں رکھ دیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ کام کیونکہ بہت زیادہ تھا اس لیے انجم جبین نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ اپنے اپنے موبائل فون بند کر دو۔ کام کے دوران کوئی کسی کی کال سنے گا اور نہ ہی کسی کو کال کرے گا۔ موبائل فون اس نے۔۔۔ آف کرنے کے لیے بیگ سے نکالا تھا اور اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ اس

نے واپس موبائل فون اپنے بیگ کے اندر ہی رکھا تھا۔

”میرا موبائل فون کہاں چلا گیا؟“ ماریہ خود سے بولی اور سوچ میں پڑ گئی۔ اپنے موبائل کی اچانک گمشدگی پر ماریہ کو تشویش اور پریشانی تھی لیکن شدید تھکاوٹ نے اسے مزید سوچنے کا موقع نہ دیا اور وہ بستر پر لیٹ گئی اور نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح کیونکہ کام نہیں تھا اس لیے ماریہ اپنی گہری نیند سے اسی وقت اٹھی جب اس کی آنکھ خود بخود کھلی تھی۔ منہ ہاتھ دھوتے اور اپنے لیے ناشا بناتے ہوئے وہ اپنے موبائل کے بارے میں کئی بار سوچتے ہوئے یاد کر رہی تھی کہ اس نے موبائل فون کہاں رکھ دیا تھا۔

چائے کا کپ لے کر وہ باہر آگئی اور ابھی اس نے چند گھونٹ ہی لیے تھے کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ انجم کی ملازمہ ہوگی، کیونکہ اس وقت وہ آج کے دن بھر کاشیڈول اسی کے ہاتھ بھیجتی تھی۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو وہ چونک گئی سامنے راشد کھڑا تھا۔

”تم؟“ ماریہ نے حیرت سے کہا۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ راشد نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

”کیا بات ہے، جو کہنا ہے یہاں ہی کہہ دو۔“ ماریہ نے روکھے لہجے میں کہا اور دروازہ نہیں چھوڑا۔

”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ سرمد مستقل حراج نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔“

”اب کیا ہوا ہے؟ تم ایک ہی بات لے کر آ جاتے ہو؟“ ماریہ کو چڑھنے لگی تھی۔

”وہ اچانک کہیں چلا گیا ہے۔ اس کے موبائل فون بند ہیں اور ایک خبر گردش کر رہی ہے کہ۔۔۔ سرمد نے شادی کر لی ہے۔“ راشد نے گویا دھماکا کر دیا اور ماریہ کے چہرے کی حیرت دوچند ہو گئی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ ماریہ کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔

”یقین نہیں آ رہا ہے تو اس کے نمبرز پر فون کر کے دیکھ لو۔ ایک بڑے نیوز چینل کا رپورٹر میرا قریبی دوست ہے۔ اسے یہ بات کئی دنوں سے معلوم تھی کہ سرمد ایک لڑکی کے ساتھ ہے اور وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے ہاتھ ایک بڑی خبر لگ گئی ہے کہ سرمد نے شادی کر لی ہے۔“ راشد نے بتایا۔

اور یہ چھت بھی ان کی ہی دی ہوئی ہے۔ اگر انجم تمہیں کہہ دیں کہ سرمہ نے واقعی شادی کر لی ہے تو؟“ راشد کی بات نے اسے ہلا دیا۔

ماریہ نے چونک کر راشد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”انہیں کیسے پتا ہے؟“

”کیونکہ وہ رپورٹر دراصل ان کا بھانجا ہے اور سب سے پہلے انہیں ہی خبر دی تھی اور انجم کے کہنے پر ہی خبر بریک ہونے سے رکی ہوئی ہے اور اس شہر میں اس خبر سے ہم دونوں ہی باخبر ہیں۔“ راشد نے نیا انکشاف کیا۔

ماریہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کا کرب اور بھی بڑھ گیا تھا، اسے کہنے کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

راشد نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا اور بولا۔ ”انجم اس وقت سو کر اٹھ جاتی ہیں۔ میں انہیں میسج کرتا ہوں۔“ راشد اپنے موبائل فون سے ایک میسج کرنے لگا۔ ماریہ نے دروازہ بھی چھوڑ دیا تھا اور راشد اندر چلا گیا تھا۔ راشد میسج کرنے کے بعد ایک طرف بیٹھ گیا جبکہ ماریہ گم صم گھڑی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد تیل ہوئی۔ راشد نے دروازہ کھولا اور انجم جیسے چہرے پر ہلکا سا میک اپ کیے اندر آ گئی۔

”سوری میں نے آپ کو تکلیف دی۔ دراصل میری بات کا ماریہ کو یقین نہیں ہو رہا۔“

انجم ایک پُرکشش عورت تھی۔ پچاس سال سے زائد عمر ہونے کے باوجود وہ اپنی عمر سے کہیں کم لگتی تھی۔ اس نے ایک نظر راشد کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ”راشد ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

ماریہ کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ انجم کی بات کا یقین نہ کرتی۔ اس کی بات سن کر ماریہ صوفے پر ہی ڈھے گئی۔

☆☆☆

راشد کی قسمت اچھی تھی کہ انجم جیسی عورت بھی اس کی مٹھی میں آ گئی اور وہ ایسا کہنے پر مجبور ہو گئی تھی جیسا راشد نے کہا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کل رات ماریہ کام ختم ہوتے ہی گھر جانے لگی تھی تو انجم نے کام کی زیادتی کی وجہ سے انکار کر دیا تھا اور ماریہ تنہا فلیٹ تک آ گئی تھی۔ ماریہ کے جاتے ہی انجم کا عاشق میک اپ روم میں آ گیا تھا۔

انجم کا اس شخص کے ساتھ تقریباً دو ماہ سے چکر چل رہا تھا۔ دونوں میں یہ اچانک ہی تعلق استوار ہو گیا تھا۔ انجم شادی شدہ تھی اور اس کا شوہر اپنی کمپنی کے کام کے سلسلے میں

ماریہ کے لیے یہ خبر انتہائی کرب ناک تھی، وہ بولی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایسا ہوا ہے تو اس وقت فی وی پر نیوز چل رہی ہوگی۔“ یہ کہہ کر ماریہ تیزی سے ریموٹ کی طرف بڑھی۔

”میرا وہ دوست خبر بریک نہیں کرے گا۔ وہ ایک ذمے دار صحافی ہے۔ البتہ تم سرمہ کے موبائل فون پر کال کر لو۔ اس کے دونوں فون نمبرز بند ہیں۔“ راشد بولا۔

”میرا موبائل فون کل سے کہیں کم ہو گیا ہے۔“ ماریہ کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”یہ تو میرے موبائل فون سے کال کر لو۔“ راشد نے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھایا تو ماریہ نے جلدی سے موبائل فون پکڑتے ہی اس کے دونوں نمبروں پر باری باری کوشش کر لی، سرمہ کے نمبرز واقعی بند تھے۔ پہلی بار ماریہ کو اس بات میں حقیقت نظر آئی کہ سرمہ نے سچ میں شادی تو نہیں کر لی کیونکہ اس کے نمبرز کبھی بھی بند نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنے نمبرز صرف رات کو سوتے وقت بند کرتا تھا۔

”سرمہ ایک بہترین رائٹر ہے۔ اس نے کالج دور میں تیرا کی سیکھی تھی کہ وہ تیرا ک بننا چاہتا تھا۔ ایک بار اس نے تیرا ک کے مقابلے میں حصہ بھی لیا تھا اور جیت بھی گیا تھا۔ لیکن اچانک اس نے پلٹا کھایا اور اس نے شطرنج سیکھی۔ وہ شطرنج کا ماہر کھلاڑی ہے۔۔۔ اور زندگی میں بھی مہروں کو بڑی سفاکی اور مہارت سے استعمال کرتا ہے۔ لیکن وہ واپس لکھنے کی طرف لوٹ آیا اور اس نے ایک بڑے ڈائجسٹ کے لیے ایسا قسط وار سلسلہ لکھا کہ ڈائجسٹ کی سرکولیشن محض اس کی وجہ سے آسمان کو چھونے لگی۔ ادھر اس نے وہ سلسلہ ختم کیا اور ادھر اتنی بڑی پیشکش کے باوجود پھر اس نے پلٹ کر ڈائجسٹ کی طرف نہیں دیکھا اور وہ شوہر میں آ گیا۔ یہاں کامیابی کا جھنڈا الہرا کر اور تم سے منگنی کر کے اچانک غائب ہو گیا اور کسی اور سے شادی کر لی۔۔۔ میں نے کہا تھا نا کہ وہ مستقل مزاج نہیں ہے۔“ راشد ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا اور ماریہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

”پھر بھی مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔“ ماریہ نے بہتے آنسوؤں میں کہا۔

”اچھا ایک بات بتاؤ تم انجم کی بات کا کتنا یقین کرتی ہو؟“ راشد نے پوچھا۔

”بہت زیادہ۔“

”ان کی بات کا یقین کرنا بھی چاہیے۔ کیونکہ وہی تمہیں جنہوں نے تمہیں سہارا دیا اور تمہارے ہاتھ میں ہنر دیا۔

اکثر شہر سے باہر بھی رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ شہر سے باہر تھا۔ اس ملاقات کو راشد نے دیکھ لیا اور پھر وہ ان کے سر پر پہنچ گیا۔

انجم سے اس نے چپ رہنے کی قیمت یہ وصول کی تھی کہ وہ جو کہے گا، اسے ایسا ہی کہنا پڑے گا۔ یہی بات تھی کہ انجم نے وہی کہا جیسا راشد نے بولا تھا اور ماریہ کو یقین کرنا ہی پڑا۔

سرمہ نے راشد کو بتایا تھا کہ وہ ہفتہ دس دنوں کے لیے اپنے گاؤں جا رہا ہے۔ راشد کے لیے یہ دن بہت اہم تھے اس لیے وہ انہیں رانگاں نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ سرمہ کی واپسی کسی بھی وقت ہو جائے۔ راشد جانتا تھا کہ وہ غیر ذمے دار نہیں ہے۔ اس نے ماریہ کے سامنے سرمہ کو غیر مستقل مزاج بتایا تھا حالانکہ سرمہ نے تیراکی، نشانے بازی اور شطرنج اپنے شوق کی خاطر سیکھی تھی۔ وہ ڈائجسٹ میں پلٹ کر اس لیے نہیں جاسکا تھا کہ اس کے مختلف پروڈکشنز کمپنیوں کے ساتھ ڈراما سیریل لکھنے کے معاہدے ہو چکے تھے۔ اس نے یہاں بھی ذمے داری کا ثبوت دیا تھا کہ وہ خود ماریہ کو اپنا نمبر دینے آیا تھا اور ساتھ وہ ملاقات بھی کرنے آیا تھا لیکن اس کی مصروفیت کے پیش نظر اس نے ماریہ کے کام میں خلل ڈالنے کے بجائے راشد کو نمبر دے دیا تھا کیونکہ سرمہ خود اپنے کام میں کسی دوسرے کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا، لیکن شاطر راشد نے ایک نیا کھیل ہی رچا دیا تھا۔

ماریہ روتے ہوئے اپنے فلیٹ میں بند ہو گئی تھی۔ شام سے پہلے پھر راشد اس کے پاس چلا آیا۔ ماریہ کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے لیکن وہ دروازہ کھول چکی تھی۔

”رورور کو اپنی جان لینے کا ارادہ ہے کیا؟ جو ہو گیا اسے بھول جاؤ اور آگے کی سوچو۔“

”مجھ سے ہمدردی جتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ماریہ نے صاف کہہ دیا۔

”زندگی ایسے نہیں گزرتی۔ اگر اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے تو تم بھی اسے چھوڑ دو۔“ راشد نے اس کی بات کی پروا کیے بغیر کیا۔

”راشد کیا تم مجھے یہی کہنے آئے ہو؟“ ماریہ کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ ”پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو۔“

”میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ جانتی ہو کہ میں کیوں نہیں چھوڑ سکتا؟ کیونکہ مجھے تمہارا احساس ہے۔ مجھے تم سے محبت

ہے۔ آؤ ہم شادی کر لیں۔“ راشد نے مقصد کی بات آسانی سے کہہ دی۔

اس کی بات سن کر ماریہ نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔ ”راشد آئندہ تم ایسی بات زبان پر لانا تو دور کی بات سوچنے کی بھی غلطی نہ کرنا۔ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں، زہر لگتے ہو تم مجھے۔“ ماریہ کہہ کر اٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ راشد اب دفع ہو جائے۔

”زندگی کیسے گزارو گی ماریہ؟“

”تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پورے شہر میں مجھ جیسا شخص تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔“

”بھاڑ میں جاؤ تم۔“ ماریہ چیخی۔

راشد کی دانست میں تھا کہ ماریہ بھی اپنا فیصلہ بدل لے گی لیکن اس کے برعکس وہ چٹان کی طرح مضبوط کھڑی تھی۔ راشد نے کچھ سوچا اور چلا گیا۔ ماریہ نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

ماریہ فلیٹ میں بند تھی اور اس کا زیادہ وقت آنسو بہاتے ہوئے گزر رہا تھا۔ اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا اس لیے وہ سرمہ سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتی تھی۔

رات کے دس بجے کا عمل تھا کہ اچانک انجم جیس کی ملازمہ نے آکر انجم کا پیغام دیا کہ ماریہ اپنا سامان پیک کر کے میک اپ روم میں پہنچے، انہیں شوٹنگ کے لیے دوسرے شہر جانا ہے۔ ملازمہ نے یہ بھی تاکید کی تھی کہ وہ اپنے سارے کپڑے وغیرہ پیک کر لے کیونکہ انہیں پندرہ، بیس دن لگ سکتے ہیں۔

ماریہ کو حیرت ہوئی کہ اس سے قبل کہیں جانے کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ یہ اچانک کیا ہوا؟ پھر وہ یہ سوچ کر اپنی پیکنگ کرنے لگی کہ بڑے اشارے بھی کبھی ضد کرنے لگتے ہیں کہ وہ کسی پر فضا شہر میں جا کر شوٹنگ کریں گے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی پروڈیوسر کو سیریل میں بہت مالی فائدہ ہو رہا ہو تو وہ شوٹنگ خود ہی کسی دوسرے اچھے شہر میں منتقل کر دیتا تھا۔ اچانک اسکرپٹ میں تبدیلی بھی ہو جاتی تھی اور شوٹنگ کا شیڈول یکدم ہی بدل جاتا تھا۔ ایسا ایک بار اس کے ساتھ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

ماریہ کے پاس چند کپڑوں کے جوڑے تھے اور کچھ ضروری سامان تھا۔ اس نے پیک کیا اور انجم کے بیوٹی پارلر میں پہنچ گئی۔ انجم اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس نے ماریہ کو

اپنے آفس میں بلا لیا۔

جونہی وہ کمرے میں پہنچی، انجم جیس نے ایک بند لفاقہ اس کی طرف بڑھایا اور سپاٹ لہجے میں بغیر وقت ضائع کیے کہا۔

”اس لفافے میں تمہارے تمام بقایا جات ہیں۔ اب ہم مزید ایک ساتھ کام نہیں کریں گے اور تم اپنا رہنے کا بھی کہیں اور بندوبست کرلو۔“

انجم جیس کی بات نے ماریہ کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ اس شہر میں انجم جیس کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ وہ اس کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتی تھی۔ رہنے کے لیے وہ کوئی بندوبست نہیں کر سکتی تھی۔

”میم... کیا ہوا؟“

”مجھے افسوس ہے کہ اپنا فلیٹ خالی کرانے کے لیے مجھے تم سے جھوٹ بولنا پڑا۔ میرے شوہر کو یہ گوارا نہیں ہے کہ تم اس فلیٹ میں مفت رہو۔“ انجم نے کہا۔

”میں کرایہ دے دیا کروں گی۔“ ماریہ بے بسی سے بولی۔

”جتنے کرائے پر میرے شوہر نے وہ فلیٹ دیا ہے، اتنی تمہاری تنخواہ بھی نہیں ہے۔“

”مجھے کام سے کیوں نکال دیا؟ کام تو کرنے دیں۔ میں رہنے کا کوئی اور بندوبست کر لیتی ہوں۔“

”سوری میری بہن کی بیٹی آرہی ہے، اسے اب میرے ساتھ کام کرنا ہے۔“ انجم جیس مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”پلیز میم... میں کہاں جاؤں گی؟ میرا اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ مجھے کچھ دن اپنے پاس رکھ لیں، میں کوئی اپنا بندوبست کر لیتی ہوں۔“ ماریہ کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو نکل آئے تھے۔

”کاش میں تمہاری مدد کر سکتی۔“ انجم کہہ کر چلی گئی۔ ماریہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ انجم کا دل اتنی جلدی پتھر کا ہو سکتا ہے۔

ماریہ بہت دیر تک انجم سے دوبارہ بات کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن انجم سے اس کی ملاقات ہو ہی نہیں سکی، وہ کہیں چلی گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس جگہ بالکل اجنبی ہو گئی ہو۔ ماریہ ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی کہ اس بیوی پارلر کی دیکھ بھال پر مامور سخت چہرے والی عورت نے ماریہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر لے جا کر بولی۔ ”ماریہ بی بی میری نوکری کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ اب کہیں اور جا کر بیٹھ

بساط

جاؤ۔“ وہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ رات کے پونے بارہ کا وقت تھا۔ ماریہ کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اس نے شوہر میں رہتے ہوئے دوستیاں بھی نہیں بنائی تھیں۔ وہ اپنا کام کرتی تھی اور انجم جیس تک اس کی دنیا محدود تھی۔

ماریہ نہیں جانتی تھی کہ اسے راشد کے کہنے پر ہی انجم نے نکالا ہے۔ اپنے راز کی وجہ سے انجم اس کے ہاتھ کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ حالانکہ ایسا سب کچھ کرتے ہوئے اسے دلی رنج ہو رہا تھا لیکن اسے اپنی عزت بچانی تھی اور اپنا راز محفوظ رکھنا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا جیسا راشد نے انجم کو کرنے کا کہا تھا۔

ماریہ ایک طرف کھڑی سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے، اس کا کوئی اور ٹھکانا ہوتا تو وہ اس جانب قدم بڑھا دیتی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بھی آیا کہ وہ واپس اپنے اس چھوٹے سے دور دراز شہر میں چلی جائے۔ لیکن اس کا وہاں کون تھا؟ ممانی تو پہلے ہی اسے برداشت نہیں کرتی تھی۔ ماموں نے ممانی کے قہر سے نجات کے لیے ہی تو اسے یہاں انجم کے پاس چھوڑا تھا۔

ماریہ ایک بندگلی میں کھڑی تھی۔ اس کے پاس جانے کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ بغیر سوچے ایک طرف چل پڑی۔ کچھ دور جا کر وہ رک گئی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک چائے کا کھوکھا تھا جہاں چند لوگ بیٹھے تھے اور ٹیلی وژن پر اونچی آواز میں ایک فلم لگی ہوئی تھی۔ وہاں دو عجیب سی شکل و صورت والے آدمی بھی بیٹھے تھے۔ دونوں نے ماریہ کو حریص نظروں سے دیکھا اور ایک دوسرے کو جانے کیا کہنے لگے۔ ماریہ ان کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ دائیں بائیں سڑک دیران تھی اور اکاؤنٹ کوئی کار گزر جاتی تھی۔ اچانک وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھے اور ماریہ کی طرف بڑھے۔ ماریہ کا دل دھڑکنے لگا اور وہ سوچنے لگی کہ کیا کرے اسی اثنا میں ایک کار اس کے سامنے آ کر رکی اور اندر راشد بیٹھا تھا۔ کار کو دیکھ کر وہ دونوں اسی جگہ رک گئے اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے لیکن ان کی نگاہیں ماریہ پر ہی تھیں۔ پہلی بار راشد کو دیکھ کر ماریہ کے دل سے اس کے لیے اچھے الفاظ نکلے اور وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔

”کہاں جانے کی تیاری ہے؟“

راشد کا آنا ایسے ہی تھا جیسے تیز بہاؤ پانی میں کوئی ڈوب رہا ہو اور اچانک اسے بچنے کا کوئی سہارا مل جائے۔ اس وقت اسے لگ رہا تھا جیسے راشد سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی

چارہ گر نہیں ہے۔
 ماریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ راشد سے کیا کہے۔
 اس نے کبھی راشد سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی تھی۔ اب
 وہ اس سے اپنی پریشانی کیسے بیان کرے۔
 راشد اپنی کار سے باہر نکلا۔ اس نے کار کا پچھلا دروازہ
 کھولا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”کہیں جانا ہے تو میں وہاں چھوڑ
 آتا ہوں۔ لیکن اس وقت تم اپنے فلیٹ سے نکل کر جا کہاں
 رہی ہو؟“

ماریہ نے ایک نظر چائے کے کھوکھے پر بیٹھے اوباش قسم
 کے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا اور پھر وہ کار کے اندر
 بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے فی الحال اپنے گھر لے چلو۔“
 راشد نے کار کا دروازہ بند کیا اور ایک مکارانہ مسکراہٹ
 اپنے چہرے پر سجا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

راشد کا گھر ایک نئی کالونی میں تھا۔ اس کالونی میں ابھی
 مکمل آبادی نہیں ہوئی تھی۔ راشد کے گھر کے آس پاس بھی
 کئی پلاٹ خالی تھے۔ راشد نے ابھی حال ہی میں وہ گھر تعمیر
 کرایا تھا۔ راشد نے اپنے گھر میں باؤنڈری وال بنوائی تھی
 اور اس کے درمیان دو منزلہ گھر کھڑا تھا۔ گھر کی ہر کھڑکی پر
 آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ اور دروازے مضبوط تھے۔ راشد
 اپنے گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس نے کار سے باہر نکل کر
 گیٹ کھولا اور کار اندر لے گیا۔ گیٹ بند کر دیا اور ماریہ اپنا
 سامان لے کر اس کے ساتھ اندر چلی گئی۔

ماریہ ایک طرف بیٹھ گئی۔ راشد نے اسے پینے کے لیے
 ایک گلاس پانی کا دیا اور پھر پوچھا۔

”اگر تم چاہو تو مجھے بتا سکتی ہو کہ اچانک اس طرح
 سڑک پر کھڑی ہونے کا کیا مقصد تھا؟“

پانی پینے کے بعد ماریہ بولی۔ ”میں نے تم سے کبھی
 سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ اگر رات نہ ہوتی تو میں شاید تم
 سے مدد نہ مانگتی۔“

”مجھے تمہاری کسی بات پر کوئی غصہ نہیں ہے۔ تم مجھے جو
 بھی غصے میں کہتی تھیں میں اسی وقت بھول جاتا تھا کیونکہ مجھے
 تم سے محبت ہے۔“ راشد کا لہجہ ریشم کی طرح ملائم تھا۔

ماریہ چپ ہو گئی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد راشد نے
 پھر پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں جانے کے لیے نکلی تھی۔ تب
 ماریہ نے جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اسے بتا دیا۔ راشد ایسے
 سنا رہا جیسے وہ اس تمام معاملے سے بے خبر ہو۔ جب ماریہ
 نے اپنی بات مکمل کر لی تو راشد نے پوچھا۔

”اب کیا ارادہ ہے؟ واپس جانا چاہتی ہو تو میں صبح
 تمہیں بس میں بیٹھا دیتا ہوں۔ اور اگر اسی شہر میں اسی شعبے
 میں کام کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں انجم کے سامنے کھڑا ہونے
 کا موقع دے سکتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔
 تم یقین کر لو کہ میں تمہیں اس حال میں بھی اکیلا نہیں
 چھوڑ سکتا۔ چاہے تم مجھ سے نفرت کرو، یا سیدھے منہ بات
 بھی نہ کرو۔“

جو کچھ اچانک انجم نے اس کے ساتھ کیا تھا، وہ ماریہ
 کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ راشد کی صورت میں اسے
 ایک بہترین اور مضبوط سہارا مل سکتا تھا۔ واپسی کی کشتیاں
 جل چکی تھیں۔ سرمہ نے چپ چاپ اسے چھوڑ کر شادی کر لی
 تھی۔ راشد اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوا تھا اگر وہ اس وقت
 نہ آتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ راشد ایسی چال کھیل چکا تھا کہ
 ماریہ خود بخود اس کے چال میں آ چکی تھی۔

”کیا تم نے واقعی میری کسی بات کا برا نہیں منایا
 تھا؟“ ماریہ نے پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ اب میں تمہیں شادی کا نہیں کہوں گا
 بلکہ مخلص ہو کر تمہاری مدد کروں گا۔“ راشد بولا۔

ماریہ چپ ہو گئی۔ راشد اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنا لپ
 ٹاپ اٹھالایا۔ اسے آن کر کے اس نے ایک فائل کھولی
 اور لپ ٹاپ کا رخ ماریہ کی طرف کر دیا۔ راشد کا ایک
 دوست کمپیوٹر میں بہت ماہر تھا۔ اس کی مدد سے ایک تصویر
 تیار کی تھی۔ سرمہ ایک خوبصورت دلہن کے ساتھ خوشگوار موڈ
 میں کھڑا تھا۔ ماریہ نے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں
 اور وہ کھڑی ہو کر بولی۔

”آپ مجھے میرے کمرے کا بتا سکتے ہیں۔“

راشد نے ماریہ کو کمرے تک چھوڑا اور عجیب انداز سے
 مسکرا کر اس نے اپنے آپ کو شاباشی دی اور وہاں سے چلا
 گیا۔

☆☆☆

راشد کے بڑے سے گھر میں رہتے ہوئے ماریہ کو دو
 دن ہو گئے تھے۔ راشد اپنے کام پر چلا جاتا تھا اور رات کو کسی
 وقت بھی اس کی واپسی ہو جاتی تھی۔ گھر میں کسی سے رابطہ
 کرنے کے لیے کوئی فون نہیں تھا۔ راشد کا ماریہ کے ساتھ
 سلوک ایسا تھا کہ ماریہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ وہ اتنے
 اچھے انسان کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ کیوں نہیں رکھ سکی
 اور اس نے ہمیشہ راشد کو برا انسان ہی کیوں سمجھا۔

راشد روز ماریہ سے پوچھتا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔

ابھی تک ماریہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن ایک خیال نے ماریہ کو مضطرب کر دیا۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ اس کے پاس کہیں جانے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے، اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے وہ واپس بھی نہیں جاسکتی تو پھر کیوں نا وہ راشد سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے اسی گھر میں رہ جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے اپنے فیصلے سے راشد کو بھی آگاہ کر دیا۔ یہ سنتے ہی راشد کے دل میں لڈو پھوٹا اور اس نے ماریہ کی اجازت سے اسی دن نکاح کا انتظام کر دیا۔

راشد اور ماریہ میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو گئے۔ دونوں کا نکاح راشد کے انتہائی قریبی دوستوں کی موجودگی میں ہوا تھا۔ نکاح کے بعد راشد کا چہرہ یکدم ہی بدل گیا۔ جہاں نرمی دکھائی دیتی تھی اب وہاں سختی بر اجمان ہو گئی۔ اس نے نکاح ہوتے ہی اپنا بناوٹی نقاب اتار پھینکا اور اس کا اصل چہرہ اپنی جگہ پر آ گیا۔

نکاح کے دو گھنٹے بعد راشد نے کہا۔ ”میں کام پر جا رہا ہوں، رات کو واپس آؤں گا۔“

راشد کے جانے کے بعد ماریہ سوچنے لگی کہ وہ کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ وہ اچھا سا کھانا تیار کرتی ہے کہ راشد خوش ہو جائے گا۔ وہ کچن میں گئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں کھانے پکانے کا سامان غائب تھا۔ کچی، چینی، مرچ مصالحہ کچھ بھی نہیں تھا۔ فریج کھولا تو وہ بھی خالی تھا حالانکہ فریج میں گوشت اور پھل موجود تھے۔ اچانک سب کچھ کہاں چلا گیا۔ ماریہ حیرت سے سوچنے لگی۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

ماریہ نے نہادھو کر اچھا سا سوٹ پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ خود ہی ہلکا سا میک اپ کرنے لگی۔ ماریہ کے چہرے پر سچے ہلکے میک اپ نے اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

ماریہ کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے اپک بار پھر متلاشی نگاہوں سے کچن اور فریج کو دیکھا لیکن پانی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

ماریہ کے پاس راشد سے رابطہ کرنے کا بھی کوئی بندوبست نہیں تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ٹیلی وژن دیکھنے لگی۔ جیسے ہی ٹیلی وژن کی اسکرین روشن ہوئی سرمد کے سیریل کا پروموجہ چلتا دکھائی دیا۔ اور جب تحریر کے خانے میں سرمد کا نام آیا تو ماریہ کی آنکھوں میں ریت کے ذرے اتر آئے۔ اس نے ٹی وی بند کر دیا۔

ماریہ نے کبھی ٹہل کر اور کبھی بیٹھ کر راشد کے آنے کا انتظار کیا۔ راشد رات آٹھ بجے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا اور شاپر میں سے اٹھتی ہوئی خوشبو بتا رہی تھی کہ وہ کھانے کے لیے کوئی مزے دار چیز لے کر آیا ہے۔

”پور تو نہیں ہوئیں؟“ راشد نے آتے ہی خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”بہت زیادہ۔“ ماریہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”بھوک لگ رہی ہے؟“ راشد نے اگلا سوال کر دیا۔

”بھوک اس قدر ہے کہ لگتا ہے میں گر جاؤں گی۔“ ماریہ بولی۔

”تم بیٹھو میں کھانا نکال کر لاتا ہوں۔ بریانی اور شامی لے کر آیا ہوں۔ مجھے بہت پسند ہے۔“ راشد کچن کی طرف بڑھا۔

”لائیں میں نکال کر لاتی ہوں۔“ ماریہ نے کہا۔

”نہیں تم بیٹھو۔“ راشد کہہ کر اندر چلا گیا۔ ماریہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد راشد ایک ٹرے میں ایک پلیٹ بریانی، دوسری پلیٹ میں دو عدد شامی، راستا اور پانی کا ایک گلاس لے کر آ گیا۔

اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ ایک فرد کا کھانا دیکھ کر ماریہ کو حیرت ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دل ہی دل میں مسکرا دی کہ شادی کے ابتدائی ایام میں میاں بیوی ایک ہی پلیٹ میں کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

راشد بھی بیٹھ گیا۔ ”کیسی مزے دار خوشبو آ رہی ہے۔ یہ اس شہر کی سب سے اچھی بریانی ہے۔ میں کئی بار کھا چکا ہوں اور جب بھی مجھے بریانی کھانی ہوتی ہے تو میں سیدھا اس کی دکان کا رخ کرتا ہوں۔“

”پلیز کھانا کھائیں بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ ماریہ سے صبر نہیں ہو رہا تھا اور اپنے سامنے بریانی دیکھ کر اس کی بھوک اور بھی چمک اٹھی تھی۔

”کھانا کھانے سے پہلے مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ راشد نے اطمینان سے کہا۔ ماریہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

راشد مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ ماریہ کو بڑی عجیب لگی۔ پھر وہ بولا۔ ”جانتی ہو میں تمہیں کب سے چاہتا تھا؟ اس وقت سے جب تم نے سرمد کی لکھی پہلی سیریل میں میک اپ آرٹسٹ انجم جبین کے ساتھ کام کیا تھا۔ میں تمہیں گھنٹوں دیکھتا تھا اور تمہاری صورت دیکھنے کے لیے بے چین ہو جاتا تھا۔ کئی ماہ میری خاموش محبت میرے دل میں ہلکی

ربی اور سرمد نے تمہاری انگلی میں انگوٹھی پہنا کر تمہیں اپنی منگیتر بنالیا اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔“

ماریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان باتوں کا کیا جواب دے۔

”سرمد میرا دوست تھا لیکن کسی بھی ناپسندیدہ بات پر وہ بے عزتی بھی کر دیا کرتا تھا۔ سرمد نے دو دفعہ میری بے عزتی بھی کی تھی اور ایک بار اس نے سیٹ پر میرے منہ پر تھپڑ بھی جمادیا تھا اور جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے مجھے اپنے فلیٹ میں بلایا اور معذرت کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر رات کا کھانا بھی کھلایا تھا۔ تب میں ہنستا رہا اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ غلطی میری ہی تھی۔ لیکن میں وہ راشد ہوں جو نفرت کی قبر بنا کر اپنے دل میں رکھتا ہوں اور وقت آنے پر وہ قبر کھود کر انتقام کی آگ جلا دیتا ہوں۔“ راشد نے آخری جملہ اس خطرناک انداز میں کہا کہ ماریہ کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی، وہ متوحش نگاہوں سے راشد کی طرف دیکھنے لگی۔ ماریہ کے سامنے یکدم اس کا ایک نیا روپ آ گیا تھا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد راشد نے پھر کہا۔ ”پہلے میں تم سے محبت کرتا تھا۔ تمہیں اپنانا چاہتا تھا لیکن جب سرمد نے تمہیں انگوٹھی پہنائی تو میں نے طے کر لیا تھا کہ تمہیں اب بھی اپنا بناؤں گا، اس سے چھین کر تمہیں اس گھر میں سرمد کی محبوبہ کے طور پر رکھوں گا۔ اپنی بیوی بنا کر بھی تمہیں اپنی بیوی کا درجہ نہیں دوں گا۔ بلکہ تمہیں اذیت دوں گا اور خوش ہوں گا کہ میں سرمد کی محبوبہ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ اس ماریہ کو اذیت دے رہا ہوں جسے سرمد چاہتا ہے اور جس ماریہ نے سرمد کو اتنی اہمیت دی کہ اسی کی ہو گئی۔ تم نے کبھی میرے ساتھ سیدھے منہ بات نہیں کی، مجھ سے ہمیشہ نفرت کی اور مجھے کبھی حیثیت نہیں دی۔ اور جب تم پر زمین تلک ہوئی تو تم نے پناہ کے لیے مجھے استعمال کرتے ہوئے مجھ سے شادی کر لی کہ رہنے کے لیے چھت مل جائے گی۔“ راشد کا لہجہ زہر آلود ہو گیا تھا۔ ماریہ کے چہرے پر حیرت برس رہی تھی۔ اس کے گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ راشد اپنے دل میں ایسی سوچ دبائے بیٹھا ہے۔

راشد نے اس کی طرف نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور بریانی کھانی شروع کر دی۔ وہ ایسے بریانی کھا رہا تھا جیسے وہ اکیلا ہی بیٹھا ہو۔ کھاتے کھاتے اس نے ماریہ کی طرف دیکھا۔

”تم اس گھر میں اپنے آپ کو قیدی سمجھو۔ جس طرح تم

خود بخود میرے پاس آ گئی تھیں میں تمہیں بغیر شادی کے بھی اس گھر میں قید کر سکتا تھا۔ لیکن بیوی بنا کر تمہیں قید میں رکھنا اور پھر تم پر کسی بات پر تشدد بھی کر دینا قابل گرفت نہیں ہوگا۔ مجھ پر بھی اغوا کا کیس نہیں بن سکے گا۔“ راشد کہہ کر پھر کھانے لگا۔ ماریہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ بت بنی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ مزے سے بریانی کھا رہا تھا۔

”اس گھر میں کوئی فون نہیں ہے کہ کسی سے تم رابطہ کر سکو۔ فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہر کھڑکی کے آگے مضبوط گرل ہے اور مین دروازہ بہت مضبوط ہے، اس کے بعد گیٹ ہے جو لوہے کا ہے۔ دیواریں اونچی ہیں کہ تم فرار نہیں ہو سکتیں۔“ راشد چپ ہوا اور کھانے لگا۔ ماریہ کا ساکت جسم ایسا تھا جیسے بے جان ہو گیا ہو۔

بریانی کھانے کے بعد پلیٹ میں چند لقمے بچ گئے تھے۔ اس نے پلیٹ ماریہ کے آگے رکھ دی۔

”تم نے سرمد سے محبت کی، اس کی سزا تمہیں بھی ملے گی اور سرمد کو بھی۔ پلیٹ میں بریانی چھوڑ رہا ہوں، کھا لو۔“ راشد اپنی جگہ سے اٹھا اور لمبی سی ڈکار لیتا ہوا اس جگہ سے چلا گیا۔

ماریہ کا دل پھٹ چکا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہو گیا ہے؟ زندگی کی ایسی کایا پلٹ گئی تھی کہ وہ جیسے تخت سے تختہ پر آ گئی تھی۔ زندگی کی سانس زہر بن کر گھونٹ گھونٹ اس کے حلق کے نیچے اترنے لگی۔

راشد ہاتھ دھو کر واپس آیا اور قدرے ماریہ کی طرف جھک کر زہر آلود لہجے میں بولا۔ ”اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ نفرت کیا ہوتی ہے۔“

راشد دس منٹ کے بعد اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ماریہ کو گھر کے اسٹور میں لے گیا، جو تقریباً خالی ہی تھا ایک کونے میں کچھ کاٹھ کباڑ ایک دوسرے کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ فرش پر ایک پرانی چٹائی اور گندا سا سرہانہ اور جانے کب کا دھویا ہوا بدبودار کمبل رکھا ہوا تھا۔

”آج سے تم یہاں سویا کرو گی۔“ راشد تسخّر سے مسکرایا اور چلا گیا۔

ماریہ کی ممانی ایک سخت گیر عورت تھی لیکن اس نے بھی کبھی ماریہ کو سونے کے لیے ایسا بستر نہیں دیا تھا۔ وہ رات ماریہ نے کانٹوں پر گزاری۔ صبح ہوتے ہی راشد نے دروازہ بجایا اور رعب سے بولا۔

”کچن میں دوانڈے اور بریڈ پڑی ہے۔ میرے لیے دوانڈے فراکی کر دو اور ایک اچھا سا کپ چائے کا بنا دو۔“

دو پٹہ اس جگہ باندھ دیا جہاں سے سر پھٹا تھا۔
راشد نے ناشتا کیا، کپڑے بدلے اور اسٹور کا تھوڑا سا
دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ماریہ نے اپنے سر پر کپڑا باندھا
ہوا تھا اور اس کا چہرہ سوج چکا تھا اور ایک طرف نسل کا نشان
واضح دکھائی دے رہا تھا۔

راشد اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”کچن میں کچھ ناشتا
بچا پڑا ہے۔ کھا لیتا۔ میں جا رہا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔“
راشد نے جانے کے لیے قدم بڑھائے اور پھر رک کر
پلٹا۔ ”کچن میں، میں نے سبزی رکھی ہے۔ اچھی طرح دھو کر
اس کی ہنڈیا تیار کر دینا۔ آج زیادہ کام نہیں ہے میں رات
آٹھ بجے تک آ جاؤں گا۔ دو روٹیاں بھی بنا دینا۔ اور یاد رکھنا
میرے آنے سے پہلے سالن تیار ہو اور روٹی کے لیے آٹا
گوندھا ہوا ہو۔ میں آؤں گا تو گرم روٹی بنانا۔“ راشد حکم
دے کر چلا گیا۔ اس نے مین دروازہ بھی باہر سے مقفل کر دیا
اور گیٹ کو بھی تالا لگا دیا تھا۔

☆☆☆

ماریہ نے رات آٹھ بجے سے پہلے ہنڈیا تیار کر دی
تھی۔ آٹا بھی گوندھ دیا تھا۔ سوا آٹھ بجے کے قریب راشد
گنگناٹا ہوا آ گیا۔ اس نے آتے ہی آواز لگائی۔
”ماریہ ڈار لنگ کہاں ہو؟ سالن تیار ہے؟“
”جی۔“ ماریہ کی گھبراہٹ ہوئی آواز نکلی۔

”میں منہ ہاتھ دھوئے جا رہا ہوں۔ دس منٹ ہیں
تمہارے پاس میرے لیے دو روٹیاں تیار کر دو، یاد رکھنا
صرف دس منٹ ہیں۔“ راشد کہہ کر اپنے کمرے میں چلا
گیا۔

ماریہ نے جلدی سے وقت دیکھا اور اس کے ہاتھ بجلی سی
تیزی سے چلنے لگے۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ کپڑا
باندھنے سے اس کا بہتا ہوا خون رک گیا تھا لیکن تکلیف ابھی
تک تھی۔ چہرے پر سوجن اور نسل کا نشان واضح تھا۔

دس منٹ میں ایک ہی روٹی تیار ہوئی تھی اور دوسری
روٹی اس نے توڑے پر ڈالی تھی کہ راشد کچن میں آ گیا۔ اس
نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔ ”دس منٹ
ہو چکے ہیں لیکن تم نے دو روٹیاں نہیں پکائیں۔“
”میں پکا رہی ہوں۔“ ماریہ ڈر گئی۔

”تم ڈری اور سبھی کتنی اچھی لگ رہی ہو ماریہ۔ جانتی ہو
جب ایک دن میں نے تمہارا نام لیا تو سرمد نے مجھے ڈانٹ
دیا کہ میں ماریہ کا نام عزت سے لوں۔ یعنی ماریہ جی کہوں۔
مجھے بڑا غصہ آیا تھا لیکن اس وقت میں اپنا غصہ پی گیا تھا۔

میں نہالوں۔ اور یاد رکھنا میرے نہانے سے پہلے سب کچھ
تیار ہو۔“

راشد ہاتھ روم میں چلا گیا اور ماریہ جلدی جلدی کچن کی
طرف دوڑی۔ آگ جلانے کے لیے وہ مایوس تلاش کرنے
لگی۔ ایک ایک چیز دیکھ لی لیکن مایوس کہیں نظر نہ آئی۔
راشد پہلے ہی مایوس کچن سے اٹھا کر لے گیا تھا۔

جس انداز میں راشد نے کہا تھا کہ نہانے سے پہلے ناشتا
تیار ہو، وہ انداز اس قدر خوفناک تھا کہ ماریہ کی سانس پھول
چکی تھی، مایوس تلاش کرتے ہوئے راشد نہا کر آ بھی گیا۔
یکدم راشد کود دیکھ کر ماریہ کا سانس ہی رک گیا۔

اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”ناشتا تیار ہو گیا؟“
”مایوس نہیں ملی۔“ ماریہ کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔
”مایوس نہیں ملی؟ کہاں چلی گئی۔“ راشد کچن میں داخل
ہوتے ہوئے غرایا اور مایوس جیب سے نکال کر غیر محسوس
انداز میں نیچے گرا دی۔ راشد نے متلاشی نگاہوں سے دائیں
بائیں دیکھا اور پھر فرش پر نظر ڈالتے ہی بولا۔ ”یہ کیا پڑی
ہے؟“

ماریہ کی نظر فوراً فرش پر چلی گئی۔ مایوس موجود تھی۔
ماریہ جیسے ہی مایوس اٹھانے کے لیے جھکی، اسی اثنا میں راشد
نے اس کے بال پکڑے اور پوری قوت سے اس کا سر دیوار
کے ساتھ مار دیا۔

ماریہ کی چیخ نکل گئی۔ سر پھٹ چکا تھا۔ وہ رونے لگی۔
”میں نے تمہیں کہا تھا کہ میرے آنے سے پہلے ناشتا تیار
ہو۔“ راشد ایک بار پھر غرایا اور اس نے مکا اس کے منہ پر
دے مارا۔ ایک بار پھر ماریہ کی چیخ نکل اور وہ نیچے گر گئی۔
اسے لگا جیسے اس کا جڑا ٹوٹ گیا ہو۔ اس کے چہرے پر فوراً
نسل کا نشان واضح ہونے لگا۔ راشد نے اسے بالوں سے پکڑ
کر اٹھایا اور بولا۔

”تم نے مجھے فالتو سمجھا ہے۔ تمہارے آگے میری
حیثیت یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس سرمد ہے تو میری کوئی قدر
ہی نہیں اور جب اس نے چھوڑ دیا تو میں تمہارے لیے اہم
ہو گیا۔ جب انجم نے اپنے فلیٹ اور نوکری سے بے دخل
کر دیا تو مجھ سے شادی کر لی کہ رہنے کو گھر مل جائے۔ یہ
باتیں ہر مار پر میں تجھے یاد دلاتا رہا ہوں گا۔“ راشد نے کہہ
کر اسے باہر کی طرف دھکا دے دیا اور کچن کا دروازہ بند
کر کے اپنے لیے ناشتا تیار کرنے لگا۔

ماریہ کا سر پھٹ چکا تھا اور خون اس کی گردن تک آ گیا
تھا۔ وہ بمشکل اٹھی اور اسٹور روم میں جا کر اس نے اپنا

اب تم نے دس منٹ میں دو روٹیاں نہیں پکائیں، اس غلطی کی سزا کے ساتھ اس دن کا غصہ بھی آج ہی نکلے گا۔“
راشد نے یکدم اسے جنونی انداز میں کھینچا اور چیختی چلاتی ماریہ کو سیڑھیوں سے نیچے دھکا دے دیا۔ ماریہ لڑکھتی ہوئی نیچے گرنے لگی اور نیچے گرتے ہی اس کا سردیوار سے لکرایا اور اس کی چیخ نکل گئی۔

راشد اوپر کھڑا ہنسا۔ ”سرمہ کو جب پتا چلے گا کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں تو اسے کتنا دکھ ہوگا۔ وہ سوچے گا کہ ماریہ سے شادی کر کے اسے پیار تو میں دینا چاہتا تھا۔“
راشد ہنسا۔ اس کے دل میں ماریہ کی تکلیف کا خفیف احساس بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔

راشد کچن کی طرف چلا گیا۔ ماریہ تکلیف سے چور تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ راشد آگ بگولا ہاتھ میں جلی ہوئی روٹی لیے آگیا۔ جس وقت راشد نے اسے کھینچا تھا اس وقت ایک روٹی تو بے پر تھی اس لیے وہ جل گئی۔ راشد برق رفتاری سے نیچے آیا اور اس نے آتے ہی اپنے پاؤں کی ٹھوکر ماریہ کے دے ماری۔ ماریہ چیختی ہوئی دور جا گری۔ اس کی پسلیوں میں شدید اور ناقابل برداشت درد اٹھا۔

”تم نے روٹی جلادی۔ دیکھو کیسے کونکہ ہو گئی ہے روٹی۔ بلاؤ اب سرمہ کو۔ اس سرمہ کو جس نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہارا نام عزت سے لوں۔ اب دیکھو میں نے تمہیں اپنے پیر کی ٹھوکر پر رکھا ہوا ہے۔“ وہ چلا رہا تھا۔

راشد کے نتھنے غصے سے پھول چکے تھے۔ ماریہ کو کوئی ہوش نہیں تھا۔ راشد نے کچھ دیر ماریہ کی طرف دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد راشد گنگناٹا ہوا اپنے لیے روٹی پکا رہا تھا۔ جب اس نے روٹی پکالی تو کھانا ٹرے میں سجا کر کھانے کی میز کی طرف جاتے ہوئے بڑے خوشگوار لہجے میں پکارا۔

”ماریہ... ماریہ جی... ڈارلنگ... آ جاؤ دیکھو میں نے روٹی پکالی ہے اور تم میرے ساتھ بیٹھ کر کھا لو۔“ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے راشد کوئی نفسیاتی مریض ہو۔ جوہل میں قہر آلود اور دوسرے لمحے نرم ہو جاتا تھا لیکن اس کے دل میں کیا تھا، اس کا علم کسی کو نہیں ہوتا تھا۔

ماریہ جو درد کی وجہ سے بے ہوش ہو چکی تھی اور اب اسے ہلکا ہلکا ہوش آرہا تھا۔ راشد کی آواز اس کی سماعت میں پڑ رہی تھی۔ اس کے جسم میں حرکت ہونے لگی۔ وہ اٹھنے کی

کوشش کر رہی تھی۔ راشد کا خوف اس کے دل و دماغ میں تھا۔

”ماریہ ڈارلنگ... کہاں ہو آ جاؤ۔“ راشد جو مزے سے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، ساتھ ساتھ ماریہ کو بڑے پیار سے آوازیں بھی دے رہا تھا۔

روٹی کے چند لقے اس نے چھوڑ دیے تھے۔ پلیٹ میں تھوڑا سا سالن بھی تھا۔ اس نے ٹرے ایک طرف دھکیل دی اور پھر بولا۔

”میں باہر جا رہا ہوں، چہل قدمی کے لیے۔ دو دن کے بعد میرا سخت شوٹنگ شیڈول شروع ہونے والا ہے۔ گھر سے جانے اور واپس آنے کا کوئی وقت نہیں ہوگا۔ میرے پاس دو دن ہیں مستی کرنے کے لیے۔ اسی لیے تو میں اپنی نئی ٹوبلی دلہن کے ساتھ مستی کر رہا ہوں۔“ راشد کہہ کر ہنسا اور پھر بولا۔ ”میں چہل قدمی کر آؤں تب تک تم کھانا کھا لو۔ سرمہ اگر یہ دیکھ لے کہ میں تمہارا کتنا خیال رکھتا ہوں۔ تمہیں کھانے کو کیا دیتا ہوں تو وہ حیرانی میں ڈوب جائے۔“
راشد نے پھر اپنے ہونٹوں پر ہنسی بکھیری اور اتراتا ہوا چلا گیا۔

ماریہ کی حالت بری ہو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم درد سے دکھ رہا تھا۔ اس سے ہلنا بھی دو بھر ہو رہا تھا۔ رات کو جانے کب راشد چہل قدمی کر کے واپس آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ماریہ کے جسم کا درد بھی دوچند ہو گیا تھا۔ گرم کبل میں لیٹنا ماریہ کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ بمشکل جیسے جیسے کر کے وہ اٹھی اور اپنی زندہ لاش کو اپنے کندھے پر ڈالے اسٹور روم تک پہنچی اور پھر پرانے کبل میں گھس گئی۔ ماریہ کو ایک بار پھر کوئی ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں لیٹی ہوئی ہے۔

رات کے آخری پہر میں راشد نے ایک دھماکے سے دروازہ کھولا اور چلایا۔

”ماریہ اٹھو اور میرے لیے ایک گلاس پانی کا لے کر آؤ مجھے پیاس لگی ہوئی ہے۔“

راشد نے ایسی آواز میں حکم دیا تھا کہ ماریہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ ڈری ہوئی بمشکل اٹھی۔ جیسے جیسے کچن تک گئی، پانی کا گلاس بھرا اور راشد کے کمرے میں چلی گئی۔

”ایسے ہی گلاس اٹھالائی ہو، جاؤ جا کر پہلے گلاس کسی پلیٹ پر رکھو اور میرے پاس لے کر آؤ۔“ راشد نے دیکھتے ہی درشت لہجے میں حکم دیا۔ اس حکم کی تکمیل کے لیے ماریہ کا

بساط

وہ اپنی حقیقت خود ہی ماریہ کے سامنے منکشف کر رہا تھا۔ اس کا روپ دیکھ کر ماریہ کو بہت حیرت ہو رہی تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔

”جانتی ہو میں نے تمہیں یہ سب کیوں بتایا ہے؟ کیونکہ یہ گھر تمہاری قبر ہے۔ اس گھر کی چار دیواری سے لکھنا اب تمہارے لیے ناممکن ہے۔ باہر کی دنیا تمہارے لیے ختم ہو چکی ہے۔ اور تمہیں میں مار دوں گا۔ کیونکہ تمہاری سزا موت ہی ہے۔ جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو تم نے مجھے بری طرح سے جھاڑ دیا تھا۔ دیکھو اچانک میں نے انجم کو اس کے عاشق کے ساتھ پکڑ لیا اور اس کا راز نہ کھولنے کی قیمت اس سے یہ وصول کی کہ جیسا میں نے کہا ویسا اس نے کیا اور تمہیں میرے کہنے پر قلیٹ اور نوکری سے نکال دیا۔“

اس کی یہ بات سن کر تو ماریہ کا منہ ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں اس کے مکار اور شاطر چہرے پر جم کے رہ گئیں۔

”سرمہ اپنی ماں کی حیار داری کے لیے گیا تھا تو اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟“ جانے ماریہ کے اندر کہاں سے ہمت آئی اور اس نے کیسے اپنے اندر گرم پانی کی طرح ابلتا ہوا سوال کر ڈالا۔

اس کا سوال سن کر راشد نے گھور کر اس کی طرف ایسے ہی دیکھا جیسے کسی کے جسم پر گرم پانی کے چھینٹے پڑ جائیں اور وہ تکلیف سے دیکھنے لگے۔

”اس نے اپنے نمبر اس لیے بند کر دیے تھے کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے اور جو نمبر غیر معروف تھا وہ نمبر مجھے دے گیا تھا کہ میں تمہیں دے دوں، جو کہ میں نے تمہیں نہیں دیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور سوال کرنا ہے تو کر لو۔ کیونکہ تم مرنے والی ہو۔ میں تمہیں مار دوں گا۔ تمہاری موت مجھے سکون دے گی جب میں سرمہ کو تمہاری جدائی میں ٹوٹے ہوئے دیکھوں گا تو مجھے بہت لطف آئے گا۔“ اس نے جواب دینے کے بعد درشت لہجہ اپنا لیا۔ ماریہ چپ کھڑی رہی۔

کچھ توقف کے بعد راشد نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ”چلی جاؤ اور پانی بھی لے جاؤ۔“ ماریہ ایک بار پھر جیسے تیسے اپنے اسٹور میں پہنچ گئی۔

سرمہ کے بارے میں حقیقت جان کر اسے بہت رنج ہوا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ راشد ایک عالم غصہ تھا۔ جس کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اپنی سابقہ بیوی کے قتل کا واقعہ کتنا خوش ہو کر سن رہا تھا۔ ماریہ یہ

کچن میں جانا اور واپس آنا پل صراط کے سفر کے مانند تھا۔ وہ پانی کا گلاس پلیٹ میں رکھے اس کے سامنے کھڑی تھی اور راشد پانی پینے کے بجائے بیڈ پر نیم دراز تھا۔

راشد نے تکبرانہ مسکراہٹ عیاں کی اور بولا۔ ”تم نے سرمہ سے منگنی کرنے میں اتنی جلدی کی، مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اتنی جلدی تمہیں نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ سرمہ نے شادی نہیں کی تھی۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ سرمہ تو اپنی ماں کی حیار داری کے لیے گیا ہوا ہے۔ دیکھو میرا دماغ کتنا ذہین ہے کہ میں نے ایسی بساط بچھائی کہ تمہیں اپنی بیوی بنا لیا۔“ راشد کہہ کر ہنسا اور ماریہ کے لیے یہ انکشاف بہت ہی زیادہ حیران کن تھا۔

راشد اپنے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا یہ حسن اور شباب میرے سامنے ہے جو سرمہ اپنے نام کر چکا تھا۔ تم نے کیونکہ مجھے سرمہ کے مقابلے میں نمبر دو حیثیت دی ہے اس لیے تمہارا حسن اور شباب پیچھے اور میرا انتقام آگے ہے۔ تمہیں اذیت دینے میں ابھی مجھے مزہ آرہا ہے، جب اذیت دینے سے میرا دل اکتا جائے گا تو پھر تمہارا حسن اور شباب بھی دیکھ لوں گا۔“ وہ کہہ کر پھر ہنسا۔ جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ اس کی باتوں کے بجائے ماریہ کا دھیان تو اس بات پر منجمد تھا کہ سرمہ نے شادی نہیں کی بلکہ وہ اپنی بیمار ماں کی حیار داری کے لیے گیا ہوا ہے۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ اس سوال نے ماریہ کو مزید سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ پھر بولا۔ ”جانتی ہو میری شادی پہلے بھی ہو چکی تھی۔ وہ شادی میرے ماں باپ نے اپنی پسند سے کی تھی، تب میں اپنے شہر میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ مجھے میری بیوی ایک نظر بھی پسند نہیں آئی۔ جانتی ہو میں نے کیا کیا؟“ راشد نے کہہ کر سوالیہ نگاہوں اور مکارانہ مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ جب ماریہ چپ رہی تو وہ خود ہی بولا۔ ”میں نے اسے زہر دے کر خود کسی کا ڈراما رچا دیا اور وہ ڈراما اتنا کامیاب ہوا کہ آج تک پولیس مجھے اس کے قتل کے الزام میں پکڑ نہیں سکی۔ حالانکہ وہ اسپیکٹر... کیا نام تھا اس کا... جلیس احمد... ہاں بالکل یہی نام تھا اس کا۔ وہ میرے پیچھے چپک ہی گیا تھا۔ اس کی تفتیش شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتی جا رہی تھی، اسے شک ہو گیا تھا لیکن ثبوت کوئی نہیں تھا۔ میں بھی ہوشیار تھا، ایک بھی ثبوت نہیں چھوڑا تھا اور بچ گیا، بے چارہ پولیس والا دانت پیستارہ گیا تھا۔“ اس کی گردن ٹخروں سے تن گئی۔

بھی جانتی تھی کہ وہ اب واقعی اس گھر سے کبھی نہیں نکل سکے گی۔ کیونکہ اس گھر کی ہر کھڑکی پر آہنی گرل ہے اور اونچی دیواروں کے ساتھ مضبوط لوہے کا گیٹ ایسا تھوڑا سا تھا۔ راشد نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ گھر اس کی قبر ہے۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی کسی نے زور سے اپنا پیر اس کی ٹانگ پر مارا تو ماریہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا انگ انگ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ جانے کس پہرینند نے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا۔ ماریہ نے دیکھا کہ راشد اپنی قہر آلود شکل کے ساتھ کھڑا تھا۔ ”نہانے جا رہا ہوں۔ میرے لیے ایک کپ چائے کا بناؤ۔“

راشد حکم دے کر چلا گیا۔ ماریہ بمشکل اٹھی اور کچن تک چلی گئی۔ وہ زخمی تھی۔ اس کا سر دو جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور ماریہ نے خون روکنے کے لیے جو دو پٹا سر پر باندھا تھا وہ بھی اس نے اتار دیا تھا کیونکہ خون رک گیا تھا لیکن درد شدید تر تھا۔

ماریہ نے اپنی طرف سے کوشش کر کے چائے جلدی جلدی بنائی اور کپ میں ڈال کر راشد کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

ماریہ کے لیے کچن میں کھڑے بہنا دو بھر تھا لیکن وہ راشد کے خوف سے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ آدھا گھنٹا گزر گیا تھا لیکن راشد نہیں آیا تھا۔ مزید دس منٹ گزرے تو راشد تیار ہو کر آ گیا۔ اس نے آتے ہی چائے کا کپ اٹھایا اور گھونٹ بھرتے ہی غرایا۔

”ٹھنڈی چائے...“ اس کے ساتھ ہی اس نے کپ میں موجود چائے اس کے چہرے پر پھینک دی۔ چائے ٹھنڈی ضرور ہوئی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ ماریہ کو تکلیف نہ ہوتی۔ ماریہ تکلیف سے چلا اٹھی۔

”میں ٹھنڈی چائے پیتا ہوں۔ تجھے عقل نہیں ہے۔“ وہ چلا یا اور اس نے کپ بھی فرش پر دے مارا۔ ماریہ کپ ٹوٹنے کے شور سے ڈر گئی۔

”جار رہا ہوں۔“ راشد کہہ کر باہر نکلا اور گیٹ کے پاس پہنچ کر وہ پھر دبے پاؤں مین دروازے کے پاس آیا اور اندر جاتے ہی اس نے دروازہ بغیر آہٹ پیدا کیے بند کیا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتا، بھاگنے کے انداز میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماریہ کو حیرت تھی کہ اس نے محض اس پر غصہ ہی کیوں کیا، اس بار اس نے اسے پیٹا کیوں نہیں؟ آدھا گھنٹا تک ماریہ کچن میں بیٹھی رہی۔ پھر وہ بمشکل

باہر نکلی اور ٹی وی لائونج میں کھڑی ہو کر سوچنے لگی کہ وہ کیا کرے۔ اس اذیت سے وہ کیسے چھٹکارا حاصل کرے؟ اگر اس نے کچھ نہ کیا تو راشد اسے مار دے گا۔ وہ سرد سے ملنا چاہتی تھی۔

اس گھر سے فرار ہونا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے ہمت کرنے کا سوچا اور مین دروازے کی طرف چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ مین دروازہ باہر سے مقفل ہوتا تھا۔ لیکن آج جیسے ہی اس نے مین دروازے کا ہینڈل گھمایا، وہ کھل گیا۔ اپنے کمرے میں کھڑا راشد تھوڑا سا دروازہ کھولے مزے سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ماریہ کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ مین دروازہ مقفل نہیں تھا۔ وہ باہر چلی گئی۔ گیاراج عبور کرنے کے بعد اس نے گیٹ دیکھا وہ مقفل تھا۔ اس نے باؤنڈری وال کی طرف دیکھا وہ اتنی اونچی تھی کہ اس کے لیے اوپر چڑھ کر دوسری طرف کو دنا بالکل ہی ممکن نہیں تھا۔

وہ چلائی۔ ”کوئی ہے... کوئی ہے جو میری مدد کر سکے۔ کوئی ہے جو مجھے اس ظالم سے چھٹکارا دلا سکے... کوئی ہے...“ ماریہ چلائی لیکن ارد گرد کوئی ہمسایہ نہیں تھا اور اس کی آواز کسی کی سماعت تک نہیں گئی۔

مایوس ہو کر جیسے ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑی راشد مین دروازے میں کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ماریہ اس کو دیکھتے ہی ڈر گئی اور اس کی نگاہیں اس پر منجمد ہو گئیں۔

”یہاں کوئی سننے والا نہیں ہے۔ اندر آ جاؤ... آؤ میں تمہاری مرہم پٹی کر دوں۔ کل میں دو دن کے لیے آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے چلا جاؤں گا۔ تم اکیلی ہوگی۔ اندر آ جاؤ۔“ غیر متوقع طور پر راشد کا لہجہ نرم تھا۔

ماریہ زندہ لاش کی طرح اس کے پیچھے اندر چلی گئی۔ اس وقت اسے اور بھی زیادہ حیرت ہوئی جب اس نے میز پر مرہم پٹی کا سامان دیکھا۔ راشد نے اسے کندھے سے پکڑ کر کرسی پر بیٹھایا، اس کے سر کا زخم صاف کیا اور کسی ڈاکٹر کی طرح مرہم پٹی کر دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر راشد نے کہا۔ ”کچن میں کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔ جو چاہو کھاؤ۔ تمہاری دوائیاں میں نے کچن میں رکھ دی ہیں۔ تمہارا درد بھی دور ہو جائے گا۔“ راشد کا لہجہ ایسا تھا جیسے اس جیسا حلیم شخص ہی کوئی نہ ہو۔ لہجے میں مٹھاس تھی اور اپنائیت تھی۔ ماریہ سوچنے لگی کہ اس شخص کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہ

بساط

کرنے پر راشد کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ وہ کسی سے ماریہ کے بارے میں نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اس لیے جب اس نے انجم کے بارے میں دریافت کیا تو سرمد کو پتا چلا کہ وہ شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔

سرمد نے سوچا اور پھر راشد کے گھر جانے کے لیے اپنی گاڑی کا رخ اس جانب موڑ لیا۔ سرمد نے راشد کے گھر کی بیل دی تو گیٹ پر ہونے والی تیز بیل نے راشد کو چونکا دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے یاد آیا کہ اس نے ہیزا کا آرڈر دیا تھا۔ اس نے اپنے پرس سے ہزار کا نوٹ نکالا اور وہ اٹھ کر گیٹ کے پاس پہنچا اور پوچھا۔

”کون ہے بھئی۔“

”میں سرمد ہوں، گیٹ کھولو۔“ باہر سے سرمد کی آواز نے راشد کو بری طرح سے چونکا دیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ باہر سرمد ہوگا۔ اس کی دانست میں تو ہیزے والا تھا۔ اگر وہ پوچھنے سے قبل گیٹ کے شیٹے سے دیکھ لیتا تو وہ گیٹ ہی نہ کھولتا۔ سرمد بیل دے کر چلا جاتا لیکن اب اس سے غلطی ہو گئی تھی۔

”ایک منٹ... گیٹ کی چابی لے کر آیا۔“ راشد کو کہنا ہی پڑا اور وہ تیزی سے اندر بھاگا۔

ماریہ کچن میں کچھ کھا رہی تھی۔ اسے کھانے کا موقع ملا تھا تو اس نے اس سے گریز کرنے کے بجائے اپنی بھوک اور نقاہت مٹانے کے لیے کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔

راشد اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا مین دروازے کے ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ وہ غیر ارادی طور پر بول رہا تھا۔ ”کم بخت سرمد کہاں سے آ گیا...“

سرمد کا نام سن کر جیسے ماریہ کے بے جان جسم میں جان آ گئی تھی۔ راشد نے اسے اندر لے جاتے ہی فرش پر بٹھایا اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے، منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر دوپٹا باندھ دیا کہ وہ بول نہ سکے اور پھر اس کی ٹانگیں بھی گس کر باندھ دیں۔ راشد نے باہر نکل کر دروازہ مقفل کر دیا اور تیزی سے گیٹ کے پاس جا کر گیٹ کھول دیا۔

”اتنی دیر لگا دی تم نے گیٹ کھولنے میں؟“

”وہ چابی نہیں مل رہی تھی۔“ راشد زبردستی مسکرایا۔ ٹھیک اسی وقت ہیزا والا آ گیا۔ راشد نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس نے طوعاً و کرہاً ہیزے کے پیسے دیے اور ہیزا لے کر گیٹ بند کر دیا۔

وہ سرمد کو لے کر اندر آ گیا۔ دونوں لاؤنج میں بیٹھ

انجمن بھی اس وقت دور ہو گئی جب راشد نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اپنا منہ کھولا۔

”میں نے سوچا کہ اب تم پر کوئی تشدد نہیں کروں گا۔ دو دن کے لیے میں شہر سے باہر شوٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ تم گھر میں موجود پھل کھانا اور جلدی سے ٹھیک ہو جانا۔ پھر ہم ہنی سون منائیں گے۔“

ماریہ کا ابہام دور ہو گیا۔ وہ اپنی طمع کے لیے یہ سب کر رہا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ”مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تم سے شادی کرنی تھی، سرمد سے تمہیں چھیننا تھا، وہ میں نے چھین لیا۔ تمہاری غلطیوں کی سزا دینی تھی وہ میں نے ابھی تھوڑی سی دے دی ہے۔ واپسی پر میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تم ہمیشہ کے لیے یہاں سے آزاد ہو جاؤ گی۔“ راشد کی بات سن کر ماریہ کانپ کر رہ گئی تھی۔

راشد کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنا ضروری سامان پیک کیا اور بیگ کو ایک طرف رکھ کر اس نے پورے گھر کا جائزہ لیا، باؤنڈری وال کو دیکھا اور مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔ اسے یقین تھا کہ ماریہ اس کی غیر موجودگی میں کسی صورت اس گھر سے نہیں نکل سکتی۔

راشد کو کہیں نہیں جانا تھا اس لیے اس نے گھر میں اپنی پسند کی فلمیں دیکھنے کا سوچا اور ٹیلی وژن کے آگے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

جس وقت راشد اپنے گھر بیٹھا بے فکری سے فلمیں دیکھ رہا تھا، اس وقت سرمد کی کار اسٹوڈیو میں داخل ہوئی اور اس نے کار سے باہر قدم رکھ کر دائیں بائیں متلاشی نگاہ دوڑائی۔ سرمد تقریباً ڈھائی گھنٹے قبل واپس آیا تھا۔ اس نے آتے ہی ہی ماریہ اور پھر راشد کو فون کیا تھا۔ دونوں کے ہی فون بند تھے۔ انجم جبیں بھی جانے کہاں مصروف تھی کہ سرمد کا اس سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ سرمد کو ماریہ سے ملنے کی بے چینی تھی۔

سرمد نے اپنے گاؤں جا کر جب اپنی ماں کو دیکھا تو وہ اتنی بیمار نہیں تھیں جتنا کہ اسے بتایا گیا تھا۔ اپنی ماں کے پاس دو گھنٹے بیٹھنے کے بعد سرمد نے باہر نکل کر ماریہ کو فون کیا تھا تو اس کا نمبر بند تھا۔ پھر اس نے راشد کا نمبر ملا یا لیکن وہ بھی بند تھا۔ انجم کا نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کے بعد جتنے دن بھی سرمد وہاں رہا، وہ مسلسل ماریہ اور راشد کو فون کرتا رہا لیکن کسی سے بھی اس کا رابطہ نہیں ہوا۔

سرمد کی ماں ٹھیک تھی۔ وہ کچھ دن وہاں رہا اور پھر واپس آ گیا۔ فون نہ ملنے پر سرمد اسٹوڈیو آ گیا تھا۔ دائیں بائیں پتا

گئے۔

”تم اچانک آ گئے۔ ماں جی کا کیا حال ہے؟“ راشد کے اندر گھبراہٹ تھی۔

”وہ ٹھیک ہیں اس لیے جلدی آ گیا۔ تمہارا موبائل فون بند ہے۔“

”آج کام نہیں تھا کل دو دن کے لیے آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔“

”اس سے پہلے بھی تمہارا نمبر بند تھا۔“

”ہاں وہ میں نے سم بدل لی تھی۔ نیا نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”خیر چھوڑ دیا۔ بتاؤ کہ ماریہ کا نمبر کیوں بند ہے۔“

”ماریہ کا نمبر بند ہی ہوگا۔“ راشد نے یکدم اپنی آنکھیں گھما کر کہا۔

”کیوں۔“ سرمد نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا

”کیونکہ اس نے تمہارے جانے کے بعد شادی کر لی اور غائب ہو گئی۔“ راشد نے ڈھیلا سامنہ بنا کر کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ سرمد نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں وہی کہہ رہا ہوں جو ہوا ہے۔“ راشد بولا۔

”کس سے شادی کی اس نے اور کیوں؟“ سرمد کو اس کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اتنا پتا ہے کہ اس نے کسی سے شادی کر لی ہے۔ کوئی بزنس مین ہے۔ وہ کون ہے میں نہیں جانتا۔“ راشد سوچتے ہوئے بولا۔

”تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔“ سرمد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ چاہو تو ابھی انجم کے پاس چلے جاتے ہیں اور اس سے پوچھ لو۔ جس کا

اس نے راتوں رات فلیٹ خالی کر دیا تھا۔ وہ بے چاری اس کی منتیں کرتی رہ گئی لیکن ماریہ نے ایک بھی اس کی نہیں سنی تھی۔“ راشد کا لہجہ پُر اعتماد تھا۔

سرمد کے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی۔ اس کا دل بے چین ہو گیا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان کی باتیں آہستہ

آواز میں ماریہ کے بند کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔ کچھ باتوں کی اسے سمجھ آرہی تھی اور کچھ باتوں کا بالکل پتا نہیں

چل رہا تھا۔ جلدی میں ماریہ کے ہاتھ اتنی مضبوطی سے نہیں بندھ سکے تھے اس لیے ماریہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کے

ہاتھ کسی طرح سے آزاد ہو جائیں۔

”میں چیز انکال کر لاتا ہوں۔“ راشد نے پیزا اٹھاتا

چاہا۔

”نہیں مجھے کچھ نہیں کھانا ہے۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو۔“ سرمد کھڑا ہو گیا۔

”کہاں چلنا ہے؟“ راشد نے پوچھا۔

”انجم سے جا کر پوچھتے ہیں۔“ سرمد بولا۔ ”اسے پتا ہوگا۔“

”چلو ابھی اس کے پاس چلے جاتے ہیں۔“ راشد کھڑا ہو گیا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے جلدی سرمد کو لے کر

نکل جائے۔ ان کے چلنے کی آواز اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ماریہ کوشش کر رہی تھی کہ وہ کسی طرح سے

اپنے ہاتھ آزاد کرانے میں کامیاب ہو سکے۔ ایک بھی اس کا ہاتھ آزاد ہو جائے تو وہ اپنے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکال کر

چب سکتی تھی۔

سرمد اچانک اس کمرے کے دروازے کے پاس رک گیا جہاں ماریہ قید تھی۔ سرمد نے پوچھا۔

”ماریہ کا کوئی رشتہ دار بھی تھا، کیا نام تھا اس کا؟“

”وہ اس کا سوتیلایا ماموں تھا۔ اسی نے تو ماریہ سے جان چھڑائی تھی۔ وہ اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ وہ خود ایک

معمولی لائٹ مین تھا۔ جیسے ہی ماریہ اپنے کام میں سیٹ ہوئی وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔“ راشد کہہ کر مین دروازے کی

طرف بڑھا۔ سرمد بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ ماریہ کے بندھے ہوئے ہاتھ سرعت سے حرکت کر رہے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے میں ناکام رہی تھی۔

باہر نکل کر راشد نے مین دروازے اور گیٹ کو اچھی طرح سے مقفل کر دیا۔ سرمد کی کار باہر کھڑی تھی۔ دونوں کار

میں سوار ہو گئے اور سرمد نے کار آگے بڑھا دی جبکہ ماریہ ایک ہاتھ آزاد کرانے کے بعد اپنا دوسرا ہاتھ بھی آزاد

کر اچکی تھی اور اب وہ اپنے پیردوں کی رسی کھول رہی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی کوشش بے سود گئی ہے کیونکہ سرمد

جاچکا تھا۔ اُسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ راشد نے بھی گھر سے نکل کر سکھ کی سانس لی تھی۔ گاڑی انجم کے بیوی پارلر کی

طرف جارہی تھی اور راشد کی انگلیاں اپنے موبائل فون پر برق رفتاری سے حرکت کر رہی تھیں، وہ انجم کو سچ لکھ رہا تھا۔

☆☆☆

راشد اپنا بندوبست پہلے ہی کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب سرمد واپس آئے گا تو وہ ماریہ کو تلاش کرے گا اور اس کی

تلاش انجم تک بھی جائے گی۔ اس لیے اس نے انجم کو پہلے

ہی آگاہ کر دیا تھا کہ اگر سرد اس کے پاس ماریہ کے بارے میں جاننے کے لیے آیا تو اسے کیا جواب دینا ہے۔ مزید اس نے اپنے موبائل فون سے اسے پیغام بھیج کر ہوشیار کر دیا تھا۔

انجم جبیں اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس نے راشد کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر ماریہ کو نکال تو دیا تھا لیکن اس کی کمی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ جتنی جلدی ماریہ نے اپنے کام پر عبور حاصل کر کے انجم کا تقریباً سارا کام سنبھالا ہوا تھا، وہ صلاحیت اس کی کسی دوسری شاگرد میں نہیں تھی اس لیے انجم کو ایک پچھتاوا بھی تھا۔

انجم ان دونوں کو..... ایک کمرے میں لے آئی۔ سرد نے پوچھا۔ ”ماریہ کہاں ہے؟“

”مجھے معلوم نہیں ہے۔ وہ مجھے اچانک چھوڑ کر چلی گئی تھی۔“ جھوٹ بولتے ہوئے انجم کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”اچانک وہ کیسے جاسکتی ہے؟“ سرد سوچنے لگا۔ ”سنا ہے کہ اس کا کسی بڑے کاروباری شخص کے ساتھ تعلق تھا۔“ انجم نے جھجکتے ہوئے راشد کا بتایا ہوا جھوٹ اپنی زبان پر لا کر سرد کی طرف دیکھا۔ سرد کے چہرے پر ایک تغیر آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ گزر گیا۔

”مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ ایسا بھی کر سکتی ہے۔ میرا دل ان باتوں کو ماننے سے انکاری ہے۔“ سرد بولا۔

”لیکن حقیقت یہی ہے۔“ راشد نے اس کا شک دور کرنے کے لیے کہا۔

انجم خاموش اپنے ہاتھوں کی انگلیاں... اضطرابی کیفیت میں دوبارہ تھی۔ سرد غیر محسوس انداز میں انجم کی اس حرکت کو دیکھ رہا تھا۔

”ماریہ ایسی نہیں ہے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھے تم دونوں کی باتوں پر یقین نہیں ہے۔“ سرد کا ٹھوس لہجہ دونوں کے لیے گھبراہٹ کا باعث بن رہا تھا۔ ”کیا ماریہ نے آپ سے خود یہ کہا تھا کہ وہ شادی کرنے جا رہی ہے؟“

انجم اس سوال سے گھبرا گئی۔ ”اس کے جانے کے بعد انواہیں گردش کر رہی تھیں۔“ انجم کو سمجھ نہ آئی تو اس نے یہی جواب دے دیا۔ جبکہ راشد چاہتا تھا کہ وہ ٹھوس جواب دے۔

”تم وہ بات بتاؤ جب تم نے اس سے جانے کی وجہ بار بار جانا چاہی تو اس نے کیا کہا تھا کہ وہ اپنا گھر بے سار ہی ہے۔ تم نے اس سے کہا کہ تمہاری شادی سرد سے ہونے والی

سناط

ہے تو اس نے کیا جواب دیا تھا... بتاؤ۔ چھپا کیوں رہی ہو؟“ راشد نے گویا انجم کو کہنے کے لیے ہموار راستہ دینے کی کوشش کی۔

انجم پر گھبراہٹ غالب تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے جلدی میں وہ بولی۔ ”اس نے کہا تھا کہ... وہ جانا چاہتی ہے اور شادی کرنا چاہتی ہے۔“

سرد نے محسوس کیا کہ انجم کے الفاظ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں بھی بے چینی تھی اور چہرہ بھی گھبراہٹ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سرد ایک لکھاری تھا۔ دوسروں کو اپنی نظر سے جانچنے کا معیار عام لوگوں سے اس کے اندر زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے مزید سوال کرنے کے بجائے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے جانا چاہیے۔۔۔۔۔ فی الحال مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے۔ آؤ راشد میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔“ سرد اپنی جگہ سے اٹھا۔

”میں کچھ دیر اپنے آفس رکوں گا۔ میں شام کو آؤٹ ڈور کے لیے جا رہا ہوں۔ اب آیا ہوں تو آفس سے اپنا کچھ سامان لے جاؤں۔“ راشد کہتا ہوا اٹھا اور اس کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ دونوں چلتے ہوئے کار تک پہنچے پھر راشد نے ہاتھ ملایا اور ایک طرف چلا گیا۔ انجم کا بیوٹی پارلر اسٹوڈیو کے پاس ہی ایک بڑے پلازہ میں تھا۔ اس لیے راشد پیدل ہی اپنے آفس کی طرف چلا گیا۔

سرد اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھا ماریہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی لڑکی سے محبت کی تھی اور اس کا ذکر اس نے اپنی ماں سے بھی کر دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ماریہ کو ان سے ملوانے کے لیے لے کر آئے گا۔ اس کی ماں یہ سن کر بہت پرجوش ہو گئی تھی۔

سرد کو کچھ شک تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے جس پر راشد اور انجم پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنے اس تجسس کو ختم کرنے کے لیے وہ انجم سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا۔ اس لیے دس منٹ تک اپنی کار میں بیٹھا رہنے کے بعد سرد باہر نکلا اور انجم کے بیوٹی پارلر کی طرف چل پڑا۔

سرد جیسے ہی اس کے بیوٹی پارلر میں داخل ہوا تو ملازمہ نے بتایا کہ وہ اپنے آفس میں بیٹھی ہے۔ سرد اس کے آفس کی طرف چلا گیا۔ اس کے آفس میں پہلے ایک کالے شیٹے والا دروازہ آتا تھا اور پھر ایک مختصر سی راہداری عبور کرنے کے بعد سامنے دکھائی دینے والا دروازہ انجم کے آفس کا تھا۔ سرد جیسے ہی دروازہ کھول کر راہداری میں داخل ہوا، انجم کے آفس کا تھوڑا سا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے انجم

کی تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہی تھی۔
 ”میں نے ماریہ پر ظلم کیا ہے۔ اور یہ ظلم تم نے کرایا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں نے اسے اپنے قلیٹ اور نوکری سے نکالا۔ تمہارے کہنے پر میں نے سرمہ سے جھوٹ بولا کہ اس نے کسی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔“

”میں نے کون سا ظلم کرایا ہے؟“ راشد کی بے پروا آواز آئی کیونکہ وہ سرمہ سے الگ ہوتے ہی پلازہ کی دوسری طرف واقع دروازے سے انجم کے بیوٹی پارلر میں پہنچ گیا تھا۔ ”جب میں نے اسے کہا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو اس نے انکار ہی نہیں کیا بلکہ مجھے کہا کہ وہ سرمہ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی اور جب سرمہ اپنے گاؤں گیا تو مجھے موقع مل گیا اور اس کے ساتھ مجھے یہ بھی موقع مل گیا کہ تم اپنے عاشق کے ساتھ میری نظر میں آگئی تھیں اور چپ رہنے کی تم سے میں نے تھوڑی سی قیمت وصول کی ہے۔ اگر تم میری بات کا انکار کر دیتیں تو میں تمہارے شوہر کو بتا دیتا کہ تمہارا چکر کس کے ساتھ چل رہا ہے۔“

”جانے وہ کسے منوس لمحے تھے جب مجھ سے وہ غلطی ہوئی تھی۔ اور اس غلطی کی میں نے توبہ بھی کر لی ہے۔ میں نے اپنے اس تعلق کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ لیکن ماریہ جیسی معصوم لڑکی مجھے شاید پھر بھی نہ ملے۔“ انجم شاید رودی تھی۔

”اب رونا دھونا بند کرو۔ اب تمہیں کوئی جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ سرمہ اب دوبارہ تم سے پوچھنے کچھ نہیں آئے گا۔ ماریہ میرے گھر میں ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔ وہ باہر نہیں نکل سکتی، اس کی آخری سانس میرے اس گھر سے ہی نکلے گی اس لیے تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن تم سرمہ کے سامنے بہت گھبرا گئی تھیں۔ تمہاری کوئی بھی غلطی میرے لیے مصیبت بن سکتی تھی۔ آئندہ اگر سرمہ تمہارے پاس آئے تو ہوشیار رہنا ورنہ تمہاری ازدواجی زندگی برباد ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔“ راشد نے کہا۔

”میرا دل چاہتا ہے میں سرمہ کو سب کچھ بتا دوں۔“
 ”اگر تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو یاد رکھنا تمہارے شوہر کو جو کچھ میں بتاؤں گا، تمہارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں مجھے جان سے ہی مار دوں۔ نکل کرنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔“ راشد کا لہجہ انتہائی سفاک ہو گیا تھا کہ انجم کانپ کر رہ گئی۔ سرمہ کے علم میں جو کچھ آیا تھا وہ اس کے

لیے بہت حیران کن تھا۔ وہ ایک لکھاری تھا۔ اپنی کہانی میں کب کیا کرتا ہے، وہ خوب جانتا تھا۔ اس وقت زندگی کے قرطاس پر اس کی حقیقی کہانی بکھری ہوئی تھی۔ اس کہانی کو سمیٹنا کس طرح ہے اس نے ایک لمحے میں سوچا اور اس جگہ سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

رات دس بجے راشد اپنے یونٹ کے ساتھ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کی واپسی کل رات کسی وقت تھی۔ جانے سے پہلے راشد نے گھر کی ایک ایک چیز دیکھی تھی۔ مین دروازے اور گیٹ کو اچھی طرح سے مقفل کیا تھا۔ ماریہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ خوب کھائے پیے اور اس گھر میں جہاں چاہے سو جائے۔ ماریہ کے لیے وہ گھر ایک جیل تھی اور وہ جانتی تھی کہ اس جیل سے فرار اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

جب راشد اپنے یونٹ کے ساتھ بس میں سوار ہو رہا تھا تو سرمہ ایک ایسی جگہ پر براجمان تھا جہاں سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی ان کی کوسٹراس جگہ سے روانہ ہوئی، سرمہ تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھا اور کار میں بیٹھتے ہی وہ سیدھا راشد کی کالونی پہنچ گیا۔ سرمہ کی کار اس کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ کار سے باہر نکلتے ہی سرمہ نے ڈرائیور سے کہا۔

”تم جاؤ۔ جب میں فون کروں تو اسی جگہ آ جانا۔“

ڈرائیور چلا گیا اور سرمہ چلتا ہوا راشد کے مکان تک پہنچ گیا۔ باؤنڈری وال کافی اونچی تھی۔ سرمہ نے دائیں بائیں دیکھا۔ دور تک ہو کا عالم تھا۔ جہاں جہاں کوئی گھر بنا تھا وہاں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ورنہ ہر طرف اندھیرا تھا۔ سرمہ بھی اندھیرے کا حصہ لگ رہا تھا۔ اس کالونی کا واحد چوکیدار جانے کہاں لینا نیند کے مزے لے رہا تھا۔

وہ اس گھر کے عقب میں آ گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک پلاٹ کی بنیادیں بنی ہوئی تھیں اور کچھ انٹیں بھی بچی پڑی تھیں۔ سرمہ نے وہاں سے انٹیں اٹھا کر اس گھر کی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھنا شروع کر دیں۔ اب وہ انٹیوں کی ڈھیری کی مدد سے اوپر چڑھ سکتا تھا۔ سرمہ نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک جست لگائی اور دیوار کے اوپر چڑھ کر دوسری جانب کود گیا۔ کچھ دیر وہ رک کر جائزہ لیتا رہا۔ سرمہ نے کھڑکی کی گرل کو پکڑا اور اس کی مدد سے اوپر چڑھنے لگا۔ وہاں سے اس نے پرنا لے کو ہاتھ ڈالا اور پھر اوپر کی منزل کی کھڑکی آگئی اور وہاں سے چڑھتا ہوا وہ گھر کی چھت تک پہنچ گیا۔ گھر کی چھت کشادہ تھی۔ سیزھیوں پر لکڑی کا مضبوط

بساط

عزت سے رہنے کے لیے اس سے شادی کرلوں۔ کیونکہ اس نے یہ بتایا تھا کہ آپ نے بھی شادی کر لی ہے اور۔۔۔ مجھے ساتھ ان کی ضرورت تھی۔“

”میں جان گیا ہوں کہ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے بساط بچھا کر ہم سب کو مہروں کی طرح استعمال کیا ہے۔“

”اب آپ مجھے اس جگہ سے لے جائیں۔ میں اس ظالم کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔“

سرم نے سوچا اور بولا۔ ”راشد کتنا کھانے پینے کا راشن دے کر گیا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ پانچ، سات دن کا ہے۔ ایک درجن کے قریب دودھ کے ڈبے ہیں، پھل ہیں، کھانے پکانے کے لیے گوشت، دال اور سبزی بھی ہے۔ میرے زخموں پر لگانے کے لیے مرہم پٹی کا سامان بھی ہے۔ وہ مجھے جنونی، پاگل اور نفسیاتی مریض لگتا ہے۔“ ماریہ نے بتایا۔

”جس طرح یہ گھر بند ہے اسے پورا یقین ہے کہ تم اس گھر سے بھاگ نہیں سکتیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ تم اس گھر سے بھاگ نہیں سکتی ہو۔ تم اطمینان سے اس خوبصورت جیل میں رہو۔ کھاؤ پیو۔ اپنی مرہم پٹی جاری رکھو۔ تم اس گھر سے تب ہی باہر آؤ گی جب وہ مرے گا۔“

ماریہ یکدم چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”وہ مرے گا تو ہم ایک ہوں گے۔ تمہیں یہاں سے نکال کر لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ تم اس کی بیوی ہو، بس تم میرا ساتھ دو پھر دیکھنا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اگر وہ پاگل جنونی ہے تو میں بھی ایک رائٹر ہوں۔ اس کی بچھائی ہوئی بساط پر اب چال میری ہوگی۔“

سرم نے اپنے کوٹ کی جیب سے موبائل فون نکال کر اس کے اندر موجود سارے نمبر ڈیلیٹ کر دیے اور ایک نمبر سید کر دیا۔ ”اس موبائل فون میں میرا وہ نمبر ہے جو میں گاؤں لے کر گیا تھا۔ میرا یہ نمبر کسی کے پاس نہیں ہے۔“

موبائل فون میں نے سائیلنٹ پر لگا دیا ہے۔ اسے تم کہیں چھپا کر رکھنا۔ اور جیسے ہی راشد واپس آئے مجھے سچ کر دینا۔

اس کے بعد ہماری بات میسر کے ذریعے سے ہوگی۔ وہ چالاک ہے۔ بتا کر دو دن کا گیا ہے لیکن ان کی شوٹنگ کا شیڈول پانچ دن کا ہے۔ ان پانچ دنوں میں تمہارے چہرے پر پڑی لالی بھی ختم ہو جائے گی۔ اور پھر ایک نیا کھیل شروع ہوگا۔“

”آپ کیا کرنے والے ہو؟“ ماریہ نے پوچھا۔

”میں راشد کو جان سے مار دوں گا۔“

دروازہ تھا جو اندر سے بند تھا۔ سرم نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے کچھ اوزار نکالے اور دروازے کے لاک پر کچھ زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ بیس منٹ تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے دروازے کا لاک کھول لیا تھا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ اوپر والی منزل کھل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

نیچے لاؤنج میں روشنی تھی۔ سرم نیچے چلا گیا۔ اس نے بغیر آواز نکالے ایک ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر اسٹور کے پاس پہنچ گیا۔ خالی کمروں کو دیکھ کر سرم پریشان ہو گیا تھا کہ اگر ماریہ اس گھر میں ہے تو پھر وہ کہاں ہے؟

اس نے اسٹور کا دروازہ کھولا تو اسے ایک ہیولا سا دکھائی دیا اور اس ہیولے نے بھی فوراً حرکت کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سرم نے اپنی ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی تو وہ چونک گیا۔ ماریہ کا زخمی چہرہ اس کے سامنے تھا اور ماریہ روشنی کی وجہ سے یہ نہیں دیکھ پا رہی تھی کہ آنے والا کون ہے۔ اس کی دانست میں یہی تھا کہ راشد کہیں نہیں گیا تھا وہ پھر واپس آ گیا ہے۔

سرم نے جن تلاش کر کے اسٹور میں روشنی کر دی تو ماریہ یکدم چونک پڑی۔ اس کے سامنے سرم کھڑا تھا۔

☆☆☆

ماریہ کی حالت دیکھ کر سرم کو بہت دکھ ہوا تھا۔ جب ماریہ نے تمام واقعات سرم کو بتائے تو اسے رنج کے ساتھ ساتھ راشد پر بھی شدید غصہ آیا۔ اگر اس وقت راشد اس کے سامنے ہوتا تو شاید وہ اسی وقت راشد کو موت کے منہ میں دھکیلنے سے بھی گریز نہ کرتا۔

سرم جو کام بھی کرتا تھا وہ سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔ وہ اپنے غصے پر بہت جلد قابو پالیتا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسی وقت راشد کو پکڑ لیتا جب اس نے راشد اور انجم کے مابین ہونے والی گفتگو سنی تھی۔ سرم اس طرح سے اپنا کام کرنا چاہتا تھا کہ راشد بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے اور ماریہ پر بھی کوئی آنچ نہ آئے۔

”راشد نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ اس کے دل میں چور تھا۔ مجھے اس کا اندازہ ہوتا تو میں اس سے بھی بات بھی نہ کرتا اور اس پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا ذاتی نمبر دے کر اس کے ذمے یہ کام بھی نہ لگاتا کہ وہ یہ نمبر تمہیں پہنچا دے۔“ سرم نے نفرت سے کہا۔

”سرم میں نے جو کچھ بھی آپ کو بتایا ہے، وہ سچ بتایا ہے۔ اس نے کھیل ہی ایسا کھیلا تھا کہ میں مجبور ہو گئی تھی کہ

”اس طرح آپ پکڑے جائیں گے اور میں پھر تنہا رہ جاؤں گی۔“

”اگر میں ہی پکڑا گیا تو پھر میرا یہ دماغ کسی کام کا نہیں۔“ سرمد بولا۔ ”دیکھو میں اوپر چھت کا دروازے کا لاک توڑ کر آیا ہوں۔ اس کے گمان میں بھی نہیں ہوگا اس لیے اس کا دھیان اس طرف نہیں جائے گا۔ میں اسی راستے سے آؤں گا اور تم میرے رابطے میں رہو گی لیکن یاد رہے کہ موبائل فون کا پتہ راشد کو نہ چلے۔“ راشد نے تاکید کی۔

”میں احتیاط کروں گی۔“ ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

سرمد اپنی جگہ سے اٹھا اور مستلاشی نگاہوں سے ایک کے بعد ایک کمرے میں جانے لگا۔ پھر وہ راشد کے بیڈروم سے موبائل فون کا چارجر لے آیا۔ وہ چارجر ماریہ کو دے کر بولا۔ ”یہ چارجر اس موبائل فون کو لگ جائے گا۔ اسے یہاں چھپا دینا۔“

اس کے بعد سرمد نے کچھ ہدایات دیں اور جس راستے سے وہ آیا تھا اسی راستے سے چلا گیا۔ ماریہ کا چہرہ اب مطمئن تھا۔

☆☆☆

تین دن گزر گئے تھے۔

ان تین دنوں میں ماریہ نے بے فکری سے کھایا تھا اور اپنی مرہم مٹی باقاعدگی سے کی تھی جس سے اس کے چہرے پر آئے نسل اور زخم کے نشان تقریباً ختم ہو گئے تھے جبکہ زخمی سر بھی بہت حد تک ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے جسم میں طاقت اور توانائی بھی آگئی تھی۔ ماریہ بے فکر پورے گھر میں گھومتی تھی۔

سرمد کو بے چینی سے راشد کے آنے کا انتظار تھا۔ چوتھے دن اسے پتا چلا کہ رات کو راشد کا یونٹ واپس آ رہا ہے۔ اسی دوپہر کو سرمد اپنی پروڈکشن کمپنی کے آفس میں بیٹھا تھا۔ اس وقت بھی ان کا ایک سیریل بڑی کامیابی سے نکل وڈن پر دکھایا جا رہا تھا۔ جس طرح سے اس سیریل کو پذیرائی ملی تھی، ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ کہانی کے اختتام میں تبدیلی لاتے ہوئے اسے چوٹا دینے والا بنادیں۔

اس بارے میں ان کی بات چیت ہو رہی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچے تو سرمد نے کہا۔

”میں آخری قسط میں کمال کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی قسط لکھنا چاہتا ہوں کہ ہماری یہ ڈراما سیریل اپنے اختتام کی وجہ

سے مدتوں یاد رکھی جائے اور یادگار سیریل بن جائے۔ اس کے لیے مجھے آپ کا وہ گھر چاہیے جو آپ نے اپنے آرام و سکون کے لیے الگ تھلک بنایا ہے۔ مجھے وہاں سوائے چوکیدار کے کوئی اور بندہ نہیں چاہیے۔ تاکہ میرے کام میں کوئی مداخلت نہ کرے۔“

پروڈیوسر نے کہا۔ ”وہ گھر آپ کا ہے۔ کب جانا چاہو گے؟“

”آج اور اسی وقت۔ میرا کسی سے فون پر رابطہ نہیں ہوگا۔ میرے دماغ میں بہت کچھ گھوم رہا ہے، چاہتا ہوں کہ بالکل تنہائی میں اپنی سوچ کو صفحہ قرطاس پر بکھیر سکوں۔“

”میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ ایک زبردست چیز لکھیں گے۔“ سیریل کا پروڈیوسر خوشی سے پھولے نہیں سارہا تھا۔

سرمد اسی وقت واپس اپنے فلیٹ میں گیا۔ اپنا ایک بیگ اور لیپ ٹاپ لے کر ڈرائیور کے ساتھ اس خوبصورت گھر میں پہنچ گیا۔

جس جگہ وہ گھر تھا، وہ شہر سے الگ تھلک ایسی کالونی تھی جہاں بڑے لوگوں نے کبھی کبھار آنے اور رہنے کے لیے گھر اور فارم ہاؤس بنائے ہوئے تھے۔ اکثر ان گھروں میں چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ وہ بڑی وسیع اور خوبصورت کالونی تھی۔ وہاں ایک مصنوعی جھیل بھی تھی۔

جس گھر میں سرمد رہ کر لکھتا چاہتا تھا، وہ گھر وسیع اور خوبصورت تھا۔ اس گھر کے اندر ایک لان اور ساتھ سوننگ پول تھا۔ گھر کے کمرے کشادہ اور خوبصورت فرنیچر سے آراستہ تھے۔ وہ گھر جس جگہ واقع تھا، اس کے عقب میں کالونی کی ہاؤنڈری وال تھی جس کی اونچائی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کالونی میں دن کو دو اور رات کو تین چوکیدار ہوتے تھے۔ رات کو دو چوکیدار مین گیٹ کے پاس اپنے کمرے میں موجود رہتے تھے جبکہ ایک کالونی کا گشت کرتا تھا۔ جب وہ گشت کر کے واپس آ جاتا تو دوسرا چوکیدار گشت کے لیے نکل جاتا تھا، اس طرح وہ ساری رات باری باری کالونی میں گشت کرتے رہتے تھے۔

سرمد کے پروڈیوسر نے اپنے ملازم کے ذریعے۔۔۔ اس گھر کا فرنیچر پھلوں اور کھانے پینے کے دوسرے سامان سے بھر دیا تھا۔ سرمد نے اپنے ڈرائیور کو جانے کا کہہ دیا تھا۔ اس کا ڈرائیور اس کے گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اور سرمد کے باپ کے پرانے وفادار کا بیٹا تھا۔

سرمد نے گھر کے چوکیدار کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ ”اس

میں دروازے کے اندر تمہیں آنے کی اجازت نہیں ہے۔
میں ذرا بھی شور اور آمد و رفت برداشت نہیں کروں گا کیونکہ
مجھے لکھنے کے لیے یکسوئی اور تہائی درکار ہے۔ تمہیں کھانے
پینے کا جو سامان چاہیے تم ابھی لے جاؤ۔“

”صاحب میرے کمرے میں فریج اور کھانے پینے کا
سامان موجود ہے۔“ چوکیدار نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ جب تک میں تمہیں آواز نہ دوں، تم نہیں
آؤ گے۔“ سرد نے تاکید کی۔

”بہت بہتر جناب۔“ وہ ہاتھ باندھ کر بولا اور چلا گیا۔
سرد نے اپنا سامان ایک کمرے میں رکھا اور اوپر جا کر
چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ وہ اس گھر میں پہلے بھی گئی بار
آچکا تھا۔ سرد گھر کے عقب کی جانب دیکھنے لگا۔ نہر کے
کنارے ایسا درخت کافی اونچے تھے اور ان کی شاخیں
اس کالونی کی باؤنڈری وال تک بھی آتی تھیں۔ ایک
درخت تو اس کالونی کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس کی شاخیں
عین اس گھر کے عقب میں باؤنڈری وال پر پڑی ہوئی
تھیں۔

اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد سرد نیچے آیا اور اس
نے ماریہ کو فون کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماریہ نے فون
اٹھایا۔

”راشد آج کسی بھی وقت پہنچ رہا ہے۔ وہ جو بتاتا ہے
وہ کرتا نہیں ہے اور...“

ماریہ نے اس کی بات کاٹ دی اور سرگوشی کے انداز
میں بولی۔ ”راشد گھر پہنچ چکا ہے۔“

”کیا...؟“ سرد کو سنتے ہی حیرت ہوئی۔ ”لیکن اس کا
یونٹ تو ابھی تک واپس نہیں آیا... راشد ان سے پہلے نکل
آیا ہوگا۔“ سرد نے خود ہی سوال کر کے سوچتے ہوئے
جواب دیا۔

”وہ مست ہاتھی کی طرح پورے گھر میں گاتا پھر رہا
ہے۔“

”میں فون بند کر رہا ہوں۔ مجھے تم سچ کرتی رہنا۔“
سرد نے کہہ کر فون بند کر دیا اور اس کے بارے میں سوچتے
لگا کہ وہ واقعی شاطر تھا۔

☆☆☆

راشد نے یونٹ سے بہانہ کیا تھا کہ اس کے عزیز اس
شہر میں رہتے ہیں اس لیے وہ ان سے مل کر آئے گا۔ لیکن
راشد کا اس شہر میں کوئی عزیز نہیں رہتا تھا۔ جب سب لوگ
دوپہر کا کھانا کھانے کی تیاری میں تھے اور دوپہر کے کھانے

بساط کے بعد وہ نکلنے والے تھے تب راشد نے ٹیکسی لی اور اپنے
شہر کی طرف سفر شروع کر دیا۔

ابھی اس کا یونٹ واپس بھی نہیں آیا تھا اور راشد اپنے
گھر بھی پہنچ چکا تھا۔ اس نے آتے ہی پیار بھرے لہجے میں
آواز دی تھی۔

”ماریہ ڈارلنگ... آئی ایم بیک... کہاں ہو تم...؟“
میری پیاری ماریہ... میرے سامنے آ جاؤ...“

ماریہ اسٹور میں تھی۔ وہ جلدی سے بھاگ کر اس کے
سامنے آ گئی۔ راشد نے اس کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ
گیا۔

”یہ تم ہی ہو ماریہ... تمہارے چہرے کے زخم کہاں
گئے ہیں؟ تم تو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو۔“
راشد اس کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کے
پاس چلا گیا اور پھر بولا۔ ”مار کھانے کے بعد تم تو اور بھی
خوبصورت ہو گئی ہو۔ آج تمہیں تھوڑے سے اور زخم بند
دوں؟ مجھے کسی کو اذیت دینے میں مزہ آتا ہے اور زخموں کے
بعد تمہارا حسن اور بھی گھر جائے گا۔“

ماریہ اس کی بات سن کر گھبرا گئی۔ یکدم راشد کھلکھلا کر
ہنس پڑا۔ اور پھر بولا۔ ”گھبراؤ نہیں میں مذاق کر رہا تھا۔
اب میں تمہیں کوئی اذیت نہیں دوں گا بلکہ آج میں تمہیں اس
اسٹور سے اپنے بیڈروم میں لے جاؤں گا۔“

ماریہ کے چہرے پر گھبراہٹ عیاں تھی اور وہ کبھی دائیں
بائیں دیکھ کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی
تھی۔

”میں نہانے جا رہا ہوں۔ تم میرے لیے چکن بناؤ اور
دیکھو بڑی تسلی سے بنانا۔ وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ شام
کے سواسات بجے ہیں۔ رات نو بجے تک تم کھانا تیار کر لو۔
تب تک میں نہاؤں گا، ٹی وی دیکھوں گا اور کچھ آرام بھی
کروں گا۔“ راشد نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے
دیکھا اور پھر باہر چلا گیا۔ اس نے تسلی کی کہ گیٹ اچھی طرح
سے مقفل ہے۔ پھر اس نے مین دروازے کو بھی لاک کر دیا
اور چابی اپنے ساتھ بیڈروم میں لے گیا۔

ماریہ اس جگہ کھڑی رہی۔ جب اسے تسلی ہو گئی کہ راشد
باتھ روم میں چلا گیا ہے تو وہ اسٹور میں چلی گئی اور جس جگہ
اس نے موبائل فون چھپا کر رکھا تھا، وہ نکالا اور جلدی سے
راشد کو میسج کر کے اسے صورتحال سے آگاہ کیا اور موبائل
فون پھر اسی جگہ رکھ دیا۔

ماریہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا خوف سے اس کی چیخ نکل

گئی۔ سامنے کندھے پر تولیا رکھے راشد کھڑا تھا۔

”کیا ہوا؟ مجھے دیکھ کر ڈر گئی ہو؟“

”اچانک... آپ کو دیکھا تو ڈر گئی۔“ ماریہ کی سانس پھول چلی تھی اور اس نے بمشکل فقرہ کھل کیا۔

”میں نے تمہیں کھانا تیار کرنے کو کہا تھا، تم اسٹور میں کیا کرنے گئی تھیں؟“ راشد کا لہجہ خشک اور آنکھیں ماریہ کے چہرے پر گھوم رہی تھیں۔

ماریہ خوف سے بولی۔ ”میں... وہ کچن میں ہی جا رہی تھی۔“ ماریہ سے کوئی بہانہ نہیں بن پایا تھا۔

”اندر ہے کیا؟“ راشد نے یہ کہتے ہوئے ماریہ کو کندھے سے ایک طرف دھکیلا اور اسٹور کے اندر چلا گیا۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔

ماریہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اپنی تسلی کرنے کے بعد راشد باہر آ گیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”جاؤ اور کھانا تیار کرو۔“

ماریہ کچن کی طرف چلی گئی اور راشد ایک بار پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

سرمہ نے اپنا کوٹ اتار کر چڑے کی سیاہ جیکٹ پہنی اور اندرونی جیبوں میں کچھ چیزیں رکھ کر کھڑکی کی طرف گیا اور تھوڑا سا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ اس گھر کا چوکیدار اپنے کیمین میں موجود تھا۔ دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔

سرمہ نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کیا اور کھڑکی کے راستے باہر نکل آیا۔ اس نے ایک جست لگائی اور باؤنڈری وال سے دوسری طرف کود گیا۔ اب وہ گھر کی حدود سے باہر تھا اور کالونی کی باؤنڈری وال کے پاس کھڑا تھا۔ پہلے اس نے رک کر جائزہ لیا اور وقت ضائع کیے بغیر کالونی کی باؤنڈری وال پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔ جہاں سے سرمہ دیوار پر چڑھ کر کودا تھا وہاں جھکے ہوئے درخت کی شاخیں تھیں جس سے وہ بالکل محفوظ تھا۔

کالونی کی باؤنڈری وال کوڈنے کے بعد سرمہ تقریباً بھاگتا ہوا نہر کے ساتھ ساتھ دائیں جانب چلنے لگا۔ کچھ ہی فاصلے پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا پل تھا۔ سرمہ نے وہ پل عبور کیا اور سڑک کی دوسری طرف چلا گیا۔ ٹریفک رواں دواں تھا۔ سرمہ اب پیدل چلنے لگا۔ چلتے چلتے اس نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی اس کے پاس رک گئی۔ وہ اسے جگہ کا بتا کر پیچھے بیٹھ گیا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

جس کالونی میں راشد رہتا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر ہی سرمہ نے ٹیکسی روک لی اور کرایہ ادا کرنے کے بعد پیدل ہی اس جانب چل پڑا۔ سرمہ نے کالونی میں داخل ہونے والے مین گیٹ کے بجائے دوسری طرف جانا شروع کر دیا۔ سرمہ اسی راستے سے کالونی کے اندر داخل ہوا جہاں سے وہ پہلے بھی گیا تھا۔

رات کا اندھیرا تھا۔ راشد کے گھر کے ارد گرد تو کچھ زیادہ ہی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی رکھی انٹیں اسی طرح رکھی ہوئی تھیں۔ سرمہ ان پر چڑھ کر اندر کودا اور پھر اسی راستے سے وہ اوپر چڑھ گیا۔ سیڑھیوں کا دروازہ جیسے اس نے بند کیا تھا وہ اسی طرح بند تھا۔ سرمہ دبے پاؤں نیچے اترنے لگا۔

راشد نے نہاتے ہوئے کافی وقت لے لیا تھا۔ اس دوران میں ماریہ نے سرمہ کی ہدایت کے مطابق مین دروازے کی چابی اٹھا کر جلدی سے مین دروازہ کھول دیا اور چابی اسی جگہ رکھ دی تھی۔ یہ کام کرتے ہوئے ماریہ کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ سارا جسم کانپ رہا تھا۔

پھر آ کے ماریہ کچن میں مصروف ہو گئی۔ راشد تو لیے سے اپنا سر رگڑتے ہوئے باہر نکلا اور وہ گنگنا بھی رہا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جانا چاہا تو اس کا ہاتھ اسی جگہ رک گیا۔

ماریہ جلد بازی اور گھبراہٹ میں کمرے کا دروازہ پوری طرح سے بند کرنا بھول گئی تھی۔ راشد کی کیونکہ اپنی ہر چیز پر نظر ہوتی تھی اس لیے اس نے سوچتے ہوئے گھوم کر اپنے کمرے کی طرف دیکھا اور ایک ایک چیز پر نظر ڈالتے ہوئے جس جگہ اس نے مین دروازے اور گیٹ کی چابی رکھی تھی، اس کی نظر چابیوں پر رک گئی۔

ماریہ نے چابی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اسی جگہ رکھ دی تھی اس لیے غور کرنے کے باوجود راشد کو یہ نہیں پتا چل سکا کہ چابیاں اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہیں لیکن راشد کو یہ یقین تھا کہ ماریہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔

راشد کمرے سے باہر نکلا اور چلتا ہوا کچن کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ ماریہ کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کی پشت پر راشد کھڑا ہے لیکن وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔

”میرے کمرے میں کیا کرنے آئی تھیں؟“ راشد کا کہنا تھا کہ ماریہ کا دل ایسے دھڑکا جیسے اس کے سینے سے باہر نکل آئے گا اور اس کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے پٹی۔ ”مم... میں تو نہیں گئی تھی...“ ماریہ نے گھبرا کر کہا۔

”بابر آؤ۔“ راشد کہہ کر لاؤنج میں چلا گیا۔ ماریہ ڈرتے ڈرتے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”کیا کرنے آئی تھیں میرے کمرے میں؟ گیٹ کی چابی اٹھانے آئی تھیں اور گھبرا کر اٹھا نہیں سکیں اور پھر کمرے سے باہر نکل گئیں؟“

”میں نہیں گئی کمرے میں؟“

”میں چاہتا تھا کہ میں آج تم پر اپنا ہاتھ نہ اٹھاؤں۔ میری خواہش تھی کہ آج صرف رومانس ہو۔ لیکن تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔۔۔“ راشد نے کہا اور پلک جھپکتے اس کا ہاتھ گھوما اور سیدھا ماریہ کے منہ پر جا پڑا۔ ماریہ چیخ کر ایک طرف گر گئی۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ ماریہ اپنی جگہ سے اٹھتی اور راشد کے قدم اس کی طرف بڑھتے یکدم سرمد سیڑھیاں اتر کر سامنے آ گیا۔ ایک دم سرمد کو دیکھ کر راشد کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”تم... یہاں...؟“ حیرت سے راشد کے منہ سے نکلا۔

سرمد نے ماریہ کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور بولا۔ ”اپنا یہ بہتا ہوا خون صاف مت کرنا۔ میں چاہتا تو تمہیں اس تھپڑ سے بچا سکتا تھا لیکن میں خود ایسا چاہتا تھا۔“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ راشد اس کی طرف بڑھا۔ ”تم نے مجھے دھوکا دیا۔ ماریہ سے جھوٹ بولا اور اسے مجبور کر دیا کہ یہ تم سے شادی کر لے۔ میں تمہاری اور انجم کی باتیں بھی سن چکا ہوں۔“ سرمد بولا۔

”کوئی باتیں...؟ کیا بکواس کر رہے ہو؟“ راشد بولا۔ ”میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔“

راشد کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور اس کے پیچھے سرمد نے قدم اٹھائے اور راشد کو دبوج لیا۔ راشد نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے ایک جھٹکا دیا اور سرمد ایک طرف گر گیا۔ راشد نے فوراً سرمد کا بازو پکڑ کر اسے پیچ کر کھڑا کیا اور دوسرے ہی لمحے اس کے منہ پر مٹکا سید کر دیا۔ اس سے پہلے کہ راشد ایک اور حملہ کرتا، سرمد نے اپنی جیکٹ کی جیب سے کور میں موجود خنجر نکالا اور ایک پل میں گھما دیا۔ راشد کی گردن پر ایک نشان نظر آنے لگا تھا اور پھر اس جگہ سے خون کا فوارہ نکلنے لگا۔ راشد تڑپتے ہوئے فرش پر گر گیا۔ سرمد تیزی سے اس کے کمرے میں گیا۔ اس کا موبائل فون تلاش کیا اور ایک نمبر ملا کر ماریہ کی طرف بڑھا۔

”ایمر جنسی پولیس کو کال کی ہے... گھبرا کی اور سرگوشی

بساط کے انداز میں کہو کہ کچھ ڈاکو گھر میں آ گئے ہیں اور انہوں نے میرے شوہر کو دبوجا ہوا ہے۔ پھر یہاں کا ایڈریس بتانا۔۔۔“

اسی اثنا میں موبائل فون سے ایک آواز ابھری اور ماریہ نے بھی گھبرا کی اور تپتی آواز میں کہنا شروع کیا۔

”ہمارے گھر چور گھس آئے ہیں۔ میرے شوہر کی جان کو خطرہ ہے۔۔۔“ دوسری طرف سے ایڈریس پوچھا گیا اور ماریہ نے جلدی سے ایڈریس بتا دیا۔ سرمد نے جب ماریہ سے ملاقات کی تھی تو اس نے یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اس گھر کا کوئی بھی یوٹیلیٹی بل نکال کر اس پر لکھا ہوا ایڈریس اچھی طرح سے یاد کر لے۔ ماریہ نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس لیے اس نے آسانی سے ایڈریس بتا دیا تھا۔

جس وقت ماریہ ایڈریس بتا چکی تھی تو اسی وقت پیچھے سے سرمد نے یکدم ماریہ کی گردن دبوج لی۔ ماریہ کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی گردن کس نے دبوجی ہے اس لیے اس کے منہ سے فطری چیخ نکل گئی۔ سرمد نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ سرمد نے ماریہ کی اس ہلکی سی چیخ سے پولیس کو یہ تاثر دے دیا تھا کہ کسی نے ماریہ کو بھی دبوج لیا ہے۔ راشد فرش پر اوندھا لیٹا مرتی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا۔ اس وقت وہ بہت بے بس اور ناچار تھا۔ اس کی گردن کے ارد گرد فرش پر خون کا تالاب سے بن گیا تھا۔

سرمد نے گیٹ کی چابی لانے کو کہا۔ ماریہ چابی لے کر آئی تو سرمد نے گیٹ کھول کر اس کا چھوٹا دروازہ کھوڑا سا کھول دیا۔ پھر وہ اندر آیا اور ماریہ کو پکڑ کر اس نے اس کے ہاتھ باندھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر اس نے ماریہ کو ایک طرف بٹھا کر کہا۔

”پولیس پوچھے تو کہنا کہ چور تین تھے اور نقاب پوش تھے اس لیے تم نے کسی کا چہرہ نہیں دیکھا۔“

راشد ابھی زندہ تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں مدھم مدھم ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ سرمد کی چال دیکھ رہا تھا۔

سرمد نے پہلے راشد کے کمرے کا سامان بکھیرا، پھر ٹی وی لاؤنج اور اس کے بعد دوسرے کمروں کا بھی سامان بکھیر دیا۔

سرمد نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے ہوئے تھے اس لیے اس نے خنجر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ سرمد نے ماریہ کو پکڑ

کر صوفے کے پیچھے بیٹھا دیا اور اسے کچھ باتیں بتائیں اور مین دروازے کی طرف چل پڑا۔ راشد کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔

سرمہ مین دروازے سے نکل کر گھوم کر پیچھے کی طرف آگیا۔ اس نے جست لگائی اور دیوار پر چڑھا اور یکدم وہ چوٹکا۔ اس کی نظر اچانک اپنی کلائی پر پڑی تھی۔ اس کی کلائی سے گھڑی غائب تھی۔ اس وقت اس نے وہی گھڑی باندھی ہوئی تھی جو اسے ایوارڈ تقریب میں ایک بڑے صنعت کار نے تحفے میں دی تھی۔

سرمہ کے جسم میں بے چینی سی دوڑ گئی اور واپس پلٹا اور ابھی وہ مین دروازے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ باہر پولیس وین رکی اور وین کے اندر سے ایمرجنسی پولیس کے جوانوں کے اترنے کی آواز آنے لگی۔ سرمہ کے لیے اب گھر کے اندر جانا مناسب نہیں تھا وہ واپس اسی دیوار کی طرف بھاگا اور اچانک ٹھوکر لگنے سے گرا اور قلابازی کھا کر وہ اٹھا اور جست لگا کر دیوار پر چڑھ گیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے باہر چھلانگ لگادی۔

ٹھیک اس وقت اس کالونی کا چوکیدار وہاں گشت کرتا ہوا رک گیا تھا اور اچانک پولیس کی وین کو دیکھ کر حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ جیسے ہی سرمہ نے چھلانگ لگائی، اس کی گردن گھومی اور اس نے سرمہ کو گھر سے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا۔ سرمہ کا چہرہ اوجھل تھا۔ سرمہ وقت ضائع کیے بغیر کالونی کی باؤنڈری وال پر چڑھ گیا۔ چوکیدار اسے دیکھ کر چلا یا۔

”جلدی سے ادھر آؤ، اس گھر سے نکل کر وہ بھاگ رہا ہے۔“ چوکیدار کہتے ہی سرمہ کے پیچھے بھاگا۔ سرمہ دوسری طرف کود چکا تھا۔ پولیس کے دو جوان بھی اس طرف بھاگ کر آگئے تھے۔ چوکیدار بھی دوسری طرف کود گیا تھا اور پولیس والوں نے بھی یکے بعد دیگرے دیوار پھلانگ لی تھی۔

سرمہ کے لیے مشکل کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ سر پٹ بھاگ رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس کا چہرہ ان کو دکھائی نہ دے ورنہ سب کچھ بکھر جائے گا۔ سرمہ کے پیچھے چوکیدار اور پولیس والے بھاگ رہے تھے۔ ایک پولیس والے نے فون کان سے لگایا ہوا تھا، وہ جس طرف سرمہ بھاگ رہا تھا، اس سمت کے بارے میں بتا رہا تھا۔

سرمہ کے لیے ان سے بچ کر نکلنا بہت ضروری تھا۔ ایک پولیس وین بھی پیچھے نکل آئی۔

سرمہ کی نظر بھاگتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ وہ موٹر سائیکل کے سوئچ میں چابی لگا کر اسے اسٹینڈ سے اتارنے ہی والا تھا کہ سرمہ نے اس کے پاس جاتے ہی اسے زور سے ایک طرف دھکا دیا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اسے اشارت کیا اور پوری رفتار سے موٹر سائیکل آگے بڑھادی۔ چوکیدار اور دونوں پولیس والے بھی وین میں سوار ہو گئے تھے اور سرمہ کا تعاقب ہو رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق تھی اس لیے سرمہ بڑی مہارت سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔

جیسے ہی وہ اس کالونی کے پاس پہنچا جہاں وہ اپنے پروڈیوسر کے گھر میں مقیم تھا، اس نے موٹر سائیکل ایک طرف چھوڑی اور سر پٹ بھاگتا ہوا کالونی کے باؤنڈری وال پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔

پولیس وین بھی اس جگہ پہنچ گئی تھی۔ سرمہ کو دیوار کودتے ہوئے انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی دیوار کود گئے۔ لیکن اس اثنا میں سرمہ اپنے گھر کی دیوار چڑھ کر اندر داخل ہو چکا تھا اور وہ کھڑکی کے راستے اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔

سرمہ نے جلدی سے اپنے کپڑے بدلے۔ ان کو ایک بڑے شاپر۔۔۔ میں ڈال کر اس نے وہ شاپر ایک محفوظ جگہ پر رکھا اور خود باتھ روم میں چلا گیا۔ ☆☆☆

ایمرجنسی پولیس کی وین سے کالی وردیوں میں ملبوس نوجوان باہر نکلے جن کی جیکٹوں کی پشت پر لکھا ہوا تھا کہ انہیں کوئی ڈر نہیں ہے۔ وہ اسلحہ تانے اندر آئے، ان کی نظر لاش پر پڑی اور پھر یکدم صوفے کے پیچھے سے ماریہ کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور پھٹے ہوئے ہونٹ سے خون نکل کر رک گیا تھا۔

ایک نے آگے بڑھ کر ماریہ کے ہاتھ کھولے اور اس کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا باہر نکال دیا۔

”اندر ہے کوئی؟“ ایک نے پوچھا۔

”وہ چلے گئے ہیں۔ انہوں نے میرے شوہر کو مار دیا ہے۔“ ماریہ نے سرمہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے راشد کی لاش کے پاس بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ پولیس کے جوان گھر کا ایک ایک کمرہ دیکھنے لگے تھے۔ بکھرا ہوا سامان ان کے سامنے تھا۔

پولیس کے جوانوں میں سے جو ان کا سینئر تھا اس نے ماریہ سے پوچھا۔ ”وہ گھر میں کیسے داخل ہوئے تھے؟“

نمک پارے!

☆ سنا ہے آپ جس کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں
اس سے شادی کر رہے ہیں؟
☆ ارے اس سے شادی کر لی تو گھوموں گا کس
کے ساتھ!

☆☆☆

☆ سنا ہے آپ اپنی بیوی کو آؤٹنگ پر لے جانا
پسند نہیں کرتے؟
☆ درست سنا ہے کیونکہ میں شادی شدہ عورتوں
کے ساتھ گھومنا پھرنا پسند نہیں کرتا۔

☆☆☆

☆ سنا ہے بیوی کے مرنے کے بعد آپ نے
اپنی سالی سے شادی کر لی؟
☆ جی ہاں، اس طرح مجھے نئی ساس سے نجات
مل گئی۔

☆☆☆

☆ دولہا کس اُمید پر اپنی شادی پر پکایا ہوا کھانا
کھلاتا ہے؟
☆ اس اُمید پر کہ باقی تمام عمر اس کو پکا پکایا کھانا
ملے گا۔

☆☆☆

☆ ہوٹل میں کھانے کی میز پر آن بن ہو جائے تو
کیا کرتے ہیں؟
☆ کرنا کیا ہے بل الگ الگ منگوا لیتے ہیں۔

درا بن کلاں سے مرزا گل، مانکہ گل کا انتخاب

مار یہ کوسرہ نے جو بتایا تھا، اس نے کہہ دیا۔ ”وہ اوپر
چھت کی طرف سے اچانک آئے تھے...“
پولیس کے اہلکار اوپر چلے گئے۔ وہ ایک ایک کمرہ
دیکھنے لگے۔ کمرہ میں بنی الماریوں کو کھول کر دیکھنے لگے۔
سرد نے اوپر کے کمرہ کی الماریوں میں موجود سامان بھی
نکال کر باہر نکھیر دیا تھا۔
پولیس اہلکار ایک ایک کمرہ دیکھ رہے تھے۔ اچھی طرح
سے تلاشی لے رہے تھے۔

پولیس اہلکار نے اوپر تک اچھی طرح سے جائزہ لے لیا
تھا۔ ٹوٹا ہوا دروازہ بھی ان کی نظر میں آ گیا تھا۔ جس سے
انہوں نے یہ اندازہ لگالیا تھا وہ سیڑھی کے دروازے کا لاک
توڑ کر نیچے آئے تھے۔ ایک اہلکار راشد کے گھر کے عقب کا
حصہ بھی دیکھ آیا تھا، دیوار کے ساتھ جوڑی ہوئی انٹیں بھی
دیکھ لی تھیں۔

پولیس والے پتے آ گئے تھے۔ اس علاقے کے متعلقہ
تھانے کو اطلاع کر دی تھی۔

متعلقہ تھانے کی.... پولیس کے ساتھ انسپٹر جلیس احمد
بھی گاڑی سے اتراتو اس نے پہلے باہر سے گھر کا جائزہ لیا
اور پھر اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

انسپٹر جلیس احمد کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور وہ
ایک صحت مند اور جاق چوبند شخص تھا۔ جلیس احمد وہی انسپٹر
تھا جو اس سے پہلے بھی راشد کی بیوی کے قتل پر تفتیش کر چکا
تھا۔ اس نے سر توڑ کوشش کی تھی اور راشد کو وہ گرفتار کرنے
تک پہنچ گیا تھا لیکن ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا تھا جس کی
بنیاد پر وہ راشد کو گرفتار کرتا۔ انسپٹر جلیس احمد کو یقین تھا کہ قتل
راشد نے ہی کیا ہے لیکن وہ بے بس تھا۔

انسپٹر جلیس احمد جب لاش کے پاس پہنچا۔ اس نے اس
کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو وہ چونک گیا۔ مکار راشد
کا چہرہ وہ کسی صورت نہیں بھول سکتا تھا۔ جب وہ اسے گرفتار
کرنے میں ناکام رہا تھا تو ایک محفل میں اچانک اس کی
ملاقات راشد سے ہو گئی تھی تو راشد نے بڑے طنزیہ لہجے میں
کہا تھا۔

”آپ کوئی اور کام دام سیکھ لیں، پولیس کی نوکری آپ
کے بس کا کام نہیں ہے۔“

جلیس احمد کو اس کا فقرہ آج بھی یاد تھا۔ جلیس احمد کا
تبادلہ ڈیڑھ سال پہلے اس شہر میں ہوا تھا۔

جلیس احمد نے راشد کا چہرہ پھر ڈھانپ دیا اور گھر کا
جائزہ لیتے ہوئے وہاں پر موجود اہلکاروں سے سوال کیے

اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ اس کے بعد انسپکٹر جلیس احمد نے ایک ایک کمرے کا جائزہ لیا اور ماریہ کو اپنے پاس بلا لیا۔

”کیا نام ہے آپ کا؟“ جلیس احمد نے ماریہ کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”میرا نام ماریہ ہے۔“ ماریہ نے مدہم آواز میں جواب دیا۔ اس نے سر جھکایا ہوا تھا اور چہرے سے وہ ایسے ظاہر کر رہی تھی کہ جیسے اسے اپنے شوہر کی موت کا بہت دکھ ہو۔

”چہرے پر زخم کیسا ہے؟“

”جب میرے شوہر نے مزاحمت کی تو ایک نے میرے منہ پر بھی تھپڑ مار دیا تھا۔“ ماریہ نے بتایا

”کتنے آدمی تھے وہ؟“

”تین، یا چار تھے۔“

”تین تھے کہ چار؟“ جلیس احمد نے ٹھوس لہجے میں ایک جواب مانگا۔

ماریہ نے سوچا کہ وہ پہلے کیا جواب دے چکی ہے پھر بولی۔ ”تین تھے۔“

”ان کو پہچان لیں گی آپ۔“

”ان کے چہرے نقاب میں تھے۔“

”گھر سے کیا کیا لے کر گئے ہیں وہ؟“

”گھر میں نقدی، میرے زیورات تھے۔ وہ لے گئے

ہیں۔“ ماریہ نے جواب دیا۔

ایک ہلکار نے بتایا کہ وہ چھت سے آئے تھے اور گھر کے عقب میں دیوار کے ساتھ انٹیں جوڑ کر اوپر چڑھنے کے لیے انہوں نے انتظام کیا تھا۔

چند سوال کرنے کے بعد جلیس احمد کمروں کو دیکھتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اور جائزہ لینے کے بعد وہ واپس آ گیا۔

سرمہ کی راشد سے لڑائی کے دوران گھڑی کی چین کی پن کھل جانے سے گھڑی کلائی سے اتر کر نیچے گر گئی تھی۔ اور سرمہ کو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اسی کے پیر کی ٹھوکر سے گھڑی لیڈی لاکج کی بڑی لکڑی کی الماری جو دیوار کے ساتھ بتائی تھی، اس کے نیچے چلی گئی تھی۔

جلیس احمد اسی الماری کے پاس کھڑا جائزہ لے رہا تھا۔ ماریہ اپنا غم میں ڈوبا چہرہ لیے ایک طرف بیٹھی تھی۔

”میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ لوگ تین نہیں تھے۔ صرف ایک تھا۔“ جلیس احمد کی اس حیرت انگیز پیش گوئی پر ماریہ ایسے چونکی جیسے اس کے پیروں میں سانپ نظر آ گیا ہو۔

جلیس احمد نے کچھ دیر ماریہ کا جائزہ لیا اور پھر بولا۔

”مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ سامان کسی ایک آدمی نے کھیرا ہے۔ صرف ایک آدمی کا کام ہے۔“

”آپ کو لگتا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں مگر کیوں؟“ ماریہ نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے سوال کر دیا۔

اس سوال کا جواب جلیس احمد کے پاس نہیں تھا، یا پھر وہ فی الوقت جواب دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ چپ رہا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ارد گرد اچھی طرح سے تلاشی لے۔ شاید انہیں کچھ مل جائے۔ اس کے اہلکار منتشر ہو گئے اور وہ خود بھی گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے جلیس احمد نیچے جھکا اور اس کی نظر سرمہ کی گھڑی پر پڑ گئی۔ جلیس احمد نے ہاتھ بڑھا کر وہ گھڑی اٹھالی اور اسے دیکھنے کے بعد اپنی جیب میں رکھ لی۔ ماریہ نے بھی دیکھ لیا تھا کہ جلیس احمد نے کچھ اٹھایا ہے، لیکن وہ یہ نہیں دیکھ سکی تھی اس کے ہاتھ کیا لگا ہے۔

جلیس احمد نے ایک بار پھر چاروں طرف کا جائزہ لے کر ماریہ سے پوچھا۔

”شوہر کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے تھے؟“

”اچھے تھے۔“ ماریہ نے جواب دیا۔

جلیس احمد نے سر ہلایا اور اپنے ایک اہلکار کو بلا کر ماریہ کا بیان لیا۔ اہلکار اس کا بیان لکھ رہا تھا۔ ابھی بیان مکمل ہوا ہی تھا کہ جلیس احمد کو ایک فون موصول ہوا۔ وہ فون اس پولیس اہلکار نے کیا تھا جو سرمہ کے تعاقب میں تھا اور اس وقت وہ اس کالونی میں موجود تھا۔

☆☆☆

پولیس کی تیز نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ بھاگنے والا اس گھر میں داخل ہوا ہے کیونکہ جب سرمہ دیوار پر چڑھا تھا تو اس کا کیچڑ میں لٹھڑا پیر کا نشان وہاں دیوار پر لگا ہوا تھا۔ بھاگتے ہوئے سرمہ کا پیر کیچڑ میں چلا گیا تھا۔

انسپکٹر جلیس احمد کی دین بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ پیر کا نشان دکھا دیا گیا تھا۔ کالونی کے چوکیدار بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ جلیس احمد کے کہنے پر اس گھر کی بیل دی گئی۔ اندر سے چوکیدار نے ایک رخنے میں سے جھانکا اور پولیس کو دیکھ کر وہ چونکا۔

”گیٹ کھولو... ہمیں گھر کی تلاشی لینی ہے۔ وقت ضائع مت کرو کوئی اس گھر میں داخل ہوا ہے۔“ چوکیدار نے گیٹ کھولنے میں تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ کالونی کے چوکیدار نے گیٹ کھولنے کے لیے کہا تو اس نے گیٹ کھول دیا۔

جلیس احمد کی معیت میں پولیس اندر داخل ہو گئی۔ اس وقت تک سرد اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ آن کر چکا تھا، اس نے بہت سے کاغذات کمرے میں بکھیر دیے تھے۔ گرم چائے تیار کر کے گگ بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس نے سب کچھ ٹھیک کر لیا تھا۔ بس ایک بات تھی۔ اس کی گھڑی وہاں رہ گئی تھی۔ سرد دیکھ رہا تھا کہ پولیس اس گھر میں داخل ہو چکی تھی۔

گھر کے چوکیدار نے ڈرتے ڈرتے سرد کے کمرے کا دروازہ بجایا تو تھوڑی دیر کے بعد سرد نے دروازہ کھولتے ہی غصے سے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔۔۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے باہر گھڑی پولیس کی طرف دیکھا تو اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا اور اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا۔۔۔؟“

”مجھے انسپکٹر جلیس احمد کہتے ہیں۔ آپ کو تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں آپ کو جانتا ہوں، آپ مشہور ڈراما رائٹر سرد شار ہیں۔ جائے وقوعہ سے ایک شخص بھاگا تھا اور وہ اس گھر میں داخل ہوا ہے۔ ہم اس گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔“

”ضرور۔۔۔ تلاشی لیں۔“ سرد نے کہا اور جلیس احمد کے اشارے پر اس کے اہلکار پورے گھر کی تلاشی لینے لگے۔ اس دوران میں جلیس احمد نے سرد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے مجھے پہچانا؟ تقریباً چھ ماہ قبل آپ نے ٹریک ریش میں معمولی سی بات پر میرے بیٹے سے الجھ کر اس کی اچھی خاصی پٹائی کر دی تھی اور پھر کچھ ایسے معززین درمیان میں آگئے تھے کہ چاہتے ہوئے بھی میں آپ پر مقدمہ نہیں بنا سکا تھا۔ ورنہ ایک انسپکٹر کا بیٹا ہو اور اس کی پٹائی کرنے والا بچ جائے، یہ کیسے ممکن ہے۔“ جلیس احمد نے لگے ہاتھ ماضی کا ورق پلٹ دیا تھا۔

”اس نے اپنی غلطی سے مار کھائی تھی لیکن مجھے لگتا ہے کہ آپ کے سینے میں وہ زخم ابھی تازہ ہے۔“ سرد بولا۔

ابھی جلیس احمد کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ ایک اہلکار نے آکر اطلاع دی کہ کوئی نہیں ملا اور بیس منٹ کے بعد سب ایک جگہ جمع ہو گئے اور سب نے ہی بتایا کہ اس گھر میں کوئی نہیں ہے۔

”مجھے یقین تھا کہ یہاں کوئی نہیں آیا لیکن میں نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔“ سرد نے کہا۔

بساط
”شواہد ہیں کہ وہ اس گھر میں آیا ہے۔“ جلیس احمد کمرے کی گھڑی کے پاس چلا گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ گھڑی کے ساتھ ایک طرف اسے تھوڑی سی مٹی لگی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ سے مٹی کو چھوا، مٹی ابھی گیلی تھی۔ سرد نے کمرے کی اچھی طرح سے صفائی کر دی تھی لیکن پھر بھی اس جگہ مٹی لگی رہ گئی تھی۔

”یہ گھر آپ کا ہے؟“ جلیس احمد نے پوچھا۔
”یہ گھر میرا نہیں ہے۔“ سرد نے جواب دیا۔

جلیس احمد کچھ سوچنے لگا۔ اس نے سوچتے سوچتے سرد کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظر کمرے سے ملحق ہاتھ روم کے دروازے پر چلی گئی۔۔۔ اس نے اپنے اہلکار سے کہا۔ ”ہاتھ روم کو دیکھا؟“ یہ کہنے ہی وہ خود ہاتھ روم کی طرف چلا گیا اور یکدم سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ سرد نے ہاتھ روم کو خوب صاف کیا ہوا تھا اور اپنے جوتے بھی اتار کر اس نے اسی شار۔۔۔ میں رکھ دیے تھے جس میں اس نے اپنے کپڑے رکھے تھے۔ جلیس احمد واپس سرد کے پاس کھڑا ہو گیا۔

”شکریہ کہ آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ شاید کل مجھے آپ کی ضرورت پڑے اس لیے برائے مہربانی میرے بلانے پر آجائیے گا۔“

”میری کیوں ضرورت پڑے گی؟“
”ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ میں آپ کے پاس آ جاؤں گا تا کہ پریس میں کوئی خبر نہ چلی جائے۔“ جلیس احمد کا لہجہ عجیب تھا۔

”دیئے وقوعہ ہوا کیا ہے؟“
”آپ ہی کی فیلڈ کا راشد نامی شخص قتل ہو گیا ہے۔“ جلیس احمد نے بتانے کے بعد سرد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ سرد سن کر کچھ حیرت زدہ ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ جلیس احمد نے اپنے اہلکاروں کو چلنے کا اشارہ کر دیا۔

☆☆☆

انسپکٹر جلیس احمد جب بھی کسی کیس کو ہاتھ میں لیتا تھا تو وہ اس کی تحقیق و تفتیش میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ راشد کو وہ پہلے ہی سے جانتا تھا۔

ماضی کی ان باتوں کے پیش نظر جلیس احمد سوچ رہا تھا کہ راشد ایک سخت مزاج اور سخت دل کا مالک تھا۔ پہلی بیوی کے ساتھ بھی اس کی لڑائیاں رہتی تھیں اور وہ اس پر تشدد بھی کیا کرتا تھا۔ اس شہر میں آکر جبکہ وہ پیسہ بھی کما رہا تھا۔ اس نے ماریہ سے دوسری شادی کی تھی۔ اگر راشد نے اپنی پرانی روش نہیں بدلی تھی تو وہ یقیناً ماریہ پر بھی تشدد کرتا ہوگا اور

ماریہ نے اس سے زچ ہو کر قتل جیسا قہقہہ قدم تو نہیں اٹھایا تھا؟ اگر اس نے ایسا کیا تھا تو ماریہ کے ساتھ ضرور کوئی دوسرا بھی ہوگا۔ ماریہ اکیلی راشد کو قتل نہیں کر سکتی۔ جلیس احمد نے سوچا، کہیں سرمہ تو ماریہ کے ساتھ نہیں ملا ہوا؟ کیونکہ قاتل کے قدموں کے نشان سرمہ کے اس گھر تک جاتے تھے جہاں وہ مقیم تھا۔

جلیس احمد کا تجربہ کہتا تھا کہ جس طرح سے گھر کا سامان نکھرا ہوا تھا اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ جیسے الماریوں سے سامان نکال نکال کر باہر پھینکا ہو۔ آنے والے چور ایسا کیا تلاش کر رہے تھے کہ انہیں ایک ایک الماری کا سامان باہر نکالنا پڑا؟

بہت سے سوالات تھے جو جلیس احمد کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ ان تمام سوالوں کا جواب لینے کے لیے اس نے اپنے طور پر تحقیق شروع کر دی تھی۔ راتوں رات اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے سے سرمہ، راشد اور ماریہ کے متعلق معلومات جمع کرنی شروع کر دی تھی۔

دوسرے دن وہ خود بھی سادہ لباس میں سرمہ کے اس گھر تک گیا تھا جہاں وہ مقیم تھا۔ اس نے دیوار اور دائیں بائیں کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ اسے شک تھا کہ راشد کو قتل کر کے بھاگنے والا سرمہ ہی تھا جو بھاگ کر سیدھا اس گھر میں آ گیا۔ رات اس نے کھڑکی کے پاس گیلی مٹی بھی دیکھی تھی جو جوتے کے ساتھ وہاں لگی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی پٹائی بھی نہیں بھولا تھا، اب وہ حساب بھی چکنا کرنا چاہتا تھا۔ جلیس احمد بہت دیر تک اس جگہ موجود رہا اور کالونی کے چوکیداروں سے پوچھ گچھ بھی کرتا رہا۔

☆☆☆

دوپہر کے بعد انسپکٹر جلیس احمد کے سامنے ماریہ اور سرمہ براجمان تھے۔ وہ راشد کے گھر میں تھے۔ اس کمرے کے باہر چند پولیس والے کھڑے تھے۔ ماریہ نے اپنا سراور ماتھا اسکارف سے لپیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ جلیس احمد نے ان دونوں کو ایک جگہ جمع کرنے میں رازداری سے کام لیا تھا۔ وہ چاہتا تو سرمہ کو بدنام کرنے کے لیے کچھ بھی کر دیتا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سرمہ کے ساتھ ایک بڑا میڈیا گروپ بھی ہے جس کے کامیاب ترین تفریحی چینل کے لیے وہ لکھتا ہے۔ جلیس احمد اس پر ٹھوس ثبوت کے ساتھ ہاتھ ڈالتا چاہتا تھا۔

”مجھے جلیس احمد کہتے ہیں۔ میرے بارے میں مشہور ہے کہ میں کیس کے ساتھ چٹ جاتا ہوں اور میری

تحقیق اتنی تیز رفتار ہوتی ہے کہ جب دوسرا پولیس والا ابھی کاغذی کام میں مصروف ہوتا ہے تو میں اس سے کہیں زیادہ آگے نکل چکا ہوتا ہوں۔ میں نے مختصر سے وقت میں تم دونوں کے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کر لی ہیں کہ تم بھی حیران رہ جاؤ گے۔“ جلیس احمد نے کہا۔

سرمہ نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔ ”میری ایک اہم میٹنگ ہے آپ کو جو بات کرنی ہے، وہ ذرا جلدی کر لیجئے گا۔“

جلیس احمد کے چہرے پر سرمہ کی بے پروائی دیکھ کر ایک رنگ آیا اور معدوم ہو گیا۔ اس نے ماریہ سے سوال کیا۔ ”راشد آپ کا شوہر تھا۔ اس کی لاش کو اس کے وارث اپنے آبائی شہر لے گئے ہیں آپ اس کی تدفین کے لیے کیوں نہیں گئیں؟“

”ہماری شادی راشد کے خاندان کی مرضی کے بغیر ہوئی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے وہاں جانے سے کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔“ ماریہ کا جواب سن کر سرمہ نے دل ہی دل میں اسے داد دی۔

”راشد اپنی پہلی بیوی کو قتل کر چکا تھا؟“

”ان پر یہ الزام تھا۔“ ماریہ نے جلدی سے کہا۔

جلیس احمد اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا کیونکہ وہ اس الزام کو ثابت نہیں کر سکا تھا۔ وہ بولا۔ ”راشد پر پہلی بیوی کے قتل کا الزام تھا۔ وہ اپنی پہلی بیوی پر تشدد بھی کرتا تھا۔ وہ عجیب جنونی اور نفسیاتی مریض تھا، آپ کے ساتھ بھی اس کا رویہ پُر تشدد ہی تھا؟“

”ہماری شادی کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ وہ مجھ پر تشدد شروع کر دیتا۔“ ماریہ کا لہجہ پُر اعتماد تھا۔ جلیس احمد لا جواب سا ہو گیا۔

”منگنی تو آپ نے سرمہ نثار سے کی تھی پھر شادی راشد سے کیسے ہو گئی؟“ جلیس احمد نے اگلا سوال کر دیا۔

”اس سوال کا جواب آپ ان سے لیں۔“ ماریہ نے جواب دینے کے بجائے سرمہ کی طرف دیکھے بغیر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

”ان سے کیوں؟“

”کیونکہ میں نے اچانک منگنی ختم کر دی تھی۔ یہ جس سے چاہتی شادی کرتی۔“ سرمہ نے بلا تامل جواب دیا۔

”آپ نے کیوں اچانک منگنی ختم کر دی تھی؟“

”میری مرضی... مجھے اس سے بہتر مل گئی اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ شوہر میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔“ سرمہ نے کہا۔

”یہ جھوٹ ہے۔ تم دونوں جلدی شادی کرنا چاہتے تھے

لیکن ایسا بیچ میں کیا ہوا کہ اس کی شادی راشد سے ہوگئی اور راشد کو جان کی قیمت ادا کرنی پڑی؟“ جلیس احمد کا لہجہ تیز ہو گیا۔

”یہ آپ کا خیال ہے۔“ سرمہ کے انداز میں ابھی تک بے پروا کی تھی۔

”بیچ یہ ہے کہ راشد اپنی اس بیوی پر بھی تشدد کرتا تھا۔ جو آپ سے ناقابل برداشت تھا اور تم دونوں نے مل کر راشد کو قتل کر دیا۔“

”میں ایک رائٹر ہوں، خونی نہیں ہوں۔“

”آپ خونی بن چکے ہیں۔ اس گھر میں آپ کی یہ گھڑی کیا کر رہی تھی؟“ جلیس احمد نے اچانک اس کی گھڑی نکال کر سرمہ کے سامنے رکھ دی۔

”راشد میرا دوست بھی تھا اور اس کے ساتھ میں نے کام ہی کیا ہے۔ اسے کسی شادی پر جانا تھا اور چار دن پہلے اس نے مجھ سے گھڑی مانگی تھی۔“ سرمہ کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔

”آپ کی محبوبہ کو وہ لے آؤ اور آپ شادی پر جانے کے لیے اسے اپنی گھڑی دے رہے ہیں؟“ جلیس احمد کی مسکراہٹ میں تمسخر تھا۔

”پلیز انسپکٹر صاحب آپ سوچ سمجھ کر بات کریں۔ اگر ایسی ہی بات کرنی ہے تو میں جا رہا ہوں اور میرا وکیل آپ سے بات کرے گا۔“

”وکیل تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا کیونکہ آپ نے راشد کو قتل کیا اور سیدھے اس گھر کی جانب بھاگے۔ چوکیدار کی نظر پڑی اور پولیس آپ کے پیچھے لگ گئی لیکن آپ اپنے اس گھر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔“ جلیس احمد بولا۔

سرمہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ عیاں کی اور بولا۔ ”آپ تو مجھ سے بھی اچھا لکھ سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہم مل کر ایک سیریل لکھیں۔“

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں سرمہ صاحب۔ آپ کے اس گھر میں جانے کے ثبوت ہیں۔“

”تو پھر وہ ثبوت آپ عدالت میں پیش کر دیں اور مجھے گرفتار کر لیں۔“ سرمہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے آپ سے جتنا تعاون کرنا تھا میں نے کر لیا۔ اب آپ کو کوئی مسئلہ ہو تو میرا وکیل آپ سے بات کرے گا۔“ سرمہ جانے لگا تو ایک اہلکار جلدی سے ہاتھ میں ایک شاپر پکڑے اندر آیا اور جلیس احمد کے کان میں کچھ بتانے لگا۔ سرمہ نے وہ شاپر بیگ دیکھ لیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی لیکن اس نے اپنے چہرے سے کچھ

ظاہر نہیں کیا تھا۔ سرمہ جانے کے لیے بڑھا تو جلیس احمد نے اسے روک لیا۔

”ایک منٹ سرمہ شاد صاحب۔ آپ سے معذرت کہ آپ کی یہاں موجودگی پر میرے دو آدمی آپ کے اس گھر کی تلاشی لیتے رہے اور وہاں سے یہ شاپر.... اٹھا لائے ہیں۔“ جلیس احمد کے چہرے پر خفیف مسکراہٹ تھی اور سرمہ کے چہرے پر کچھ تاثرات عیاں ہو کر معدوم ہو گئے۔

”واردات کی رات جو کپڑے آپ نے پہنے تھے وہ اس شاپر.... میں ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ کچھ توقف کے بعد جلیس احمد نے سرمہ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ ”میں کسی کام کو ادھورا نہیں چھوڑتا۔ اب آپ خود ہی بتادیں کہ یہ سارا کھیل کیسے کھیلا گیا تھا۔ آپ کی خاموشی کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس شاپر.... کے اندر آپ کے وہ کپڑے ہیں جو آپ نے پہن کر راشد کو قتل کیا تھا اور اپنے گھر جاتے ہی سب سے پہلے ان کپڑوں کو بدلاتا تھا۔ اندر وہ دستانے بھی ہیں جو آپ نے چڑھائے ہوئے تھے۔ اب بتانا ہی پڑے گا کہ کیوں قتل کیا تھا تم نے راشد کو؟“ جلیس احمد کا لہجہ کراخت ہو گیا۔ ”ابھی پریس والوں کو بلاتا ہوں اور آپ کا نیاروپ سب کے سامنے دکھاتا ہوں۔“

مار یہ مطمئن اور منہ دوسری طرف کیے بیٹھی تھی لیکن وہ اندر سے بری طرح سے گھبرا گئی تھی۔ اس کی سانس تیز ہوگئی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ اب پکڑے گئے ہیں۔ جیل اب ان کا مقدر ہوگی اور وہ کبھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔

سرمہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”اس شاپر میں بھری ہوئی ردی نکال کر پھینک دیں میں بساط کا مہرہ نہیں ہوں کہ آپ مجھے گھیر کر بات کر دیں گے۔ ایسے ہوا میں تیر چلانے کے بجائے اپنی تفتیش کا رخ بدلیں اور راشد کا جو قاتل ہے اسے گرفتار کریں۔ اس سے آپ کا اور میرا وقت بچ جائے گا۔“

سرمہ نے کہہ کر جلیس احمد کا کندھا تھپتھپایا اور اس جگہ سے چلا گیا۔ مار یہ حیران تھی کہ جاتے ہوئے سرمہ کو جلیس احمد نے روکا کیوں نہیں؟

سرمہ کے جانے کے بعد جلیس احمد نے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا اندازہ غلط تھا۔ اگر سرمہ نے قتل کیا ہوتا تو وہ اس شاپر کو دیکھ کر گھبرا جاتا اور کچھ نہ کچھ بول دیتا اور ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ کیونکہ عادی مجرم کے علاوہ باقی مجرم کسی بھی بات پر گھبرا کر سچ اُگل ہی دیتے ہیں، میری یہ چال ناکام ہوگئی ہے اٹھا کر پھینک دو اس شاپر کو۔“ جلیس احمد کی بات سن کر مار یہ نے سکھ کی سانس

لی۔ جبکہ سرمدا اپنی کار کو اسٹارٹ کرتے ہوئے بول رہا تھا۔
 ”جلیس احمد جس اسکول میں تم ٹیچر ہو وہاں میں ہیڈ
 ماسٹر ہوں۔ تمہارے جاتے ہی میں نے اپنے کپڑوں کو جلا
 کر اس کی راکھ فلش میں بہا دی تھی اور جوتے دھلے اور
 پالش کیے اس وقت میرے پیروں میں ہیں۔“

☆☆☆

چھ ماہ گزر گئے تھے۔

ماریہ پھر سے انجم کے پاس چلی گئی تھی کیونکہ راشد کی
 موت کے ساتھ ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ ان چھ ماہ میں
 سرمدا نے ایک بھی ملاقات ماریہ سے نہیں کی تھی۔ پھر ماریہ
 اکیلی سرمدا کے کہنے پر اس کے گاؤں چلی گئی اور اس سے
 بھی پہلے سرمدا اپنی کار میں گاؤں پہنچ چکا تھا۔

سرمدا نے اپنے گاؤں کے لاری اڈے سے ماریہ کو لیا
 اور اپنی حویلی میں لے گیا۔ سب ماریہ سے مل کر خوش ہوئے
 اور تیسرے دن دونوں کا نکاح ہو گیا۔ جب نکاح کے بعد
 سرمدا اپنی دلہن کے پاس جانے والا تھا تو سرمدا کے بھائی نے
 بتایا کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔

سرمدا کو حیرت ہوئی اور وہ اس سے ملنے مہمان خانے میں
 چلا گیا۔ تب وہ حیران رہ گیا جب اس نے اپنے مہمان
 خانے میں انسپکٹر جلیس احمد کو دیکھا۔

”آپ مجھے اچانک دیکھ کر حیران تو ہوئے ہوں گے۔
 چھ ماہ سے آپ دونوں کی نگرانی کر رہا ہوں۔ داد دیتا ہوں
 آپ کو کہ آپ چھ ماہ سے ایک بار بھی ماریہ بی بی سے نہیں
 ملے۔ اور پھر اچانک انہیں گاؤں بھیج کر اب شادی کر لی۔“
 ”انسان کا کبھی بھی دل بدل سکتا ہے۔ کل جس کو چھوڑ
 دیتا ہے وقت آنے پر اسے اپنا بھی لیتا ہے۔ اس میں ایسی کیا
 بات ہے؟“ سرمدا نے کہا۔

”آپ رائٹر ہو اور میں باتوں میں آپ سے جیت نہیں
 سکتا۔ ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ یہ بات میرے
 تجربے میں ہے کہ پہلا جرم کرنے کے بعد گھبراہٹ اور
 خوف ان کے چہرے پر بسرا کر لیتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی
 بات پر خوف سے کچھ ایسا کہہ جاتے ہیں کہ وہ پکڑے جاتے
 ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ راشد کا قتل تم نے ہی کیا تھا۔ جائے
 وقوعہ پر گھڑی ملی تو تم نہیں گھبرائے، میں نے تمہارے سامنے
 شاپر۔۔۔ رکھا تو تم گھبرائے کیوں نہیں؟ اعتماد کا پہاڑ اپنے
 چہرے پر سجائے کیسے کھڑے رہے؟“

”آپ کو یہ یقین کیوں ہے کہ میں نے ہی راشد کا قتل کیا

ہے؟“

بساط

”سرمدا اور ماریہ کی محبت اور پھر راشد کا ماریہ کو دھوکے
 سے اپنے گھر میں لے جا کر زبردستی اس سے شادی کرنا اور تم
 دونوں کا ایک ہونے کے لیے اسے قتل کرنا۔۔۔ بہت کچھ
 جاننے کی کوشش کی ہے میں نے۔ یہ حقیقت تمہارے گھر
 والوں کو بتا دوں تو وہ شاید اس حقیقت کو ہضم نہ کر سکیں کہ
 ماریہ بی بی کی پہلے بھی شادی ہو چکی ہے۔“ جلیس احمد بولا۔

”ایک بات کہوں۔ آپ کو اس سے کوئی سروکار نہیں
 ہے کہ راشد کو قتل کس نے کیا ہے۔ دراصل آپ اپنے بیٹے کی
 پٹائی کا مجھ سے حساب چکنا کرنا چاہتے ہیں اور وہ زخم آپ کو
 چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا ہے۔“ سرمدا کی بات سن کر جلیس
 احمد نے اپنے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ سجائی جیسے وہ یہ
 کہہ رہا ہو کہ تم حقیقت تک پہنچ ہی گئے ہو۔

سرمدا نے جلیس احمد کے قریب کھڑے ہو کر اپنے ایک
 ملازم کو آواز دی۔ ایک ہٹا کٹا ملازم اندر آیا تو سرمدا نے کہا۔
 ”یہ پولیس والا ہے۔ ایک بار میں نے اس کے بیٹے کو پٹا
 تھا۔ اس کا زخم سینے پر لیے پھر رہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی
 اور بھی آیا ہے؟“

”جی ان کا ڈرائیور ہے۔ وہ بھی پولیس والا ہی لگتا
 ہے۔“ ملازم نے جواب دیا۔

”ایسا کرو کہ اس کا گلا کاٹ کر اس کی کار کی ڈکی میں
 ڈال دو اور پولیس کو بلا لو۔ آگے کیا کرنا ہے میں بتا دوں گا۔“
 ملازم سنتے ہی باہر کی طرف بھاگا۔ جلیس احمد حواس باختہ
 ہو گیا۔ ”ارے یہ کیا۔۔۔ اسے روکو۔۔۔“ جلیس احمد کہتا ہوا
 باہر کی طرف بھاگا۔ ڈرائیور کار کے اندر بیٹھا تھا۔ وہ ملازم
 اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جلیس
 احمد کار کے اندر بیٹھا اور غصے سے بولا۔
 ”نکلو یہاں سے جلدی کرو۔“

کار اسٹارٹ ہوئی اور وہاں سے نکل گئی۔ آگے جا کر
 جلیس احمد نے گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے دیکھتے ہوئے
 کہا۔ ”جو کھاتا بند ہو جائے، اسے دوبارہ نہیں کھولنا چاہیے،
 دل کی خلش کا کھانا تو بالکل بھی نہیں کھولنا چاہیے۔ بھاڑ میں
 گیارا شد، اس نے اپنی معصوم بیوی کا قتل کیا تھا، اس کی سزا
 اسے مل گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ سامنے والا آنکھیں نکالنے
 سے ڈر جائے، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سامنے والا اس سے بھی
 بڑی اور سرخ آنکھیں رکھتا ہو۔“

ڈرائیور کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، وہ کبھی جلیس احمد کا
 منہ دیکھتا اور کبھی سامنے دیکھنے لگ جاتا۔